جناب غلام احمد پرویز کی (خود ساختہ)

عجمی سازش پر ایک نظر

حافظ پروفیسر ڈاکٹر مُحمّد دین قاسمی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد آپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com

جناب غلام احمد پرویز کی (خودساختہ)

عجمی سازش پر ایک نظر

جامعہ بیت العتیق (رجسٹرڈ)

کتاب نمبر ____________

حافظ پروفیسر ڈاکٹر محمد دین قاسمی
بی ایس سی (آنرز) ایگریکلچر
ایم اے اسلامیات
پی ایچ ڈی علوم اسلامیہ

کتاب سرائے
بیت الحکمت کا اشاعتی ادارہ
الحمد مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور

جملہ حقوق محفوظ

۱۴۳۰ ہجری ۲۰۰۹ء

نام کتاب : جناب غلام احمد پرویز کی (خودساختہ) عجمی سازش پر ایک نظر
مؤلف : حافظ پروفیسر ڈاکٹر محمد دین قاسمی
اہتمام : بیت الحکمت، لاہور
مطبع : میٹرو پرنٹرز، لاہور

ڈسٹری بیوٹرز

کتاب سرائے
پبلشرز، ڈسٹری بیوٹرز، مشیران کتب خانہ جات
فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ
اُردو بازار، لاہور فون: 7320318 فیکس: 7239884
ای میل: hikmat100@hotmail.com

فضلی بک سپر مارکیٹ
اُردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔
فون: 2212991-2629724

ترتیب

- افتتاحی کلمات (۱)...... ھذا کتابنا ینطق علیکم بالحق ---------- ۱۵
- ذہنی غلامی کا سبب ---------- ۱۹
- جناب چوہدری غلام احمد پرویز ---------- ۲۱
- ہدفِ اوّل کے لیے پرویزی حیلے ---------- ۲۲
- مخالفتِ سنت کی ٹیکنیک ---------- ۲۴
- (۱) حدیث وسنت کی حجیت کا انکار ---------- ۲۴
- (۲) سنت کو مشکوک ٹھہرانا ---------- ۲۵
  - (الف) استشراقی حربے اور پرویزی حیلے ---------- ۲۵
  - (ب) عیب چینی کے لیے کتب احادیث کو کھنگالنا ---------- ۲۶
- ایک ضمنی ہدف...... مخالفتِ علماءِ اسلام ---------- ۲۶
- جدید اسلام کی تعمیر ---------- ۲۹
  - ''دینِ نو'' کی راہ میں موانع کا ازالہ ---------- ۳۰
  - (الف) مزاحمتِ علماء کا حل ---------- ۳۰
  - (ب) قرآن فہمی کا مسئلہ اور اس کا حل ---------- ۳۱
- مصطلحاتِ قرآن اور لغات القرآن ---------- ۳۳
- اپنے اصول کی آپ مخالفت ---------- ۳۴
- ''مفکرِ قرآن'' کا متضاد طرزِ عمل ---------- ۳۵
- تحریفِ قرآن، بربناءِ عشقِ اشتراکیت ---------- ۳۶

❀ تحریفِ قرآن، بربناءِ بُغضِ سرمایہ داری نظام ---------- ۴۰

❀ مصنّفین کتبِ لغات ---------- ۴۲

❀ خلاصۂ بحث ---------- ۴۴

(۲)...... ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہو ویسی سنو ۴۸

وابستگانِ طلوعِ اسلام کا ردِ عمل ---------- ۵۰

"یہی دلسوز ہے جو رہ چکا ہے دل نشیں برسوں" ---------- ۵۳

"مفکرِ قرآن" کا فنِ دشنام طرازی ---------- ۵۴

میری مجبوری ---------- ۵۶

باب اوّل --- "عجمی سازش" کی اجمالی تردید ۶۰

❀ سازش کے اسباب ---------- ۶۱

❀ فتح کے بعد ---------- ۶۲

❀ سازش کا مضحکہ خیز پہلو ---------- ۶۳

❀ عجمی سازش اور دینی علوم ---------- ۶۵

❀ جھوٹی حدیث اور وعید ---------- ۶۷

❀ دوسری صدی ---------- ۶۸

❀ دورِ تدوین ---------- ۶۹

❀ دورِ ترتیب ---------- ۷۰

❀ مشت بعد از جنگ ---------- ۷۱

❀ سازش کہاں کہاں؟ ---------- ۷۵

❀ قراءِ سبعہ ---------- ۷۵

❀ علم اور جہالت میں فرق ---------- ۷۷

❀ سازش کے اثرات ---------- ۷۸
❀ تحریک انکارِ حدیث کی رفتار ---------- ۸۴

باب دوم --- ''عجمی سازش'' کی تفصیلی تردید ۸۵

(۱) ''عجمیت'' کیا ہے؟ ---------- ۸۷
عجمی سازش ---------- ۸۹
(۲) انتقامِ عجم ---------- ۹۱
(۳) انتقامِ عجم اور شہادتِ عمر رضی اللہ عنہ ---------- ۹۲
وجۂ انتقام...... ''شاندار ایرانی تہذیب'' کا خاتمہ ---------- ۹۵
(۴) انتقامِ عجم کا شاخسانہ --- شہادتِ عمر رضی اللہ عنہ ---------- ۹۹
صحابہ رضی اللہ عنہم پر عدم مدافعت کا الزام ---------- ۱۰۳
(۵) قاتلِ عمر رضی اللہ عنہ --- ابولؤلؤ فیروز ---------- ۱۰۴
(۶) قتلِ عمر رضی اللہ عنہ کا محرک ---------- ۱۰۶
محرکِ قتل اور ''مفکرِ قرآن'' ---------- ۱۰۸
بے سروپا روایات کا سہارا ---------- ۱۱۰
مزاجِ پرویز کا ایک پہلو ---------- ۱۱۱
(۷) ھرمزان کا کردار ---------- ۱۱۳
(۸) جفینہ کا کردار ---------- ۱۱۹
(۹) شہادت عمر رضی اللہ عنہ اور کعب احبار ---------- ۱۲۰
(الف) استشارِ عمر رضی اللہ عنہ اور مشورۂ کعب ---------- ۱۲۱
(ب) کعب کا قبولِ اسلام ---------- ۱۲۵
(ج) شہادتِ عمر رضی اللہ عنہ اور کعب ---------- ۱۳۱

کیا کعب، شریک سازش تھا؟ ---------- ۱۵۳
(۱۰) مسلمانوں کی قوت کا راز ---------- ۱۳۶
(۱۱) ’’خدا کا ساتھ چھڑا دو‘‘ کا مفہوم ---------- ۱۳۸
’’معیت خدا‘‘ کا معنی، اتباع رسول ﷺ مع تعظیم نبی ﷺ ---------- ۱۴۱
(۱۲) کیا ایرانیوں کا ایمان کھوٹا تھا؟ ---------- ۱۴۴
(۱۳) شہادتِ عمر رضی اللہ عنہ کا الزام، ہرمزان پر ---------- ۱۴۶
(۱۴) انتقام عجم کا سیاسی محاذ ---------- ۱۵۱
علماء پر اتہامات ---------- ۱۵۳
(۱۵) علماء پر دوسرا الزام ---------- ۱۵۵
(۱۶) ’’مفکر قرآن‘‘ کی رنگ آمیزی اور دروغ گوئی ---------- ۱۵۹
(۱۷) مسلکِ پرویز سے اختلافِ علماء کی وجہ ---------- ۱۶۳
(۱۸) حضرت علی رضی اللہ عنہ اور بنو عباس کی طلب اقتدار ---------- ۱۶۵
(۱۹) رجعت کا عقیدہ اور ابن سبا ---------- ۱۶۶
(۲۰) حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق عقیدۂ وصایت ---------- ۱۷۱
(۲۱) ’’عجمی سازش‘‘ کا ایران سے تعلق، بذریعہ شہر بانو ---------- ۱۷۳
قصۂ شہر بانو کے وجوہِ بطلان کا اجمالی جائزہ ---------- ۱۷۶
(۲۲) حضرت سلمان رضی اللہ عنہ (فارسی) ---------- ۱۸۱
(۲۳) ’’عجمی سازش‘‘ یا عربوں کی قبائلی عصبیت ---------- ۱۸۳
(۲۴) ایک غلط فہمی اور اس کا ازالہ ---------- ۱۹۲
(۲۵) ابو مسلم خراسانی ---------- ۱۹۵
(۲۶) ابو مسلم خراسانی، کوچۂ سیاست میں ---------- ۱۹۷
(۲۷) خاندانِ برامکہ ---------- ۲۰۱

(۲۸) برامکہ کی اصل ---------- ۲۰۲
(۲۹) برامکہ کا عروج ---------- ۲۰۵
(۳۰) برامکہ کا عجمی اسلام ---------- ۲۰۷
مزاج پرویز کا ایک اور پہلو ---------- ۲۱۰
(۳۱) بیت الحکمت کا قیام اور مناظرے ---------- ۲۱۱
(۳۲) فوج میں ایرانی عنصر ---------- ۲۱۳
(۳۳) فرقہ وارانہ کشمکش ---------- ۲۱۸
(۳۴) دینی انتقام ---------- ۲۱۹
نت نئے بدلتے ہوئے مفاہیم ---------- ۲۲۲
آخر، یہ تبدیلی کس ''مفہومِ قرآن'' کے مطابق؟ ---------- ۲۲۸
(۳۵) شیعہ فرقے ---------- ۲۲۹
(۳۶) پرویز صاحب کا ''قرآنی مسلک'' ---------- ۲۳۱
حدیث کی بابت مسلک پرویز ---------- ۲۳۶
جائزۂ مسلکِ پرویز ---------- ۲۳۶
قرآن کے غلام فطرت اور نادان دوست ---------- ۲۳۹
(۳۷) سُنیوں کے مسلک پر عجمی اثرات ۔ (۱) تقلیلِ اہمیتِ قرآن ---------- ۲۴۱
اہمیت قرآن کو گھٹانا ---------- ۲۴۲
ترتیب قرآن اور طلوع اسلام ---------- ۲۴۵
قرآن اور مفہومِ ''کتاب'' ---------- ۲۴۸
حفاظتِ قرآن کا اصل ذریعہ، حفظ ہی ہے ---------- ۲۵۰
(۳۸) سُنیوں کے عقائد و مسلک پر عجمی اثرات ۔ (۲) ۔ عقیدۂ ناسخ و منسوخ ---------- ۲۵۱
جواب آں غزل ---------- ۲۵۳

(۳۹) سُنّیوں کے عقائد و مسلک پر عجمی اثرات۔ (۳)۔ وحی کی دو قسمیں ---------- ۲۵۶
دو نہیں، بلکہ تین قسمی وحی ---------- ۲۵۸
(۴۰) سُنّیوں کے عقائد و مسلک پر عجمی اثرات۔ (۴) مثلہ معہ ---------- ۲۶۱
مثلہ معہ ---------- ۲۶۲
حدیث پر نشانہ بازی ---------- ۲۶۳
(۴۱) سُنّیوں کے عقائد و مسلک پر عجمی اثرات۔ (۵)۔ حدیث کا مقام ---------- ۲۶۶
حکمِ قرآن اور حکمِ سنت کی پیروی میں مساوات ---------- ۲۶۷
(الف) حدیث زیرِ تنقید یا بالائے تنقید ---------- ۲۷۰
(ب) احادیث و سنن، محض تاریخ؟ ---------- ۲۷۲
دین اور تاریخ، جمع بین النقیضین؟ ---------- ۲۷۳
(ج) راویوں پر ایمان کا شوشہ ---------- ۲۷۳
(د) ''قرآن یقینی مگر روایات ظنی'' کا پراپیگنڈا ---------- ۲۷۶
(ر) اختلافِ سنت کا پراپیگنڈا ---------- ۲۷۸
(س) منکرین حدیث کا ایک شبہ اور اس کا ازالہ ---------- ۲۷۹
ازالۂ اشکال ---------- ۲۸۱
تبیینِ رسول کی مثالیں ---------- ۲۸۶
(ص) امام اوزاعی اور یحییٰ ابن کثیر ---------- ۲۹۰
(ط) قرآن، تعبیراتِ پرویز کا محتاج ---------- ۲۹۰
(ف) حافظ محمد ایوب کا اقتباس ---------- ۲۹۲
دورِ حاضر کے ایک عالم کی وضاحت ---------- ۲۹۳
(۴۲) زمانۂ تدوینِ حدیث ---------- ۲۹۸
(الف) خود ساختہ فلسفہ ---------- ۲۹۹

خوئے بدرا بہانہ ہائے بسیار است ---- ۳۰۱

چلو، ان ہی کو تسلیم کر لو ---- ۳۰۳

(ب) ''کچھ حدیثیں'' ---- ۳۰۴

(۴۳) ابن شہاب زہری اور ان کا مجموعۂ حدیث ---- ۳۰۵

(۴۴) تدوین حدیث کی بابت ''مفکر قرآن'' کی عیارانہ چال ---- ۳۰۷

(۴۵) امام زہری اور خلفاءِ بنی امیہ ---- ۳۰۸

(۴۶) کیا شیعہ راویوں کی روایات سنیوں کے ہاں قابل قبول نہیں ہیں؟ ---- ۳۱۱

آمدم برسرِ مطلب ---- ۳۱۴

(۴۷) کیا جامعین صحاح ستہ، سب کے سب ایرانی تھے؟ ---- ۳۱۹

(۱) امام بخاری ---- ۳۲۱

(۲) امام مسلم ---- ۳۲۱

(۳) امام ترمذی ---- ۳۲۱

(۴، ۵) امام نسائی و امام ابن ماجہ ---- ۳۲۲

(۶) امام ابو داؤد ---- ۳۲۲

کثرتِ تعدادِ احادیث کی وحشت ---- ۳۲۵

جملہ معترضہ بابت صحیفۂ ہمام ابن منبہ ---- ۳۲۹

امام بخاری کی چھ لاکھ احادیث ---- ۳۳۵

''مفکر قرآن'' کی ''حسن نیت'' اور خارزارِ تضادات ---- ۳۳۶

(۴۸) عباسیوں کی محبت ---- ۳۳۹

آیت قرآن اور ''ایسی احادیث'' ---- ۳۴۱

لفظ ''آل'' اور پرویزی حیلہ ---- ۳۴۲

(۴۹) اصحابؓ رسول ﷺ (معاذ اللہ) مرتد ہو گئے ---- ۳۴۴

دورُخا پن اور متضاد رویہ ---- ۳۴۶
امکانِ ارتداد در آیاتِ قرآن ---- ۳۴۷
عہد نبوی میں وقوعِ ارتداد کا اعتراف اور طلوعِ اسلام ---- ۳۴۹
(۵۰) امام طبری رحمہ اللہ، شیعہ تھے یا سُنّی؟ ---- ۳۵۱
(الف) کتب رجال اور امام طبری رحمہ اللہ ---- ۳۵۲
(ب) اپنے اعمال بد، دوسروں کے کھاتہ میں ---- ۳۵۵
(۵۱) امام طبری رحمہ اللہ کی تفسیر ---- ۳۵۸
غور وفکر کا سد باب ---- ۳۶۱
ما ابعد الیوم من الامس ---- ۳۶۳
تفسیر طبری پر یہ غیظ وغضب کیوں؟ ---- ۳۶۴
تفسیر طبری کی خوبیاں ---- ۳۶۷
تفسیر طبری کو طلوع اسلام کا خراجِ تحسین ---- ۳۶۹
(۵۲) امام طبری رحمہ اللہ کی تاریخ ---- ۳۷۱
تاریخ طبری اور اسلامی تاریخ کا پرویزی تصور ---- ۳۷۳
امام طبری رحمہ اللہ کا ''جرم'' ---- ۳۷۶
(۵۳) اسلام 'دین نہ رہا' مذہب بن گیا ---- ۳۷۷
(الف) قرآن کے علاوہ وحی ---- ۳۷۸
ثبوت وحی، خارج از قرآن ---- ۳۷۸
عقیدۂ وحی اور وضع حدیث ---- ۳۸۲
(ب) دینِ اسلام، مذہب میں بدل گیا ---- ۳۸۵
''پریم اور شانتی'' کا مذہب (تصنیفِ پرویز) ---- ۳۸۸
(ج) آزاد مملکت سے مراد؟ ---- ۳۹۱
(۵۴) آیت استخلاف ---- ۳۹۷

موقفِ پرویز کا تفصیلی جائزہ ---- ۳۹۹

ایک کا جرم، دوسرے کے سر ---- ۴۰۳

''عجمی سازش'' کے مآخذ ---- ۴۰۴

مآخذ پرویز کی تفصیل ---- ۴۱۲

باب سوم --- گاڑی اپنا کانٹا بدلتی ہے ۴۱۹

(۵۵) مذہب وسیاست میں ثنویت ---- ۴۲۰

''مفکر قرآن'' کی ایک اور دروغ گوئی ---- ۴۲۳

مسخِ حقائق کے پرویزی حیلے ---- ۴۲۴

اطاعت کا غلط مفہومِ پرویز ---- ۴۲۶

''مطابق قرآن'' بنانے کی دُھن میں تاریخی حقائق کی تحریف ---- ۴۲۷

آمدم برسر مطلب ---- ۴۲۷

کیا احکام سنت قابل تغیر وتبدل ہیں؟ ---- ۴۳۰

(۵۶) امام شافعی پر بہتان ---- ۴۳۱

(۵۷) محدثین اور فقہاء پر بہتان تراشی ---- ۴۳۴

(۱) کیا قیاس اور اجتہاد ہم معنٰی ہیں؟ ---- ۴۳۵

(۲) بہتان برامام شافعی رحمہ اللہ ---- ۴۳۵

(۳) سدِّ بابِ اجتہاد کی حقیقت ---- ۴۳۶

(۵۸) اہل حدیث پر بہتان تراشی ---- ۴۳۹

(۵۹) اہلِ فقہ پر بہتان تراشی ---- ۴۴۴

(۶۰) نظامِ سرمایہ داری کا احیاء ---- ۴۴۸

''مفکر قرآن''، مزاج شناس رسول بھی اور مزاج شناس عمرؓ بھی ---- ۴۵۱

قرآن کریم کی توحید اور ''مفکر قرآن'' کی توحید ---- ۴۵۲

آمدم برسرِ مطلب ---- ۴۵۴

(۶۱) حدیث وفقہ کی رُو سے نظام سرمایہ داری کا اسلام قرار پانا ---------- ۴۵۷
''مفکر قرآن'' کے تضادات ---------- ۴۵۹
مفہومِ آیت (۹/۳۵،۳۴) ---------- ۴۶۱
اڑھائی فیصد زکوٰۃ کا اقرار بھی اور انکار بھی ---------- ۴۶۲
اسلام کا معکوس تصور ---------- ۴۶۳
''مفکر قرآن'' کی اصول شکنی ---------- ۴۶۴
''مفکر قرآن'' بمقابلہ رسولِ قرآن ---------- ۴۶۵
رَدّ حدیث کی پرویزی ٹیکنیک ---------- ۴۶۶
''مفکر قرآن'' کا تحریفی مفہوم حدیث ---------- ۴۶۸
حدیث رسول ﷺ، ''مفکر قرآن'' کی درایت کی زد میں ---------- ۴۷۱
پہلے تنقیدی نکتہ کا جائزہ ---------- ۴۷۱
تاریخ کو ''مطابق قرآن'' بنانے کا پرویزی حیلہ ---------- ۴۷۴
دوسرے تنقیدی نکتہ کا جائزہ ---------- ۴۷۵
صحابہ پر حکم خدا کا گراں گزرنا ---------- ۴۷۶
پہلا واقعہ ---------- ۴۷۷
دوسرا واقعہ ---------- ۴۷۸
تیسرے تنقیدی نکتہ کا جائزہ ---------- ۴۷۹
صحابہ رضی اللہ عنہم کے مال و دولت کی حقیقت ---------- ۴۸۰

باب چہارم ---- ''عجمی سازش'' کے متوازی، ایک حقیقی ''عربی سازش'' ۴۸۳

(۶۲) ''عجمی سازش'' کے اثرات۔ امت مسلمہ پر۔ (۱)۔ عقیدۂ تقدیر ---------- ۴۸۴

”مفکرِ قرآن“ کا رسولِ قرآن سے معارضہ ومقاومہ ---- ۴۸۷

ایمانیاتِ خمسہ اور ”انسانی ذات پر ایمان“ کا عقیدہ ---- ۴۸۸

عقیدۂ تقدیر اور طلوعِ اسلام ---- ۴۸۸

”مفکرِ قرآن“ کی مزید گوہر افشانیاں ---- ۴۸۹

(۶۳) عجمی سازش کے اثرات، امتِ مسلمہ پر۔ (۲) تصوف ---- ۴۹۱

(الف) حقیقت تصوف۔ اسلامی یا غیر اسلامی؟ ---- ۴۹۱

(ب) کیا تصوف سرزمینِ اسلام میں اجنبی پودا ہے؟ ---- ۴۹۴

(ج) صوفیاء کا کشف والہام ---- ۴۹۷

(۶۴) عجمی سازش کے اثرات، امت مسلمہ پر۔ (۳)۔ تصوف میں مجوسی عقائد ---- ۵۰۱

(۶۵) عجمی سازش کے اثرات، امت مسلمہ پر۔ (۴)۔ باطنی معانی ---- ۵۰۴

باطنی معانی سے بدتر ”مفکرِ قرآن“ کے مجازی مفاہیم ---- ۵۰۵

ابن عربی کا باطنی مفہوم اور ”مفکرِ قرآن“ کا مجازی مفہوم ---- ۵۰۸

باطنی علم کی سند ---- ۵۰۹

حدیث کا صحیح مفہوم ---- ۵۱۱

باطنی معانی اور علامہ اقبال رحمہ اللہ ---- ۵۱۵

(۶۶) عجمی سازش کے اثرات۔ امت مسلمہ پر۔ (۵)۔ جماعتی زندگی کی نفی اور جہاد سے بے زاری - ۵۱۶

(۶۷) مرزا غلام احمد قادیانی کا دعویٰ ---- ۵۱۸

باب پنجم --- ”مفکرِ قرآن“ --- علماءِ اسلام اور دانشورانِ کفر کی نظر میں ۵۲۵

- علماءِ کرام کے ہاں پرویز اور فکرِ پرویز کی قدر وقیمت ---- ۵۲۷
- علماءِ عرب کی طرف سے فتاوائے کفر ---- ۵۲۷

حکومتِ کویت کا فتویٰ ---------- ۵۳۰-۵۲۹
متحدہ عرب امارات کا فتویٰ ---------- ۵۳۰
شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ، آلِ شیخ کا فتویٰ ---------- ۵۳۱
❀ دنیائے کفر کا پرویز صاحب کو خراجِ تحسین ---------- ۵۳۶
❀ آخر یہ پذیرائی کیوں؟ ---------- ۵۴۰
❀ اختتامی کلمات (۱) استشراقی ہتھکنڈے اور ''مفکرِ قرآن'' ---------- ۵۴۹
❀ (۲) عالمِ کفر کی جامعات ---------- ۵۵۷
❀ (۳) ''عجمی سازش'' اور شورش کاشمیری ---------- ۵۶۱
❀ کتابیات ---------- ۵۶۱

* * *

افتتاحی کلمات

(۱)ھذا کتابنا ینطق علیکم بالحق

بیماریوں میں خطرناک ترین بیماری وہ ہوتی ہے جس کی علامات عیاں نہ ہوں بلکہ وہ مریض کو صحت مندی کے دھوکے میں مبتلا رکھ کر، اُسے آہستہ آہستہ سوئے گور دھکیل رہی ہو۔ رہی وہ بیماری جس کی علامات واضح اور اجاگر ہوں، تو وہ چنداں خطرناک نہیں ہوتی، کیونکہ انسان، اس کی علامات واضح ہوتے ہی اپنی مدافعانہ کاوشیں شروع کر دیتا ہے، اس کے برعکس ایسا مرض، جو اپنے آثار و علامات کو ظاہر ہی نہ ہونے دے، اور اندر ہی اندر صحت کی جڑیں کاٹتا رہے، انسان ایسے پُر اسرار مرض کے سامنے لاچار اور بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔

عداوتوں میں بدترین عداوت وہ ہوتی ہے جو دوستی کے پیرائے میں اختیار کی جائے، اور انسان کو پتہ ہی نہ چل پائے کہ اس لباسِ خلّت میں ملبوس شخصیت، اس کی دوست نہیں بلکہ دشمن ہے۔ انسان اپنے کھلے دشمن سے نقصان اٹھا سکتا ہے مگر دھوکہ نہیں کھا سکتا، لیکن اس دشمن سے جو عداوت کا نہیں بلکہ دوستی کا لباس پہن کر آتا ہے، اور بابِ عداوت سے نہیں بلکہ پُر خلوص دوستی کے دروازے سے وارد ہوتا ہے، انسان دھوکہ بھی کھاتا ہے اور نقصان بھی اٹھاتا ہے۔

اپنے آثار کو نمایاں کر دینے والی بیماری کی نسبت، اپنی علامات کو مخفی رکھنے والی بیماری ـــ اور ـــ کھلے دشمن کی مبینہ دشمنی کی نسبت، دوستی کے بھیس میں چھپی ہوئی عداوت بدرجہا زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔

ہمارے دشمنوں کی ایک قسم وہ ہے، جس کے افراد کھلے بندوں ہمیں، ہمارے دین سے برگشتہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں، ہماری تہذیب کے ان اعداء نے، ہمارے دین کے مقابلے

میں، ایک خود ساختہ دین پیش کیا ہے جو خدا پرستی کی بجائے ہوا پرستی کی تعلیم دیتا ہے، اور جس کا پورا نقشۂ حیات، ہمارے اسلامی نقشۂ حیات کی ضد واقع ہوا ہے، جس میں خیر و شر کی بنیاد، انبیائے معصومین کے مبنی بر وحی ٹھوس علم پر ہونے کی بجائے، آزاد فکر فلسفیوں کے ظنی قیاسات پر قائم ہے۔ بدقسمتی سے تقریباً سارا عالم اسلام، ہمارے دین و تہذیب کے ان کھلے دشمنوں کی سیاسی غلامی میں صدیوں مبتلا رہا ہے۔ عالم اسلام کا بیشتر حصہ اگرچہ اب سیاسی آزادی سے ہمکنار ہو چکا ہے لیکن ابھی تک وہ ذہنی غلامی سے چھٹکارا نہیں پا سکا۔

جن دنوں، ہم سیاسی طور پر اسلام دشمن قوتوں کے غلام تھے، ان دنوں سامراج نے ہماری دینی روایات اور تہذیبی نشانات کو بڑے منظم لیکن غیر محسوس طور پر مٹانے کی کوششیں کیں۔ خدا و رسول کی تعلیمات کی بجائے، آغوشِ دہریت میں پروردہ فلاسفہ کے نظریات کو پھیلایا گیا۔ ردّ و قبول اور اخذ و ترک کے اسلامی پیمانوں کی جگہ، جدید تہذیب کی اقدار کو معیار گردانا گیا۔ ملکی قانون کو (جو جس حد تک بھی اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ رہ گیا تھا) بدل کر استعماری قانون نافذ کر دیا گیا۔ درس گاہوں میں ہمارے تہذیبی فکر اور تمدنی آثار کی بجائے، استعماری فکر اور مغربی آثارِ مدنیت کو فروغ دیا گیا تاکہ امت مسلمہ کا قرآن اور نبیؐ قرآن سے تعلق، ٹھوس علمی، عقلی اور ایمانی اساس پر قائم رہنے کی بجائے (بشرطیکہ وہ رہ بھی جائے) جذباتی، تقلیدی اور موروثی بنیاد پر قائم ہو جائے۔

یہ سب کچھ ہماری تہذیب اور ہمارے دین کے ان کھلے دشمنوں نے برسرِ عام کیا۔ امت مسلمہ چونکہ اپنے ان اعداء اور ان کی حیلہ سازیوں سے واقف تھی، اس لئے ان سے فریب خوردہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ انہوں نے مخلوط سوسائٹی کی ترویج کی، مگر امت اسلامیہ کی غالب اور عظیم اکثریت نے اس کا کوئی اثر قبول نہ کیا۔ انہوں نے بہتیرا شور مچایا کہ قربانی ایک "وحشی" رسم ہے، مگر امت نے اس منسک کو برقرار رکھا۔ انہوں نے تعلیم کے ذریعہ اپنی فکر کو مسلط کرنے کی کوشش کی مگر ملت اسلامیہ کے اکابر نے اس مسموم تعلیم کے اثرات سے خود کو محفوظ رکھنے کے لئے، اپنے جداگانہ تعلیمی اداروں کا بندوبست کر لیا۔ انہوں نے دفتری

نظام الاوقات میں نماز کی ادائیگی کے لئے کوئی، وقت نہ رکھا مگر مسلمانوں نے نماز کو ترک نہ کیا۔ الغرض، مسلمانانِ ملت نے اپنے ان کھلے دشمنوں کی ان گمراہ کن چالوں سے اپنے آپ کو محفوظ و مصئون رکھنے کی ہمیشہ کوشش کی۔ اگر ایک مختصر اور حقیر سی اقلیت نے تہذیب غالب کا رنگ اختیار کیا بھی، تو اس کے اکثر افراد اپنے دل میں ندامت و شرمساری محسوس کرتے رہے۔

یہ تھے ہمارے دین کے کھلے دشمن، اور یہ تھیں اُن کی چالیں، اور یہ تھیں وہ تدابیر، جو مسلمانوں نے ان اعداءِ دین کے خلاف چوکنے ہو کر اختیار کیں۔ ان کھلے دشمنانِ دین کے بعد، اب ذرا ان نقاب پوش اعداء اسلام کو بھی ملاحظہ فرمایئے، جو اسلام کا لبادہ اوڑھ کر، مصلحین کے روپ میں مسلم معاشرے میں نمودار ہوتے ہیں۔ ان کی فکر، اُسی سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے جو ہمارے کھلے اعداءِ دین نے پیش کیا ہے۔ ان کے ردّ و قبول اور اخذ و ترک کے بنیادی معیار وہی ہیں جو ہمارے کھلے دشمنوں کے ایجاد کردہ ہیں۔ اگر وہ لوگ، اپنی لذّت پرستانہ مدنیتِ فاسدہ کی بدولت حجابِ نسواں کو جاہلانہ رسم قرار دیتے ہیں تو یہ لوگ قرآن ہاتھ میں لے کر، امت مسلمہ کو یہ باور کرانے میں کوشاں ہیں کہ پردہ ملاؤں کی ایجاد کردہ رسم ہے جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ لوگ، اگر قربانی کو ''وحشی رسم'' قرار دیتے ہیں، تو یہ لوگ بھی، اس میں کوئی ''تجربی فائدہ'' اور ''حسی منفعت'' نہیں پاتے۔ وہ لوگ، اگر اپنی شہوت پرستانہ تہذیب کی بدولت، مرد و زن کی مخلوط سوسائٹی کے قائل ہیں تو یہ ''فکر اسلامی'' اور ''فکر قرآنی'' کے علمبردار، مخلوط سوسائٹی کو قرآن سے کشید کر ڈالتے ہیں۔ وہ لوگ، اگر اپنے دفتری اوقات میں نماز کا وقفہ دینے کے لئے تیار نہیں ہیں، تو یہ لوگ ''معارف القرآن'' بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اقامت صلوٰۃ سے مراد، سرے سے یہ نماز ہے ہی نہیں، جو مساجد میں پڑھی جاتی ہے، بلکہ اس سے مراد، ایک خاص قسم کا نظام قائم کرنا ہے۔

الغرض، ہمارے کھلے مگر ''دانا دشمن'' ہمیں اسلام سے منقطع کر کے، اپنی جاہلی تہذیب کی طرف کھلے عام دعوت دیتے ہیں، مگر اسلام کے یہ ''نادان دوست'' بھی، اگر چہ ہمیں اُسی جاہلیت کی طرف بلاتے ہیں، مگر اس فریب یقین کے ساتھ، کہ یہی جاہلیت دراصل عین اسلام

ہے۔ ہمارے کھلے دشمن، جب ہم سے اسلام کو ترک کروا کر، ہمیں اپنی گمراہ کن معاشرت کی طرف بلاتے ہیں، تو وہ ہمیں یہ دھوکہ نہیں دیتے کہ اب تم جس معاشرت کی طرف آ رہے ہو، یہی اسلام کی مطلوبہ معاشرت ہے، مگر یہ لوگ، جب قرآن کے نام پر، ہمیں مغربی معاشرت کی طرف دعوت دیتے ہیں، تو اس فریب کے ساتھ کہ اصل اسلامی معاشرت یہی ہے جس کی طرف ہم تمہیں بلا رہے ہیں۔ وہ لوگ، اپنے فکر کو، اپنے فلاسفہ اور سماجی مصلحین کی طرف منسوب کرتے ہوئے، اسے قبول کرنے کی ہمیں ترغیب دیتے ہیں، مگر یہ لوگ، اسی فکر کو مغربی مفکرین کے نام سے نہیں بلکہ اسلام اور قرآن کے حوالے سے ہمیں اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ نتیجتاً، اگر ایک مسلمان، کھلے اعداءِ دین سے متاثر ہو کر، ان کی فکر و نظر کو اپنا لیتا ہے، تو وہ اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہتا کہ وہ اب بھی مسلمان ہے، مگر ان حضرات کی تبلیغ کے نتیجہ میں، اگر ایک شخص، اسلامی فکر کو ترک کر کے فرنگی فکر کو اپناتا ہے تو وہ اس خوش فہمی میں مبتلا رہتا ہے کہ وہ اب بھی بدستور اور حسب معمول مسلمان ہے کیونکہ افقِ پاکستان پر، نیا ''طلوع اسلام'' کرنے والوں اور ''فکرِ اسلامی'' کے ٹھیکیداروں نے ''فقہ القرآن'' بیان کرتے ہوئے، یہی یقین دلایا ہے۔ ہمارے تعلیم یافتہ مگر سادہ لوح مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ اگر کارل مارکس اور اینجلز کے نام سے، انہیں کمیونزم کی طرف دعوت دی جائے، تو وہ اس دعوت پر کان بھی نہیں دھرتے اور اسے خلافِ اسلام قرار دے کر رد کر دیتے ہیں، لیکن جب وطن عزیز کے افق پر ''طلوع اسلام'' ہوتا ہے اور اسی یہودی نژاد نظام کو ''نظام ربوبیت'' کے نام سے، اسلام ہی کا جدید ایڈیشن قرار دیا جاتا ہے، تو وہ سادہ لوح مسلمان، جو اس نظام کو کارل مارکس کے نام پر لینے سے گریزاں تھے، اب آمادۂ قبول نظر آتے ہیں۔ مغربی مفکرین، جن افکار و نظریات کو، ہمارے قلوب و اذہان پر مستولی نہ کر پائے، ہمارے یہ غلام فطرت مستغربین، اُنہی افکار و نظریات کو اُمت مسلمہ میں رواج دینے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں۔ صرف فکر اور نظریے ہی کی حد تک نہیں، بلکہ عملاً مدنیت و معاشرت کا وہ پورا نقشہ، قرآن کے جعلی پرمٹ پر درآمد کیا جا رہا ہے جو تہذیب مغرب کا تشکیل کردہ ہے، مثلاً مخلوط سوسائٹی، مخلوط تعلیم، ترکِ حجاب،

مردوزن کی مطلق اور کامل مساوات، درونِ خانہ فرائضِ نسواں کی بجائے، اسے بیرون خانہ مردانہ مشاغل میں منہمک کرنا، تعدد ازواج کو معیوب قرار دینا، خانگی زندگی میں، اُس کے فطری وظائف سے اُسے منحرف کر کے، قاضی و جج بلکہ سربراہ مملکت تک کے مناصب پر براجمان کرنا، وغیرہ، وغیرہ۔

اب، اگر یہی اجزاءِ معاشرت، قرآنی معاشرت کے لوازمات ہیں، تو انہیں آخر قرآن سے کشید کر ڈالنے کی ''پچاس سالہ قرآنی خدمات'' محض، پانی میں مدھانی چلائے رکھنے کی فضول حرکات ہیں، کیونکہ اہل مغرب نے، ان معاشرتی اجزاء، کو بغیر کسی قرآن کے ''مفکر قرآن'' کے کتاب اللہ میں ''غوطہ زن'' ہونے سے، بہت پہلے سے اپنا رکھا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ''مفکر قرآن'' کا مغربی معاشرت کے اس چوہے کو، جبلِ قرآن سے کھود نکالنا، ان کی ذہنی غلامی اور فکری اسیری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

ذہنی غلامی کا سبب

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے، اور وہ یہ کہ آخر اسلام کے ان نام لیواؤں میں مغرب کی یہ فکری اسیری اور ذہنی غلامی کا سبب کیا ہے؟ یہ ان میں کیونکر پیدا ہوئی؟ اس سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ جب عالمِ اسلام، زوال وانحطاط کا شکار ہوا، اور عالمی قیادت کا منصب، اُس سے چھن گیا، اور اہل اسلام کی بستیاں پے در پے کفار کے قبضۂ اقتدار میں آتی گئیں، یہاں تک کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ کوئی مسلمان سلطنت، اپنی آزادی کو برقرار نہ رکھ سکی، اقوامِ مسیحیت کی پیش قدمی کا نتیجہ صرف سیاسی مغلوبیت ہی نہ تھا، بلکہ وہ اپنی تہذیب، اپنے تمدن اور اپنی معاشرت کو بھی مفتوح ممالک پر مسلط کرنا چاہتے تھے، اس مقصد کے لئے، انہوں نے تعلیمی اور قانونی وسائل استعمال کیے، اپنے معاشرتی طور طریقوں کو رواج دیا، حکومت کی پوری مشینری، مفتوحین کو مغربی رنگ میں رنگ دینے پر تُل گئی، نتیجہ یہ کہ ہر مسلم سرزمین میں، اسلامیت اور مغربیت میں ایک کشمکش پیدا ہوگئی، جس کے نتیجہ میں امت مسلمہ، تین گروہوں میں بٹ گئی۔

ا۔۔۔ ایک گروہ، ان لوگوں پر مشتمل ہے، جو مغربی افکار ونظریات، اور مغرب کے

اخلاقی اقدار اور معاشرتی معیار سے متاثر ہی نہیں، بلکہ بری طرح مرعوب ہو چکے ہیں۔ یہ گروہ چاہتا ہے کہ اسلام کو بھی چھیل چھال کر، معیارِ مغرب کے مطابق بنا دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے یہ لوگ، اسلامی تعلیمات کو تاویل کے خراد پر چڑھا دیتے ہیں، کیونکہ دینِ اسلام کی ہر روایت، انہیں، دریا برد کر دینے کے لائق نظر آتی ہے، لیکن تہذیبِ مغرب کی ہر چیز، آسمانی نعمت دکھائی دیتی ہے۔ ان کے ردّ وقبول کے پیمانے اور اخذ وترک کے معیار، وہ ہیں جو ایجاد کردۂ مغرب ہیں۔ اگرچہ ان کی آنکھیں اپنی ہیں، لیکن دیکھتے، غیروں کے زاویۂ نگاہ سے ہیں۔ کان، ان کے اپنے ہیں، لیکن سنتے، غیروں کی ہیں۔ دل اور دماغ، تو اپنے ہیں، لیکن ان میں فکر، تہذیب غالب کی ہے۔ ﴿لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ﴾ ان غلام فطرت لوگوں کی یہ مستقل عادت ہے کہ ''قرآنی دانشور'' بن کر، یہ تقلید قدیم پر خوب گرجتے برستے رہتے ہیں، لیکن تقلید جدید کی راہ چلتے ہوئے، مقلدینِ قدیم سے بھی، یہ لوگ، چار قدم آگے رہتے ہیں۔

۲۔۔۔ دوسرا طبقہ، ان روایتی علماء وعوام پر مشتمل ہے، جو جدید سے مکمل طور پر آنکھیں بند کر کے قدیم ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا چکا ہے۔ اس گروہ کا موقف یہ ہے کہ اگر امت مسلمہ کے افراد، قدامت پرستی کی مضبوط چٹان بن جائیں، تو جدیدیت کی لہریں، اس سے ٹکرا کر خود ہی دم توڑ دیں گی۔ سیلابِ مغربیت کا مقابلہ، اس کے آگے بند باندھنے سے نہیں، بلکہ مضبوط و مستحکم چٹان بن کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات، نہ کبھی ان کے حاشیۂ خیال ہی میں آئی، نہ ہی یہ لوگ سوچنا چاہتے ہیں کہ اگر یہ طوفانِ بلاخیز، اپنی تند وتیز لہروں کے ساتھ، چٹانوں کے اوپر سے گزر گیا، تو پھر کیا بنے گا؟ یہ طبقہ، اسلاف کی تقلید پر اس قدر زور دیتا ہے کہ وہ، دورِ حاضر کی مشکلات اور زمانۂ جدید کے تقاضوں کا شعور ہی نہیں رکھتا کجا یہ کہ وہ ان مشکلات کا حل، قرآن وسنت کی روشنی میں پیش کر سکے اور تقاضا ہائے جدید کا چیلنج قبول کر سکے۔ تمدنِ جدید کے وسیع سمندر میں، یہ لوگ، قدامت پرستی کے ایک ایسے جزیرے میں رہتے ہیں جن میں یہ خود کو

سیلابِ جدید کی موجوں سے محفوظ و مصؤن سمجھتے ہیں۔

۳۔۔۔تیسرا طبقہ، اُن فہیم و فطین اور با شعور علماء پر مشتمل ہے، جو اپنے اسلاف کی علمی و فکری میراث کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے، اور تہذیب مغرب کی فکری بنیادوں سے بھی خوب واقف ہے۔ یہ لوگ، اسلام پر پختہ اور غیر متزلزل یقین رکھتے ہیں، خدائے قدوس کی کرم گستری سے، انہیں ذہن رسا اور عمیق تنقیدی نگاہ بھی ملی ہے، اس لئے یہ طبقہ، تہذیبِ مغرب اور تمدن فرنگ پر تنقیدی نگاہ ڈالتا ہے، اور ''خذ ما صفا و دع ما کدر'' کا اُصول اپناتا ہے۔ اس طبقہ سے وابستہ علماء، قدیم و جدید کا حسین امتزاج ہیں۔ ان کی تنقیدی سرگرمیوں کے طفیل، تہذیبِ غالب میں پایا جانے والا کھوٹ، زرِ خالص سے متمیز ہو چکا ہے۔ یہ طبقہ، قدیم کی صالحیت اور جدید کی نافعیت کو جمع کرتا ہے، کیونکہ یہ اسلاف کے سرمایہ کا بھی قدردان ہے، اور جدید تحقیقات و انکشافات کا بھی۔ یہ گروہ سابقہ دونوں طبقوں سے، اختلاف کرتے ہوئے، اسلام ہی کو اصل و اساس قرار دے کر، مغربی افکار و نظریات کو، اس کی میزان پر تولتا ہے، اور پھر رد و قبول کا فیصلہ کرتا ہے۔

جناب چودھری غلام احمد پرویز

جناب جی اے پرویز، ''مفکر قرآن'' صاحب کا تعلق، اول الذکر طبقہ سے ہے، جو مغربی ثقافت و کلچر اور اس کے افکار و نظریات سے مرعوب ہے، اور پھر اس مرعوبیت میں فکری غلامی، ذہنی مغلوبیت اور دماغی اسیری کا لوث بھی، جب شامل ہو جاتا ہے، تو ان کا مقصد اعلیٰ، ہدف اعظم اور آخری مطمح نظر، یہ امر قرار پاتا ہے کہ قرآن و سنت پر مبنی اسلام کے مقابلہ میں، ایک ایسا اسلام تراشا جائے جو مغرب کے لیے قابل قبول ہو، یہی ہدفِ اعظم، ان کی قرآنی نگارشات کا مرکز و محور اور ان کی ''پچاس سالہ قرآنی خدمات'' کا نقطۂ ماسکہ تھا۔ یہی وہ مقصدِ اعلیٰ ہے جو ان کی پوری قلمی زندگی میں، اُن کے دل و دماغ پر حاوی رہا ہے۔ یہی وہ آخری مطمح نظر ہے، جس کے زیر اثر، انہوں نے اپنا ''قرآنی لٹریچر'' پیش کیا ہے۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو دو اوّلین، مگر مساوی الوزن، اہداف، ہمیشہ ان کے پیشِ نظر رہے ہیں۔

۱: قرآن وسنت پر مبنی اسلام کی شدید مخالفت کرنا۔

۲: قرآن اور رسولِ قرآن کے پیش کردہ اسلام کے مقابلہ میں ایک نیا اسلام گھڑنا۔

اب ظاہر ہے کہ نئے اسلام کے گھڑنے کا جواز، اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ قرآن و سنت پر مبنی اسلام میں کیڑے ڈالے جائیں، اور اسے، غیر حقیقی، جعلی اور ناکارہ مذہب قرار دیا جائے۔ تاکہ اس کی مخالفت کا جواز نکل سکے۔

ہدفِ اوّل کے لئے پرویزی حیلے

جہاں تک ہدفِ اول کا تعلق ہے (جو قرآن وسنت پر مبنی اسلام کی مخالفت ہے) اس کی تردید ومخالفت دو پہلوؤں سے کی جاتی ہے:

اولاً...... اس پہلو سے کہ یہ پورے کا پورا دین ''غیر قرآنی مذہب'' ہے۔ پھر اس ''غیر قرآنی مذہب'' کا سرچشمہ بیان کرنے میں بھی، متضاد موقف اختیار کیے جاتے ہیں۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ:

> آج جو اسلام، دنیا میں مروّج ہے، وہ زمانہ قبل از قرآن کا مذہب ہو، تو ہو، قرآنی دین سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ ❶

یہاں قارئین کرام کے قلوب و اذہان میں، یہ بات مستحضر رہنی چاہئے کہ قیامِ پاکستان سے قبل، جناب پرویز صاحب، جس اسلام کو پیش کیا کرتے تھے، وہ قرآن وسنت ہی پر مبنی اسلام تھا۔ اُس زمانے کا اُن کا اسلام، اخلاص و نیک نیتی کے ساتھ پیش کیا جاتا تھا؟ یا کسی مصلحتِ فقیہانہ کا تقاضا تھا؟ اسے ہم سپردِ خدا کرتے ہیں۔ اور یہاں اپنے قارئین کرام کی توجہ صرف اس امر کی طرف مبذول کروانا چاہتے ہیں کہ پاکستان بننے کے بعد، چونکہ خود ''مفکر

---

❶ طلوع اسلام، مئی، جون ۱۹۶۲ء، ص ۱۵۹۔

قرآن'' کی سمتِ قبلہ (بظاہر یا حقیقتاً) تبدیل ہوگئی، اور اس کے ساتھ ہی، ان کی نگاہوں کا نقطۂ ماسکہ بھی بدل گیا۔ اس لیے اب انہیں، قرآن کریم اور سنتِ رسول ﷺ پر استوار اسلام، ''عجمی اسلام'' نظر آنے لگا، اور اکبر بادشاہ کے دینِ الٰہی کی طرز پر ترتیب دیا ہوا، وہ اسلام، جو مغربی معاشرت اور اشتراکی معیشت کی پیوندکاری کا نتیجہ تھا، ''قرآنی دین'' دکھائی دینے لگا۔ اور اس کے ساتھ ہی، انہوں نے علماءِ اسلام کے پیش کردہ (مبنی بر قرآن وسنت) اسلام کے متعلق، کبھی یہ ڈھنڈورا پیٹنا شروع کیا کہ یہ دین زمانہ قبل از قرآن کا کوئی مذہب ہے جیسا کہ اقتباس بالا سے ظاہر ہے، اور کبھی متضاد موقف اختیار کرتے ہوئے، یہ پراپیگنڈا کیا کہ یہ، عجم کی ''عجمی سازش'' کے نتیجہ میں بننے والا ''عجمی اسلام'' ہے، جیسا کہ درجِ ذیل اقتباس سے واضح ہے:

> انہوں نے (ایرانیوں نے) اُن عربوں سے شکست کھائی تھی، جنہیں وہ ابھی کل تک وحشی اور جنگلی شمار کیا کرتے تھے، اور شکست بھی ایسی، جس سے ان کی اس قدر وسیع سلطنت اور ایسی قدیم تہذیب کا خاتمہ ہوگیا۔ وہ ہونے کو تو مسلمان ہوگئے (یعنی اسلامی سلطنت کے فرمانبردار ہوگئے) لیکن اس شکست اور محکومی کا احساس، اُن کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا، اور اپنے حریف عربوں کی شان وشوکت کے منظر سے، ان کے سینوں میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھتی تھی، انہوں نے یہ انتقام دو طرح سے لیا، ایک تو بساطِ سیاست پر، جہاں انہوں نے اپنی ریشہ دوانیوں سے امت واحدہ کے ٹکڑے ٹکڑے کردیے، اور دوسرے، مذہب کے میدان میں۔ ①

ثانیاً...... مخالفت کے پہلو میں، اختیار کیے گئے متضاد موقف کو نظر انداز کرتے ہوئے، اب ہم دوسرے پہلو کی طرف آتے ہیں، جس میں قرآن وسنت پر مبنی اسلام کی مخالفت، تفصیلی انداز سے اور مختلف پرویزی حیلوں کے ساتھ کی گئی ہے۔

---

① طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۵۹ء، ص ۲۹۔

چونکہ علماء کرام، جس اسلام کے علم بردار ہیں، وہ قرآن و سنت پر مبنی ہے، اور ''مفکر قرآن'' مغرب کی ذہنی غلامی اور فکری اسیری کا شکار ہوکر، جس نئے اسلام کو تراشنا چاہتے ہیں، اس کی راہ میں سنت بُری طرح حائل ہے، اس لیے اس کی مخالفت بھی ان کا قریبی ہدف (Immediate Objective) قرار پایا۔ کیوں؟ اس لیے کہ:

> انہوں نے محسوس کیا کہ اسلام کے نظام حیات کو جس چیز نے تفصیلی اور عملی صورت میں قائم کیا وہ رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے۔ اسی سنت نے قرآن کی ہدایات کا مقصد و منشأ متعین کر کے مسلمانوں کے تہذیبی تصورات کی تشکیل کی ہے، اور اسی نے ہر شعبۂ زندگی میں اسلام کے عملی ادارے مضبوط بنیادوں پر تعمیر کر دیئے ہیں۔ لہٰذا اسلام کی کوئی مرمت اس کے بغیر، ممکن نہیں ہے کہ اس سنت سے پیچھا چھڑایا جائے۔ اس کے بعد صرف قرآن کے الفاظ رہ جاتے ہیں جن کے پیچھے نہ کوئی عملی نمونہ ہوگا، نہ کوئی مستند تعبیر و تشریح ہوگی، اور نہ کسی قسم کی روایات اور نظیریں ہوں گی۔ ان کو تاویلات کا تختۂ مشق بنانا آسان ہوگا، اور اس طرح اسلام بالکل موم کا ایک گولہ بن کر رہ جائے گا جسے دنیا کے ہر چلتے ہوئے فلسفے کے مطابق ہر روز ایک نئی صورت دی جا سکے گی۔ ①

مخالفتِ سنت کی ٹیکنیک

سنت رسول ﷺ کی مخالفت کے پیشِ نظر، جو ٹیکنیک اپنائی گئی ہے، وہ دو اساسی حربوں پر مشتمل ہے۔

۱: سنت کا بجائے خود، حجت و سند ہونے سے انکار کرنا۔

۲: سنت کی صحت کو مشکوک و مشتبہ قرار دینا۔

(ا) حدیث و سنت کی حجیت کا انکار

حجیتِ حدیث اور سندیتِ سنت کے انکار کے لیے، منکرین سنت نے، قرآن کریم کے الفاظ سے، روحِ قرآن کے خلاف، منصبِ رسالت کا یہ غلط تصور تراشا کہ حضور اکرم، صرف

---

① سنت کی آئینی حیثیت ص ۱۷ تا ص ۱۸۔

قرآن پہنچا دینے کی حد تک ہی رسول تھے، اس کے بعد، انہوں نے تالیِ قرآن، معلم کتاب، مدرّسِ حکمت، مزکی نفوس، شارح قرآن، شارع قانون، قاضئ عدالت، فرمانروائے سلطنت اور سپہ سالارِ افواج وغیرہ کی مختلف اور متنوع حیثیتوں سے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، وہ محمد رسول اللہ کی حیثیت سے نہیں، بلکہ محمد ابن عبد اللہ کی حیثیت سے ہیں۔ جس طرح، روز مرہ کی زندگی میں، عام انسانوں سے غلطیاں سرزد ہوتی ہیں، اُسی طرح آپ ﷺ سے بھی، ان کا صدور ہوا ہے، جیسا کہ چند مقامات پر قرآن میں مذکور ہے، مزید برآں، قرآن کریم، وَمَا عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلَاغُ کہہ کر، آپ ﷺ کی حیثیتِ رسالت، کو معاذ اللہ، ایک ڈاکیہ کی طرح، صرف قرآن کی ڈاک، بندوں تک پہنچا دینے کی حد تک محدود رکھتا ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ آپ کی سنت، کوئی دینی مقام و مرتبہ نہیں رکھتی۔ یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ حضور اکرم ﷺ کو قرآن کریم میں جہاں بھی محض مبلغ کہا گیا ہے، وہاں یہ حیثیت، کفار کے مقابلہ میں بیان کی گئی ہے۔ رہے اہل ایمان، تو آپ، اُن کے لئے صرف مبلغ ہی نہیں ہیں، بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں قابل اتباع نمونہ اور اسوہ حسنہ بھی ہیں۔ مزید برآں، بعض مقاماتِ قرآن پر، محض البلاغ کی بجائے البلاغ المبین کے الفاظ بھی موجود ہیں، جن کا مفاد یہ ہے کہ پیغامِ خداوندی کو تبیین و وضاحت کے ساتھ پہنچایا جائے، جو مجرد ''پیغام رسانیدن'' سے زائد تر چیز ہے۔ یہاں میں قارئین کرام سے یہ گزارش کروں گا کہ وہ منصب رسالت کے صحیح تصور کے لیے مولانا مودودی کی کتاب ''سنت کی آئینی حیثیت'' کا مطالعہ ضرور فرمائیں۔

(۲) سنت کو مشکوک ٹھہرانا

سنت کو مشکوک و مشتبہ قرار دینے کے لئے، جو ٹیکنیک اپنائی گئی ہے۔ اس کے دو اہم اجزاء ہیں۔

(الف) استشراقی حربے اور پرویزی حیلے

حدیث و سنت کی صحت میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کی ابتداء، (خوارج و معتزلہ کے ادوار کے بعد) مستشرقین نے کی تھی۔ اس لئے منکرینِ حدیث کے لئے (جو اُن ہی کے ذہنی غلام اور فکری اسیر ہیں)، ان استشراقی حربوں پر، نہ صرف یہ کہ ایمان لانا لازم ٹھہرا، بلکہ اپنی

عیاری و مکاری سے، ان میں پرویزی حیلوں کا اضافہ کرنا بھی فرض قرار پایا۔ پھر ان حربوں اور حیلوں کے ذریعہ، سنت کے بارے میں، ایسے شکوک وشبہات پیدا کر ڈالنا بھی واجب ٹھہرا، جن سے اہل ایمان، اس غلط فہمی میں پڑ جائیں کہ قرآن کے سوا، کوئی چیز بھی مسلمانوں کو قابل اعتماد ذرائع سے نہیں پہنچی۔

(ب) عیب چینی کے لئے کتبِ احادیث کو کھنگالنا

دوسرا حربہ، جو اس مقصد کے پیش نظر اپنایا گیا ہے۔ وہ کتبِ احادیث کو عیب جوئی کے لئے، اس طرح کھنگالنا ہے، جس طرح کبھی عیسائی مشنریوں اور آریہ سماجیوں نے قرآن مجید کو کھنگالا تھا، تا کہ اس میں سے ایسی چیزیں نکال نکال کر، بلکہ بنا بنا کر، لوگوں کے سامنے رکھی جائیں، جن سے اُن میں بے زاری اور نفرت پیدا ہو جائے، اور پھر مگرمچھ کے آنسو بہاتے ہوئے، مسلم عوام کو یہ باور کروانے کی کوشش کرنا، کہ یہی وہ احادیث ہیں، جو ایک طرف، اسلام کی رسوائی کا باعث ہیں، اور دوسری طرف، امت مسلمہ کی پستی کا سبب ہیں لہٰذا، اگر تمہیں، پستیوں کی بجائے رفعتوں کی تلاش ہے، اور ذلت اسلام کی جگہ عزتِ اسلام مطلوب ہے، تو پھر اس رسوا کن اور شرمناک دفتر حدیث سے چھٹکارا پاؤ۔ اور اپنے اس وعظ کو ’’دلپذیر اور مؤثر‘‘ بنانے کے لئے، برادرانِ یوسف کی طرح گریہ زاری اور آہ و بکاء کے ساتھ، یہ اپیل کی جاتی ہے کہ جملہ کتبِ احادیث کو دریا برد کر ڈالو۔

ایک ضمنی ہدف ـــ مخالفتِ علماء

قرآن وسنت پر مبنی اسلام کی تخریب کے ساتھ ساتھ، قرآن کریم کے نام پر، ایک ایسا نیا اسلام تراشنا بھی ضروری ہے، جو مغرب کے لئے قابل قبول ہو۔ کیونکہ بقول پرویز صاحب:-

> ہمارا قدامت پرست طبقہ، جو کچھ مذہب کے نام پر پیش کرتا ہے، اس میں اس کی صلاحیت ہی نہیں کہ وہ علم و بصیرت کی کسوٹی پر پورا اُترے، اور عقل وفکر کے تقاضوں کو پورا کر سکے۔ ①

---

① طلوع اسلام، اگست ۱۹۶۰ء، ص ۳۔

چونکہ نئے مجوزہ اسلام کو ''عقل و بصیرت کی'' جس ''کسوٹی پر پورا اُترنا ہے'' اور ''عقل و فکر کے'' جن ''تقاضوں کو پورا کرنا'' ہے، اُن کا تعلق، دورِ حاضر کی غالب تہذیب ہی سے ہے، اس لیے لامحالہ، وہ ایسا اسلام ہونا چاہیے، جو عصرِ رواں کی غالب تہذیب ہی سے ماخوذ ہو۔ چنانچہ ''مفکرِ قرآن'' نے، قرآن کریم سے جس نئے ''اسلام'' کو قطرہ قطرہ کشید کیا ہے، وہ آج کی غالب تہذیب کے مختلف اجزاء ہی پر مشتمل ہے۔ اس کے معاشرتی اجزاء فرنگی تمدنِ فاسد سے اور اقتصادی نظام، مارکسی اشتراکیت سے لے کر، اسی طرح ''قرآنی دین'' کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جس طرح مغل شہنشاہ اکبر نے مختلف مذاہب کے بے جوڑ اجزاء کے مجموعے کو ''دینِ الٰہی'' بنا کر پیش کیا تھا۔

ظاہر ہے کہ اس مقصد کے حصول کے راستے میں، جو سب سے بڑی رکاوٹ ہے، وہ علماء امت کا وجود ہے، اس لیے اس آخری ہدف کو پانے سے قبل، اِس قریبی مطمحِ نظر (Immediate Objective) کو پیش نظر رکھنا ضروری قرار پایا، جس میں علماء کی شدید مخالفت کے ذریعے، ان کی رکاوٹ کو دُور کرنا، وقت کا فوری تقاضا بن جاتا ہے، چنانچہ اس فوری تقاضے کے پیش نظر، ''مفکرِ قرآن'' نے، ''مذہبی پیشوائیت''، ''پریسٹ ہڈ'' اور ''تھیا کریسی'' جیسی اصطلاحات کو، نصرانیت، ہندومت، بدھ مت اور یہودیت جیسے باطل مذاہب سے مستعار لیا، اور پھر ان کا ترجمہ ''ملّا ازم'' کرتے ہوئے جملہ علماءِ امت، مفسرینِ قرآن، محدثین عظام اور فقہاءِ کرام کو مطعون کرنے کا ذریعہ بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ علماءِ امت، از سلف تا خلف، سب کی توہین و تذلیل اور تحقیر و تضلیل، ان کا مستقل وظیفۂ حیات بنا رہا۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ علماء امت، ''مفکرِ قرآن'' کے خود ساختہ، اُس ''قرآنی نظامِ حیات'' کے منکر و مخالف ہیں، جس کے معاشرتی اجزاء، مغرب کے فساد زدہ تمدن سے، اور معاشی نظام، پورے کا پورا اشتراکیت سے ماخوذ ہے۔ اس لیے وہ علماء کے خلاف، انتہائی تحقیر آمیز رویہ اختیار کیا کرتے تھے۔ تمام دنیا و جہان کی سمیٹی ہوئی برائیوں کو، لفظ ''ملّا'' میں سمو کر، اسے علماء کرام سے منسوب کرتے رہنا، ''مفکرِ قرآن'' کا مستقل شیوہ رہا ہے۔ وہ اپنے لٹریچر میں،

علماء کرام کو ”قرآنی معاشرے کا مخالف“ قرار دیا کرتے تھے۔ انہیں، ”بے علم، بے بصیرت، دلائل سے محروم اور براہین سے عاری“ کہا کرتے تھے۔ اُن پر، ”قرآنی تحریک کی مخالفت“ کا فتویٰ رسید کیا کرتے تھے۔ حالانکہ وہ بیچارے قرآنی تحریک کے نہیں، بلکہ قرآن کے نام پر اٹھائی جانے والی اُس تحریک کے مخالف تھے (اور اب بھی ہیں) جو ”قرآنی معاشرہ“ کے لیبل کے تحت، مغرب کی ننگی معاشرت اور بے حیا سوسائٹی کے جملہ اجزاء کو، مسلم معاشرہ میں پھیلانا چاہتے ہیں۔ نیز وہ علماء کو سانپوں سے بھی زیادہ خطرناک قرار دیتے ہوئے یہ سوقیانہ پراپیگنڈہ کیا کرتے تھے کہ علماء کی صفوں میں تو کوئی بے ضرر اور مفید فرد نہیں ہے، جبکہ سانپوں میں بے ضرر اور مفید سانپ بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ علماء، ایسے قدامت پسند، بلکہ قدامت پرست واقع ہوئے ہیں کہ ان کا پیش کردہ دین، ”نہ تو علم و بصیرت کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے، اور نہ ہی عقل و فکر کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے“۔ ظاہر ہے کہ ایسا دین پیش کرنے والا وہی شخص ہوسکتا ہے جو یورپ کی شرم و حیا سے عاری معاشرت سے اطوار و عادات کی خیرات لے کر اور اشتراکیت سے اقتصادی نظام کی بھیک مانگ کر، اسے قرآنی کشکول میں پیش کرکے ”مفکر قرآن“ بننے والا ہو۔ جب کہ ”مولوی“ بیچارہ، ایسی جدت طرازی سے کوسوں دور ہے۔ اسی وجہ سے ”مفکر قرآن“ کے ممدوح تعلیم یافتہ حکمران، ”ملا“ کے خلاف (بقول اُن کے) یہ رونا روتے رہتے ہیں کہ ”اس نے قوم کو تباہ کر ڈالا“ کیونکہ یہ لوگ، ”قرآن سے قطعاً نابلد ہیں“ اور قرآن و سنت کی بناء پر، چودہ سو سالہ پرانا وہ دین پیش کرتے ہیں، جس میں خدا و رسول کی تعلیمات سے ہٹ کر، جدید معاشی نظام اور معاشرتی اقدار کو اپنانے کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔

علماء کرام کے خلاف یہ گھٹیا، گھناؤنی اور سوقیانہ مہم، دراصل، ”مفکر قرآن“ کی وہ سازش ہے، جو اگرچہ، بجائے خود ہدفِ اعلیٰ اور منتہاءِ مقصود کی حیثیت نہیں رکھتی، لیکن ایک ایسے ذریعہ کی حیثیت ضرور رکھتی ہے، جو اپنی انتہائی منزل کے راستہ میں واقع رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے بطور وسیلہ اپنائی گئی ہے۔ اس سازش کا سارا تانا بانا، خود ”مفکر قرآن“ نے بُنا ہے،

ورنہ عالم واقعہ میں، اِس کا وجود ماضی و حال، کسی دور میں بھی نہیں پایا جاتا۔ پھر اس سازش کے ذریعہ، جن رذائل و جرائم کو، علماءِ ملتِ اسلامیہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، وہ سب "مفکر قرآن" کی اپنی ذات میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن علمی عیّاری اور ذہنی مکّاری کی بناء پر، ان منکرات و مثالب کو علماء کرام کے کھاتہ میں صرف اس لئے ڈالا جاتا ہے کہ کسی کی نگاہ، خود اُن کے اپنے عیوب و نقائص کی طرف ملتفت نہ ہونے پائے۔ لیکن ایک اور پہلو سے دیکھا جائے، تو یہ سازش، ذریعہ ہونے کے ساتھ ساتھ، بجائے خود، مطلوب و مقصود بھی ہے، جیسا کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ کے مندرجہ ذیل اقتباس سے واضح ہے۔

> امت مسلمہ کے تمام فقہاء، محدثین، مفسرین اور ائمہ لغت کو ساقط الاعتبار قرار دینا، تاکہ مسلمان، قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے، ان کی طرف رجوع نہ کریں، بلکہ ان کے متعلق، اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں کہ ان سب نے قرآن کی حقیقی تعلیمات پر پردے ڈالنے کے لئے ایک سازش کر رکھی تھی۔ ❶

"جدید اسلام" کی تعمیر

قرآن اور رسولِ قرآن کے پیش کردہ اسلام کی تخریب کے ساتھ ساتھ، جس نئے اسلام کو "مفکر قرآن" نے کتاب اللہ کا نام لے کر گھڑا ہے، وہ تین اصولوں پر مشتمل ہے، اس (جدید اسلام کے) اِن اصولوں کی بابت، مولانا مودودی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں۔

> اس کا پہلا اصول یہ ہے کہ تمام شخصی املاک کو ختم کر کے، ایک مرکزی حکومت کے تصرف میں دے دیا جائے، اور وہی حکومت، افراد کے درمیان تقسیم رزق کی مختار کل ہو۔ اس کا نام ہے "نظام ربوبیت"۔ اور کہا جاتا ہے کہ قرآن کا اصل مقصود یہی نظام قائم کرنا تھا، مگر پچھلے تیرہ سو سال میں کسی کو اسے سمجھنے کی توفیق نہ ہوئی، صرف حضرت مارکس اور اس کے خلیفۂ خاص، حضرت انیجلز، قرآن کے اس مقصد اصلی کو پا سکے۔

---

❶ سنت کی آئینی حیثیت، ص ۲۰۔

اس کا دوسرا اصول یہ ہے کہ تمام پارٹیاں اور جماعتیں توڑ دی جائیں، اور مسلمانوں کو قطعاً کوئی جماعت بنانے کی اجازت نہ دی جائے، تاکہ وہ معاشی حیثیت سے بے بس ہوجانے کے باوجود، اگر مرکزی حکومت کے کسی فیصلے کی مزاحمت کرنا چاہیں، تو غیر منظم ہونے کی وجہ سے نہ کرسکیں۔

اس کا تیسرا اصول یہ ہے کہ قرآن میں، جس ''اللہ و رسول'' پر ایمان لانے اور جس کی اطاعت بجالانے اور جسے آخری سند تسلیم کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اس سے مراد ہے ''مرکز ملت''۔ یہ مرکز ملت، چونکہ خود ''اللہ اور رسول'' ہے۔ اس لیے قرآن کو، جو معنیٰ وہ پہنائے، وہی اس کے اصل معنیٰ ہیں۔ اس کے کسی حکم یا قانون کے متعلق یہ سوال سرے سے اٹھایا ہی نہیں جاسکتا کہ وہ قرآن کے خلاف ہے۔ جو کچھ وہ حرام کرے، وہ حرام، اور جو کچھ وہ حلال کرے، وہ حلال ہے۔ اس کا فرمان شریعت ہے، اور عبادات سے لے کر، معاملات تک، جس چیز کی جو شکل بھی وہ تجویز کردے، اس کا ماننا فرض بلکہ شرط اسلام ہے۔ جس طرح ''بادشاہ'' غلطی نہیں کرتا، اُسی طرح ''مرکز ملت'' بھی سبوح و قدوس ہے۔ لوگوں کا کام، اس کے سامنے بس سر جھکا دینا ہے۔ ''اللہ اور رسول'' نہ تنقید کے ہدف بن سکتے ہیں، نہ ان کے خطاکار ہونے کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہے، اور نہ ہی ان کو بدلا ہی جاسکتا ہے۔ ❶

''دینِ نو'' کی راہ میں موانع کا ازالہ

اس ''نئے اسلام'' کی راہ میں، دو زبردست موانع واقع ہیں۔ ایک تو علماء کرام کا وجود، جو قرآن وسنت کے مقابلہ میں، ہر من گھڑت دین کی راہ میں رکاوٹ ہے، اور دوسرا، قرآن مجید کا عربی زبان میں ہونا، اور غیر عرب لوگوں کا اسے نہ سمجھنا۔

(الف) مزاحمتِ علماء کا حل

علماء کرام کی مزاحمت کا حل یہ سوچا گیا کہ ان کے خلاف، اوران کے پیش کردہ قرآن و

---

❶ سنت کی آئینی حیثیت، ص۲۰ تا ۲۱۔

سنت پر مبنی اسلام کے خلاف، ایک زبردست یلغاری مہم چلائی جائے، فقہاء و مجتہدین اور مفسرین و محدثین پر "ملاازم" کا لیبل چسپاں کر کے، انہیں، ہمیشہ مطعون اور بدنام کرتے رہنے کا "قرآنی جہاد" اس مقصد کے تحت جاری کیا گیا۔ پریسٹ ہڈ اور تھیا کریسی، جیسی اصطلاحات کا تصور، مذاہب باطلہ سے لے کر، اس کا تخم سرزمینِ اسلام میں، اس لئے بویا گیا، کہ جملہ علماء کو نشانۂ تضحیک و استہزاء بنا کر، انہیں بے آبرو کر دیا جائے، تاکہ اسلام فہمی اور قرآن فہمی کے لیے لوگ، اُن کے پاس نہ جائیں۔ چنانچہ اس مقصد کے تحت، ایک طرف، تو قرآن و سنت پر مبنی اسلام کو "عجمی اسلام" کا نام دیا گیا، اور اس نئے دین کو، جسے مغرب کی بے حیا معاشرت کے اجزاء کو اشتراکیت کے ساتھ منتھی کر کے پیش کیا گیا، "حقیقی اسلام" اور "قرآنی دین" کہا گیا۔ چونکہ پاکستان میں قرآن و سنت پر مبنی اسلام کے نفاذ کی منظم اور باضابطہ کوشش، جماعت اسلامی اور سیّد ابوالاعلیٰ مودودی نے کی۔ اس لیے سب سے زیادہ مخالفت کے حق دار وہی قرار پائے، اگرچہ کچھ اور گوشوں سے بھی نفاذ اسلام کی آواز اٹھی، لیکن جس دائمی، شدید اور گھناؤنی مخالفت کے مستحق مولانا مودودی رحمہ اللہ اور ان کی تنظیم کو سمجھا گیا، کسی اور کو نہیں گردانا گیا۔

ہم سفر اور بھی سرگرم سفر تھے لیکن　　مجھ کو رفتار سے صیّاد نے پہچان لیا

(ب) قرآن فہمی کا مسئلہ اور اس کا حل

انکار سنت کے بعد، جب قرآن تنہا رہ گیا تو یہ سوال پیدا ہوا کہ قرآنِ عربی سے "نیا اسلام" اخذ کرنا، قرآن فہمی کے بغیر ممکن نہیں، لہٰذا قرآن کو اگر سمجھا جائے، تو کیسے، کیونکر اور کہاں سے؟ کیونکہ بقول طلوع اسلام۔

> قرآن مجید سمجھ میں نہیں آ سکتا:
>
> ترجموں سے، کیونکہ قرآنی الفاظ کے مرادفات، دنیا کی کسی زبان میں نہیں مل سکتے۔
>
> تفسیروں سے، کیونکہ تفاسیر میں عام طور پر، مفسروں کے اپنے خیالات اور معتقدات، قرآنی مطالب پر غالب آ جاتے ہیں۔ ①

---

① طلوع اسلام، اپریل ۱۹۷۷ء، ص ۶۴ (آخری ٹائٹل صفحہ کا اندرونی ورق)۔

اب جبکہ قرآن فہمی، نہ تو مترجمین کے تراجمِ قرآن سے، اور نہ ہی مفسرین کی کتب تفسیر سے ممکن ہے، تو آخر فہمِ قرآن کیسے اور کہاں سے حاصل ہو؟ جواب میں فرمایا گیا

> قرآن مجید، اس طرح سمجھ میں آ سکتا ہے کہ عربی مبین کی مستند کتب لغت کی رو سے، اس کے الفاظ کے معانی متعین کیے جائیں، اور ایک مضمون کی مختلف آیات کو سامنے رکھ کر، اس کا مفہوم مرتب کیا جائے

> ''مفکر قرآن'' پرویز صاحب نے چالیس سالہ محنتِ شاقہ سے، پہلے، اس قسم کا ایک لغات مرتب کیا اور اس کے بعد، پورے قرآن کا مفہوم، اسی انداز سے متعین کیا۔ ①

اب ظاہر ہے کہ جس قرآن کو سمجھنے کے لیے، مترجمین کے تراجم قرآن اور مفسرین کی کتب تفاسیر، سب بیکار ہیں، اُسے اگر سمجھا جا سکتا ہے، تو صرف اور صرف، اس لغات القرآن کی رُو سے، جسے ''مفکر قرآن'' نے اپنی ''چالیس سالہ محنتِ شاقہ'' سے ''مستند کتب لغات'' کی روشنی میں مرتب فرمایا ہے، اور پھر اسے مرتب کرنے والے خود ''مفکر قرآن'' کی شان یہ ہے کہ صرف اُن ہی کا فہم و تدبر، مینارۂ نور اور خضرِ راہ ہے کیونکہ:

> یہ حقیقت قارئین کرام کے علم میں ہے کہ طلوع اسلام کے قرآنی مباحث، محترم پرویز صاحب ہی کے نورِ بصیرت سے مستنیر ہوتے ہیں

اور اُن ہی کا تدبر فی القرآن، ہم سب کے لیے چراغِ راہ ہے۔ ②

لہٰذا ع

آؤ لوگو! کہ یہیں نورِ خدا پاؤ گے

کتنی بڑی ہیں یہ دو نعمتیں (۱) لغات القرآن اور ''مفکر قرآن'' فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ.

---

① طلوع اسلام، اپریل ۱۹۷۷ء، ص ۶۴ (آخری ٹائٹل صفحہ کا اندرونی ورق)۔

② طلوع اسلام، نومبر ۱۹۴۹ء، ص ۵۴۔

مصطلحاتِ قرآن اور لغات القرآن

''مفکرِ قرآن'' کی ''چالیس سالہ محنتِ شاقہ'' کے نتیجہ میں، ''مستند کتبِ لغات'' کی رو سے، قرآنی الفاظ کے معانی تو متعین ہو گئے۔ لیکن قرآن کریم میں کچھ اصطلاحات بھی پائی جاتی ہیں، جن کا مفہوم، لغوی مفہوم سے منفک اور متغائر ہوتا ہے، ایسی اصطلاحات کے مفہوم کو کتبِ لغات سے نہیں، بلکہ اس نظام کے ذریعہ اور حوالہ سے معلوم کیا جاتا ہے جس سے وابستہ ہو کر، انہیں ایک خاص مدلول اور مفہوم ودیعت ہوتا ہے۔ خود ''مفکرِ قرآن'' صاحب فرماتے ہیں۔

> جب کوئی لفظ اصطلاح کی شکل میں مستعمل ہونے لگ جائے تو وہ اپنا لغوی مفہوم کھو دیتا ہے۔ اس کے بعد، آپ، جب بھی، اس لفظ کا استعمال کریں گے، وہ اپنے ان تمام مضمرات ولزومات کو، اپنے ساتھ لائے گا جس سے وہ نظریہ یا نظام عبارت ہے، جس کے لئے وہ اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ ❶

اصطلاحات کے متعلق، پرویز صاحب کا تسلیم کردہ اصول ملاحظہ فرما لینے کے بعد، اب قارئین کرام، اُن ہی کے قلم سے، یہ بھی جان لیں کہ قرآن مجید میں کون کون سے الفاظ بطور اصطلاح مستعمل ہیں۔

> قرآن کریم میں اقامت صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ کی اصطلاحات، دین کے بنیادی ارکان (عمائد اور ستون) کی حیثیت سے بار بار دُہرائی جاتی ہیں۔ ❷

اس اقتباس سے واضح ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ، قرآنی اصطلاحات ہیں۔ ایک اور مقام پر انفاق کو بھی اصطلاحِ قرآن کہا گیا ہے۔

> انفاق کے معنی خرچ کرنے کے نہیں، بلکہ یہ ایک ایسی روش، نظریہ یا معاشی نظام کی اصطلاح ہے جس میں سامانِ زیست کو روک کر نہیں رکھا جاتا، بلکہ اسے عالمگیر

---

❶ طلوعِ اسلام، ستمبر ۱۹۷۴ء، ص ۴۴۔

❷ تفسیر مطالب الفرقان، ج ا، ص ۹۷۔

ربوبیتِ انسانیہ کے لئے کھلا رکھا جاتا ہے۔ ❶

ان دونوں اقتباسات سے اقامتِ صلوٰۃ، ایتاءِ زکوٰۃ اور انفاق، تینوں کا قرآنی اصطلاحات ہونا واضح ہے۔ یہ نہ سمجھئے کہ ''مفکرِ قرآن'' کے نزدیک صرف یہ تین ہی قرآنی اصطلاحات ہیں۔ نہیں، بلکہ ان کے ہاں یہ فہرست بہت لمبی ہے، لیکن ہم صرف ان تینوں پر ہی اکتفاء کرتے ہیں۔

اپنے اصول کی آپ مخالفت

''مفکرِ قرآن'' صاحب، ان تینوں کو قرآن کی اصطلاحات بھی قرار دیتے ہیں، لیکن پھر ان کا مفہوم متعین کرنے کے لئے کتبِ لغات کھول کر بھی بیٹھ جاتے ہیں چنانچہ اقامت صلوٰۃ کی اصطلاح کا مفہوم وہ ازروئے لغت (بذریعہ تحریف) متعین کرتے ہیں اور شارع علیہ السلام کے اس مفہوم کو، جو تواتر کے ساتھ ہم تک پہنچا ہے، قطعی نظر انداز کرتے ہیں، اور لغوی موشگافیوں پر مبنی قلمی ورزش کے نتیجہ میں، کئی پیراگراف، اس کے لئے وقف کر ڈالتے ہیں، جن کو طوالت کے ڈر سے یہاں نقل نہیں کیا جا رہا ہے۔ (دیکھئے لغات القرآن از پرویز، ج ۳، ص ۱۰۳۴)

اسی طرح کا معاملہ وہ ''ایتاءِ زکوٰۃ'' کی اصطلاح کے ساتھ کرتے ہیں۔ ایتاء کی الگ لغوی بحث کرتے ہیں، اور زکوٰۃ کی الگ۔ پھر مؤخر الذکر لفظ کی بحث کے دوران، وہ علماءِ لغت کے حوالہ سے جو کچھ بیان کرتے ہیں، وہ ان کی قلمی چابکدستی کے باعث، یکسر بعید از حقیقت ہوتا ہے۔ لغات القرآن میں یہ بحث، تقریباً دو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، لیکن حرام ہے جو اس اصطلاح میں کہیں ان مضمرات ولزومات کا بھی ذکر ہو، جو خود شارع علیہ السلام نے اس میں سمو دیئے ہیں۔ اس بحث میں سے نتیجہ کے طور پر، جو کچھ وہ نکالتے ہیں (یعنی ریاست کی کل آمدنی Revenue)، دنیا و جہاں کی کسی کتاب لغت میں، زکوٰۃ کا یہ معنٰی نہیں دیا گیا۔ ''مفکرِ قرآن'' کی اس ضمن میں انحرافات کی قلعی، ماہنامہ محدث کے شمارہ مارچ ۱۹۸۹ء میں کھولی جا چکی ہے۔

---

❶ تفسیر مطالب الفرقان، ج ۱، ص ۱۰۶۔

یہی کھیل، ''مفکر قرآن'' نے، انفاق، کی اصطلاح کے ساتھ کھیلا ہے۔ وہ اس کے خود ساختہ معنٰی ''کھلا رکھنا'' پیش کرتے ہیں۔ اور پھر سینہ زوری کا یہ عالم ہے کہ وہ یہ نہیں کہتے کہ ''انفاق کا معنٰی کھلا رکھنا بھی ہے، تاکہ کسی دوسرے معنٰی (بلکہ اصل معنٰی) کی گنجائش بھی باقی رہ جائے، بلکہ وہ ''خرچ کرنے'' کے معنٰی کی قطعی نفی کرتے ہیں اور ''کھلا رکھنا'' کے واحد معنٰی کا اثبات کرتے ہیں (جیسا کہ گذشتہ اقتباس میں گزر چکا ہے) مزید برآں، وہ، بہت سی قرآنی آیات میں، اپنے خود ساختہ معنٰی کو نبھا بھی نہیں سکے ہیں۔ پھر یہ اصطلاح، جب ان کی لغوی تحقیق کی جولا نگاہ سے نجات پا کر نکلتی ہے، تو اس کا چہرہ انحرافات سے داغدار ہو چکا ہوتا ہے۔ ان انحرافات کا پردہ بھی اپریل ۱۹۸۹ء کے شمارہ محدث میں چاک کیا جا چکا ہے۔

اصطلاحاتِ قرآنیہ کا مفہوم متعین کرنے کے لیے، کتب لغات کو کھنگالنے کے ساتھ ساتھ، ''مفکر قرآن'' صاحب، یہ ڈھنڈورا بھی پیٹتے نہیں تھکتے کہ

> ۱۔۔۔ ہر نظام کی ایک اصطلاح ہوتی ہے، اور وہ اصطلاح اسی نظام کے منطوق کے اظہار کے لیے وضع کی جاتی ہے۔ ❶
>
> ۲۔۔۔ جب کوئی لفظ بطور اصطلاح کے رائج ہو جائے تو اس کے لغوی معانی نہیں بلکہ اصطلاحی معانی لیے جاتے ہیں۔ ❷
>
> ۳۔۔۔ جب کوئی لفظ اصطلاح کے طور پر استعمال ہونے لگے تو اس کے لغوی معنٰی نہیں لئے جاتے، اصطلاحی مفہوم لیا جاتا ہے، اور ان میں اکثر بڑا فرق ہوتا ہے۔ ❸

''مفکر قرآن'' کا متضاد طرزِ عمل

''مفکر قرآن'' کا (ہر معاملہ کی طرح) اس امر میں بھی متضاد طرزِ عمل ملاحظہ فرمائیے کہ وہ اقامتِ صلوٰۃ، ایتاءِ زکوٰۃ اور انفاق وغیرہ کو قرآنی اصطلاحات بھی مانتے ہیں، اور پھر یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ''جب کوئی لفظ اصطلاح کی شکل میں مستعمل ہونے لگ جائے، تو وہ اپنا

---

❶ طلوع اسلام، ستمبر ۱۹۶۶ء، ص ۶۰۔
❷ طلوع اسلام، اپریل ۱۹۸۱ء، ص ۶۱۔
❸ طلوع اسلام، جون ۱۹۸۱ء، ص ۶۸۔

لغوی مفہوم کھو دیتا ہے......'' پھر وہ، ان قرآنی مصطلحات کے مفہوم کے تعین کے لیے کتب لغات کھول کر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ اس ورق گردانی کے نتیجے میں، کہیں کی اینٹ اور کہیں کا روڑا لے کر، وہ نئے نئے معانی کا کنبہ جوڑا کرتے تھے۔ ہمارے نزدیک یہ ساری کارروائی، جس میں وہ عمر بھر قرآنی اصطلاحات کا مفہوم، ازروئے کتب لغات متعین کرنے میں مبتلائے زحمت رہے ہیں، نہ صرف یہ کہ پانی میں مدھانی چلانے کے مترادف ہے، بلکہ اگر یہ فریب دہی نہیں، تو فریب خوردگی ضرور ہے۔

بہر حال، اقامت صلوٰۃ، ایتاءِ زکوٰۃ اور انفاق، اور جملہ دیگر اصطلاحات میں، جو معانی و مفاہیم، شارع علیہ السلام نے، نظامِ اسلام کے ساتھ وابستہ کرتے ہوئے، ان میں سمو دیئے ہیں، اور معاشیاتِ اسلام کے حوالہ سے، جو لزوم و مضمرات، ان میں ودیعت شدہ ہیں، اُن سے صرفِ نظر کرتے ہوئے، کتب لغات کی بنیاد پر، کھینچ تان کر کے، مارکسزم کی فکری و ذہنی غلامی کے زیر اثر، خود ساختہ معانی داخل کرنا، بدترین تحریف ہے۔ ''مفکر قرآن'' کی عمر بھر کی ''قرآنی خدمات'' کا ماحصل یہ ہے کہ قرآن کریم کی ایک ایک اصطلاح کو لے کر، کہیں اشتراکی نظام کی مذموم محبت میں مبتلا ہو کر، اور کہیں نظامِ سرمایہ داری کی شدید نفرت کا شکار ہو کر، کتب لغات کی آڑ میں، نئے مدالیل و مفاہیم داخل کئے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس حقیقت کی وضاحت کے لئے، ایک دو مثالیں بھی پیش کر دی جائیں۔

تحریف، بربناءِ عشقِ اشتراکیت

جب عجلِ اشتراکیت کی محبت، ''مفکر قرآن'' کے سویدائے قلب میں راسخ ہو گئی، تو قرآنی مفردات اور آیات میں، تحریف کے ذریعے، کس طرح نئے معانی داخل کیے گئے، اس کی متعدد مثالوں سے صرف ایک مثال ملاحظہ فرمائیے۔

سورہ یوسف کے ابتدائی رکوع میں یہ کہا گیا ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَ اِخْوَتِهٖٓ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ۝﴾ (یوسف: ۷)

''پوچھنے والوں کے لیے یوسف علیہ السلام اور اس کے بھائیوں (کی داستان) میں

نشانیاں ہیں۔"

لیکن جب "مفکر قرآن" اشتراکیت کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہوئے، تو مفہوم آیت مندرجہ ذیل الفاظ میں ڈھل گیا

> جو لوگ یہ پوچھتے ہیں کہ کبھی نظامِ ربوبیت قائم ہوا تھا، تو بلاشبہ، اس قصہ میں، جس کے مرکزی کردار یوسف علیہ السلام اور اس کے بھائی ہیں، اُن کے اس سوال کا جواب موجود ہے، ان ہی کے لیے نہیں بلکہ ہر متجسسِ حقیقت اور جویائے صداقت کے لیے، اس قصہ میں بڑی ہی نشانیاں ہیں۔ ❶

حالانکہ اسی آیت کا ترجمہ، جب کہ وہ یا تو لیلائے اشتراکیت کے مجنوں نہیں بنے تھے، یا اشتراکیت کی محبت کو مصلحتاً ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے، کبھی ان الفاظ میں بھی پیش کیا کرتے تھے۔

> جو لوگ، حقیقت حال پوچھنے والے ہیں، (اگر وہ سمجھیں، تو) ان کے لیے، یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کے معاملے میں، (موعظت وعبرت کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں۔ ❷

یہ تو صرف ایک آیت کا اشتراکیت زدہ ترجمہ ہے۔ اب قارئین کرام، سورۃ الیل کا وہ مفہوم بھی ملاحظہ فرمالیں جسے اشتراکیت کے رنگ میں رنگ کر پیش کیا گیا ہے۔

> سورہ والّیل میں اس حقیقت کو کس قدر بلیغ انداز میں پیش کیا گیا ہے، جب فرمایا کہ إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى (۹۲/۴) تمہاری کوششیں مختلف سمتوں میں جاتی ہیں، لیکن اس حقیقت کو یاد رکھو کہ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى جس نے "دینا" سیکھا، اور اس طرح اپنے آپ کو تباہیوں سے محفوظ رکھا۔ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى اور معاشرے میں توازن پیدا کر کے اس حقیقت کو سچ کر دکھایا۔ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى، تو اس کے لیے نشوونما کی راہیں آسان ہوگئیں۔ اس کے برعکس، وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ،

---

❶ طلوع اسلام، فروری ۱۹۶۷ء، ص ۷۷۔

❷ معارف القرآن، ج ۳، ص ۱۱۶۔

جس نے صرف ''لینا'' سیکھا، اور سب کچھ اپنے ذاتی مفاد کے لئے سمیٹ لیا، وَاسْتَغْنٰی اور سمجھ لیا کہ یہی کچھ میری پرورش کے لئے کافی ہے، مجھے اس کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں، نہ معاشرہ کی، نہ دیگر افرادِ انسانیہ کی۔ وَکَذَّبَ بِالْحُسْنٰی، اور اس طرح معاشرے کے توازن کو بگاڑ دیا فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰی، تو اس کے نشوونما کی راہیں مسدود ہوگئیں اور وہ مشکلات میں پھنس گیا۔ لیکن یہ اس کی بھول ہے، اس نے سمجھا ہی نہیں کہ انسانی زندگی کیا ہے، اور اس کی نشوونما کے لئے کیا قانون مقرر ہے۔ اس کے سامنے یہ حقیقت، اس وقت نمایاں ہوگی جب اس کی اس غلط روش کے خلاف معاشرہ میں انقلاب برپا ہو جائے گا، اور اس وقت وہ دیکھے گا کہ اس کا جمع کردہ مال، اس کے کسی کام نہیں آیا: مَا یُغْنِیْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰی۔ اس نے یہ روش اس لیے اختیار کی تھی کہ اس نے سمجھا تھا کہ وہ زندگی کی نشوونما کے لیے خود ہی قاعدے مقرر کر سکتا ہے، لیکن اس نے اس حقیقت کو بھلا دیا کہ انسانی زندگی کی نشوونما کے لیے خود ہی قاعدے مقرر نہیں کیے جا سکتے۔ ان قواعد و قوانین کا سرچشمہ وہی ہے جو زندگی کا سرچشمہ ہے۔ اِنَّ عَلَیْنَا لَلْهُدٰی۔ اس لیے کہ عقلِ انسانی کے پیشِ نظر، فقط فرد متعلقہ کے مفاد (یعنی مفادِ عاجلہ) کی نگہداشت ہوتی ہے، اور قانونِ خداوندی کے سامنے، مفادِ عاجلہ اور مستقبل کے مفاد دونوں ہوتے ہیں۔ وہ انسان کی طبیعی زندگی کی پرورش کو بھی سامنے رکھتا ہے، اور انسانی ذات کی نشوونما کو بھی۔ اس سے اس کی یہ دنیا بھی خوشگوار ہو جاتی ہے، اور اگلی زندگی بھی تابناک: وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰی۔ خدا کا قانون، انسان کو، اندازِ زندگی کی ہلاکت سامانیوں سے متنبہ کرتا ہے جو انسانی زندگیوں کی برومندیوں کو جھلسا دیتی ہے فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰی۔ اس تباہی اور ہلاکت کا شکار وہ لوگ ہوتے ہیں جو انفرادی زندگی کو نصب العین حیات بنا لیتے ہیں (لَا یَصْلٰهَاۤ اِلَّا الْاَشْقَی) یعنی وہ لوگ، جو معاشرہ کے

توازن کو بگاڑ کر، اپنے دعوائے انسانیت کی عملی تکذیب کرتے ہیں، اور اس طرح صحیح راہ حیات سے گریز کی راہیں تلاش کرتے ہیں: اَلَّذِیْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی۔ اس ہلاکت سے وہ لوگ بچ سکتے ہیں جو اپنی زندگی میں قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہیں۔ وَسَیُجَنَّبُهَا الْاَتْقٰی، یعنی وہ لوگ جو ''دینا'' سیکھتے ہیں، اور اس طرح اپنی اور تمام نوع انسانی کی نشو ونما کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَکّٰی (۹۲/۴_۱۸)

ان آیات کبریٰ سے یہ حقیقت، تمہارے سامنے آ گئی ہوگی، سلیم! کہ قرآن کی رو سے انسانی زندگی کی نشو ونما کا راز ''دینے'' میں ہے۔ Einstein کے الفاظ میں:

> انسان کی قدر وقیمت کا معیار یہ ہے کہ وہ کس قدر ''دیتا'' ہے، نہ یہ کہ اس میں لینے کی استعداد کس قدر ہے۔ (Out Of My Later Days) ❶

اشتراکیت کے رنگ میں مصبوغ، سورۃ اللّیل کی اس تفسیر (بلکہ تحریف) میں دو باتیں، خاص طور پر توجہ کے قابل ہیں۔

۱۔۔۔ مَا یُغْنِیْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰی، اور پھر آگے چل کر مذکور نَارًا تَلَظّٰی کا تعلق، عالم آخرت سے ہے جہاں بخل وشحّ سے سمیٹا ہوا مال، اسے تباہی سے نہ بچا سکے گا، لیکن ''مفکر قرآن'' نے اشتراکیت کے عشق میں سرشار ہوکر، اسے اُس موہومہ انقلاب سے تعبیر کر ڈالا ہے، جو مزدوروں اور سرمایہ داروں کی باہمی جنگ کے نتیجہ میں، اسی دنیا میں واقع ہوگا۔ یہ اشتراکیت کا وہ جادو ہے جو اُن کے سر چڑھ کر بول رہا ہے۔

۲۔۔۔ اس اقتباس کے آخری حصہ میں، آئین سٹائن کے بگھارے ہوئے ایک فلسفہ پر ''مفکر قرآن'' نے فوراً ہی دو آیات، تصدق کر ڈالی ہیں، بغیر یہ سوچے سمجھے کہ، آئین سٹائن اور قرآن مجید کے ہاں ''لینا'' اور ''دینا'' کیا مفہوم رکھتا ہے؟ کس سے ''لینا'' اور کس کو ''دینا'' مراد ہے؟ پھر یہ ''لینا'' اور ''دینا'' کس مقصد کے لئے ہے؟ اللہ کی رضاء کے لیے؟ یا کسی

---

❶ سلیم کے نام، ج۱، ص۱۳۳ تا ص۱۳۴۔

اور دنیوی غرض کے لیے؟ بس ''مفکر قرآن'' اس دھن میں یہ ''تفسیر'' فرما رہے ہیں کہ قرآن آئین سٹائن کے معیار پر پورا اتر آئے۔

تحریفِ قرآن بربناءِ بغضِ سرمایہ داری نظام

اب، ایک مثال، اس امر کی بھی ملاحظہ فرمایئے کہ نظامِ سرمایہ داری کی شدید نفرت کا شکار ہونے کے بعد ''مفکر قرآن'' کے ہاتھوں، کس طرح، قرآنی الفاظ کے مدلولات، تغیر کی بھینٹ چڑھتے ہیں۔

قرآن کریم میں ایک لفظ — مُتْرَفِیْنَ — بکثرت استعمال ہوا ہے، جس سے مراد، ''خوشحال، صاحب ثروت اور آسودہ حال لوگ'' ہیں، قطع نظر اس کے کہ اخلاقی طور پر، یہ لوگ قابل تعریف اور نیک ہوں یا قابل مذمت اور بدکردار ہوں۔ خود پرویز صاحب نے اس لفظ کو انہی معانی میں استعمال کیا تھا، اور قرآنی آیات کے تراجم میں، اس لفظ کے یہی معانی بیان کیے تھے۔ لیکن یہ اُس دور کی بات ہے، جب ان کا قلب و دماغ، یا تو عجل اشتراکیت کی محبت کی آماجگاہ نہ بنا تھا، یا پھر وہ اپنی اس حُبّ اشتراکیت کو مکتوم و مخفی رکھنا چاہتے تھے، چنانچہ وہ، مندرجہ ذیل آیت میں واقع لفظ مترفین کا ترجمہ، نہایت صحیح کیا کرتے تھے۔

﴿وَ مَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ﴾ (۳۴/۳۴)

''اور ہم نے جس بستی میں بھی کسی ڈرانے والے (رسول) کو بھیجا، وہاں کے خوش حال لوگوں نے یہی کہا کہ ہم تو ان احکام (کے ماننے) سے انکار کرتے ہیں، جو تمہیں دے کر بھیجے گئے ہیں۔'' ❶

لیکن پرویز صاحب، جب لیلائے اشتراکیت پر فریفتہ ہوئے، تو جس قدر اشتراکیت سے ان کی فریفتگی میں اضافہ ہوتا چلا گیا، اُسی قدر نظام سرمایہ داری سے ان کا بغض و عناد فزوں تر ہوتا چلا گیا۔ پھر جس نسبت سے حبّ اشتراکیت اور بغض سرمایہ داری میں اضافہ ہوا، اُسی

---

❶ معارف القرآن، ج ۱، ص ۱۱۶۔

نسبت سے درجہ بدرجہ قرآنی الفاظ کے مفاہیم میں بھی تغیر واقع ہوا۔ چنانچہ اشتراکیت سے شدید محبت اور نظامِ سرمایہ داری سے شدید نفرت کے باعث، اب مترفین کے معنیٰ ومفہوم میں، ''دوسروں کی کمائی پر خوش حال ہونے اور تن آسان ہونے'' کا رنگ بھی پیدا ہوگیا۔ چنانچہ، اب، ''مترفین کے دوگروہ'' کے زیرعنوان، وہ، اس لفظ کی یوں تشریح کرتے ہیں۔

> قرآن نے ان دونوں کو مترفین کہہ کر پکارا ہے، یعنی وہ لوگ، جو دوسروں کی کمائی پر خوش حالی اور تن آسانی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ❶

پھر ''مفکر قرآن'' کے عشقِ اشتراکیت اور بغض سرمایہ داری میں مزید سختی پیدا ہوئی، تو تیسرے مرحلے میں، اسی لفظ کے مفہوم میں، اضافۂ غلظت وشدت کے باعث، ''مزدور کی محنت اور دولت کے غاصب'' بن جانے کا معنیٰ بھی داخل ہوگیا، جبکہ ''تن آساں'' ہونے کا مفہوم تو دوسری منزل ہی میں، اس لفظ میں سرایت کر چکا تھا۔ چنانچہ اب مترفین کی تعریف یہ قرار پائی۔

> مترفین۔ جو لوگ، خود محنت نہیں کرتے، بلکہ (اپنے سرمایہ کے زور پر) دوسروں کی محنت کی کمائی غصب کر لیتے، اور اس طرح تن آسانی کی زندگی بسر کرتے ہیں، قرآن کریم انہیں مترفین کہہ کر پکارتا ہے۔ ❷

اب اگلی اور آخری منزل میں۔ مترفین، کا معنیٰ ''سرمایہ دار طبقہ'' ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اب ایک آیت کا ترجمہ بایں الفاظ کیا جاتا ہے۔

> اگر آپ کو اب بھی کسی قولِ فیصل کا انتظار ہے تو، اسے بھی سن لیجئے، جہنم کے شعلے بھڑک رہے ہیں، اور اس میں پڑے لوگ چیخ چلا رہے ہیں۔ پوچھنے والا پوچھتا ہے کہ یہ کون لوگ ہیں؟ اور انہوں نے کیا جرم کیا تھا جو اس قدر شدید عذاب میں مبتلا ہیں؟

---

❶ طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۶۲ء، ص ۲۷۔

❷ طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۶۶ء، ص ۲۵۔

﴿إِنَّهُمْ كَانُوا قَبْلَ ذَٰلِكَ مُتْرَفِينَ﴾ (۴۵/۵۶)

"یہ سابقہ سرمایہ داروں کا طبقہ ہے۔"❶

ان مثالوں کو دیکھیے، اور پھر "مفکرِ قرآن" کا یہ دعویٰ بھی ملاحظہ فرمایئے کہ انہوں نے قرآنی الفاظ کا بالکل وہی مفہوم پیش کیا ہے، جو دورِ نزولِ قرآن کے عربوں میں رائج تھا، اور یہ کہ انہوں نے اس امر کی پوری کوشش کی کہ:

> یہ معلوم ہو جائے کہ نزولِ قرآن یا اس کے قریب تر زمانہ میں، ان الفاظ سے بالعموم کیا مفہوم مراد لیا جاتا تھا۔❷

لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ خود پرویز صاحب نے، قرآن کے عربی الفاظ میں عجمی مفاہیم ۔۔۔ اور وہ بھی نزولِ قرآن کے چودہ صدیوں بعد کے مفاہیم ۔۔۔ اس حد تک داخل کیے ہیں کہ مفہومِ آیت مسخ ہو کر رہ گیا ہے، اور یہ دورِ حاضر کی اتنی بڑی عجمی سازش ہے کہ اس کے مقابلہ میں اُن دسائس کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے، جنہیں وہ اسی نام سے پیش کرتے ہوئے، علماءِ سلف و خلف کو نشانہ بناتے رہے ہیں۔

مصنّفین کتبِ لغات

پھر ستم بالائے ستم یہ کہ جن کتبِ لغات کو، "مفکرِ قرآن" نے اپنی "لغات القرآن" کی تصنیف و تالیف میں، بطورِ اساسی کتب کے اپنے سامنے رکھا ہے، انہیں "مستند کتبِ لغات" بھی قرار دیا ہے، اور "عجمی تصورات کے حامل قرآنی الفاظ پر مشتمل کتبِ لغات" بھی کہا ہے۔ اب، ان ہی کتب کے مصنّفین کے متعلق، وہ، یہ بھی فرماتے ہیں

> اس کے ساتھ یہ بھی عجیب ماجرا ہے کہ جن حضرات نے یہ کتابیں مرتب کیں، وہ (باستثناءِ معدودے چند) سب کے سب غیر عرب (یعنی عجمی) تھے۔ یہی کتابیں، عربی زبان کا اوّلین سرمایہ تھیں۔❸

---

❶ طلوعِ اسلام، اکتوبر ۱۹۷۳ء، ص ۶۳۔

❷ طلوعِ اسلام، اگست ۱۹۶۱ء، ص ۶۹۔

❸ لغات القرآن، ج ۱، پیش لفظ، ص ۸۔

اب اس سے بھی بڑھ کر، عجیب تر ماجرا یہ ہے کہ ان کتب کے مصنفین، تو (باستثناءِ معدودے چند) تھے ہی عجمی، لیکن دورِ حاضر میں، مغربی تہذیب کے طلسم میں گرفتار ہو کر، لکھی جانے والی ''لغات القرآن'' کے مصنف بھی عجمی ہیں۔ نام کے اعتبار سے بھی، تخلص کے اعتبار سے بھی، پیدائش کے اعتبار سے بھی، شکل و صورت کے اعتبار سے بھی، ماحول کے اعتبار سے بھی، رہن سہن کے اعتبار سے بھی، اور مغرب کی ذہنی غلامی اور فکری اسیری کے اعتبار سے بھی۔ لیکن خود سراپا عجمی ہو کر، دوسروں پر عجمیت کا الزام عائد کرتے ہوئے، وہ خود اپنی عجمیت کو نظر انداز کر دیا کرتے تھے، تاکہ لوگوں کے ذہنوں میں، یہ تاثر اُبھر آئے کہ جو شخص، دوسروں پر، عجمیت کا عیب لگاتا ہے، وہ خود عجمی کیسے ہو سکتا ہے، لامحالہ اور یقیناً وہ (بٹالہ نامی) کسی خالص عربی قصبے ہی میں پیدا ہوا ہو گا، جو کسی عرب ملک ہی میں واقع ہو گا، اور اس کی مادری زبان بھی عربی ہی ہو گی، اور اُس نے اپنی تمام عمر، یا زندگی کا غالب حصہ، قرآن فہمی کے لئے، لازماً، عرب کے بدوؤں ہی میں گزارا ہو گا، کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ فرمایا کرتے تھے کہ

> قرآن سمجھنا چاہتے ہو، تو صحرا کے بدوؤں میں، کچھ دن گزارو، کیونکہ جس زبان میں قرآن نازل ہوا ہے، وہ زبان، اُن کے ہاں، اپنی اصل شکل میں موجود ہے۔ ①

پھر ''مفکرِ قرآن'' کے سیرت و کردار کا یہ پہلو بھی، اپنے اندر ایک انفرادیت رکھتا ہے کہ جو عیب، خود ان میں پایا جاتا تھا، اُسے 'وہ' دوسروں کی طرف منسوب کر ڈالا کرتے تھے۔ وہ خود عجمی تھے، اور تہذیبِ مغرب کی ذہنی غلامی اور فکری اسیری میں مبتلا ہو کر، انہوں نے قرآنی الفاظ میں، (چودہ صدیوں بعد کے) عجمی تصورات داخل کئے تھے، لیکن ٹھیک اسی بات کا الزام، وہ، دوسروں پر تھوپا کرتے تھے، چنانچہ وہ، اس بات کی وضاحت میں کہ قرآنی مفردات میں عجمی تخیلات، کیونکر در آئے، یہ فرماتے ہیں کہ یہ سب کچھ دورِ ملوکیت میں ہوا۔

> قرآن کے الفاظ تو وہی تھے، جو وقتِ نزولِ قرآن تھے، کیونکہ ان کی حفاظت کا ذمہ، خود خدا نے لیا ہے، لیکن ان کی روح بالکل نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی،

---

① لغات القرآن، ج ۱، پیش لفظ، ص ۱۴۔

> اور جب روح سامنے نہ ہو، تو ان الفاظ کے ساتھ، جو تصورات وابستہ تھے، آہستہ آہستہ ان کا مفہوم بھی بدل گیا، اور ایسے سانچوں میں ڈھل گیا جو مسلمانوں کی تاریخ کے دورِ ملوکیت کی یادگار ہیں۔ ①

اور اب دورِ حاضر میں، ماشاء اللہ، ”ملوکیت“ کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ ”جمہوریت“ کا دور دورہ ہے۔ کارل مارکس کی بدولت، دنیا کو وہ نظام مل چکا ہے، جو ”قرآنی نظام ربوبیت“ کے متماثل ہے، اور جسے چودہ صدیوں میں کوئی مفسر قرآن، کوئی متکلم اسلام، کوئی ماہر حدیث، کوئی عالم تاریخ و سیر، اور کوئی فقیہہ و مجتہد نہ سمجھ سکا۔ اس کا اگر شعور و فہم، کسی نے پایا، تو وہ ایک فرزند یہودیت، کارل مارکس اور اس کا خلیفۂ خاص انجلز تھا، جن سے پرویز صاحب کو علم ہوا کہ قرآن تو آیا ہی اس لیے ہے کہ وہ ”عالمگیر نظام ربوبیت“ قائم کرے۔ چنانچہ ہندوستان نام کے ایک خالص ”عرب“ ملک میں، بمقام بٹالہ، ایک خالص ”عربی مفکر قرآن“ پیدا ہوا، جس کی مادری زبان عربی تھی، اور جس پر نظام ملوکیت کی کوئی پرچھائیں تک نہ پڑی تھی، اور الفاظِ قرآن کی وہ روح، جو دورِ ملوکیت میں، قرآنی مفردات سے منفک ہو چکی تھی، وہ، پرویز صاحب کی مرتب کردہ ”لغات القرآن“ میں لوٹ آئی۔

خلاصۂ بحث

مقدمۂ کتاب کی اس بحث سے، یہ امر، اُبھر اور نکھر کر سامنے آ جاتا ہے کہ ”مفکر قرآن“ کی جملہ ”قرآنی خدمات“ تین سازشوں پر مشتمل ہیں۔

۱: قرآن و سنت پر مبنی اسلام کو ”عجمی سازش“ قرار دینے کی دسیسہ کاری

۲: پریسٹ ہڈ اور تھیا کریسی جیسی اصطلاحات کا لیبل، تراش کر، علماءِ سلف و خلف کو مطعون و بدنام کرنے کی سازش۔

۳: آج کی تہذیبِ غالب کی ذہنی غلامی کے زیر اثر، ایک ”نیا اسلام“ گھڑنے کی سازش۔

پہلی دونوں سازشیں، اس اعتبار سے قطعی جھوٹ، سراپا کذب اور خالص دروغ ہیں کہ

---

① طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۹۴ء، جنوری ۱۹۵۵ء، ص ۹۳۔

ان کا وجود، ماضی یا حال، کسی زمانہ میں بھی کبھی پایا گیا ہو۔ یہ دونوں سازشیں، واقعہ کے لحاظ سے اپنا کوئی وجود نہیں رکھتیں۔ یہ محض ''مفکر قرآن'' کے اپنے وہم و گمان کو عالم واقعہ کے ''حقائق'' بناڈالنے کی بھونڈی اور مذموم کاوش ہے۔ اس سے بہرحال یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ''مفکر قرآن''، اپنی قلمی صلاحیتوں کے بل پر، جس افسانے کو چاہیں، حقیقت اور جس حقیقت کو چاہیں، افسانہ بناڈالتے تھے۔

رہی دوسری سازش، جس کا تعلق، ملّا ازم جیسی اصطلاحات کی آڑ میں، علماء سلف و خلف کو نشانۂ تحقیر و تذلیل بنانے سے ہے؛ تو اس کا وجود بھی، اگرچہ، مسلمانوں کی تاریخ میں ناپید ہے، تاہم، اس کا تصور مذاہب باطلہ میں موجود ہے، وہیں سے اس کا بیج لے کر، ''مفکر قرآن'' نے سرزمینِ اسلام میں بویا ہے۔ اور پھر پریسٹ ہڈ (Priesthood) وغیرہ کے عجمی تصورات کے تحت، علماء کی تذلیل و تضلیل کے لیے استعمال کیا ہے۔ اس سازش کا ایک مقصد، علماء سلف و خلف کو اس قدر نشانۂ ملامت و مذمت بنا کر بدنام کر ڈالنا ہے کہ لوگ، دین سیکھنے کے لیے، ان کی طرف رجوع نہ کر سکیں تا کہ اُن کے خود ساختہ ''اسلام'' کی راہ میں رکاوٹ بنیں بھی، تو ملامت و مذمت اور بدنامی و بے آبروئی کی یلغاری مہم کے سامنے، یہ رکاوٹ غیر مؤثر ہو کر رہ جائے، اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ اپنے یلغاری پراپیگنڈے کے ذریعہ، علماء کرام کے خلاف لگائے گئے جھوٹے الزامات کی آڑ میں، خود ''مفکر قرآن'' کی اپنی حرکاتِ سیئہ مستور و مخفی رہیں۔ کیونکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ چالاک، عیار اور مکار لوگ، بلند نصب العین کا لبادہ اوڑھ کر، دوسروں پر کیچڑ اچھالا کرتے ہیں، تا کہ ان کی اپنی سیاہ عملی چھپی رہے۔ اس نفسیاتی حقیقت کو، خود طلوع اسلام نے بھی ایک مقام پر، بایں الفاظ بیان کیا ہے، اس لیے مَیں، وابستگانِ طلوع اسلام اور دیگر منکرین حدیث کے سامنے اسی اقتباس کا آئینہ پیش کیے دیتا ہوں، تا کہ وہ خود بھی:

> اپنی روش کا نفسیاتی تجزیہ کر کے دیکھیں کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان کا نفس، دوسروں کی تنقیص میں اس لیے مصروف ہے تا کہ اس کی اپنی سہل انگاری ڈھکی رہے، اور

> اُسے چھپانے کے لئے، اُس نے بلند نصب العین کو آڑ بنا رکھا ہو، فریب نفس سے اکثر ایسا ہوا کرتا ہے۔ ❶

علاوہ ازیں، ''مفکر قرآن'' کی طرف سے شدید دریدہ دہنی اور انتہائی تلخ نوائی کے ساتھ، علماء کرام پر جھوٹے اور باطل الزامات کی بوچھاڑ، اس لئے بھی ہے کہ اس سے علماء اور ان کے متبعین کے خلاف، قلوبِ قارئین طلوع اسلام میں، جو نفرت پیدا ہوتی ہے، وہ انہیں متحد رکھنے میں کام آئے، کیونکہ یہ عام مشاہدہ کی بات ہے کہ لوگوں کو اپنے مخالفین کے خلاف، متحد رکھنے کے لئے، ''حبِ علی'' سے کہیں زیادہ مؤثر داعیہ، ''بغضِ معاویہ'' ہی کا داعیہ سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا، اپنے فرقۂ منکرینِ حدیث کے تشخص کو قائم و برقرار رکھنے کے لئے، علماء کے خلاف، نفرت انگیز، زہریلے اور معاندانہ پراپیگنڈے کی یلغار کو پیہم رواں دواں اور جواں رکھنا، ''مفکر قرآن'' کی ایک مجبوری تھی۔ کیونکہ بقول اُن کے:

> فرقہ بندی کی نفسیات یہ ہیں کہ اپنے فرقے کے لوگوں کے دل میں، دوسروں کی طرف سے نفرت پیدا کی جائے۔ جس قدر نفرت شدید ہوگی، اتنا ہی فرقہ زیادہ مضبوط ہوگا۔ ❷

> فرقے ہوں یا پارٹیاں، ان کا جداگانہ تشخص، دوسرے فرقوں یا پارٹیوں کے خلاف جذباتِ نفرت کی بناء پر قائم رہتا ہے۔ ❸

اور طلوع اسلام کی فائل گواہ ہے کہ پاکستان میں، پرویز صاحب نے، اپنی ساری عمر، علماء کے خلاف، اور (بالخصوص) مولانا مودودی رحمہ اللہ کے خلاف، جذباتِ نفرت کو بھڑکانے اور ہوا دینے ہی میں کھپا دی۔

اب جہاں تک تھیا کریسی اور پھر حکومت کے ساتھ اس کے گٹھ جوڑ رکھنے کا تعلق ہے، تو

---

❶ طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۴۰ء، ص ۱۳۔

❷ طلوع اسلام، اپریل ۱۹۷۳ء، ص ۱۱۔

❸ طلوع اسلام، نومبر ۱۹۷۸ء، ص ۳۔

یہ بھی، کم از کم دینِ اسلام کی حد تک قطعی جھوٹ ہے۔ خود پرویز صاحب بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ مذہبی پیشوائیت کا اسلام میں کوئی وجود نہیں ہے۔ اور تاریخ اسلام اور تاریخ مسلمین میں بھی اس کا وجود ناپید ہے، اسی طرح، حکومت کے ساتھ ساز باز رکھنا بھی، کذبِ محض بلکہ الزامِ باطل ہے۔ لیکن اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو حکومت کے ساتھ راہ و رسم رکھنے اور ساز باز رکھنے کی یہ خصوصیت، (علماء کرام کی بجائے) پرویز صاحب ہی میں پائی جاتی ہے۔

اب رہی تیسری سازش، تو وہ قرآن کے جعلی پرمٹ پر، مغرب کی بے حیا اور اخلاق سوز معاشرت سے اجزاء لیتے ہوئے، انہیں اشتراکیت کے معاشی نظام کے ساتھ، نتھی کر کے، ایک ایسے ”جدید اسلام“ کے طور پر درآمد کرنا ہے، جسے قرآن و سنت پر مبنی اسلام کا متبادل قرار دیا جا سکے، کیونکہ مغرب کے یہود و نصاریٰ، اپنے غلام فطرت ”قرآنی دانشوروں“ سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ مسلمانوں میں کسی ایسے ”اسلام“ کو روشناس کروائیں، جو مستشرقین اور عالم مغرب کے لئے قابل قبول ہو، اور دورِ حاضر کے ”علم و بصیرت کی کسوٹی پر پورا اترے“ اور ”عصرِ رواں کے عقل و فکر کے تقاضوں کو پورا کر سکے۔“ چنانچہ ”مفکر قرآن“ نے ”نیا قرآنی اسلام“ تراش کر، کفار مغرب کی نگاہ میں، عزت و احترام کا مقام پیدا کر لیا۔ یہ کارنامہ انجام دیتے ہوئے، ”مفکر قرآن“ کی بالکل وہی پوزیشن رہی ہے، جو عہد نبوی کے اسلامی معاشرے میں، منافقین کی پوزیشن تھی، جو مسلم معاشرے میں رہتے ہوئے، نام تو اسلام کا لیتے تھے، لیکن ان کی دلی ہمدردیاں اور قلبی وابستگیاں، کفار و مشرکین اور یہود و ملحدین کے ساتھ تھیں۔

اس سازش کا دوسرا رخ، قرآن و سنت پر مشتمل اسلام کو ”عجمی سازش“ کا شاخسانہ قرار دینا ہے۔ اس پر بھی تنقیدی تبصرہ کیا گیا ہے، ایک باب، اجمال و اختصار پر مشتمل ہے، اور اسے مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ کی کتاب ”حجیت حدیث“ سے لیا گیا ہے، جب کہ دوسرے باب میں تفصیل و اطناب سے کام لیا گیا ہے، اور یہ، مصنف کتاب کے اپنے قلم کا رہین منت ہے۔

میں اس معاملہ میں تذبذب کا شکار رہا کہ اجمالی تنقید اور تفصیلی تنقید پر مشتمل دو ابواب میں سے کس کو پہلے درج کیا جائے اور کس کو بعد میں۔ لیکن قرآن کریم میں یہ دیکھتے ہوئے کہ سورۃ

البقرہ میں بنی اسرائیل کو تفصیلی خطاب سے قبل، جو تقریباً ایک پارہ پر مشتمل ہے، اجمالی خطاب کیا گیا ہے جو صرف ایک رکوع پر مشتمل ہے۔ میں نے بھی اسی ترتیب کو اپنا لیا۔ اور اجمالی تنقید کے باب کو تفصیلی تنقید کے باب پر مقدم رکھا ہے۔

قرآن وسنت پر مشتمل اسلام کی مخالفت اور پھر اس کے مقابلہ میں، مغربی معاشرت کے اجزاء اور اشتراکیت کے اقتصادی نظام پر مشتمل "جدید اسلام" کی تشکیل "مفکر قرآن" جیسے غلام فطرت "قرآنی دانشور" کا وہ کارنامہ ہے، جس کی وجہ سے عالم اسلام کے علماء، اس پر فتوائے کفر عائد کرتے ہیں، لیکن عالم کفر کے احبار و رہبان، انہیں قابل ستائش سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ایک باب اس حقیقت کی وضاحت کے لئے وقف کیا گیا ہے۔

............(۲)............

ہے یہ گنبد کی صدا، جیسی کہو ویسی سنو

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں، ایک اور چیز کی بھی وضاحت ہو جائے۔ اب تک، میری مندرجہ ذیل کتب، زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر، منظر عام پر آ چکی ہیں۔

۱۔۔۔ "جناب غلام احمد پرویز، اپنے الفاظ کے آئینے میں"...... اس کا پہلا ایڈیشن، چھ ماہ ہی میں ختم ہو گیا تھا۔ پھر دوسرا ایڈیشن، جب شائع ہوا، تو جون ۲۰۰۶ء کے طلوع اسلام میں اٹھائے گئے اعتراضات کا بھرپور جواب بھی شامل اشاعت کیا گیا۔ اب تیسرے ایڈیشن کی آمد آمد ہے۔ کتاب کی اس مقبولیت پر، میں بارگاہِ صمدیت کے عتبۂ عالیہ پر جس قدر بھی سر بسجود رہوں، کم ہے۔

۲۔۔۔ "ولادتِ عیسیٰ علیہ السلام اور منکرین حدیث"۔ تا حال، منکرین حدیث کی طرف سے، نہ کوئی تنقیدی تبصرہ، اس کتاب پر آیا ہے، اور نہ ہی کوئی مفصل کتاب، اس کی تردید میں شائع ہوئی ہے۔ الحمد لله على ذالك

۳۔۔۔ "جناب غلام احمد پرویز کے "نظام ربوبیت" پر ایک نظر......" پرویز صاحب کے اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے، کہ صرف، قرآن مجید ہی کی بنیاد پر، ان کی کتاب "نظام

ربوبیت" کا جائزہ لیا جائے، میں نے اختصار کے ساتھ، اُن کے فکر اور نظریہ کی تردید کی ہے۔ منکرین حدیث، ابھی تک، اس کا بھی کوئی جواب نہیں دے پائے۔ الحمد لله علی ذالك۔

۴۔۔۔ "قرآن اور عورت" اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن، ادارہ معارف اسلامی، منصورہ، لاہور نے ۲۰۰۷ء میں شائع کیا ہے۔ اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش کے نتیجہ میں، عورت کے حوالہ سے جو مسائل پیدا ہوئے ہیں، ان پر حلقہ منکرین حدیث ہی کے خیالات کی تردید میں، یہ کتاب لکھی گئی ہے اور ان تمام مغالطوں کی قلعی کھولی گئی ہے، جو اس موضوع پر منکرین حدیث بالعموم اور عمر احمد عثمانی اور غلام احمد پرویز، بالخصوص دیا کرتے ہیں۔

۵۔۔۔ "عقوباتِ قرآن اور "مفکر قرآن" اگست ۲۰۰۸ء میں، یہ کتاب، زیور طباعت سے مزین ہوکر، مارکیٹ میں آئی ہے۔ قرآنی سزاؤں پر، مغرب کی اندھی تقلید، ذہنی اسیری اور فکری غلامی میں مبتلا ہوکر، جناب پرویز صاحب نے جو مشقِ ستم اور تمرین تحریف کی ہے، اس کا بھرپور جائزہ لیتے ہوئے، میں نے، نہ صرف یہ کہ اُن کی اغلاط کو بے نقاب کیا ہے، بلکہ اصل حقیقت کو بھی اجاگر کیا ہے۔

جن لوگوں نے میری کتب کا مطالعہ کیا ہے، وہ اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ یہ کتب، ٹھوس دلائل، قوی براہین اور مضبوط شواہد پر مشتمل ہیں، اور یہ کہ میں نے منکرین حدیث کے باطل موقف کے خلاف قلمی جنگ، قرآن وسنت کی سرزمین پر نہیں، بلکہ مخالفین ہی کے اصول وضوابط کے میدان میں لڑی ہے، اور اُن پر، خود اُن ہی کی عبارات سے اتمام حجت کیا ہے، جس پر وہ بہت سیخ پا ہوئے ہیں۔ چونکہ میں نے، اپنی کتب میں، منکرین حدیث کے پیشوا کے تضادات وتناقضات کو، دروغ گوئیوں اور کذب بافیوں کو، تہمت طرازیوں اور بہتان تراشیوں کو، بددیانتوں اور خیانت کاریوں کو، فریب کاریوں اور مغالطہ انگیزیوں کو، خود "مفکر قرآن" ہی کے لٹریچر سے واضح کیا ہے، اس لیے ابھی تک خواہش وکوشش کے باوجود، وہ، میری تردید میں، کوئی کتاب تصنیف کرنے کی ہمت نہیں کر پائے۔ ان کتب میں سے، میری

پہلی کتاب کو، ایک معرکتہ الآراء تصنیف قرار دیا گیا ہے۔ اس کی اشاعت پر، منکرین حدیث، جس قدر تلملائے اور سٹپٹائے ہیں، وہ بیان سے باہر ہے۔ ایک صاحب نے ہوش سے عاری ہو کر، محض وقتی جوش اور ہیجان کی کیفیت میں مبتلا ہو کر، طلوع اسلام کے شمارہ جون ۲۰۰۶ء میں، جو تنقیدی تبصرہ لکھا، اس کا بھرپور جواب، جب میری طرف سے شائع ہوا، تو پھر کسی کو بھی، میرے ٹھوس دلائل کی آندھی کے سامنے، اپنا دیا جلانے کی ہمت، اب تک نہیں ہو سکی۔ سنا ہے کہ وابستگانِ طلوع اسلام میں سے ایک جیالا اور متوالا، میرا پورا لٹریچر پڑھنے کے بعد، میری تردید میں لکھنے کے لیے بہت بے تاب ہے، اور اپنی اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لئے، اس بات کا متمنی ہے کہ میرے پی ایچ ڈی کے مقالہ کی فوٹو کاپی، اسے کہیں سے مل جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے، اُس نے میرے ایک دوست، جناب محمد رمضان یوسف سلفی سے جب رابطہ کیا، تو انہوں نے اسے یہ جواب دیا کہ...... ''مقالہ تو ابھی اشاعت کے مراحل سے گزر رہا ہے، لیکن مجھے حیرت، اس بات پر ہے کہ قاسمی صاحب کی جو کتب شائع ہو چکی ہیں، ان کا جواب تو، ابھی تک آپ لکھ نہیں سکے ہیں، لیکن جو چیز ابھی شائع نہیں ہوئی، اس کے پیچھے آپ پڑے ہوئے ہیں۔''

وابستگانِ طلوع اسلام کا ردِ عمل

بہر حال، وابستگان طلوع اسلام میں سے، میری کتب کا مطالعہ کرنے والے، کچھ وہ لوگ ہیں، جو مجلہ طلوع اسلام سے، جناب پرویز صاحب کی زندگی ہی میں متعارف ہو چکے تھے، اور وہ اس کے مستقل قارئین میں سے ہیں۔ ان لوگوں کو خوب معلوم ہے کہ پرویز صاحب، ملت اسلامیہ کے اسلاف و اخلاف پر مشتمل، مفسرین و محدثین، فقہاء و مجتہدین اور اصحابِ سیر و مورخین کے لیے کس قسم کا اندازِ تخاطب اختیار کیا کرتے تھے۔ جملہ علماءِ امت پر، ''ملا ازم''، ''پریسٹ ہڈ'' اور ''مذہبی پیشوائیت'' کے لیبل چسپاں کر کے، انہیں، کس قدر استہزاء و تضحیک کا نشانہ بنایا کرتے تھے۔ تلخ نوائی اور درشت گوئی کے لب و لہجہ میں اُن کی تحقیر و توہین اور تذلیل و تضلیل میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں چھوڑا کرتے تھے۔ زمانہ بھر کی نفرتوں اور برائیوں کو لفظ

ملّا میں سمیٹ کر، جملہ عیوب ونقائص کو، ان کے سر تھوپا کرتے تھے۔

دوسری قسم کے قارئین مجلّہ، وہ لوگ ہیں، جو پرویز صاحب کی وفات کے بعد طلوع اسلام سے واقف ہوئے، اور اس کے مطالعہ کے عادی بنے۔ ان لوگوں کو قطعاً یہ معلوم نہیں کہ ''مفکر قرآن'' صاحب، اپنے مخالفین کے خلاف، کس قسم کی سوقیانہ زبان اور کس قدر گھٹیا پرویزی حیلے استعمال کیا کرتے تھے، اور کس بلا کا درشت، کرخت اور تلخ لب ولہجہ اپنایا کرتے تھے۔ ان ہی میں سے، کچھ لوگوں کو میری زبان کی سختی کا شکوہ پیدا ہوا، ورنہ اول الذکر حلقہ میں سے کسی کو میرے خلاف، یہ شکایت پیدا نہیں ہوئی، اس لیے کہ انہیں خوب معلوم ہے کہ ان کے سرغنہ، پرویز صاحب، علماءِ امت کے خلاف بالعموم اور مولانا مودودی رحمہ اللہ کے خلاف بالخصوص، کس قدر گھٹیا، اوچھی اور بازاری زبان استعمال کیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ طلوع اسلام، جون ۲۰۰۶ء کے شمارہ میں، جو تنقیدی مضمون، میرے خلاف شائع ہوا ہے، اس میں میرے اندازِ نگارش میں، سختیِ زبان کا قطعاً ذکر نہیں کیا گیا، کیونکہ یہ زبان، خود اُن ہی کے پیشوا کی اپنی زبان ہے۔ بہرحال، قارئین کرام کو، علماء کرام کے خلاف، پرویز صاحب کی سوقیانہ زبان کا ہلکا سا اندازہ، میرے اس مقالہ سے ہوسکتا ہے، جو ماہنامہ محدث کے مارچ ۲۰۰۶ء کے شمارہ میں شائع ہوچکا ہے۔ باقی رہے مولانا مودودی رحمہ اللہ، تو وہ خاص طور پر، ''مفکر قرآن'' کے نشانہ پر رہے ہیں، اُن کے خلاف، جو غلیظ اور کرخت زبان، بانی طلوع اسلام اپنایا کرتے تھے، اس کا اندازہ، طلوع اسلام کی فائل میں بکھری ہوئی، اُن گالیوں سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے، جن کا حوالہ، مندرجہ ذیل سطور میں دیا جارہا ہے۔ چونکہ یہ تمام حوالے، طلوع اسلام ہی سے ماخوذ ہیں، اس لیے صرف ماہ وسال اور صفحہ نمبر دینے پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔

نمبر شمار	مغلظاتِ طلوع اسلام	ماہ وسال	صفحہ نمبر
۱	ملّائیت کا سرخیل	فروری ۱۹۵۳ء	۱۵
۲	اسلام اور پاکستان، دونوں کی دشمن جماعت اسلامی کا امیر	اکتوبر ۱۹۵۳ء	۴۵
۳	اسلام اور پاکستان، دونوں کے لئے خطرہ	۱۴ مئی ۱۹۵۵ء	۵

۴	فتنہ انگیزی کا زہر پھیلانے میں منظم طور پر سرگرمِ کار	جنوری ۱۹۶۱ء	۴۴ تا ۴۵
۵	اپنی مفاد پرستی کے لیے اسلام کے مقدس نام کو استعمال کرنے والا	جنوری ۱۹۶۱ء	۴۴ تا ۴۵
۶	یہود کی طرح دین ساز	مئی ۱۹۶۳ء	۱۴۹
۷	پاکستان کا کھلا کھلا باغی	دسمبر ۱۹۶۳ء	۳۴
۸	بیچ بازار کھڑے ہو کر گالیاں دینے والا	جنوری ۱۹۶۴ء	۳۱
۹	سرمایہ دارانہ نظام کا حامی اعظم	اگست ستمبر ۱۹۶۴ء	۱۲۶
۱۰	دوسروں کی آنکھوں میں دُھول جھونکنے والا	دسمبر ۱۹۶۳ء	۴۲
۱۱	ہر آن بدلتے ہوئے اور تضاداتی اسلام کا علمبردار، جس پر اصل اسلام بھی سر پیٹ کر رہ جائے	جنوری ۱۹۶۶ء + جنوری ۱۹۶۸ء	۲۲ ۱۶
۱۲	جھوٹا اور بے اصل (جس سے تعاون کرنا ممکن ہی نہیں۔ اداریہ)	جنوری ۱۹۶۸ء	۲ تا ۸
۱۳	ساری زندگی تضادات سے بھرپور	اگست ۱۹۶۸ء	۴۹
۱۴	جرأت اور دیدہ دلیری سے جھوٹ بولنے والا	فروری ۱۹۶۹ء	۴۰
۱۵	مذہبی آمریت کے مقام پر براجمان	فروری ۱۹۷۰ء	۳۲
۱۶	صحابہ سے بغض رکھنے والا	جون ۱۹۷۰ء	۶۱
۱۷	جسے نہ خوفِ خدا، نہ شرمِ رسول	فروری ۱۹۷۱ء	۷۸
۱۸	ڈھٹائی سے مکیاولی سیاست پر کاربند	ستمبر ۱۹۷۱ء	۶۳
۱۹	پاکستان میں، اسلام کو ذلیل کرنے اور پاکستان کو کمزور کرنے کے لیے آیا	جولائی ۱۹۷۳ء	۲۵
۲۰	مرزائیت کے نقشِ قدم پر چلنے والا، مگر اس سے بھی زیادہ خطرناک	دسمبر ۱۹۷۴ء	۲۳

۲۱	امت محمدیہ سے شدید بغض وعناد رکھنے والا	دسمبر ۱۹۷۴ء	۳۹
۲۲	دین اسلام کو تفریح سمجھنے والا	ستمبر ۱۹۷۶ء	۱۵
۲۳	نفرت کی اشاعت کے مشن کا علمبردار	جنوری ۱۹۷۷ء	۱۴
۲۴	سیرت رسول کو داغ دار کرنے کا سازشی، بلکہ اس سازش کا بانی	مارچ ۱۹۷۷ء	۱۶
۲۵	اسلام کو بدنام کرنے والا	مارچ ۱۹۷۷ء	۱۶
۲۶	قرآن کریم کی ابجد تک سے ناواقف	مارچ ۱۹۷۷ء	۳۱
۲۷	قرآن سے کھلا کھلا بغض رکھنے والا	اپریل ۱۹۷۷ء	۲۷
۲۸	نظریۂ ضرورت کے تحت، فتوائے جوازِ کذب دینے والا	فروری ۱۹۸۳ء	۷
۲۹	نظریۂ ضرورت کے اسلام کا حامل	جولائی ۱۹۸۳ء	۴۸
۳۰	ہوسِ اقتدار میں پاکستان کو جہنم میں دھکیلنے والا	اکتوبر ۱۹۸۵ء	۲۶

یہی دل سوز ہے جو رہ چکا ہے دل نشیں برسوں

لیکن یہ وہی مودودی رحمہ اللہ صاحب ہیں، جن کے متعلق، کبھی جناب پرویز صاحب نے طلوع اسلام میں، یہ بھی لکھا تھا۔

> ترجمان القرآن، ایک ماہانہ مجلّہ ہے، جو چھ سال سے اسلام کی صحیح ترجمانی اور قرآن حکیم کی حکیمانہ دعوت کی نشر و تبلیغ کر رہا ہے۔ جن لوگوں کو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی فکری اور اسلامی صلاحیتوں کا علم ہے، اُن کے لیے بس یہ کہنا ہی کافی ہے کہ آپ ہی ترجمان القرآن کے مدیرِ اعلیٰ ہیں۔ خدا تعالیٰ نے مولانا موصوف کو، اس زمانہ میں اسلام کی خدمت اور ملت کی تجدید کے لیے بہرۂ وافر عطا فرمایا ہے، اور وہ شرحِ صدر، وہ اسلامی بصیرت اور تفقہ فی الدین دیا ہے، جو مغربی الحاد کے دور میں ہر چیز کا صحیح ادراک کر کے، قرآن کریم کی روشنی میں ہر مرض کا تریاق مہیا کرتا ہے۔ ترجمان القرآن کا موضوع قرآن حکیم ہے، ایک

طرف، وہ قرآن حکیم کی روشنی میں تاریک دلوں کو منور کر رہا ہے، اور دوسری طرف فرنگی اور مغربی الحاد کے خلاف مسلسل جہاد کر کے، مغربی فلسفہ کا رعب، دلوں سے نکال رہا ہے

قرآن کریم کو منشاءِ الٰہی کے مطابق، صحیح سمجھنا، صحیح اصولوں پر اس کی نشر و اشاعت کرنا، اسلام کے خلاف باطل سرچشموں کا پتہ لگانا، اور ان کو عقلِ سلیم کی حجت سے بند کرنا، اسلام کے مقابلہ میں بڑی سے بڑی مخالفت سے مرعوب نہ ہونا، ذہنیتوں میں یکسر انقلاب پیدا کر دینا، اور وقت کی مناسبت سے جملہ مشکلات کا حل، قرآنِ کریم سے پیش کرنا، وغیرہ، وہ خصوصیات ہیں جو بحمد اللہ رسالہ ترجمان القرآن کو حاصل ہیں۔ ہندوستان میں آج کل سیاست کے نام پر مسلمانوں میں جو گمراہی پھیلائی جا رہی ہے، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اس سے غافل نہیں ہیں اور کتاب و سنت کی روشنی میں مسلمانوں کی سیاسی راہنمائی بھی فرما رہے ہیں۔ اس رسالہ کا مطالعہ ہر خیال کے مسلمانوں کے لیے ازبس ضروری ہے، خصوصاً ان تعلیم یافتہ اور روشن خیال مسلمانوں کے لیے جو فلسفۂ جدیدہ، سائنس اور مغربی حکماء کی دانش فروشیوں سے مرعوب ہو چکے ہیں، اور جنہوں نے مذہب کو عقل و دانش اور ترقی کے خلاف سمجھ لیا ہے۔ کالج اور یونیورسٹیوں کے طلبہ اور اساتذہ کو اس رسالہ کا مطالعہ سب سے پہلے کرنا چاہیے۔ بلحاظِ نصب العین اور مسلک، ترجمان القرآن اور طلوع اسلام کو ایک ہی اصل کی دو شاخیں سمجھیے۔ ❶

''مفکرِ قرآن'' کا فنِ دشنام طرازی

''مفکرِ قرآن'' نے، اپنی خداداد قلمی صلاحیتوں کے غلط استعمال سے، سب وشتم اور گالی گلوچ کو بھی، ایک ''فن'' بنا ڈالا تھا، جیسا کہ افتخار احمد بلخی فرماتے ہیں:

رہی وہ تیسری خدمت، یعنی ذوقِ دشنام طرازی کی تسکین اور اس کے مقتضیات

---

❶ طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۳۸ء، ص ۷۸۔

سے عہدہ برآ ہونے، اور اخلاقی بضاعت کے افلاس پر، فریب وریا کے پردے ڈالے جانے کی خاطر، جو گالیوں کو باضابطہ ایک ''فن شریف'' بنا کر پیش کیے جانے کی صورت میں، پوری سرگرمی کے ساتھ انجام دی جارہی ہے، وہ، دراصل، اس دورِ ترقی وتجدّد کا ایک مرض ہے، جس کے متواتر وپیہم دورے پڑتے رہتے ہیں، اس مرض کو آپ ''ملّا خولیا'' کے نام سے یاد کرسکتے ہیں۔ اس مرض کی علت، وہ احساس کمتری ہے جو تحت الشعور میں جاگزیں ہے، یا کتاب وسنت میں درک وبصیرت کے فقدان کا ایک ردّعمل ہے جو اس شکل میں ظہور پذیر ہوتا رہتا ہے۔ ①

اور اس ''جہادِ اکبر'' کے لیے، اس ادارے نے جو اسلحہ فراہم کر رکھے ہیں، وہ ذاتی پرخاش، آتشِ حسد، گندگیاں اچھالنے کی فن کاری، تضلیل وتحقیر اور تضحیک و استہزاء، کذب وافتراء، اتہام ودشنام طرازی اور اقتدارِ وقت کو اکسا کر، جبر و تشدد پر آمادہ کرنے کی سعی جیسے ''قرآنی'' حربے ہیں۔ ②

ذوقِ دشنام طرازی کو ایک فن بنا کر، طعن وتشنیع، طنز واستہزاء اور تضحیک کی وہ تیسری خدمت ہے، جو تقسیم کار کے اصول سے اس ادارے (طلوع اسلام) نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے

چنانچہ کتاب کے ساتھ، سنت کو بھی، دینی حیثیت باور کرنے والے دین دار طبقہ اور اسلام اور شعائر اسلام کی توہین وتذلیل کی خاطر، جو ایک اصطلاح ''مُلّا اور مُلّائیت'' کی وضع کی گئی تھی، اس اصطلاح کی آڑ میں، دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے، اس فنِ دشنام طرازی کی بے محابا نمائشیں کی جاتی ہیں۔

یہ تیسری خدمت، اس لیے بھی پوری دلچسپی کے ساتھ، ایک مہم کے انداز سے انجام دی

---

① فتنۂ انکارِ حدیث کا منظر وپس منظر، ج ۳، ص ۲۹۔

② فتنۂ انکارِ حدیث کا منظر وپس منظر، ج ۳، ص ۲۸۔

جارہی ہے کہ اخلاقی بضاعت کے افلاس پر فریب وریا کے پردے ڈالے جائیں اور احساس کمتری کے جو یہ حضرات شکار ہیں، تو اس باب میں تسکین خاطر کے کچھ ساماں فراہم ہوسکیں۔

اس کے علاوہ علم وفن میں، اپنی ناپختہ کاری کی پردہ پوشی بھی، اس تیسری خدمت کے پس پردہ مطلوب ہے۔ ①

اور تو اور، خود مولانا مودودی مرحوم نے ایک دفعہ، ''مفکر قرآن'' کی دریدہ دہنی کے متعلق، یہ فرمایا تھا:

> یہ لوگ، اپنی بحث میں بالعموم بازاری غنڈوں کا سا طرز اختیار کرتے ہیں۔ ان کے مضامین پڑھتے وقت، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی شخص، ایک غلاظت بھری جھاڑو لیے کھڑا ہو، اور زبان کھولنے کے ساتھ ہی، مخاطب کے منہ پر جھاڑو کا ایک ہاتھ رسید کردے۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کے منہ لگنا، کسی شریف آدمی کے بس کی بات نہیں۔ ②

میری مجبوری

الغرض، ''مفکر قرآن'' کے ''غنڈوں کے سے طرزِ تحریر'' سے ناواقف لوگوں کو (خواہ وہ حلقۂ طلوع اسلام میں سے ہوں یا باہر کے افراد ہوں) مَیں، یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میں نے جناب پرویز صاحب کے لیے، کوئی بھی ایسا لفظ استعمال نہیں کیا جو خود انہوں نے، علماء کرام کے خلاف بالعموم اور سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کے خلاف بالخصوص، استعمال نہ کیا ہو۔ ہاں، البتہ میں نے اتنا تصرف ضرور کیا ہے کہ اگر ''مفکر قرآن'' نے کسی عالم دین کو، طنزاً، ''اسلامی گوئبلز'' کہا ہے، تو میں نے ''قرآنی گوئبلز'' لکھ کر، اس طنز کو ''مفکر قرآن'' ہی کی طرف لوٹا دیا ہے تاکہ حق بحق دار رسید۔ میری جرأت آمیز عبارات اور بے باکانہ اقتباسات سے، جن

---

① فتنۂ انکار حدیث کا منظر و پس منظر، ج ۳، ص ۴۴۰۔

② رسائل ومسائل، ج ۲، ص ۵۲۔

قارئین کرام کو میری سختیِ زبان اور تلخیِ بیان کا احساس ہوا ہے، انہیں جان لینا چاہئے کہ یہ دراصل ''مفکرِ قرآن'' ہی کی ''کوثر و تسنیم میں دُھلی ہوئی زبان'' کا بے ساختہ اور فطری ردِ عمل ہے...... ہے یہ گنبد کی صدا، جیسی کہو، ویسی سنو...... میری اگر کسی عبارت سے قارئین کرام کو، کنکر باری کا احساس ہوا ہو، تو یہ فی الواقع، اُس کلوخ اندازی کا بے ساختہ جواب ہے، جو ''مفکرِ قرآن'' کا پاکستان میں، عمر بھر کا شیوہ رہا ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے کنکر باری کا جواب کنکر باری سے دیا ہے، بم باری سے نہیں دیا ہے۔ اور ایسا کرتے ہوئے، میں نے کہیں بھی، دیدہ دانستہ، مندرجہ ذیل قرآنی احکام کی مخالفت نہیں کی۔

﴿فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ﴾ (البقرہ: ١٩٤)

''جو تم پر دست درازی کرے، تم بھی اُسی قدر اُس پر دست درازی کرو، البتہ اللہ سے ڈرتے رہو۔''

﴿جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾ (الشوریٰ: ٤٠)

''برائی کا بدلہ ویسی ہی، اُسی قدر، برائی ہے۔''

﴿وَ اِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ﴾ (النحل: ١٢٦)

''اور اگر تم بدلہ لو، تو بس اُسی قدر لے لو، جس قدر تم پر زیادتی کی گئی ہے۔''

یقیناً قرآن کریم میں یہ بھی مذکور ہے کہ ﴿وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ﴾ (اگر تم صبر کرو، تو یہ اہل صبر کے حق میں بہتر ہے) لیکن یہ بلند پایہ ہدایت، افضل ہونے کے باوجود بھی، بدلہ لینے کے غیر افضل حکم کو منسوخ نہیں کرتی، کیونکہ کبھی بدلہ لینا بھی تقاضاءِ ایمان قرار پاتا ہے۔

﴿وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ○﴾ (الشوریٰ: ٣٩)

''اہل ایمان وہ ہیں، جو، جبکہ ان پر زیادتی کی جائے، تو بدلہ لیتے ہیں۔''

قرآن کریم کی (بدلہ و انتقام اور صبر و عفو سے کام لینے کی) یہ دونوں قسم کی آیات، اختلافِ احوال اور تفاوتِ موقع و محل کی بناء پر دی گئی ہیں، اور خود صحابہ کرام نے بھی، ان

دونوں قسم کی آیات پر عمل کیا ہے۔ اُن حضرات کے فضائل و مناقب بیان کرتے ہوئے، سورۃ الفتح میں، اُن کی اشِدَّاء ہونے کی صفت کو، رُحَمَاء ہونے کی صفت پر مقدم رکھا گیا ہے۔

اب اگر ''مفکر قرآن'' جناب غلام احمد پرویز، اپنی غیر مبہم دروغ گوئیوں، صریح فریب کاریوں، واضح مغالطہ آرائیوں، نمایاں خیانت کاریوں اور مسخ حقائق کی کھلی کھلی کارروائیوں کے باوجود بھی ـــــ بلکہ اس آگے بڑھ کر، عام علماء امت تو رہے ایک طرف، خود ذاتِ رسول کو بھی، ـــــ اپنی بہتان تراشیوں کا نشانہ بنا کر، کفر و نفاق کا ارتکاب کرنے کے باوجود بھی...... نرم و نازک اندازِ بیان ہی کے مستحق ہیں، تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ قرآن کریم میں وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ کا حکم، کیوں اور کن کفار و منافقین کے بارے میں دیا گیا ہے۔

طلوع اسلام کی فائل کا مطالعہ کرتے ہوئے، علماءِ اسلام کے خلاف، غنڈوں کے سے بازاری انداز میں، جب ''مفکر قرآن'' کی مغلظات کو میں دیکھتا ہوں، تو خدا شاہد ہے کہ میرا خون کھول اٹھتا ہے۔ لہٰذا میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ جسے، مَیں نے، اپنے علم و تجربہ کی روشنی میں انتہائی کاذب و دروغ گو، ازحد خائن و فریب کار، اور قطعی مفتری و محرف پایا ہے، اُس کے بارے میں، مَیں، وہ الفاظ استعمال نہ کروں، جو، خود اُس نے جمیع علماءِ سلف و خلف کے لیے بالعموم اور مولانا مودودی کے لیے بالخصوص استعمال کیے ہیں۔ جو لوگ، مجھے، اس دریدہ دہن اور دروغ باف ''مفکر قرآن'' کے لیے، ملاطفت و ملائمت کا رویہ اپنانے کے لیے وعظ فرماتے ہیں، مجھے اُن پر، اس اعتبار سے حیرت ہوتی ہے کہ

مجھی سے سب یہ کہتے ہیں کہ نیچی رکھ نگاہ اپنی   کوئی، اُن سے نہیں کہتا ''نہ نکلو یوں عیاں ہوکر''

بہرحال، ''مفکر قرآن'' کی زبان درازیوں، سبّ و شتم کی فن کاریوں، کذب و زُور کی منہ زوریوں، قطع و برید کی ہنرمندیوں اور خیانت و فریب کی کرشمہ سازیوں کو، بچشمِ خود، دیکھ لینے کے بعد، میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں گدھے کے گلے میں موتیوں کا ہار ڈالتا رہوں۔

ایک زمانہ تھا، جب مجھے، پرویز صاحب کے فکر و نظر سے، اگرچہ اختلاف تھا، لیکن اس کے باوجود، مَیں، اُنہیں، قرآن کریم کا مخلص، نیک نیت اور دیانت دار خادم سمجھتا تھا۔ اُس دور

میں، میرے قلم میں یہ سختی نہیں تھی، اُن کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے، اُن کے موقف کی تردید، مضبوط دلائل اور قوی شواہد سے کیا کرتا تھا۔ لیکن بعد میں جب اس ''مفکر قرآن'' اور ''مفسر کتاب اللہ'' کی کذب بافیاں اور دروغ گوئیاں، فریب کاریاں اور دھوکہ بازیاں، خیانت کاریاں اور مغالطہ انگیزیاں، تضاد بیانیاں اور تناقض کلامیاں مجھ پر عیاں اور بے نقاب ہوئیں، تو ان کے اخلاص اور نیک نیتی کا تاثر یکسر زائل ہو گیا۔ پھر ان اخلاقی رذائل کے علاوہ، جب ان کی دشنام طرازیاں، اُن کی بھرپور درشت بیانیوں کے ساتھ، میرے سامنے آئیں، تو اُن کی شخصیت پوری طرح بے نقاب ہو گئی۔ تب مجبوراً مجھے کانٹے کی تول، وُہی انداز نگارش اپنانا پڑا، جو ''مفکر قرآن'' کا پسندیدہ انداز تھا، حالانکہ میں طبعاً یہ پسند نہیں کرتا کہ علمی مسائل میں تلخ لب ولہجہ سے کام لیا جائے، لیکن جن قارئین نے طلوع اسلام میں شائع شدہ ''مفکر قرآن'' کے اندازِ تحریر کو ملاحظہ فرمایا ہے، وہ اس امر سے اتفاق کریں گے کہ آخر الامر، ایک سنجیدہ مزاج انسان بھی، جواباً اس پر مجبور ہو جاتا ہے کہ جو شخص، جس انداز میں، بات کرنے اور سمجھنے کا عادی ہو، اُس سے اُسی انداز میں بات کی جائے، تاکہ وہ حسب عادت، اُسے آسانی سے سمجھ سکے۔ میری جملہ تصانیف میں، بعض مقامات پر، سخت انداز بیان کی جس کیفیت کو، بعض قارئین کرام نے محسوس فرمایا ہے، وہ اگرچہ، میرے طبعی منشا کے خلاف ہے، لیکن بہرحال، وہ، اسی مجبوری کی آئینہ دار ہے۔

اب آخر میں، مَیں، جملہ قارئین سے بالعموم اور وابستگانِ طلوع اسلام سے بالخصوص، درخواست گزار ہوں کہ جس طرح، خود مَیں نے، پرویز صاحب کی تندوتیز، تلخ و غلیظ، اور کرخت و درشت زبان اور غنڈوں کے سے سوقیانہ طرزِ بیان کے علی الرغم، اُن کے افکار و نظریات کو، قرآن کریم کی کسوٹی پر پرکھ کر، ''دولت پرویز'' سے زرِ کھوٹ کو نمایاں کر دیا ہے، اُسی طرح، وہ بھی میری سختی بیان کے علی الرغم، اُن واقعات وحقائق کو، مرکزِ غور و فکر بنائیں، جو میں نے اپنی کتب میں پیش کئے ہیں، کیونکہ میری سختی بیان، فی الواقع، جناب پرویز صاحب ہی کی تلخ نوائی اور درشت گوئی کا ردّعمل ہے۔

باب اوّل

”عجمی سازش“ کی اجمالی تردید

(یہ پورا باب، شیخ الحدیث، حضرت مولانا محمد اسماعیل مرحوم کی کتاب ”حجیت حدیث“ سے ماخوذ ہے)

انکارِ حدیث کے نظریہ کی عمر، تقریباً ستر سال ہوگی جس کی ابتداء، مولوی عبد اللہ صاحب، مولوی حشمت علی صاحب لاہور، مولوی رمضان صاحب گوجرانوالا، رشید الدولہ صاحب گجرات، اور منکرین حدیث ملتان وڈیرہ غازی خاں وغیرہ نے کی، اور حدیث اور ائمہ حدیث کے اصولوں پر کڑی تنقیدیں کی ہیں، لیکن حدیث میں فارسی سازش کا شبہ، ان حضرات نے کبھی نہیں کیا۔ تاریخ سازی کا یہ انکشاف صرف ادارہ طلوع اسلام اور مولانا جے راج پوری کے حصہ میں آیا ہے۔ ان حضرات کا خیال ہے کہ ائمۂ حدیث میں چونکہ کافی تعداد، اہل فارس کی ہے، فارسی حکومت چونکہ پہلی صدی ہی میں ختم ہو چکی تھی، یزدجرد کی موت کے بعد فارسی، اقتدار ہمیشہ کے لیے دم توڑ گیا، منکرین حدیث کا خیال ہے کہ ائمۂ حدیث نے فارسی حکومت کے بقیۃ السیف کے ساتھ مل کر، اسلام کی تخریب کے لیے سازش کی، اور احادیث کے یہ طویل وعریض دفاتر، رجال کا یہ علمی وتاریخی ذخیرہ، اصولِ حدیث کے عقلی اور لغوی قواعد، یہ سب اس ردّ عمل کا نتیجہ ہیں جو فارسی حکومت کے افراد اور علماء کی سازش کے تحت عربوں سے شکست کھانے کے بعد ظہور پذیر ہوا، اور اسی سے اسلام میں تخریب کی راہ پیدا ہوئی۔ چند سالوں سے اس تہمت کو بے حد ہوا دی جا رہی ہے۔ فتح فارس کی وجہ سے آج کا بے خبر ذہن، اسے قبول بھی کر رہا ہے۔

میں اس پر ذرا تفصیل سے تبصرہ کرنا چاہتا ہوں، میں اس پوری داستان کو محض افسانہ اور افتراء سمجھتا ہوں۔ میری دانست میں یہ محض وہم ہے، اس کے لیے کوئی دلیل نہیں، بلکہ جو حضرات، اس سازش کا پراپیگنڈہ کر رہے ہیں، وہ خود کسی کی سازش کا شکار ہیں۔

سازش کے اسباب

آج کے جمہوری دور میں حکومت، پورے ملک کی ہوتی ہے۔ انتخاب کے مروّجہ طریقوں میں یہ اساسی طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ ارباب حکومت، پورے ملک کی نمائندگی کرتے ہیں۔ چونکہ یہ لوگ، عوام کے سامنے جواب دہ ہیں، اور عوام کے ووٹ نے انہیں اقتدار بخشا ہے، اس لئے یہ عوام کی حکومت ہے۔ ایسی حکومت اگر برباد ہو جائے، تو یہ سمجھنا مشکل ہوتا ہے کہ اقتدار پورے ملک سے نکل کر، اجنبی ہاتھوں میں چلا گیا ہے، اس لئے ان حالات میں سازش کا امکان ہو سکتا ہے۔

آج سے تقریباً ایک صدی پہلے، حکومت نہ انتخابی تھی، نہ جمہوری نمایندگی کی سند، ان کو حاصل تھی۔ نہ وہ حکومتیں عوام کے سامنے جواب دہ ہوتی تھیں، بلکہ اس وقت کی حکومتیں شخصی ہوتی تھیں یا زیادہ سے زیادہ کوئی قوم حاکم ہو جاتی، باقی لوگ محکوم ہوتے تھے۔ اقتدار میں عوام کی جواب دہی قطعاً ملحوظ نہیں رکھی جاتی تھی، نہ ہی حکومت کسی آئین کی پابند ہوتی تھی۔ بادشاہ کی رائے اور بادشاہ کا قلم، پورا آئین ہوتا تھا، یا وہ لوگ، جو بادشاہ کی ہاں میں ہاں ملا کر، حکومت کے منظورِ نظر ہو جائیں۔

ایسی حکومتوں کے ساتھ ہمدردی، ذاتی ضرورتوں کی وجہ سے ہوتی تھی، یا بادشاہ کے ذاتی اخلاق اور کیریکٹر کی وجہ سے۔ اگر کوئی انقلاب آ جاتا، تو انقلاب سے ملک متاثر تو ہوتا تھا، لیکن اس کی وجہ بادشاہ یا اس کے خاندان کے ساتھ ہمدردی نہیں ہوتی تھی، بلکہ یہ تاثر آنے جانے والی حکومتوں کے ذاتی مقاصد کی وجہ سے ہوتا تھا۔

فارس کی حکومت، شخصی حکومت تھی، یزدجرد کی موت پر، اس کا خاتمہ ہو گیا۔ یزدجرد کا خاندان یقیناً اس انقلاب میں پامال ہوا ہو گا لیکن تاریخ، اس وقت کی کسی ایسی سازش کا پتہ نہیں دیتی، جو اس خاندان کے ساتھ ہمدردی کے طور پر کی گئی ہو۔

نوشیرواں کے بعد، ویسے بھی فارس کی حکومت روبہ انحطاط تھی۔ ان کے کردار میں عدل وانصاف کی بجائے، استبداد روز بروز بڑھ رہا تھا۔ عوام کو حکومت کے ساتھ کوئی دلچسپی اور محبت

نہیں تھی، پھر سازش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مذہباً فارسی حکومت آتش پرست تھی۔ اسلام نے توحید کے عقیدہ کی سادگی سے یہودیت اور عیسائیت تک کو متاثر کیا۔ بت پرستی اس کے سامنے نہ ٹھہر سکی۔ آتش پرستی کی وہاں کیا مجال تھی۔ اسلام کی تعلیمات، اس مسئلہ میں نہایت مدلل اور واضح تھیں۔ ان میں کوئی چیز ڈھکی چھپی نہ تھی۔ اسلام کا موقف عقیدۂ توحید کے معاملہ میں کھلی کتاب تھی۔ وہ دوسروں کے شبہات اور اعتراضات، بڑی کشادہ دلی سے سنتا تھا۔ مخالفین کے شبہات کی تردید اور اصلاح میں کوئی کوتاہی نہیں کرتا تھا، نہ ہی اپنے نظریہ کو کسی پر جبراً ٹھونستا تھا۔ پھر اس کے خلاف کیوں سازش کی جائے؟ کون کرے؟ اور کس طرح کرے؟ فارس کی حکومت کا چراغ خلیفۂ ثانی کی حکومت میں گل ہوا، یزدجرد کو، خود اس کی رعایا نے قتل کیا، اور اس کے مقابلہ میں مسلم عساکر کی مدد کی۔ پھر سازش کی ضرورت کیسے ہوئی؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت میں بعض مشتبہ بیانات ملتے ہیں، لیکن قاتل کو جس طرح سزا دی گئی، اس میں کوئی سازش تصور نہیں کی گئی بلکہ ابولؤلؤ کا ذاتی انتقام تصور کیا گیا۔

اگر کسی سازش کا خطرہ ہوتا، تو عجمی حضرات پر، مدینہ منورہ کے دروازے بند کر دیئے جاتے۔ بعض غیر معتدل اشخاص سے خطرہ کے باوجود مدینہ منورہ میں داخلہ پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی۔ شخصی رنجشوں سے بعض وقت قتل تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ یہی چیز، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت میں کارفرما تھی، اور اگر اسے سازش تسلیم بھی کر لیا جائے، تو وہ عام اور قومی نہ تھی، بلکہ ایک فارسی خاندان تک محدود تھی۔

فتح کے بعد

فارس کی فتح کے بعد، ہزاروں فارسی اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے، جزیہ دیتے رہے۔ انہیں کسی نے بھی کچھ نہیں کہا۔ اُن کے معبد (آتش کدے) مدتوں قائم رہے۔ جو لوگ، ان میں سے اسلام کی طرف راغب ہوئے، انہیں اسلام نے پوری ہمدردی کے ساتھ، اپنی آغوشِ تر میں عزت کی جگہ دی۔ اُن کی طرف سے آخر سازش کا کیا سوال؟

جہاں مذہب یوں آزاد ہو، اور سیاست اس طرح بے اثر، ملک کے عوام، مسلمانوں کی فتوحات پر خوشیاں مناتے ہوں، جب وہ جنگی مصالح کی بناء پر، کسی مقام سے پیچھے ہٹنا پسند کریں، تو اس علاقہ میں صفِ ماتم بچھ جائے، وہاں سازش کیسی؟

تعجب ہوتا ہے کہ ادارہ طلوع اسلام اور جناب اسلم جیراجپوری نے سازش کے جراثیم کو کون سی آنکھ سے دیکھ لیا۔

تاریخ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی عدل گستری اور انصاف پسندی کی وجہ سے فارس کے لوگ بالکل مطمئن ہو گئے۔ اس لیے سیاسیات کا میدان چھوڑ کر، فاتحین کی علم دوستی کے اثرات سے فارس کے ذہین لوگ فوراً علم کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس راہ میں، انہوں نے آخرت کی سربلندیوں کے علاوہ، علمی دنیا میں بہت بڑا نام پیدا کیا، اور حکومت کے خلاف سازش کا، ان کی زبان پر کبھی نام تک نہ آیا۔

یہ سازش کا پورا کیس، مولانا جیراجپوری کے کاشانہ اور ادارہ طلوع اسلام کے دفتر میں تیار ہوا۔ واقعات کی روشنی میں اسے ثابت کرنا، مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ البتہ عباسی حکومت میں جب قلمدانِ وزارت برامکہ کے ہاتھ میں چلا گیا تو یونانی علوم کے تراجم سے اسلام کے سادہ عقائد کے خلاف ایک محاذ قائم ہوا، لیکن اس وقت حدیث کے دفاتر منضبط ہو چکے تھے، خلیفہ ہارون جیسا آدمی، حدیث کے متعلق مطمئن تھا۔ رہے یونانی علوم، تو ان کا رد، ائمۂ سنت نے پوری جرأت سے کیا یہاں تک کہ وہ بے اثر ہو گئے اور ائمۂ سنت کے حملوں کی تاب نہ لا سکے۔

سازش کا مضحکہ خیز پہلو

سازش کی یہ عجیب قسم ہے کہ سازشیوں نے فاتحین کا مذہب قبول کیا، اور پھر ان کے علوم کی اس قدر خدمت کی کہ فاتحین، اپنے علوم کی حفاظت سے بے فکر اور کلی طور پر مطمئن ہو گئے۔ پھر فاتحین نے ان میں سے اکثر علوم اور علماء کی سرپرستی کی۔ ابن خلدون فرماتے ہیں:

"ودفعوا ذالك اِلٰی من قام به من العجم والمولدين وما زالوا يرون لهم حق القيام به فانه دينهم وعلومهم ولا يحتقرون

حملتها کل الاحتقار .)) (مقدمہ ابن خلدون ص ۵۸)

’’عرب بادشاہوں نے علوم کو ان لوگوں کے سپرد کر دیا، جو ان کی پوری طرح حفاظت کر سکیں، اور یہ لوگ، سب عجمی اور موالی تھے۔ پھر یہ بادشاہ، ان علماء کے حقوق کا پورا احترام کرتے تھے، اور ان کی خدمت کی قدر کرتے تھے، اور قطعی طور پر ان کو حقیر نہیں سمجھتے تھے، کیونکہ وہ، ان کے علوم اور دین کے محافظ تھے۔‘‘

معلوم ہے کہ اموی خلفاء کے وقت، شاہی درباروں میں عجمیوں کو وہ اقتدار حاصل نہ تھا، جو عباسی درباروں میں برامکہ کو حاصل ہوا، لیکن ان کا دامن، دین کی خدمات سے بالکل خالی تھا۔ قرآن ؑشت اور دینی علوم تو بڑی بات ہے، برامکہ سے تو عربی زبان کی بھی کوئی بڑی خدمت نہ ہو سکی۔

ہارون الرشید نے امام مالک اور ان کے درس کی سرپرستی کرنے کی کوشش کی، لیکن امام نے اسے بے اعتنائی سے مسترد کر دیا۔ روپیہ دینے کی کوشش کی تو پورے استغناء سے واپس فرما دیا۔ سازش کا آخر یہی مقصد ہو سکتا تھا، کہ شاہی دربار تک رسائی ہو۔ مال و دولت اور حکومت میں حصہ ملے۔ اب دربار، خود درِ دولت پر حاضر ہوتا ہے۔ اپنی ساری سربلندیاں چھوڑ کر، پورے انکسار اور انتہائی احترام سے خزانوں کے دروازے کھلتے ہیں۔ تھیلیاں باادب پیش ہوتی ہیں، اور ’’سازشی‘‘ ہیں کہ نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے۔

بادشاہ، عرض کرتے ہیں کہ بغداد، تشریف لے چلیے، آنکھیں فرشِ راہ ہوں گی، ’’فارسی سازش‘‘ کے سرغنہ یا فنِ حدیث کے سالارِ قافلہ فرماتے ہیں۔ والمدینة خیر لهم لو کانوا یعلمون۔ مطلب یہ ہے کہ اس بڑے دربار سے علیحدگی، میرے لیے ناممکن ہے۔

پھر سازشیوں کا یہ پورا گروہ مختلف عجمی ممالک سے ہزاروں میل کا سفر کر کے مدینہ منورہ پہنچ کر، امام کی خدمت میں تحصیل علم کے لیے پیش ہوتا ہے، اور کوئی نہیں سوچتا کہ ان کا شیخ عرب ہے، اور یہ عجمی النسل لوگوں کی پوری سازش کا راز نہ فاش کر دے۔

عرب استاد کے عجمی شاگرد مدتوں استفادہ کرتے ہیں، اور انہیں علوم کا درس دیا جاتا

ہے۔ ساتھی ساتھی پر جرح کرتا ہے، ایک دوسرے کی کمزوریوں کے کھلے بندوں تذکرے ہوتے ہیں۔ عرب محدث، عجمی علماء پر تنقید کرتے ہیں اور عجمی، اہل عرب کے نقائص کی نشان دہی کرتے ہیں، لیکن اس سازش کا سراغ، جس کے اختراع کا سہرا، طلوع اسلام کے دفتر کے سر ہے، نہ کسی عرب کو لگا، نہ کسی عجمی کو۔ نہ استاد نے اسے محسوس کیا۔ نہ شاگرد نے، اور نہ کسی ساتھی نے۔

پھر ستم بالائے ستم اور تعجب بالائے تعجب یہ ہے کہ فارس کی فتح، پہلی صدی کے اوائل میں ہوئی اور سازش کا منصوبہ تیسری صدی میں بنایا گیا۔ تقریباً پورے دوسو سال بے وقوف اہل فارس آرام کی نیند سوتے رہے، یعنی جب شکست کا درد اور کوفت تازہ تھی، اس وقت تو فارسیوں کو کوئی احساس نہ ہوا، لیکن "تین سو سال کے بعد، درد کی بے قراریاں انگڑائیاں لینے لگیں، اور فارسی سازشیوں نے بخاری، مسلم اور کتب صحاح کی صورت اختیار کر لی۔ فیا للعقول وارباربها. ☆

پھر اتنی بڑی سازش، جس نے پوری اسلامی اور تعلیمی دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، اسے کوئی نہ جان سکا۔ دنیا کے مسلم اور غیر مسلم مؤرخوں کی آنکھیں بے کار ہو گئیں، قلم ٹوٹ گئے اور زبانیں گنگ ہو گئیں، ان کی عظیم کتابیں اور ضخیم تصنیفات، اس عظیم الشان سازش کے تذکرہ سے یکسر خالی ہیں۔ یہ راز سب سے پہلے یورپ کے ملحد مکتشفین پر کھلا، اور اس کے بعد دفتر طلوع اسلام کے دریوزہ گروں نے کچھ ہڈیاں مستعار لے لیں۔ فویل لهم مما کتبت ایدیهم وویل لهم مما یکسبون۔

عجمی سازش اور دینی علوم

فن حدیث کے طالب علم جانتے ہیں کہ فن حدیث کو آغاز ہی میں، تین مراحل سے گزرنا پڑا۔ جمع، تدوین اور ترتیب حدیث۔

جمع اور حفظ کا سلسلہ تو آنحضرت ﷺ کی حیاتِ مقدسہ میں، آپ کے سامنے ہی

☆ اس اعتراض کا جو جواب، پرویز صاحب نے دیا ہے، اس کا رد اگلے باب کی تفصیل میں موجود ہے۔

شروع ہوگیا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے علماء حدیث اور اس کی طلب میں سرگرداں ہونے والوں کے حق میں دعائیں فرمائیں۔ رَحِمَ اللّٰہ امرءً ا سَمِعَ کلامی فوعاھا ثمّ ادّاھا کما سمعھا (مشکوٰۃ، کتاب الاعتصام) ۔ "اللہ تعالیٰ، اس شخص پر رحم فرمائے، جس نے میری بات سن کر، اسے یاد رکھا اور پھر جس طرح سنا، اُسی طرح آگے پہنچا دیا۔"

صحابہ رضی اللہ عنہم، باہم حدیث کا مذاکرہ اور دور کرتے تھے، ابوسعید خدری فرماتے ہیں:

"تذاکروا الحدیث فان الحدیث یھیج الحدیث ."

(دارمی، ص ۷۷)

"حدیث کا باہم مذاکرہ کرو، باتوں سے باتیں یاد آجاتی ہیں۔"

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں:

"حدیث کا باہم مذاکرہ کرو تاکہ یہ بھول نہ جائے، یہ قرآن کی طرح مجموعہ نہیں۔ اگر اس کا مذاکرہ نہ کیا گیا، تو یہ بھول جائے گی، اور یہ مذاکرہ، ہر روز ہونا چاہیے۔"

ابن ابی لیلیٰ فرماتے ہیں:

"تذاکروا فان احیاء الحدیث مذاکرتہ ." (دارمی ص ۷۸)

"حدیث کا دور کرو، حدیث کی زندگی دور و مذاکرہ سے ہے۔"

علقمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"تذاکروا الحدیث فان ذکرہ حیاتہ ."

"حدیث کے درس اور ذکر ہی میں اس کی زندگی ہے۔"

صحابہ رضی اللہ عنہم، نماز عشاء کے بعد درس اور مذاکرہ کے لیے بیٹھتے، یہاں تک کہ صبح کی اذان ہوجاتی۔ دارمی اور دوسری کتب حدیث میں اس قسم کے اثرات کثرت سے موجود ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کے پاس، حدیث کے لکھے ہوئے تذکرے اور مجموعے بھی موجود تھے۔ عبداللہ بن عمروؓ، عبداللہ بن عمرؓ اور ابوہریرہؓ کے صحیفوں کا ذکر، کتب حدیث میں اکثر ملتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کی زندگی میں، درس اور مذاکرہ ہوتا۔ صحابہ اپنے اسباق قلمبند

فرماتے تھے۔ ابوقبیل فرماتے ہیں:

> ”سمعت عبد الله ابن عمرو قال بینما نحن حول رسول الله ﷺ فنكتب فسئل رسول الله ﷺ ای المدینتین تفتح اولا قسطنطنیة او رومیة فقال رسول الله ﷺ بل مدینة هرقل .“

(دارمی، ص٦٨)

> ”ہم آنحضرت ﷺ کے حلقۂ درس میں بیٹھ کر لکھ رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ دونوں شہروں میں سے پہلے کون سا شہر فتح ہوگا؟ قسطنطنیہ یا روما؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”ہرقل کا شہر پہلے فتح ہوگا یعنی قسطنطنیہ۔“

اس اثر سے آنحضرت ﷺ کا درس حدیث اور آپ ﷺ کی موجودگی میں، اس کی کتابت کا تذکرہ واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم، اپنے اسباقِ حدیث، یادداشت ور تذکرہ کے طور پر لکھا کرتے تھے۔

جھوٹی حدیث اور وعید

آنحضرت ﷺ کی اس وعید کے بعد، کہ جو آدمی، دانستہ جھوٹی حدیث بیان کرے، س کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔ حدیث کی کتابت کے سوا چارہ ہی نہیں؟ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث، قرآن کی طرح متواتر ہے۔ اس حدیث کی موجودگی میں، کتابت حدیث اور اس کے جواز اور عدم جواز کی بحث، بالکل بے معنٰی ہے۔ اس کا قطعی مفہوم یہ ہے کہ حدیث ایک مستند دستاویز ہے۔ شرعاً وہ حجت ہے۔ اس میں کسی جھوٹ اور آمیزش کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ اس حقیقت کے ہوتے ہوئے ضروری ہے کہ اس ذخیرہ کی حفاظت کے لئے، ہر سامان کیا جائے، حفظ وضبط ہو، یا تحریر اور کتابت، بلکہ دونوں، کیونکہ انفراداً دونوں میں غلطی اور سہو کے امکانات ہیں۔

اور اس کے لئے موزوں تر وقت، آنحضرت ﷺ کی زندگی اور صحابہ کے جم غفیر کی

موجودگی ہے، ورنہ اس سامانِ حفاظت کی ضرورت ہی کیا تھی؟ سابقہ آثار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپنی طبعی رفتار کے ساتھ یہ سلسلہ مختلف علاقوں میں جہاں اہل علم صحابہ موجود تھے۔ پوری پہلی صدی میں جاری رہا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے ضخیم کتابیں بطور تذکرہ جمع فرمائیں جن کی طرف وہ بوقتِ ضرورت مراجعت فرماتے اور احادیث کی تصحیح فرماتے تاکہ آنحضرت ﷺ کی طرف، کوئی غلط چیز منسوب نہ ہو جائے۔ اس کی تفصیل، سنت کے دفاتر میں اپنے اپنے مقام پر موجود ہے۔

دوسری صدی

پہلی صدی کے اواخر (نہیں بلکہ دوسری صدی کے اوائل ..... قاسمی) میں اموی سلطنت کا چراغ گل ہو گیا، اور اموی حکومت کا پھریرا، ہمیشہ کے لئے سرنگوں ہو گیا۔ چند سال، ائمۂ حدیث کی نقل و حرکت پر سیاسی خلفشار کی وجہ سے پابندی رہی، اور علم کے یہ خزانے اپنے اپنے علاقوں تک محدود رہے، کوفہ، بصرہ، بغداد، خراسان، مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، نجد، یمن اور مصر وغیرہ مختلف علاقوں کے علماء، اپنے اپنے علاقوں میں درس حدیث دیتے رہے۔ ان علاقوں میں جو جو صحابہ اقامت پذیر تھے، ان کے علوم اور دروس کی اشاعت، اس علاقہ میں ہوتی رہی اور حفظ و کتابت حدیث کا سلسلہ، ان علاقوں میں اپنی بساط کے مطابق بدستور جاری رہا۔ اموی، ہاشمی اور عباسی قسمت آزما پوری قوت سے نبرد آزما تھے اور اکھاڑ پچھاڑ کی تند و تیز ہوائیں، پورے زور سے چل رہی تھیں، اور یہ ''سازشی'' پورے سکون سے، اپنے مدارس میں حدیث کے حفظ و جمع میں مشغول تھے۔ اگر کسی سر پھرے بادشاہ کو کسی عالم پر بدگمانی ہوئی تو اُسے اس نے جیل میں ڈال دیا۔ جب ظلم نے اپنا نصاب پورا کرلیا، قید کی مدت ختم ہوگئی، تو جیل سے نکل کر اپنے مدرسہ میں آ گئے، اور علم دین کی خدمت میں مشغول ہو گئے۔ کوئی عملی قدم، ان متحارب فریقوں کے موافق یا مخالف نہیں اٹھایا گیا۔ بدگمانیاں محض اظہارِ خیال یا رجحان طبع کی وجہ سے ہوئیں، حالانکہ سازشیں، ایسے ہی وقت کی منتظر ہوتی ہیں۔ دشمن پر حملہ کرنے کا بہترین وقت وہی ہوتا ہے جب دشمن، دوسری طرف مشغول ہو، حضرت ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے متعلق

سیاسی دلچسپی کے بعض واقعات تاریخ کی زبان پر آتے ہیں، لیکن ان میں فارس کا یہ عظیم الشان ''سازشی''، ہاشمی اور عربی حکومت کا حامی تھا۔ آپ اس دور کی تاریخ پڑھ جائیے۔ آپ کو اہل علم پر حکومت کی چیرہ دستیوں کے واقعات تو خال خال ملیں گے، لیکن یہ کہ ان علماء نے حکومت کے خلاف کوئی محاذ قائم کیا ہو، اس سے تاریخ ساکت ہے۔ سازش کی پوری مسل، طلوع اسلام کے دفتر اور علامہ جیراجپوری کے دولت کدہ میں بنی، اور وہیں دھری کی دھری رہ گئی، اور شاید اس ساری تہمت تراشی کا پورا بوجھ، یہی حضرات، اپنے کندھوں پر اٹھا کر، خدا کے سامنے حاضر ہوں گے، وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ۔ (الشعراء: ۲۲۷)

دورِ تدوین

تیسری صدی میں جب عباسی حکومت کے قدم جم گئے، امویوں کے ساتھ ہاشمی بھی خلافت کی بساط سے غائب ہوگئے۔ چند روزہ خلفشار کے بعد، جب ملک میں امن و امان قائم ہوا تو ائمۂ حدیث پا برکاب ہوگئے۔ انہوں نے زمین کی طنابیں کھینچ لیں۔ علم میں وطنی اور علاقائی تقسیم کو عملاً ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ سفر کے موجود اور ممکن وسائل کے ساتھ، خراسان سے اقصائے مغرب تک، ان علم کے بادشاہوں نے پُرسکون حملے شروع کردیئے، اور علم کی منصفانہ تقسیم کے لیے میدان ہموار ہوگئے۔ محدثین کی علمی سخاوت نے مشرق و مغرب کے قلابے ملا دیئے۔

اُس وقت جمع و حفظ کا کام ختم ہو چکا تھا اور غیر مرتب تذکرے اہل علم کے مکاتب میں موجود تھے۔ طلبہ مسودات اور مبیضات کی تصحیح اور اصلاح کے بعد ان کی تدوین کی طرف متوجہ ہوئے۔ بعض کتابیں دوسری صدی میں بھی مدوّن ہوئیں، لیکن مہم کے طور پر تدوین کا کام تیسری صدی میں شروع ہوا، ائمۂ حدیث نے فن کی تدوین مختلف طریقوں سے فرمائی۔ بعض نے مرفوع احادیث اور آثارِ صحابہ دونوں کو جمع کیا بعض سے صرف مرفوع احادیث کی تدوین ہوئی۔ بعض نے مرفوع احادیث کے ساتھ فقہاء کے مذاہب کا ذکر فرمایا، کسی نے اسانید اور رجال کا مفصل ذکر کیا۔ کسی نے یہ تذکرے بقدرِ ضرورت بیان فرمائے، تفصیل کی

ضرورت نہیں سمجھی۔ بعض نے ہر صحابی رضی اللہ عنہ کی سند کو یکجا جمع کیا۔ ہر ایک کی مسانید کو قرینے سے یکجا کر دیا۔ بعض نے معجم کی صورت میں یہ ذخیرہ جمع کیا۔ کسی نے متن حدیث کا پہلا حرف بطور عنوان ذکر کیا۔ کسی نے رواۃ کے نام سے معجم مرتب فرمائی۔ کسی نے حدیث کے تمام ابواب اور مسائل کا ذکر کیا جس میں سیرت، آداب، مغازی، اشراط ساعت وغیرہ سب آ گئے، جیسے بخاری اور ترمذی وغیرہ۔ اور بعض نے صرف سنن پر کفایت کی۔ اس میں عبادات و معاملات وغیرہ کی تفصیل آ گئی، کسی نے صرف صحیح احادیث جمع کیں۔ بعض نے صحیح و ضعیف کا ملا جلا ذخیرہ پیش فرمایا۔ بعض حضرات نے استدراک فرمایا۔ بعض نے صرف ایک ہی مسلک کے ادلہّ جمع کر دیئے، غرض، اس فن میں انتہائی خوش نما تنوع کے بکھرے ہوئے پھول جمع ہو گئے۔

ائمۂ حدیث میں سے اکثر فقیہہ تھے۔ مسائل کے استنباط پر انہیں پوری قدرت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں اجتہاد کی تمام شرائط جمع فرما دی تھیں۔ انہوں نے بہترین تبویب کے ساتھ، اپنی تصانیف کو علم کی منڈی میں لا کر رکھ دیا۔

دورِ ترتیب

اس تدوین کے ساتھ، ترتیب کا مرحلہ بھی لازمی تھا۔ وہ آج تک علماء کی طبع آزمائی کے لئے ایک بہترین میدان ہے۔ اخلاق، اصول، مغازی، معاشیات، طب، ادعیہ، اربعینیات، خمسیدیات، اجزاء وغیرہ کی صورت میں مجموعے مرتب ہوتے رہے۔ پھر شروح، حل لغات قواعد، تسوید رجال، تمیز بین المختلطات، سند اجازت وجادہ، غرض مختلف انداز سے امت نے اس فن کی خدمت کی۔ اس کے علوم کو مرتب فرمایا، اور اسے پوری زندگی کا وظیفہ قرار دیا۔ یہ عجیب سازش تھی جو مقصد زندگی قرار پا گئی۔ راتوں کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ دنیا کے مشاغل سب طاقِ نسیاں کی زینت ہو گئے۔ نہ اچھے کھانے کی خواہش، نہ بہتر مکان کی تلاش، نہ بادشاہوں کے درباروں سے واسطہ۔

عرصہ ہوا، امرتسر کے رسالہ بیان القرآن میں ان بے چاروں پر یہ بھی الزام لگایا

گیا کہ محدثین نے درباروں کا مقاطعہ کر کے ملک کی خدمت کے بہترین مواقع ضائع کر دیئے۔

دراصل عیب چینی اور الزام تراشی سب سے سہل مشغلہ ہے خصوصاً اُن لوگوں کے خلاف، جو صدیوں سے اللہ کو پیارے ہو چکے ہوں، اور پھر اعتراض بھی وہ لوگ کریں، جن کی اپنی زندگیاں خداشناسی، خداترسی سے تقریباً ناآشنا ہیں۔ اعمالِ صالحہ، اتباعِ سنت، اور ورع وتقویٰ سے یکسر خالی۔ یہاں کی سب سے بڑی دینی خدمت اور منتہائے علم، کتابوں کی فروخت، اور جھوٹ سچ کہہ کر، اداروں کو چلانا اور حضراتِ امراء کو خوش کرنے کے سوا، کچھ نہیں۔ ائمۂ حدیث زندہ ہوتے، تو ان معترضین کو عمر خیام کی زبان سے عرض کرتے:

صاحب فتویٰ زتو پرکار تریم! بایں ہستی از تو ہشیار تریم
تو خونِ کساں بخوری، خون رزاں انصاف بدہ کدام خونخوار تریم

ائمۂ حدیث معصوم نہیں، جمع وتدوین وترتیب میں غلطی ہوسکتی ہے۔ وہ خود آپس میں تنقید واستدراک فرماتے ہوئے بڑے سے بڑے آدمی کی لغزش کو معاف نہیں فرماتے، لیکن کسی سازش اور دیانت فروشی کا ادنیٰ احتمال بھی اس بارگاہ میں ممکن نہیں۔ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَ مَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا. (الاحزاب:۳۳_۲۲)

مشق بعد از جنگ

یہ سازش کی تہمت کا حربہ، بڑی دیر کے بعد، منکرین حدیث کے ذہن میں آیا، یہ مشق بعد از جنگ ہے۔ اس کا استعمال اپنے ہی قرابت داروں پر ہونا چاہیے، جمع وتدوین کا سلسلہ، تقریباً تیسری صدی کے آخر تک ختم ہوگیا۔ اب پورے ہزار سال بعد، ان کے ہوش وحواس نے انگڑائی لی کہ محدثین تو سازش کر گئے، اور فنِ حدیث سازشیوں کی نذر ہوگیا۔ اب سوچیے کہ اتنی دیر کے بعد، ایسے فوجداری مقدمات کی تفتیش ممکن ہے؟ یا کوئی دانشمند اس موضوع پر

سوچنے کی بھی کوشش کرسکتا ہے؟ اور پھر یہ تفتیش کسی نتیجہ پر بھی پہنچ سکتی ہے؟ مثلاً قرآن عزیز نے آج سے کئی ہزار سال پیشتر کا ایک کیس ذکر فرمایا ہے۔ ملکۂ مصر نے محبت کی سرشاریوں میں اپنے غلام کو بلا کر، محل کے تمام دروازے بند کر دیئے، اور غلام سے کھلے طور پر کہا کہ جنسی محبت کی آخری حدوں تک کامیاب رسائی کے لیے میرا دل بے قرار ہے، اور اس سے انکار اور گریز کے متعلق کوئی عذر نہیں سنا جاسکتا۔ پاکباز غلام نے ملکہ کا ہاتھ جھٹک دیا، اور بڑی جرأت سے کہا کہ دروازوں کی بندش کا کوئی سوال نہیں۔ میرے رب کی دور بین نگاہ، اس محل کے گوشہ گوشہ پر محیط اور ذرے ذرے میں ساری ہے۔ اس کے ساتھ ہی، اپنے آقا کی ناشکری یا نمک حرامی میرے لیے کیسے ممکن ہے؟ غلام دروازے کی طرف بھاگ نکلا، ملکہ اس کے تعاقب میں دوڑی۔ اس دوڑ میں غلام کی قمیص پچھلی طرف سے پھٹ گئی۔ جب مکان کے صحن میں پہنچے، تو ملکہ کے خاوند اور غلام کے آقا وہاں بذات خود موجود تھے۔ ملکہ نے غلام پر الزام لگایا کہ چھیڑ کی ابتداء غلام نے کی ہے، اسے جیل کی ہوا چکھانا چاہیے۔ عزیز مصر، حقیقتِ حال، دریافت ہی کر رہے تھے کہ فیصلہ کی ایک صورت سامنے آ گئی۔ حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ مسئلہ چنداں مشکل نہیں۔ اگر ابتداءِ شرارت، غلام کی ہے تو اس کا رخ ملکہ کی طرف ہونا ضروری ہے۔ غلام کے کپڑے اگر سامنے کی طرف سے پھٹے ہیں تو ملکہ کی بات درست ہے، سزا غلام کو ملنی چاہیے۔ اگر غلام کے کپڑے پشت کی طرف سے پھٹے ہیں، تو معاملہ ظاہر ہے کہ بھاگتے ہوئے غلام کا تعاقب ملکہ نے کیا ہے، اس لیے غلام سچا ہے، ملکہ کی اس غلط جرأت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے، غلام میں کوئی غلطی نہیں۔

جب معاملہ کی تحقیق کی گئی تو غلام سچا نکلا، کیونکہ غلام کی قمیص، پُشت کی طرف سے پھٹی ہوئی تھی۔ یہ جھگڑا، آج سے کئی سو سال قبل پیدا ہوا، اور اس وقت کی سوسائٹی کے عدالتی معیار کے مطابق معاملہ طے ہو گیا اور حضرت یوسف علیہ السلام باعزت بری ہو گئے۔

اب آج کا عدالتی نظام، آج کے عیارانہ اذہان اور فنِ وکالت کی موشگافیوں کی مدد سے سوچتا ہے، تو وہ یہ کہنے کی جرأت کرتا ہے کہ ملکہ کو خواہ مخواہ بدنام کیا گیا۔ عورت ذات اور پھر

ملکہ، اور آج سے کئی سو سال پہلے کا ذہن کیسے عقل باور کر سکتی ہے کہ ملکہ اپنے ادنیٰ غلام کے گریبان میں ہاتھ ڈالے، اور اس کے پیچھے بھاگنا شروع کر دے۔ عقل اسے قبول نہیں کر سکتی۔ غلام ہزار خوبصورت سہی، کیا ملکہ اپنے مقام کو نہیں سمجھتی تھی، وہ اس کے پیچھے پیچھے بھاگ کھڑی ہوئی، یہ پوری داستان، اصول درایت کے خلاف ہے۔ بے شک قرآن نے اس روایت کی تصدیق فرما دی ہے، لیکن درایت کو کیسے نظر انداز کیا جائے؟

ممکن ہے غلام کی قمیص، اس حادثے سے پہلے ہی اتفاقاً پھٹ گئی ہو۔ بچوں کی بھاگ دوڑ میں غلام کا کُرتا پہلے ہی کہیں شگاف آلود ہو چکا ہو، شاہد کی ہمدردیاں غلام کے ساتھ ہوں یا اتفاقاً معاملہ ہی اس نہج پر آ گیا ہو۔ اس وقت عدالت نے چونکہ اس احتمال اور امکان پر غور نہیں کیا۔ اس لیے یوسف کی برأت مشکوک اور امرءۃ العزیز کا جرم، یا مصر کی عدالت کا فیصلہ نظر ثانی کے لیے پھر قانونی عدالت میں آنا چاہیے۔ اس کے علاوہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک طاقتور نوجوان پوری قوت سے بھاگ رہا ہو، تو ایک عورت اس تیزی سے دوڑے کہ نوجوان کا دامن چاک کر دے، ممکن نہیں ہے کہ عورت، اس تیزی سے دوڑ سکے۔ عورت کے بدن کی ساخت اور جسم کے مختلف اجزاء کی ہیئتِ کذائی کا تقاضا ہے کہ وہ جواں مرد کو نہ پکڑ سکتی ہے، نہ اس کے پیچھے اس طرح دوڑ سکتی ہے۔ مصر کی عدالت کا فیصلہ محض جذباتی ہے، اس کی اپیل ہونی چاہیے۔ ممکن ہے ملکہ کا الزام، غلام پر درست ہو، اور درایت کی رو سے ملکہ مصر بری نکلے۔

اس قسم کی اور بھی کئی تنقیحات، امکان اور احتمال کی مشین کے ذریعے سے فن کار اور ماہر وکیل پیدا کر سکتے ہیں، اور درایت کے عاشق، درایت کی ریتی سے واقعات کا برادہ کر کے دے سکتے ہیں۔

اس ساری وکالت پروری کا جواب ایک سادہ دل اور دیانت دار انسان تو یہی دے گا کہ جس ماحول میں جرم ہوا، اس ماحول کی عدالت نے مناسب تحقیق کے بعد جو فیصلہ کیا، وہی درست ہے۔

میں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے شاہد کی از روئے حدیث، پوزیشن کو عمداً نظر انداز کیا

ہے۔ اس لیے کہ ہمارے فریق مخالف اسے مانتے ہی نہیں، اور یہاں تو وہ بظاہر قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن نے تو شاہد اُسی کو کہا ہے جس میں شہادت کی فقہی شروط پائی جائیں اور ان حضرات کی بارگاہ میں معجزہ اور کرامت کو کوئی اہمیت حاصل نہیں۔

قرآن عزیز میں اور بھی ایسے واقعات ہیں جن پر بحث کی گنجائش ہے، اور آج کا قانونی مزاج اس پر مطمئن نہیں ہوسکتا۔ اس دور کے قانون پیشہ اور جج یقیناً محسوس کریں گے کہ ان پر مرافعہ اور نظر ثانی کی کافی گنجائش ہے۔ امکان اور درایت کے ہتھیاروں سے قرآن پر بھی حملہ کیا جاسکتا ہے جو اہل قرآن کا اصل مقصد ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس بھیڑوں کا کیس پیش ہوا، تو حضرت نے ڈگری ایک بھیڑ والے کے حق میں دے دی، اور نوے بھیڑوں والے کے خلاف فیصلہ صادر فرما دیا، اور مدعیٰ علیہ کا بیان تک نہیں سنا۔ استغاثہ کی کہانی سن کر مستغیث کو ڈگری دے دی۔ ممکن ہے ایک بکری کا مالک ایک (بکری) کی صحیح نگہداشت ہی نہ کرسکتا ہو۔ مدعیٰ علیہ کا خیال ہوگا کہ وہ ریوڑ میں آکر زیادہ اور بہتر طور پر پرورش پاسکے گی۔ حضرت داؤد علیہ السلام کا اس کے خلاف بغاوت اور ظلم کا فیصلہ، آج کے عدالتی ماحول میں یقیناً مرافعہ کا مستحق ہے، اور درایۃً محلِ نظر۔

سورہ نون میں باغ والوں کا قصہ مذکور ہے جو بے چارے سوالیوں کی بھیڑ، اور اپنے باغ کی حفاظت اور فائدہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا شکار ہوئے، حالانکہ ان کا کوئی جرم نہیں۔ باغ ان کو باپ کی وراثت میں ملا۔ مسکین کو دینا، نہ دینا شرعاً مالک کی مرضی ہے۔ پھر اس میں مستحق اور غیر مستحق کی بحث بھی آجاتی ہے، لیکن ناراضگی میں ان بے چاروں کا باغ برباد کردیا گیا، اور وارننگ تک نہیں دی گئی۔ بیشک یہ فیصلہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، لیکن جب عقل و شعور کی فوجیں، انسانی حقوق اور عدل و انصاف کی حمایت کے لیے میدان میں آجائیں، تو وہاں حقائق کو کھل کر سامنے آنا چاہیے۔ اللہ اور رسول کے نام سے ایسے مواقع پر اپیل نہیں کی جاسکتی۔ عقل و شعور کے مفتی کو بہرحال اپنا فتویٰ صادر کرنے کا حق ہے۔ اس کا اثر خدا پر پڑے یا اس کے رسول پر۔ آخر انسانی حقوق اور عدل و انصاف کے تقاضے بھی تو انہیں

کے بنائے ہوئے اور بتائے ہوئے ہیں۔ پھر وہ کیوں اس کی پابندی نہ کریں، اور عقل و درایت کی تنقید سے وہ کیوں بچیں۔ اصول سب کے لئے اصول ہے۔

عقل اور احتمالات کے گھوڑے اگر اسی طرح سرپٹ دوڑانا شروع کر دیں جس طرح سنت اور حدیث کے خلاف ان کی لگامیں ڈھیلی کر دی گئی ہیں، تو ان کی یورش سے نہ خدا بچے گا نہ رسول۔ نہ کوئی حقیقت محفوظ رہے گی نہ کوئی اصول۔

خود بے چارے ابلیس کا کیس، اسی نوعیت کا تھا۔ معمولی سی عقل و درایت کی گرفت سے ہمیشہ کے لئے مطرود اور جلاوطن کر دیا گیا ہے۔ اپیل کے لئے بھی، اسے کوئی موقع نہیں دیا گیا۔

سازش کہاں کہاں؟

اب سازش کے ان مریضوں سے گذارش ہے کہ آپ کا کیس خراب ہو چکا۔ آپ کو آج سے چند صدیاں پہلے پیدا ہونا چاہئے تھا۔ پھر ضروری تھا کہ کسی پولیس کے ہمرنگ محکمہ میں ملازمت کرتے، اور ایسے انداز کے آفیسر آپ کو مل جاتے، تو ممکن تھا کہ آپ کا کیس کمزور بھی ہوتا تو فیصلہ آپ کے حق میں ہو جاتا۔ یورپین مکتشفین کی شہادتیں، آپ کے حق میں ہوتیں۔ لیکن آپ کو سازش کی کہانی اُس وقت سوجھی، جب اس کا وقت گزر چکا۔ فن کی تکمیل اور ملزموں کی موت پر صدیاں گزر چکیں۔ آپ نے تیرہ صدیوں کے بعد صرف حدیث کے متعلق سازش کا احساس کیا، مگر سازش ساری علمی دنیا میں اپنا جال بچھا چکی ہے۔ قرآن مجید کا تواتر لفظی، جس پر آپ حضرات اترا رہے ہیں، وہ بھی عجمی اثرات سے محفوظ نہیں۔

آپ جانتے ہیں کہ قرآن کے معنٰی و مفہوم تو متواتر نہیں، صرف الفاظ متواتر ہیں۔ اختلافِ قراءت کے باوجود قرآن متواتر ہے، اور یہ قراءت اور فنِ تجوید، ہم تک قراء سبعہ کی معرفت پہنچا، اور ان کی اکثریت عجمی ہے۔ دیکھا آپ نے کہ جس تواتر پر آپ کو ناز ہے، اس کی کلید عجمیوں کے ہاتھ میں ہے۔

قراءِ سبعہ

(۱) عبداللہ بن کثیر مکی ۱۲۰ھ

(۲) نافع بن عبد الرحمٰن مدنی ۱۶۹ھ
(۳) عبد اللہ بن یزید بن تمیم بن عامر ۱۱۸ھ
(۴) ابو عمر بن علاء المقری البصری ۱۵۴ھ
(۵) عاصم بن ابی النجود الکوفی ۱۳۷ھ
(۶) حمزہ بن حبیب بن عمارہ ۱۵۸ھ
(۷) ابوالحسن علی بن الکسائی ۱۲۹ھ

ان سات حضرات میں سے صرف دو عرب ہیں۔ ابن عامر اور ابو عمرو۔

لیس فی هٰؤُلَآءِ السبعة من العرب الا ابن عامر وابو عمرو .

(الجواهر المضيّة۔ج۲، ص٤٢٣)

عربی زبان کی امامت بھی عجمیوں کے سپرد ہوگئی۔ ابن خلدون فرماتے ہیں۔

فكان صاحب صناعة النحو سيبويه والفارسي بعده والزجاج من بعدهما كلهم عجم في انسابهم . (مقدمه ص ۵۰۰)

”سیبویہ اور ابو علی فارسی اور ان دونوں کے بعد زجاج یہ سب نسباً عجمی تھے۔“

اور سنیے:

وكان علماء الاصول الفقه كلهم عجمًا . (مقدمه ابن خلدون ص ۵۰۰)

”علماء اصولِ فقہ سب عجمی تھے۔“

اور سنیے:

وكذا حملة علم الكلام وكذا اكثر المفسرين ولم يقم بحفظ العلم وتدوينه الا الا عاجم . (حواله مذكور)

”متکلمین اور مفسرین کرام کی اکثریت بھی عجمی ہے۔“

غرض، دینی علوم کی حفاظت کی ذمہ داری، تمام تر عجمی علماء پر آ گئی، اور آپ خرگوش کی نیند سوتے رہے۔

دیکھئے! آپ صرف حدیث میں عجمی سازش سمجھ رہے تھے۔ آپ کی پوری علمی جائداد پر عجمی قبضہ ہے۔ افسوس ہے آپ کو اس سازش کا اس وقت علم ہوا جب آپ پورے طور پر لٹ چکے تھے، اور عجمیوں نے سارے علوم کے دروبست پر قبضہ کرلیا، لیکن آپ کو یورپ کے مکتشفین نے صرف حدیث کے متعلق بتایا۔ آپ نے اپنی لاعلمی کی وجہ سے اسے بہت بڑا اکتشاف سمجھا، حالانکہ یہ صرف لاعلمی کی ستم ظریفیاں ہیں اور بس۔

علم اور جہالت میں فرق

ابن خلدون، یورپ کے مؤرخین میں مسلمہ امام ہیں۔ تاریخ کی جدید تدوین ان کی رہین منت ہے، یہ خود اندلس کے رہنے والے اور عجمی ہیں، لیکن وہ عالم ہیں، علوم کی تدوین اور ان کے تدریجی ارتقاء کی پوری تاریخ، ان کی نظر میں ہے، وہ اس حقیقت کی علمی تحقیق فرماتے ہیں کہ دینی علوم پر عجمیوں نے کیسے قبضہ کیا اور کیوں؟

> ومن الغريب الواقع ان حملة العلم فى الملة الاسلامية اكثرهم العجم ولا من العلوم الشرعية ولا من العلوم العقلية الا القليل النادر وان كان منهم العربى فى نسبته فهو عجمى فى لغته ومرباه ومشيخته مع ان الملة عربية وصاحب شريعتها عربى ۔ (مقدمه، ص ۴۹۹)

’’یہ عجیب واقعہ ہے کہ علماء اسلام اکثر عجمی ہیں۔ شرعی اور عقلی علوم میں عرب قلیل اور نادر ہیں۔ اگر ان میں کوئی نسبت کے لحاظ سے عربی ہے تو لغت، تربیت اور شیوخ کے لحاظ سے عجمی ہے حالانکہ ملت عربی ہے اور نبی بھی عربی ہے۔‘‘

اس کے بعد، ابن خلدون اس کی وجہ بتاتے ہیں۔

اس کا سبب یہ ہے کہ اسلام میں ابتداءً سادگی تھی، اس میں علم اور صنعت نہ تھی۔ بدوی زندگی کا یہی تقاضا تھا۔ دین کے اوامر ونواہی نقلاً حافظوں میں موجود تھے۔ وہ ان کے ماخذ کو کتاب وسنت سے جانتے تھے۔ انہیں تعلیم وتالیف اور تدوین کی

> ضرورت تھی۔ یہ طبعی اور قدرتی روش، صحابہ اور تابعین کے زمانہ تک قائم رہی، اس قسم کے اہل کو وہ اپنے عرف میں قراء کہتے تھے۔ اسی طرح قرآن وسنت کے حافظوں کو بھی وہ قاری ہی کے نام سے تعبیر کرتے تھے، اس لیے کہ وہ قرآنِ عزیز اور سنن نبویہ ماثورہ سے مسائل کو سمجھتے تھے اور معلوم ہے کہ حدیث قرآن کی تفسیر ہی تو ہے جب حفظ ونقل کا زمانہ دور ہوتا گیا تو عباسی دور اور ہارون الرشید کی حکومت میں قرآن مجید کے لیے تفسیر اور احادیث کو قید کتابت میں لانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ پھر احکام کے استنباط واستخراج، اور زبان کو بگاڑنے سے بچانے کے قواعد بنائے گئے۔ یعنی صرف ونحو، معانی و بیان وغیرہ علوم عربیہ کی بنیاد رکھی گئی۔ اس طرح ان تمام علوم نے فن اور حرفت کی صورت اختیار کرلی۔
>
> عرب، حکومت کی مشغولیت اور موروثی سادگی کی وجہ سے، پیشہ وری اور صنعت و حرفت سے نفرت کرتے تھے، عجمی اہل علم چونکہ شہرت کے عادی تھے، ان کے ہاں صنعت وحرفت، کا ایک اعزاز تھا۔ اس لیے طبعی رجحانات کی وجہ سے تمام علوم کی سرپرستی عجمیوں کے سپرد ہوگئی اور اپنی مخلصانہ محنت اور جانفشانی کے بل بوتے پر وہ اسی اعزاز کے اہل قرار پائے۔ (مقدمہ ابن خلدون ص ۵۰۰)

نہ اس میں کوئی سازش تھی، نہ دھوکہ، بلکہ یہ ایک قدرتی تقسیم کار تھی جو خود بخود واقع ہوگئی۔ خدا کی قدرت ہے کہ پوری بارہ صدیوں میں، اکابر اور فحول اہل علم، اس عجم خولیا سے محفوظ رہے۔ تیرہویں صدی کے اواخر میں سیکریٹریٹ کے چند پنشنر کلرکوں کو یہ تکلیف ہوئی جس کا اثر عوام پر بھی ہوا، اللہ تعالیٰ سب کو صحت عطا فرمائے، اور عقل و دیانت سے سوچنے کی توفیق دے۔

سازش کے اثرات

عقل مند آدمی کے لیے ضروری ہے کہ اپنا معاملہ ہر پہلو سے سوچے اور خطرے کے ہر گوشہ کو کھلی نظر سے دیکھے۔ فارسی سازش کا خطرہ ہمیں صرف اس لیے ہوا کہ ہم نے فارس کو فتح

کیا، فارسی حکومت، اس کے بعد صفحۂ ہستی سے ناپید ہوگئی۔ ہم نے آج کے حالات میں دیکھا کہ مغربی حکومتیں باہم سازش کرتی ہیں۔ انتداب کے بہانہ سے چھوٹی حکومتوں کو دبا لیتی ہیں، اورفنی امداد کے بہانے کمزور حکومتوں میں سازشوں کے جال بچھا دیتی ہیں۔ کچھ امداد دے کر، بعض اوقات، لوگوں کے ایمان تک خریدتی ہیں۔ آہستہ آہستہ چھوٹے ملک، اُن کے سہارے پر، جینے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ آپ نے یہ سمجھا کہ خلیفہ ثانی نے جب فارسی شہنشاہیت کو تاراج کیا تو فارسیوں نے عربوں کے خلاف ضرور کوئی سازش کی ہوگی۔ یہ استدلال بظاہر واقعات پر مبنی معلوم ہوتا ہے اس لئے تھوڑی دیر کے لئے ذہن کو اپنی طرف پھیر لیتا ہے، اور عام آدمی جس کی نظر، اپنی اور عام قومی تاریخ پر نہ ہو، اس سے ٹھوکر کھا سکتا ہے لیکن اگر آپ تھوڑی سی گہرائی میں جائیں، تو آپ یقین کریں گے کہ اس استدلال میں بہت کافی خلاء ہے، جس نے دلیل کو قطعی بے کار کر دیا ہے۔

۱:......اُس وقت کی حکومتوں کو آج کل کی حکومتوں کے مزاج پر قیاس کرنا درست نہیں۔ آج کی حکومتوں کے مزاج میں جمہوریت کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ شخصی حکومتیں اور ملوکیتیں بھی، اس امتزاج سے خالی نہیں۔ اس لحاظ سے پوری دنیا کا مزاج بدل چکا ہے۔ استبداد کافی حد تک ختم ہو چکا ہے۔ اس لئے وقت کی شخصی بادشاہتوں کو آج کی جمہوری حکومتوں پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

۲:......اُس وقت کے مستبد بادشاہ، اپنے قریبی اعزہ اور اقارب کو بھی عموماً دشمن بنا لیتے تھے۔ ملوکیت کی پوری تاریخ اس قسم کے حوادثات سے بھری پڑی ہے۔ بھائی نے بھائی کو قتل کرا دیا۔ بیٹے نے باپ کے خون سے ہاتھ رنگ لئے۔ ایسے لوگوں کے لئے عصبیت اور ان کی حمایت میں سازشیں اور بغاوت کون کرے؟

۳:......یہ درست ہے کہ مروان الحمار کی حکومت کے خلاف، بغاوت کے لئے خراسان کو مرکزی حیثیت حاصل ہوئی، اس لئے نہیں کہ اس میں فارسی عنصر زیادہ تھا۔ اس بغاوت کے سرغنہ تو عرب ہی تھے، یعنی ہاشمی اور عباسی، اہل بیت کی حمایت کے بہانہ سے یہ لوگ وہاں

سازشیں کر رہے تھے، ان میں فارس کے شاہی خاندان کے فارسی ہمدردوں کا تاریخ میں کوئی پتہ نہیں چلتا ہے۔ بغاوت کے لیے اس مقام کا انتخاب اس لیے کیا گیا کہ یہ پایۂ تخت یعنی شام سے کافی دور تھا، اطلاعات پہنچنے میں دیر ہوتی اور سرکوبی کے انتظامات کی وہاں تک رسائی کافی مشکل ہوتی۔ یہ حادثہ حدیث کے معاملہ میں، فارسی سازش کے لیے دلیل نہیں بن سکتا۔

۴:...... پھر آپ نے کبھی اس چیز پر بھی غور فرمایا کہ سرزمین حجاز سے شروع ہو کر، اسلامی حکومت اقطار عالم تک لاکھوں مربع میل زمین پر پھیلی ہوئی تھی۔ آپ یہ سوچیں، آپ کو صلح سے کیا کوئی ملک ملا؟ خود سرزمین حجاز میں قدم قدم پر لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ مکہ پر فوج کشی کی ضرورت ہوئی۔ نجد لڑائی سے ملا، شام، عراق، حبش، یمن کے بعض علاقوں پر لڑنا پڑا۔ سمندر کے ساحلی علاقوں پر جنگیں ہوئیں۔

آنحضرت ﷺ کو اپنی زندگی میں کم وبیش بیاسی جنگیں لڑنا پڑیں۔ پھر یہ جنگوں کا سلسلہ، خلیفہ ثالث کی حکومت کے درمیانی دور تک جاری رہا۔ پھر خلیفہ ثالث کے آخری دور سے شروع ہو کر، حضرت علی کی حکومت کا پورا زمانہ قریب قریب باہمی آویزش کی نذر رہا ۔ ۶۱ھ کے بعد، جوں ہی ملک میں امن قائم ہوا، خلفائے بنوامیہ نے شخصی کمزوریوں کے باوجود، جہاد فی سبیل اللہ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ہندوستان، اندلس، بربر، الجزائر تمام علاقے، جنگ ہی سے اسلامی قلمرو میں شامل ہوئے۔ پھر آپ کے قلم اور دماغ نے سازش کا نزلہ صرف فارس پر کیوں گرایا؟ اگر محض ملک گیری اور فتوحات کی بناء پر، بغاوتیں اور سازشیں تصنیف کی جا سکتی ہیں، تو حجازی سازش، بربری سازش، ہندوستانی سازش اور اندلسی سازش کیوں نہیں بنائی گئی؟ کیا شام کے یہودی معصوم تھے۔ عراق اور روم کے مشرک عیسائی، فارسیوں سے زیادہ پاکباز تھے؟ کیا ان کی حکومتیں، مسلمانوں کے ہاتھوں فنا کے گھاٹ نہیں اتریں؟ مصر میں اسلامی فتوحات سے قبطی اور مصری قوتوں کا وقار پامال نہیں ہوا؟ پھر آپ مصری سازش کے متعلق کیوں نہیں سوچتے؟

اگر عقل کا دیوالہ نہیں ہوا، تو اپنی فتوحات کی پوری تاریخ پر غور فرمایئے، چین کے سوا شاید

ہی کوئی ملک ہو، جہاں مسلمانوں کے خون نے زمین کو لالہ زار نہ کیا ہو۔ مغربی سمندر کے ساحل پر آپ کی فوجیں برسوں لنگر انداز رہیں۔ ان لوگوں پر آپ کو سازش کا کیوں شبہ نہیں ہوا؟ آپ الٹا خود ہی ان کی سازش کا شکار ہو گئے۔

غزالی، ابن مکرم، ابن عربی، ابن العربی، شاطبی، ابن حزم، یحییٰ بن یحییٰ، مسعودی وغیرہم، قرطبہ اور اندلس کے علماء کو کیوں سازشی نہیں کہا جاتا۔ اگر خراسان، بخارا، قزوین، ترمذ، نسا کے علماء پر حدیث کے سلسلہ میں سازشی ہونے کی تہمت اس لیے لگائی گئی ہے کہ ان بزرگوں نے سنت کے پرانے تذکروں، صحابہ اور تابعین کی بیاضوں، اور سلف امت کے مسودات سے تدوین حدیث کے لیے راہیں ہموار کیں، تو علمائے اندلس نے بھی سنت کی کچھ کم خدمت نہیں کی۔ شروحِ حدیث، فقہ الحدیث اور علوم سنت کی خدمت میں، ان بزرگوں نے لاکھوں صفحات لکھ ڈالے۔ ان خدمات کو کیوں سازش نہیں کہا گیا۔ منکرینِ حدیث کے پورے خاندان میں کوئی عقلمند نہیں جو ان حقائق پر سنجیدگی سے غور کرے۔ کیا علوم دینی اور فنون نبوت کی ساری داستان میں آپ کو صرف علماءِ فارس ہی مجرم نظر آئے۔

من کان ھٰذا القدر مَبْلَغَ علمه فَلْيَسْتَتِر بالصمت والکتمان

فارسی سازش کے متعلق گذارشات میں کسی قدر تفصیل سے عرض کرنا پڑا۔ اس لیے کہ عوام کے ذہن، اس تہمت سے متاثر ہیں۔ بعض پڑھے لکھے لوگوں میں بھی، اس تہمت کی وجہ سے تذبذب پایا جاتا ہے۔ دین کا علم رکھنے والوں، اور اپنی علمی تاریخ سے واقف حضرات کے ذہن پر اس کا کوئی اثر نہ تھا۔ رجال اور ان کی تاریخ سے تھوڑے بہت واقف لوگوں کو بھی اس پر شک نہیں گزرتا، لیکن رنج ضرور ہوتا ہے کیونکہ یہ اُن لوگوں پر تہمت ہے جو دینی علوم کے ستون ہیں۔ دینی اور شرعی علوم کے آسمان، ان ہی اقطاب پر گردش کرتے ہیں۔ اگر یہ لوگ، سازشی ثابت ہو جائیں، تو اسلام کی پوری عمارت زمین بوس ہو جائے گی۔

فرض کیجیے، اگر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ، امام مالک رحمہ اللہ، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ، امام بخاری، امام مسلم بن الحجاج، امام ابوعیسیٰ الترمذی ایسے بزرگ اسلام کے

خلاف سازشیں کرنے لگیں، تو فقہ اور حدیث، دونوں مشتبہ اور ناقابل اعتماد قرار پائیں گے۔

پھر اگر یہ سلسلہ بڑھتا چلا جائے تو صرف ونحو، معانی، بیان، اصول کلام، سارے علوم مشکوک ہوجائیں گے، تیرہ سو سال کی محنت، جو عرب وعجم سب نے مل کر کی، غارت ہوجائے گی، بلکہ پوری امت کو کم فہم اور عقل فراموش تسلیم کرنا ہوگا جو ساری عمر اس شر انگیز شرارت کو معلوم نہ کر سکے تو یہ تو پھر بلاہت کی انتہاء ہوگی۔

پھر ان ناقلین آثار میں، امام شافعی رحمہ اللہ، مطلبی رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ، ابوعبید قاسم بن سلام، ایسے خالص عرب بھی شامل ہیں، نیز ہر دور میں کتاب و سنت اور دینی علوم کی خدمت، عرب اور عجم مل کر، اپنی بساط کے مطابق کرتے رہے، اور کسی کو محسوس نہ ہوا کہ ہم عجمیوں کی سازش کا شکار ہوچکے ہیں۔ یہ امت پر مضحکہ خیز پھبتی ہوگی، خصوصاً جب یہ معلوم ہو کہ صدیوں کے بعد، چند بے علم یا محدود العلم کلرکوں نے اس سازش کا سراغ لگالیا۔ دنیا کے دانشمند، اکابرِ امت کے اس تساہل پر تعجب کریں گے اور ہنسیں گے۔ حالانکہ اس میں لاعلمی اور عجائب پسندی کے سوا، کچھ بھی نہیں۔ امید ہے کہ احباب، ان مختصر گذارشات پر غور فرمائیں گے۔

تحریک انکارِ حدیث کی رفتار

مولوی عبداللہ صاحب سے مولوی محمد رمضان اور مولوی حشمت علی صاحب تک اس تحریک کے سوچنے کا انداز یہ رہا کہ گویا اس ساری تحریک کے پیش نظر، ایک مکان کی آبادی تھی، جس کا مالک اور منتظم شیخ چٹو ہے۔ مولوی عبداللہ وغیرہ بحیثیت مولوی وہاں رہتے ہیں، کچھ لکھتے ہیں، کچھ بچوں کو پڑھاتے ہیں۔ ان کے نزدیک اسلام کے تقاضے صرف اسی قدر ہیں کہ شیخ چٹو ناراض نہ ہوں، اور مولوی عبداللہ کچھ لکھتے پڑھتے رہیں۔ عوام کو مطمئن رکھا جائے کہ مولویوں نے اسلام میں بڑی خرابی پیدا کردی ہے۔ اسلام بہت لمبا ہوگیا ہے۔ حدیثوں نے اس میں اور اضافہ کردیا ہے، چنانچہ مولوی عبداللہ صاحب سے مولوی رمضان تک یہ مختصر سا کارخانہ چلتا رہا۔ ان سب بزرگوں کو آرڈر دیا گیا کہ ازراہ عنایت ہلکی پھلکی سی نماز بنادیں

تاکہ مولویوں کی پرانی نماز سے پیچھا چھوٹ جائے۔ کام ہوتا رہا۔ نماز بنتی رہی، منکرین حدیث کے بڑے بڑے فاضل دن رات کام کرتے رہے، پچاس سال تک اکابرِ امت پر پھبتیاں اڑتی رہیں، نصف صدی کے بعد معلوم ہوا کہ کوئی متفقہ نماز نہیں بن سکی، نہ رکعات کا تعین ہوسکا، نہ ہی وظائف طے ہوسکے، اور نہ ہی اوقاتِ نماز کا فیصلہ ہو پایا۔ پچاس سال کے بعد، کاریگر، باہم دگر دست وگریباں ہوگئے۔ ہر ایک نے دوسرے کے کام کو غلط و ناتمام کہا۔ آخر نماز نہ بن سکی، مالک تنگ آ گیا۔ اس نے آرڈر واپس لے لیا، اور کارخانہ بند کر دیا، اور کاریگر، ملتان، گوجرانوالہ اور ڈیرہ غازی خاں منتقل ہوگئے۔ یہاں تک اسلام چند فقہی مسائل کا نام تھا، جن میں سے سب سے پہلے نماز ہی ان حضرات کی نگاہ میں آئی، جو نہ بن سکی۔ یہ حضرات نہ اسلام کو نظامِ زندگی سمجھتے تھے، نہ ہی انہوں نے اس کے لیے کوئی کوشش کی۔

پچاس سال کے بعد، کچھ کلرک ریٹائر ہوئے، کچھ یورپ زدہ حضرات، احادیث کی تشریحات سے تنگ آئے ہوئے تھے جنہیں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور قربانی وغیرہ مسائل کسی طرح پسند نہ تھے۔ انہوں نے نظریہ تو مولوی عبداللہ صاحب سے مستعار لیا، لیکن اسے سابقہ تجربے سے فائدہ اٹھا کر، نماز، روزہ اور ارکانِ اسلام کو، کچھ غیر ضروری سمجھ کر، نظر انداز کر دیا، اور فرمایا، یہ سب وقتی احکام تھے جو اس وقت امت کو دیئے گئے تھے۔ اب دنیا بہت آگے نکل گئی ہے۔ وقت کے تقاضے بدل چکے ہیں۔ یہ نماز، وضو، روزے، عبادات، پُرانا فرسودہ فلسفہ ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں زندگی کی دوڑ میں یورپ سے آگے نکلنا ہے۔ اس لیے اب عورت کو برقعہ اتار پھینکنا چاہیے۔ اُسے حق ملنا چاہئے کہ وہ سرِ محفل، اپنے حسن کی نمائش کرے۔ کلب میں دوسروں سے ملے۔ مرد کو خواہ مخواہ، اس پر بدگمان نہیں ہونا چاہئے۔ ہر ایک کو اپنی خواہشات پورا کرنے کا حق ہے۔ یہ پابندیاں اور ستر، شرم و حیا، یہ حدیثوں نے دین میں شامل کی ہیں۔ اب قرآن کے الفاظ یا ترجمہ کی ضرورت نہیں۔ اب صرف مفہوم قرآن اور مقصد قرآن سمجھنا چاہیے، اور قرآن اور اسلام کو نئے تقاضوں اور زندگی کی جدید راہوں سے ہم آہنگ ہونا چاہیے، اگر یہ کشادگی اسلام میں پیدا نہ کی جاسکی، تو زندگی آگے نکل جائے گی،

اسلام بہت پیچھے رہ جائے گا۔ اس لئے قرآن کی تشریح وقت کے مطابق ہونی چاہئے۔ حدیث کی حیثیت غیر مستند تاریخ کی ہے۔ اگر ضرورت ہو، تو کبھی اس طرف بھی نظر ڈال لینی چاہئے۔ لیکن اگر اس کی تفصیلات اور آنحضرت کے قول و فعل اور آپ کی خاموشیاں، اگر دین تصور ہوں، تو اسلام تنگ ہو جائے گا اور مسلمانوں کے لئے دنیا میں رہنا ناممکن ہو جائے گا۔ احادیث و سنن کو قانون کی اساس نہیں بنانا چاہئے۔ پیش آمدہ مسائل کے متعلق ہر زمانہ میں، اس وقت کے لوگ، اپنے خیالات کے مطابق، قرآن کی تفسیر کریں گے۔ تفسیر میں سلف یا خلف یا آنحضرت ﷺ کے ارشادات کی پابندی قطعاً نہیں ہوگی، بلکہ یہ مجتہد اور مفسر حضرات، جمہور کے انتخاب سے مقرر ہوں گے۔

* * * *

باب دوم

عجمی سازش کی تفصیلی تردید

جناب چودھری غلام احمد پرویز، قلم کی بے پناہ خوبیوں کے مالک تھے۔ اپنے خیالات کو بہت خوبصورت انداز میں پیش کرنے کا سلیقہ رکھتے تھے، تحریر میں شگفتگی، اور عبارت میں ادبی چاشنی کے ساتھ، برمحل اشعار کی موجودگی، قاری پر ایک خاص اثر ڈالتی ہے۔ ان کا ساحرانہ انداز نگارش، صاحبِ مطالعہ کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتا۔ طاہرہ کے نام، اُن کی کتاب میں۔۔۔ ’’صابرہ کی دکھ بھری داستان‘‘، ’’شفقت کی بے چارگی‘‘ اور ’’شاکرہ کی شادی، اس کے لیے پیغامِ موت‘‘۔۔۔ پڑھ کر، ہر شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ بہت اچھے کہانی نویس اور افسانہ نگار تھے، اس پہلو سے ہر سلیم الفطرت شخص ان کی قلمی صلاحیتوں کا لوہا ماننے پر مجبور ہے۔ کسی داستان کو زیادہ سے زیادہ قابلِ پذیرائی بنانے کا فن، وہ، خوب جانتے تھے، اور صاحب نگارش کی یہ خوبی بڑی قابلِ قدر ہے کہ وہ اپنی فرضی کہانی کو اس انداز میں پیش کرے کہ لوگ، اسے ایک سچا واقعہ باور کرلیں۔ جناب پرویز صاحب کے خوبصورت انداز نگارش کا یہی کمال ہے کہ ایک طرف بے حقیقت داستانیں بھی حقیقت دکھائی دیتی ہیں، اور دوسری طرف، ساحرانہ طرز تحریر ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ ٹھوس حقائق بھی افسانہ دکھائی دیتے ہیں۔ ’’مفکر قرآن‘‘ جناب غلام احمد پرویز نے، اپنے حُسنِ نگارش کے بل بوتے پر جن دو عظیم افسانوں کو تراشا ہے، ان میں سے ایک مُلّا اِزم، تھیا کریسی یا مذہبی پیشوائیت کا افسانہ ہے، اور دوسرا عجمی سازش کا جس کا ایک پہلو، قرآن وسنت پر مبنی اسلام کو ’’عجمی اسلام‘‘ قرار دینا ہے اور دوسرا پہلو، مغرب کے لیے قابل قبول ایک ’’نیا اسلام‘‘ تراشنا ہے۔ اول الذکر افسانے کی حقیقت، ماہنامہ محدث لاہور کے مئی ۲۰۰۷ء تا اگست ۲۰۰۷ء کے شماروں میں، چار اقساط میں، منظر عام پر آچکی ہے۔ رہا

ثانی الذکر افسانہ تو اس کی حقیقت و واقعیت کا جائزہ، زیرِ نظر تصنیف میں لیا جا رہا ہے۔ اسے ''مفکرِ قرآن'' نے بڑی عبارت آرائیوں اور ملمع سازیوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ چونکہ یہ افسانہ، خود ان کا اپنا طبع زاد افسانہ ہے اس لئے اس کو ایک ''واقعی حقیقت'' باور کروانے کے لئے، بالعموم، یہ حربے اختیار کئے گئے ہیں۔

۱۔۔۔ اپنے مُدعاءِ مقصود کو ''ثابت'' کرنے کے لئے، تاریخی واقعات کی قلمبندی میں، اپنی طرف سے ایسے الفاظ کا اضافہ کرنا، جو قارئین کے لئے، ''مفکرِ قران'' کی مقرر کردہ منزلِ مراد تک پہنچنے کے لئے، زینے کا کام دیں۔

۲۔۔۔ تاریخ کے نام پر، اپنا مواد پیش کرتے ہوئے، اس بات کا التزام کرنا، کہ اصل ماخذ کا ذکر نہ آنے پائے۔ اور بلا حوالہ اپنی بات کہہ ڈالی جائے، تاکہ تحقیق طلب ذہن، اس کا ماخذ ڈھونڈتے ڈھونڈتے، اس قدر تھک جائے کہ اس کی طبیعت اچاٹ اور بے زار ہو جائے، اور وہ تحقیق کے اس بھاری پتھر کو بس چوم کر رکھ دے۔

۳۔۔۔ چکمہ بازی، مغالطہ آرائی، خیانت کاری اور مسخ و تحریف کے ذریعہ، واقعات کو اس انداز سے پیش کرنا کہ قارئین پر، ''مفکرِ قرآن'' کے مدعاءِ مقصود کی طرف جانے کی راہ کھل جائے۔

۴۔۔۔ اپنے مقصد کی دُھن میں، تاریخ کے پیش پا افتادہ حقائق کو نظر انداز کرنا، اور دور کی کوڑی لاتے ہوئے، کہیں کی اینٹ اور کہیں کا روڑا لے کر، بھان متی کا ایسا کنبہ جوڑنا، جو ''مفکرِ قرآن'' کے مدعاءِ مقصود سے مطابقت رکھتا ہو۔

۵۔۔۔ اگر کبھی کسی ایسی اٹل حقیقت کو بیان کرنا بھی پڑے جو ان کی ''قرآنی بصیرت'' کے خلاف ہو، تو اسے اس انداز میں بیان کرنا، کہ اُن کی نوکِ قلم سے وہ ذبح بھی ہو جائے تو خون کا کہیں کوئی دھبہ نظر نہ آئے، تاکہ نہ وہ حقیقت سامنے آئے اور نہ اس کے اعتراف کا خطرہ مول لینا پڑے، نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔

۶۔۔۔ اس ''عجمی سازش'' کو، اپنے لٹریچر میں ''مفکرِ قرآن'' کا اس کثرت سے بتکرار و

اعادہ بیان کرتے رہنا کہ وہ قارئین کو ایک ''حقیقت'' نظر آنے لگے کیونکہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ

> نازیوں کے گوئبلز کا مقولہ تھا کہ...... ''جھوٹ کو اگر سو دفعہ دہرایا جائے، تو وہ سچ بن جاتا ہے''...... دنیا، اُس کے اس مقولے پر ہنستی رہی، لیکن دور رس نگاہوں نے، اسے قیمتی متاع سمجھ کر، احتیاط سے رکھ لیا، تاکہ بوقتِ ضرورت، اس سے کام لیا جا سکے۔ ①

اب ظاہر ہے کہ ''مفکر قرآن'' سے بڑھ کر، ''دور رس نگاہ'' کس کی ہو سکتی ہے۔ انہوں نے اسے قیمتی متاع سمجھ کر، خوب احتیاط سے رکھ لیا، اور بوقتِ ضرورت، اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا، اور خوب کثرت سے ''عجمی سازش'' کے افسانہ کو دہرایا۔

ہم نے ''مفکر قرآن'' کی اس ''عجمی سازش'' کا بھرپور جائزہ لیا ہے، یوں تو، انہوں نے، اس کا ہر جگہ ایجاز و اختصار سے ذکر کیا ہے، لیکن اسے سب سے زیادہ تفصیل و اطناب سے، انہوں نے ''شاہکار رسالت'' کے آخری باب میں بیان کیا ہے، اس لیے ہم نے بھی اپنی بحث کا مدار اسی پر رکھا ہے، اور کوشش کی ہے کہ ''مفکر قرآن'' کا کوئی قابل لحاظ نکتہ، ہمارے جائزے میں چھوٹ نہ جائے۔ لیجئے، اب نمبروار اس جائزہ کا مطالعہ فرمایئے۔

(۱) عجمیت کیا ہے؟

عجمیت؟

سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ ''مفکر قرآن'' نے، مذکورہ بالا حربوں کے ساتھ، جس ''عجمی سازش'' کا بتکرار بسیار ڈھنڈورا پیٹا ہے، وہ ہے کیا؟ چنانچہ جب اُن کے سامنے یہ سوال اٹھایا گیا کہ...... ''آپ کے ہاں عجمی سازش اور عجمی تصورات سے بیزاری کا اظہار ہے، لیکن کاش کوئی مضمون یہ بھی ہوتا کہ یہ عجمی تصور ہے کیا؟''...... تو اس کے جواب میں یہ کہا گیا:

> عجمی تصور کے متعلق، اس سے زیادہ کیا عرض کیا جائے کہ ؎

---

① طلوع اسلام، ستمبر ۱۹۶۰ء، ص ۷۹۔

> تفصیلِ معنئ غم الفت طویل ہے   اور ویسے تو خفیف سا اک دل میں درد ہے
>
> تفصیل و اطناب کی طرف جائیے تو مسلمانوں کی موجودہ زندگی کا ہر گوشہ عجمی تصورات کی تصویر ہے۔ اس کی شرح کہاں تک کی جائے۔ اور اختصار کی طرف آئیے تو یہ سب کچھ اس ایک فقرہ میں سما جائے، کہ جو کچھ قرآن کے خلاف ہے۔ وہ سب عجمی تصورات کا نتیجہ ہے خواہ اسے کیسا ہی مقدس اسلامی نام کیوں نہ دے دیا جائے۔ ❶

اور کبھی عجمی تصور کی وضاحت یہ کہہ کر کی گئی

> اسلام نام ہے اس جماعتی نظام کا، جو دنیا میں قرآنی آئین کو نافذ کرنے کا ضامن ہو، اس کے سوا، جو کچھ ہے، وہ عجمی تصور ہے۔ ❷

اور ایک مقام پر عجمیت کی تعریف، ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

> عجم سے مراد، کوئی خاص ملک نہیں، بلکہ ہم ہر غیر قرآنی تصور کو عجمی کہتے ہیں۔ ❸

یہاں قارئین کرام سے گذارش ہے کہ وہ دو باتوں کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔

اوّلاً۔۔۔ یہ کہ، اللہ تعالیٰ نے تنہا کسی کتاب کو لوگوں تک نہیں پہنچایا، بلکہ کتاب اللہ کو رسول کے ذریعے پہنچایا، اور پھر رسول پر یہ فریضہ عائد کیا کہ وہ قرآن کی آیات کی نہ صرف یہ کہ لوگوں پر تلاوت فرمائیں بلکہ اس کی تعلیم بھی دیں۔ یَتْلُوْا علیھم ایاتہٖ ویعلمھم الکتاب۔ دورانِ تعلیم، جہاں کوئی بات وضاحت طلب ہو، وہاں اپنے قول اور عمل کے ذریعے وضاحت بھی فرمائیں وانزلنا الیك الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم (النحل: ۴۴) جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ خود خدائے قدوس کے نزدیک بھی، تنہا کتاب کافی نہیں ہے جب تک کہ رسول، اس کے ساتھ توضیح و تشریح کے لیے موجود نہ ہو، کیونکہ تعلیم بلا معلم، کتاب بلا رسول، اور قرآن بلا محمد ﷺ کا مسلک، ایک غیر معقول مسلک ہے لہٰذا، خود قرآن کریم کی

---

❶ طلوع اسلام، جولائی ۱۹۴۹ء، ص ۵۶۔

❷ طلوع اسلام، جولائی ۱۹۴۹ء، ص ۵۶۔

❸ طلوع اسلام، ۵ نومبر ۱۹۵۵ء، ص ۱۰۔

نگاہ میں، جسے اسلام کہا جاتا ہے، وہ محض الفاظِ قرآن تک محدود نہیں ہے، بلکہ وہ پورا اسوۂ رسول ہے جس کی اتباع کا قرآن میں بار بار حکم دیا گیا ہے۔

ثانیاً۔۔۔ یہ کہ، جب ہر غیر قرآنی تصور کو عجمی قرار دیا جاتا ہے تو اس کے نتیجہ میں، قرآن کے ہر بدلتے ہوئے معنیٰ و مفہوم کی روشنی میں، ''عجمی تصور'' بھی مرغ بادنما کی طرح بدلتا رہتا ہے۔ ہمارے ''مفکر قرآن'' کی فضاءِ دماغی میں، جب بھی کسی نئے خیال کی لہر اٹھی، تو ''عجمیت'' کا تصور بھی، اُس کے ساتھ متغیر ہو گیا۔ اس امر کی بیسیوں نہیں، بلکہ سینکڑوں مثالیں، ''مفکر قرآن'' کے لٹریچر میں پائی جاتی ہیں، میں خود بھی، قرآن کے ترجمہ و تفسیر کے حوالہ سے، ''مفکر قرآن'' کے جملہ تضادات کو، ایک الگ تصنیف میں جمع کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

عجمی سازش

بات ہو رہی تھی ''عجمی سازش'' کی، جس کا مفہوم، پرویز صاحب کے نزدیک، یہ ہے کہ تنہا قرآن کے خلاف (نہ کہ قرآن و سنت کے خلاف) غیر مسلم اقوام سے تصورات لے کر، انہیں اسلام قرار دے دیا جائے۔ چنانچہ ایک مقام پر، اس کی وضاحت، ان الفاظ میں کی گئی ہے:

> آج جسے مذہب اسلام کہا جاتا ہے، یہ مجموعہ ہے مختلف قوموں سے مستعار تصورات کا، جن پر لیبل قرآنی اصطلاحات کا لگا دیا گیا ہے۔ ❶

ان مختلف اقوام میں سے، ایرانی قوم کا خاص طور پر ذکر کیا جاتا ہے، جو فتح ایران کے نتیجہ میں مسلمانوں سے مغلوب و مفتوح ہوئی تھی:

> ''تسخیر ایران کا نتیجہ یہ نہ نکلا کہ ایران، اسلام کا حلقہ بگوش بن گیا، بلکہ یہ نکلا کہ اسلام، ایرانیت کے رنگ میں رنگا گیا۔ ❷

---

❶ طلوع اسلام، اپریل ۱۹۸۵ء، ص ۴۔

❷ طلوع اسلام، اپریل ۱۹۶۸ء، ص ۴۲۔

اس کے بعد، تان یہاں آ کر ٹوٹی کہ:

> واضح رہے کہ چونکہ ہمارے ہاں اسلام، ایران (عجم) کے راستہ آیا ہے۔ اس لیے اس کی اصطلاحات بھی (عربی یا قرآن کی جگہ، ایرانی (فارسی) متداول ہیں۔ صلوٰۃ کی جگہ نماز، صوم کی جگہ روزہ، حالانکہ لسانیات کا مبتدی بھی جانتا ہے کہ کسی زبان کی اصطلاحات کا دوسری زبان میں ترجمہ نہیں ہوسکتا۔ اگر ایسا کیا جائے تو اس کا مفہوم، کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ ❶

ہوسکتا ہے کہ لسانیات کا "مبتدی" یہ سب جانتا ہی ہو، لیکن ہمارے "مفکر قرآن" جیسے "منتہی" یا تو اس سے قطعی جاہل و بے خبر ہیں، یا پھر وہ محض اپنی خوئے تضاد گوئی کو نباہنے کے لیے، خود بھی صلوٰۃ کا ترجمہ "نماز" سے، اور صیام کا ترجمہ "روزوں" سے کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے، یہ دو اقتباسات

۱: وَامُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ ...... "اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دے۔" ❷

۲: كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا..... "تم پر روزے فرض کیے گئے جس طرح......" ❸

اور پھر یہ بھی کیا خوب "گپ" ہے کہ "ہمارے ہاں اسلام، ایران (عجم) کے راستے آیا ہے" جب کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ اسلام، ہمارے پاس براہِ راست عرب سے، محمد بن قاسم کے ذریعے، باب الاسلام (سندھ) کے راستہ سے پہنچا ہے۔ بلکہ طلوع اسلام کے فروری ۱۹۶۱ء کے شمارہ میں، ......"ہند میں اسلام کا آغاز" ...... کے زیرِ عنوان، ایک تحقیقی مقالہ میں تو یہاں تک ثابت کیا گیا ہے کہ سرزمین ہند، حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کے دور میں اسلام سے روشناس ہو چکی تھی۔ اس مقالہ کا آخری حصہ، ...... "سب سے پہلے مبلغ اسلام فی الہند" ...... کی سرخی کے تحت یوں دیا گیا ہے:

---

❶ طلوع اسلام، جون ۱۹۸۴ء، ص ۳۰۔

❷ معارف القرآن، ج ۳، ص ۲۷۹۔

❸ مفہوم القرآن، ص ۶۷۔

(۱) حبیشِ ثقفی، یعنی حکیم بن العاص ثقفی، و مغیرہ بن العاص ثقفی ۱۵ھ، اور ان کی جماعت نے بزمانہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، بمبئی میں تھانہ میں لوگوں کو مسلمان کیا پھر بھراچ و دیبل کے اشجار و احجار تک توحید کے نغموں سے مانوس ہو گئے۔ ان کے بعد

(۲) ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے تقریباً ۱۷ھ، بزمانہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، ہندوستانی فوج اساورہ اور جاٹ کو مسلمان کیا۔ ان کے بعد

(۳) عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ تقریباً ۲۶ تا ۳۰ ھ، بزمانہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، زرنج اور کش کے درمیان علاقہ پر قابض ہوئے، پھر چج اور دادن پر قبضہ کیا اور تبلیغ کی (اُوزبت کا قصہ)۔ ان کے بعد۔

(۴) ثاغر بن دعور (بسند ایلیٹ و ابوظفر ندوی) یا حارث بن مرہ (بسند فتوح البلدان، بلاذری) ۳۸ھ، بزمانہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، کوہستان قیعان پر۔ (نعرہ اللہ اکبر کا قصہ) بہت سے لوگ مسلمان ہوئے۔ ❶

لیکن ہمارے ''مفکر قرآن'' صاحب کو، چونکہ ''عجمی سازش'' کے افسانہ کی کڑیوں کو ایران سے ملانا مقصود تھا، اس لیے، ان کے ''نظریۂ ضرورت'' نے، انہیں اس کذب صریح کا سہارا لینے پر مجبور کر دیا کہ اسلام ہمارے ہاں، براستہ ایران آیا ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ''مفکر قرآن'' کو جھوٹ بولتے ہوئے شمہ بھر بھی تامل نہ تھا۔

(۲) ''انتقام عجم''

بہر حال، بات ہو رہی تھی ''عجمی سازش'' کی۔ اس سازش کی بابت، ''مفکر قرآن'' صاحب، انکشاف فرماتے ہیں:

> عجم کی یہ سازش، دراصل انتقام تھی، یہود و نصاریٰ کی ان شکستوں کا، جو انہیں

---

❶ طلوع اسلام، فروری ۱۹۶۱ء، ص ۳۷۔

میدان جنگ میں، مسلمانوں کی تبلیغِ حق کے مقابلہ میں اٹھانی پڑیں۔ یہ لوگ جانتے تھے کہ اس ملت مجاہدین کی قوت و سطوت کا راز، قرآن کی حیات بخش تعلیم میں ہے۔ لہٰذا انہوں نے ایسی چال چلی کہ مسلمانوں کو قرآن سے یکسر بیگانہ بنا کر، غیر قرآنی اسلام کے فریب میں الجھا دیا۔ اور یہ سب کچھ اس کامیاب طریق سے کیا کہ سادہ لوح مسلم، اس سرابِ رنگ و بو کو، سچ مچ کا گلستان سمجھنے لگ گیا۔ ❶

تاریخ کے سیدھے سادے واقعات میں، ''انتقامِ عجم'' کا خود ساختہ تصور، جناب پرویز صاحب نے صرف اس لئے داخل کیا ہے کہ ایرانیوں کی اسلام کے خلاف ''عجمی سازش'' کا تانا بانا بنا جا سکے۔ پھر شہادتِ عمر رضی اللہ عنہ کو، اس ''انتقامِ عجم'' کا شاخسانہ قرار دیا گیا۔ پھر اس کے بعد، زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہوئے سیاسی اور مذہبی دوائر میں، اس سازش کی کارفرمائی کا انکشاف کیا گیا۔ اس اعتبار سے ''عجمی سازش'' کے فسانہ کی تین بڑی کڑیاں گھڑی گئی ہیں۔

(۱) انتقامِ ایران بصورتِ شہادتِ عمر رضی اللہ عنہ (۲) دین اسلام سے اہل ایران کا مذہبی انتقام (۳) امت مسلمہ سے عجم کا سیاسی انتقام۔

لیجئے، سطور ذیل میں، ان تینوں گوشہ ہائے سازش پر ہمارا مفصل تنقیدی جائزہ ملاحظہ فرمائیے۔

(۳) ''انتقامِ عجم'' اور شہادتِ حضرت عمر رضی اللہ عنہ

قبل اس کے کہ شہادتِ عمر رضی اللہ عنہ کے سلسلہ میں، ''عجمی سازش'' کا تفصیلی جائزہ لیا جائے، یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ سازش کے اس ڈرامے کی تشکیل کے لئے، تاریخ کے سیدھے سادے واقعات میں، ''مفکر قرآن'' صاحب کس طرح ''انتقامِ عجم'' کے عنصر کو، اپنی لفاظی اور ملمع آرائی کے ذریعے داخل کرتے ہیں۔ تاریخ میں صرف اس قدر مرقوم ہے کہ ایرانی سپہ سالار ہرمزان جب اپنی پے در پے شکستوں کے بعد، بالآخر شکست کھا گیا اور اُسے خدمتِ خلیفہ میں پیش کیا گیا تو بلاشبہ اسے یہ احساس تھا کہ عرب کے جن بدوؤں کو وہ ذرا بھی اہمیت

---

❶ طلوع اسلام، مارچ ۱۹۵۹ء، ص ۴۶۔

نہیں دیتے تھے، آج وہ ان کے سامنے اسیر وقیدی کی حیثیت سے کھڑا ہے، اسے یقین تھا کہ سلمانوں سے ہر مصالحت کے بعد، نقضِ عہد کا جو رویہ وہ اب تک اختیار کرتا رہا ہے، اس کا نتیجہ وہ موت ہے جو اس پر عنقریب بحکم خلیفہ ٹوٹ پڑنے والی ہے۔ وہ صرف اور صرف موت کے خوف میں مبتلا تھا، اور چاہتا تھا کہ کوئی ایسا حیلہ کیا جائے، جو اسے موت سے بچا لے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی، وہ مسلم فاتحین کے اخلاق سے بھی متاثر تھا کہ انہوں نے پے درپے اس کی نقضِ عہد کی کارروائیوں کے باوجود اپنے محکوم بلکہ اسیر کے ساتھ، ہر موقع پر ترحم خسروانہ سے کام لیا۔ اور اس کی ہر بدعہدی کو نظر انداز کرتے ہوئے، اس کی اس درخواست کو بھی قبول کر لیا کہ اُسے موقع پر ہی قتل کر دینے کی بجائے، خلیفۃ المسلمین تک پہنچا دیا جائے، پھر مدینہ پہنچ کر، وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کسی شاہانہ کروفر کے ساتھ دیکھنے کی بجائے، نہایت سادگی سے مسجد میں لیٹے ہوئے، دیکھ کر اس قدر متاثر ہوتا ہے کہ بے ساختہ، اس کے لبوں پر یہ الفاظ آ جاتے ہیں فینبغی ان یکون نبیاً ''اس شخص کے شایان شان تو یہ ہے کہ وہ نبی ہو'' اور قبل ازیں یہ تو وہ دیکھ ہی چکا تھا کہ اسلحہ وافرادی قوت کی انتہائی قلت کے باوجود بدویانِ عرب کا، ایران جیسی سپر طاقت سے نہ صرف ٹکرانا، بلکہ اسے صفحۂ ہستی سے مٹا دینا، ایک ایسا غیر معمولی واقعہ ہے، جس کے پس پردہ یقیناً کوئی غیبی اور روحانی قوت پائی جاتی ہے۔ ہرمزان کے ان احساسات کا آخری نتیجہ کیا نکلا، یہ آگے آ رہا ہے۔

لیکن ''مفکر قرآن'' صاحب، ان واقعات میں اپنی رنگ آمیزیوں اور سخن سازیوں کے نتیجہ میں، ''انتقام عجم'' کا داعیہ، بایں الفاظ داخل کرتے ہیں:

> اس المیہ کے دو اہم کردار ہیں، ہرمزان اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ۔ پہلے ہرمزان کو لیجئے۔ یہ ایران کا نہایت معزز، سربلند، صاحب شوکت وحشمت فرزند تھا۔ اس ایران کا، جس کی عظیم سلطنت کا خاتمہ ابھی ابھی عربوں کے ہاتھوں ہوا تھا جس کی ہزاروں سال کی پرانی تہذیب، جس پر انہیں اس قدر فخر تھا، پامال ہو چکی تھی، جس کا شہنشاہ اپنی جان بچانے کے لیے در بدر دھکے کھا رہا تھا، سوچیے کہ اس

> ایران کے باشندوں کے دل پر بالعموم اور ان کے اس قدر صاحب عزت و سطوت ابناءِ قوم کے جگر پر بالخصوص، ان ذلت آمیز شکستوں کے زخم کس قدر گہرے ہوں گے، اور عربوں کے خلاف، ان کی آتشِ انتقام کی حدت کس قدر شدید۔ خود ہرمزان، ایک صوبہ کا نامور گورنر تھا۔ اس کی ریاست چھن گئی تھی۔ اس کی حکومت کا تختہ الٹ گیا تھا، اسے پے در پے رسوا کن شکستیں ہوئی تھیں، اور اب وہ ان عربوں کے سامنے پا بجولاں کھڑا تھا جن کے ساتھ یہ ایرانی جنگ کرنا بھی کسر شان سمجھا کرتے تھے۔ سوچئے کہ اس کے سینے میں غصے اور انتقام کے کیا کیا طوفان نہ اٹھ رہے ہوں گے۔ ❶

ابتدائی کتب تاریخ کی کسی گری پڑی کتاب میں بھی ''انتقام جوئی'' کا ذکر تک نہیں ہے۔ یہ صرف ذہن پرویز کی کرشمہ سازی ہے، تاکہ وہ اس ''انتقام جوئی'' کو، اپنی خود ساختہ ''عجمی سازش'' کی پہلی کڑی قرار دے سکیں۔ وہ اس ''انتقام'' کا ذکر بار بار کرتے ہیں تاکہ یہ جھوٹ، سچ بن جائے، ایک اور مقام پر، پھر اس کا ذکر، بایں الفاظ کیا گیا ہے:

> ایرانی اس حقیقت کو پا گئے تھے کہ جب تک خدا مومنین کے ساتھ ہے، ہم (یا دنیا کی کوئی طاقت) ان پر غالب نہیں آ سکتی، لہٰذا ان سے اپنی شکستوں کا انتقام لینے کے لیے ضروری ہے کہ ان سے خدا کا ساتھ چھڑا دیا جائے۔ ❷

آگے چل کر، جہاں وہ ''ایران اور روما کی فتوحات میں فرق'' واضح کرتے ہیں، پھر اس ''انتقام'' کا ڈھنڈورا یہ کہہ کر پیٹتے ہیں:

> ''صدر اول کے مسلمانوں نے ایران اور روما، دونوں سلطنتوں کو پاش پاش کیا تھا، لیکن ان میں ایک بنیادی فرق تھا۔ روما کی سلطنت کے صرف بعض حصے مسلمانوں کے قبضہ میں آئے تھے۔ نہ ان کی پوری کی پوری سلطنت کا خاتمہ ہوا

---

❶ شاہکار رسالت، ص ۱۸۶۔

❷ شاہکار رسالت، ص ۴۴۰۔

تھا، نہ ان کی تہذیب مٹی تھی۔ اس کے برعکس ایران کی مملکت بھی ختم ہوگئی تھی، اور ان کی وہ ہزار سالہ تہذیب بھی، جس پر انہیں اس قدر فخر و ناز تھا، مٹ گئی تھی، اس لیے مسلمانوں کی اس فتح کا زخم، ایرانیوں کے دل پر بڑا گہرا تھا، اور اسی لیے وہ مسلمانوں (بلکہ اسلام) کے خلاف انتقام جوئی میں پیش پیش تھے۔ ❶

وجہ انتقام...... ''شاندار ایرانی تہذیب'' کا خاتمہ

''مفکر قرآن'' کی قلمی خوبیوں میں سے ایک ''خوبی'' یہ بھی تھی کہ جہاں کوئی بات، بنائے بھی نہ بن سکے، وہ وہاں بھی بات بنا ڈالنے پر جُت جایا کرتے تھے۔ اہل ایران کے قلوب و اذہان میں ''انتقام جوئی'' کے جذبہ کی وجہ، ان کی ''شاندار حکومت'' اور ''قابلِ فخر تہذیب'' کا خاتمہ قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ وہ سلطنت اور وہ تہذیب، نہ علماء کرام کے قرآن و سنت پر مبنی اسلام کے نقطۂ نظر سے کوئی اچھی حکومت اور مستحسن تہذیب تھی، اور نہ ہی ''مفکر قرآن'' کے قرآنی نقطۂ نظر سے کوئی قابلِ تعریف چیز تھی، کیونکہ (بقول پرویز صاحب) کسی حکومت کے مکروہ اور کسی تہذیب کے قابل نفرت ہونے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ اس میں ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ دارانہ نظام کی سہ گونہ لعنتیں موجود ہوں، اور لاریب، اسلام کے ایران پر حملہ آور ہونے کے وقت، اس میں یہ تینوں لعنتیں موجود تھیں۔ (۱) ساسانی بادشاہوں کی ملوکیت، اپنی رعایا کو قہر و جبر، جور و ستم، اور ظلم و استبداد کا نشانہ بنائے ہوئی تھی۔ (۲) زرتشت کی مذہبی پیشوائیت، ریاستی امور میں وسیع اثر و رسوخ کی حامل تھی۔ سول انتظامیہ اور شاہی کونسلوں میں بھی، ''ملاازم'' کا اقتدار بہت نمایاں تھا۔ اور وہ لوگ، اپنے اقتدار کو دیگر مذاہب کے خلاف آلۂ تعذیب کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔ (۳) مزید برآں، اُس ''نظام ربوبیت'' کا بھی، ایران میں کوئی نام و نشان نہ تھا جسے ''مفکر قرآن'' صاحب انسانیت کے لیے، آیۂ رحمت قرار دیا کرتے تھے۔ بلکہ سرمایہ داری نظام ہی، اپنی ساری خوں آشامیوں

---

❶ شاہکار رسالت ص ۴۴۱۔

کے ساتھ، باشندگانِ ایران پر مسلط تھا۔ پھر ملوکیت اور پریسٹ ہڈ (Priesthood) کا وہ "باہمی سمجھوتہ" بھی، ایرانی سلطنت اور تہذیب کا مستقل حصہ تھا، جس کا تصور مجوسیت سے لے کر، اسے اسلامی تاریخ کا جزو بناتے ہوئے، "مفکرِ قرآن" صاحب، علماء امت کو کوسا کرتے تھے، تاکہ حکومت وقت کے ساتھ پرویز صاحب کے اپنے خفیہ تعلقات اور باطنی سمجھوتوں کی طرف، کسی کی نگاہ نہ ملتفت ہو سکے۔ ملاحظہ فرمائیے، ٹی ڈبلیو آرنلڈ کا یہ اقتباس، جو ایرانی ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کے باہمی گٹھ جوڑ پر روشنی ڈالتا ہے۔

> The reigns of the last representatives of the sasanid dynasty had been marked by terrible anarchy, and the sympathies of the people had been further alienated from their rulers on account of the support, they gave to the persecuting policy of the state-religion of Zoraastrianism. The Zoraastrious priests had acquired an enormous influence in the state, they were well-nigh, all powerful in councils of the king and arrogated to themselves a very large share in the civil administration.☆

ساسانی خاندان کے آخری نمایندوں کی حکومت، خطرناک افراتفری کا لازمہ بن چکی تھی۔ اور مذہب زرتشت کے ریاستی مذہب قرار پا جانے پر، اپنے مخالفین کے خلاف، مذہبی قائدین کی اذیت رسانی کی جس پالیسی کی، حکمراں، حمایت اور اعانت کر رہے تھے، اس کی بناء پر، عامۃ الناس کی ہمدردیاں حکمرانوں سے مزید دور اور بیگانہ ہو چکی تھیں۔ مذہب زرتشت کے یہ علمبردار، ریاست میں ایک ممتاز مقام کے حامل تھے، وہ حکمرانوں کے ناک کے بال اور ذی اقتدار تھے۔ شاہی کونسلوں اور سول انتظامیہ میں، بڑا موثر حصۂ اقتدار رکھنے کے باعث، من مانیاں

☆ The preaching of Islam. By T.W.Arnold. Page 209.

کرنے میں بہت مغرور تھے۔

یہ تھی جبر وقہر پر قائم وہ حکومت، جس کے محو ہو جانے کا غم، (بقول پرویز صاحب) اہل ایران کو لاحق تھا۔ یہ تھی وہ ریاست، جس کا شعار وشیوہ جور وستم تھا۔ اور جس کے مٹ جانے پر (بقول ''مفکر قرآن'') ایرانی رنجیدہ تھے، اور یہ تھی ظلم واستبداد پر مبنی وہ سلطنت، جس کا خاتمہ مفتوحین کے لیے سوہان روح بنا ہوا تھا، اور یہ تھی، ان کی وہ ''قابل فخر وناز تہذیب'' جس کے نمایاں پہلوؤں میں سے، ایک پہلو، غرور وتکبر اور تمرد وسرکشی کی طغیانیاں تھیں، اور دوسرا پہلو، مذہبی پیشوائیت کی خواب آور فریب کاریاں اور تیسرا پہلو، سرمایہ دارانہ نظام کی پرسکوت خوں آشامیاں تھیں۔ اس ستم پیشہ حکومت اور اس سراپا فتنہ وفساد تہذیب کے مٹ جانے کا، ایرانیوں کے دل پر بڑا ''گہرا زخم'' تھا، اور وہ غیظ وغضب میں مبتلا ہو کر، عرب فاتحین سے ''انتقام'' لینا چاہتے تھے، کیونکہ انہوں نے مفتوحین کو اپنے دین سے، اپنے اخلاق سے، اپنے ایماندارانہ رویے سے، اپنے عادلانہ برتاؤ سے، اور فی الجملہ اپنے حسن سلوک سے نواز رکھا تھا۔

> مسلمان، اسلام کا علم لے کر، عرب سے نکلے، تو انہوں نے اپنے حسنِ کردار سے، قوموں کی قوموں اور ملکوں کے ملکوں کو مسلمان بنا دیا، لیکن جب غیر مسلم اقوام مسلمان ہو گئیں، تو مسلمانوں اور نو مسلموں میں کوئی امتیاز باقی نہ رہا۔ (اور ان سب میں بے مثال اخوت اور بے نظیر مساوات پیدا ہو گئی...... قاسمی) ①

لیکن ستیاناس ہو، اُس منحرف ذہنیت کا، جس کے تحت تقلیبِ امور، مسخِ حقائق اور تنکیس واقعات کی روش، ایک غلط کار انسان کی فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہے، اور اپنے مزعومات کی حمایت وپاسداری کے لیے، واقعات کی تحریف اور کتر بیونت، اس کا شیوہ بن جاتا ہے، قلب ودماغ میں اٹھنے والے اوہام ووساوس کو، اٹل حقائق قرار دینا، اس کا وطیرہ بن جاتا ہے۔ عقل کے نام پر خلافِ عقل امور کو، محض لفاظی اور ملمع کاری کے ذریعہ، قابل قبول بنا دینا، اس کا شعارِ حیات بن جاتا ہے۔ اب سیدھی سی بات ہے کہ ایرانی ریاست وتہذیب کا جو بوسیدہ شجر، نہ تو اہل ملک

---

① طلوعِ اسلام، اپریل ۱۹۶۷ء، ص ۱۳۔

کو، حالات کے تپتے ہوئے صحرا میں خوشگوار سایہ ہی فراہم کر رہا تھا، اور نہ ہی اس شجرِ خبیثہ کے پھل ہی، ان کے لئے غذاءِ حیات بن رہے تھے، ایسا درخت، اگر مسلم فاتحین کی آندھی سے زمیں بوس ہو جاتا ہے، تو اس کے پیوند خاک ہو جانے پر کسی کو کیا غم لاحق ہو گا؟ اور کون اس شجر خبیثہ کے غم میں گھلتا ہوا، ”انتقام جوئی“ پر اُتر آئے گا، بالخصوص جب کہ فاتحین، خود جگہ جگہ، کڑوے کسیلے پھل دینے والے اس بس بھرے درخت کی جگہ، کلمہ طیبہ پر مبنی ایسے باغات لگا رہے ہوں، جس کی شاخیں، انہیں، ٹھنڈا سایہ فراہم کریں، جس کا لذیذ و شیریں پھل، اُن کی خوراک ٹھہرے، اور جس کی لکڑی، ان کی ضروریات کی کفیل بنے، اور جس کی خوشبو دار فضائیں، ان کے مشام جاں کو معطر رکھیں۔ اور یہ سب کچھ، فاتحین کے اُس دین، اور اس کی عدل و انصاف پر مبنی تعلیمات کی بدولت تھا جو نبی برحق کی کامل اطاعت میں، انہیں، مرحمت ہوا تھا۔ یہ دین صرف اپنوں ہی کے لئے نہیں، بلکہ غیروں کے لئے بھی باعث رحمت تھا۔ ان مفتوحین کے ساتھ، عرب فاتحین کا جو سلوک تھا، اُسے یکے از منکرینِ حدیث، جناب اسلم جیراجپوری، بایں الفاظ قلمبند کرتے ہیں:

> ان تمام ممالک کا انتظام، اسلامی عدل کے اصول پر قائم کیا گیا، اور ہر قسم کے ظلم و ستم، جو جابر بادشاہوں کے ہاتھوں رعایا پر ہوتے تھے، مٹا دیئے گئے، اور ذمی، امن و امان کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرنے لگے۔ ①

اسلام کی سادہ لیکن انتہائی خوشگوار اور منفعت بخش تعلیم نے ایرانیوں میں جس طرح شرف قبولیت پایا، اسے ٹی، ڈبلیو آرنلڈ کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے۔

> But the Muslim creed was most eagerly welcomed by the townfolk, the industrial classes and the artisans, whose occupation made them impure, according to the Zorastrian creed, ……………………, embraced with eagerness a creed, that made them at once free men

---

① تاریخ الامت، ج ۲، ص ۱۲۹۔

and equal in the brotherhood of faith.[☆]

لیکن مسلمانوں کے عقیدہ و مسلک کو، ان عام شہریوں، صنعتکار اور دستکار طبقوں نے بڑے اشتیاق سے خوش آمدید کہا جن کے آبائی پیشوں نے، انہیں مذہب زرتشت کے باعث آلودہ کر رکھا تھا............... انہوں نے بڑے اشتیاق سے ایک ایسا (اسلامی) عقیدہ اپنایا جس نے انہیں فی الفور آزادی و حریت سے مالا مال کر دیا، اور ایمان کی بنیاد پر، ان میں مساوی درجے کی اخوت پیدا کر دی۔

ان حقائق کی بنیاد پر، کیا یہ بات عقل و دانش کو اپیل کرتی ہے کہ ایرانیوں نے، اپنی استبدادی حکومت، ظالم ریاست اور فاسد تہذیب کے خاتمہ پر، اس قدر گہرا زخم، اپنے دلوں پر پایا ہو کہ وہ ان مسلمانوں سے (اور ان کے اس دین سے) انتقام لینے پر اُتر آئے ہوں، جن کی بدولت، انہیں، ہر نوع کی حریت و آزادی ملی ہو، اور معاشرتی طور پر، ان میں اونچ نیچ کی جگہ، اخوت و مساوات پیدا ہو چکی ہو، اور ان کا پورا سماج، عدل و انصاف کی اساس پر استوار ہو چکا ہو۔ ایسی بات کا تصور، وہی شخص کر سکتا ہے، جو عقل و دانش کا نام لے کر، عقل و دانش ہی کا دشمن ہو، لیکن ہمارے ''مفکر قرآن'' صاحب، چونکہ بہت اچھے کہانی نویس، اور بہترین افسانہ نگار تھے، اس لئے انہوں نے عجمی سازش کے زیر عنوان، جو افسانہ تراشا ہے، اس کی کڑیوں میں ایک کڑی، ایرانیوں کے دل پر وہ ''گہرا زخم'' ہے، جو ان کی ظالمانہ بادشاہت، اور مبنی بر فساد ریاست، اور سراپا فتنہ و فساد تہذیب کے خاتمہ کے نتیجہ میں، انہیں لگا ہے، اور پھر وہ ''جذبۂ انتقام'' ہے، جسے ''مفکر قرآن'' نے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کا محرک بنا ڈالا ہے۔

(۴) ''انتقامِ عجم'' کا شاخسانہ، شہادتِ عمر رضی اللہ عنہ

شہادتِ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا المناک اور روح فرسا واقعہ بیان کرنے کے بعد، ''مفکر قرآن'' صاحب فرماتے ہیں۔

[☆] The Preaching of Islam, By T.W.Arnold. Page 211.

نچوڑ اس داستانِ خونچکاں کا یہ کہ ایران نے، مسلمانوں کے ہاتھوں، جو اس قدر ذلت آمیز شکست کھائی تھی، یہ اس کے انتقام کا پہلا قدم تھا۔ ❶

''مفکر قرآن'' اس حادثۂ فاجعہ کا ذکر، بایں الفاظ کرتے ہیں:

> حادثہ کی تفصیل اتنی ہی ہے کہ ۲۶ ذی الحجہ ۲۳ھ، مؤذن نے فجر کی اذان دی، صحابہ رضی اللہ عنہم مسجد نبوی میں جمع ہو گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، امامت کے لیے کاشانۂ خلافت سے باہر تشریف لائے، دیکھا کہ نمازیوں کی دو ایک صفیں سیدھی نہیں۔ انہیں اشارہ سے سیدھا کیا۔ جماعت کھڑی ہو گئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابھی تکبیر کہی تھی کہ ایک شخص، اچانک اُن کے سامنے آیا، اور نہایت تیز خنجر سے ان پر متعدد وار کیے۔ آپ کی آنتیں کٹ گئیں۔ حادثہ کی تفصیل ختم ہو گئی۔ ❷

اور نیچے حاشیہ میں، قاتل کے متعلق، یہ درج کیا گیا ہے۔

> ایک روایت میں ہے کہ وہ سامنے سے نہیں آیا تھا بلکہ نمازیوں کی صف اول میں کھڑا تھا، اور وہیں سے اس نے حملہ کیا تھا۔ ❸

اور قدرے اور آگے چل کر، وہ، پھر لکھتے ہیں:

> تاریخ نے اس المیہ کی جو تفصیل بیان کی ہے، اس سے ہمارے سامنے، حیرت کے سوا کچھ نہیں آتا۔ اگر اس زمانہ میں اس قسم کا کوئی حادثہ رونما ہوتا تو حکومت ان سارے نمازیوں کو بھی شامل تفتیش کر لیتی جو اس وقت مسجد میں موجود تھے کہ ان کی آنکھوں کے سامنے ایک شخص سربراہِ مملکت پر (چھپ کر، دور کھڑا، بندوق سے نہیں، بلکہ) پاس آ کر خنجر سے حملہ کرتا ہے، اور ان میں کوئی بھی مداخلت کے لیے کچھ نہیں کرتا۔ آخر امام اور نمازیوں کی پہلی صف میں فاصلہ ہی کتنا تھا؟ اگر قاتل سامنے سے آیا تھا، تو مسجد میں نماز کی حالت میں، کسی شخص کا اس طرح

---

❶ شاہکار رسالت، ص ۴۳۲۔

❷ شاہکار رسالت، ص ۴۱۹۔

❷ شاہکار رسالت، ص ۴۱۹۔

سامنے سے آنا، بجائے خویش ایک غیر معمولی اور اندیشہ خیز واقعہ تھا، جس سے انہیں چوکنا ہو جانا چاہیے تھا، اور اگر وہ صف اول میں سے نکل کر آگے بڑھا تھا تو باقی نمازی خاموش کھڑے کیا دیکھتے رہے؟ ❶

اگرچہ ''مفکر قرآن'' صاحب، بڑے ذہین و فطین افسانہ نگار تھے، لیکن اس کے باوجود، وہ اس کہانی کی تراش خراش میں، آج اور اُس دور کی مساجد کی حالت میں فرق کو مستحضر نہ رکھ سکے۔ آج کے دور میں، نماز فجر، جن مساجد میں ادا کی جاتی ہے۔ ان کا ہر گوشہ برقی قمقموں سے بقعۂ نور بنا ہوا ہوتا ہے، اور تاریکی کا نام و نشان تک نہیں ہوتا، حتیٰ کہ چھپکلیاں، کیڑے مکوڑے، مکھیاں اور مچھر تک دکھائی دیتے ہیں، اور پھر دور حاضر میں، اکثر مساجد میں یہ نماز، حالتِ اسفار میں ادا کی جاتی ہے جب کہ روشنی قدرے پھیل چکی ہوتی ہے۔ پھر اگر برقی رو کا تسلسل ٹوٹ بھی جائے تو لمحہ بھر میں Converters اس تعطل کا ازالہ کر دیتے ہیں، لیکن عہد نبوی اور خلافتِ راشدہ میں مساجد کو روشن رکھنے کا یہ اہتمام مفقود تھا۔ اور نماز بھی خاصے اندھیرے میں اول وقت پڑھی جاتی تھی۔ ممکن ہے کسی مٹی کے چراغ کی نہایت مدھم سی روشنی کا اہتمام بھی ہوتا ہو۔ لیکن جہاں بھی یہ واقعہ، کتب تاریخ میں مذکور ہے وہاں روشنی کی بجائے، تاریکی ہی کا ذکر ہے۔ مثلاً امام ابن قتیبہ، الامامة والسیاسة میں، شہادت عمر ؓ کے واقعہ کے ضمن میں بیان فرماتے ہیں:

فَاَقْبَلَ لِصَلٰوةِ الصُّبْحِ وَكَانَ يَغْلِسُ بِهَا .

''وہ نماز فجر کے لیے بڑھے، وہ اسے تاریکی میں ادا کیا کرتے تھے۔ ❷

اسی طرح، صاحب مروج الذهب، یہ لکھتے ہیں:

فلما ازمع بالذی او عدبه اخذ خنجراً فاشتمل علیه ثم قعد لعمر فی زاویة من زوایا المسجد فی الغلس . ❸

---

❶ شاہکار رسالت، ص ۳۲۰۔

❷ الامامة والسیاسة، ص ۲۱۔

❸ مروج الذهب، ج ۲، ص ۳۲۰۔

جب اس (ابولؤ فیروز) نے اپنی دھمکی کو عملاً پورا کرنے کا ارادہ کر لیا، تو ایک خنجر لیا، اور تاریکی میں مسجد کے کونوں میں سے کسی کونے میں جا بیٹھا۔

الغرض، "مفکر قرآن" کا حیرت کا اٹھایا ہوا، یہ سارا گرد و غبار، اس حقیقت کو نظر انداز کر دینے کا نتیجہ ہے کہ اُس دور میں نماز فجر، اول وقت میں، جب کہ تاریکی شب موجود رہتی تھی، پڑھی جاتی تھی۔

اب آیئے، دور حاضر کی کسی عالیشان مسجد کی طرف، جس میں برقی قمقموں نے ہر گوشۂ مسجد کو روشن کر رکھا ہے۔ اذان فجر کے بعد، برقی رو معطل ہو جاتی ہے، مسجد میں روشنی کا کوئی متبادل انتظام موجود نہیں۔ پوری مسجد تاریکی میں ڈوب جاتی ہے۔ لوگ منہ اندھیرے اٹھ کر سوئے مسجد روانہ ہوتے ہیں۔ ان ہی میں سے ایک شخص اپنی چادر میں خنجر کو چھپائے گوشۂ مسجد میں بیٹھ جاتا ہے۔ تکبیر اقامت کے بعد، جونہی امام، تکبیرِ تحریمہ کہہ کر، آغاز نماز کرتا ہے۔ تاریکی میں گھات لگائے ہوئے وہی شخص، امام کے سامنے سے یا صف میں سے نکل کر، حملہ آور ہوتا ہے۔ مسجد میں نہ کبھی ایسا واقعہ ہوا، اور نہ ہی اس کی توقع کی جا سکتی ہے۔ تاریکی میں کئے جانے والے خنجر کے یہ وار، انسانی جسم میں پیوست ہوتے ہیں، لیکن نماز میں مستغرق امام، صبر و برداشت سے کام لیتا ہے۔ ایسی صورت میں جب کہ حملہ آور، تاریکی میں وار کر رہا ہو، اور خلف الامام نمازیوں کے لئے یہ حملہ غیر متوقع بھی ہو اور خنجر کے گوشت میں نفوذ کرنے کی آواز بھی ناقابلِ سماعت ہو تو مدافعت کون اور کیسے کرے؟ بالکل یہی صورتِ حال، شہادت عمر رضی اللہ عنہ کے وقت پیش آئی۔ دوران نماز، آپ رضی اللہ عنہ نے کوئی واویلا نہیں کیا، کوئی شور نہیں مچایا، ہاتھ سے ٹٹول کر اپنے پیچھے والے نمازی کو، اپنی جگہ کھڑا کیا، اور وہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف تھے۔ ممکن ہے کہ آپ کو اس بات کا علم ہی نہ ہو کہ تاریکی میں جس شخص کو وہ مصلیٰ امامت پر کھڑا کر رہے ہیں، وہ واقعی عبدالرحمٰن ہیں یا کوئی اور شخص ہیں۔

اب بتایئے اس صورت میں حیرت و استعجاب کیسا؟ پھر حیرت و استعجاب کے ساتھ، جن سوالات کو، افسانہ نگار نے اٹھایا ہے، وہ صرف اسی صورت میں اٹھائے جا سکتے ہیں جب کہ یہ

حادثہ، دن کی واضح روشنی میں یا برقی قمقموں کی ضیا پاش فضاء میں واقع ہوا ہو۔ حالانکہ وہاں ایسی کوئی صورت حال ہی نہیں تھی۔ مزید برآں، ارادۂ قتل کو اپنے قلب و ذہن میں مخفی رکھتے ہوئے، کسی غیر مسلم کا مسلمانوں کی عبادت گاہ میں آنا قطعی غیر متوقع ہے، بالکل اسی طرح، جس طرح کسی مسلمان کا مندر، گرجا یا کسی آتش کدہ میں جانا غیر متوقع ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم پر عدمِ مدافعت کا الزام

باقی رہا ''مفکر قرآن'' کا بربناءِ حیرت، یہ کہنا کہ...... ''صحابہ میں سے کوئی بھی مدافعت کے لئے کچھ نہیں کرتا۔'' تو یہ پھر اس حقیقت کو نظر انداز کردینے کا نتیجہ ہے کہ (۱) یہ واقعہ، تاریکی میں پیش آیا۔ (۲) غیر متوقع طور پر وقوع پذیر ہوا۔ (۳) ایک ایسے غیر مسلم کے ہاتھوں واقع ہوا، جس کا مسجد میں آنا، کسی کے سان گمان میں بھی نہ تھا۔ (۴) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شور نہیں کیا، اور اپنے پیچھے کھڑے مقتدی کو جائے امامت پر کھڑا کردیا۔ (۵) قاتل نے جو کچھ تاریکی میں کیا، وہ بے آواز ہونے کی بناء پر، لوگوں کے علم میں ہرگز نہ تھا۔ اور جب انہیں فی الواقع علم ہوا، تو قاتل کا تعاقب کیا گیا۔ خود پرویز صاحب لکھتے ہیں۔

> قاتل وار کر کے بھاگا۔ نمازیوں نے اسے پکڑنے کی کوشش کی تو اس نے ان پر بھی وار کیے، یہاں تک بارہ آدمی زخمی ہوگئے۔ جب آخر الامر، اس پر قابو پالیا گیا تو اس نے اسی خنجر سے اپنے آپ کو ہلاک کرلیا۔ اس طرح جرم کی اولین شہادت، ہمیشہ کے لئے مٹ گئی اور باقی صرف خنجر رہ گیا جس کی زبان نے جو کچھ بیان کیا وہ ذرا آگے چل کر سامنے آتا ہے۔ ❶

لہٰذا، یہ شبہ پیدا کرنا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے، اس حادثہ میں، دفاع کا فریضہ انجام نہیں دیا، ایک قطعی بے بنیاد شبہ ہے۔ اس قسم کے شبہات کو بڑے تکلف اور تصنع کے ساتھ، صرف اس لئے اٹھایا جارہا ہے کہ اپنی مزعومہ ''عجمی سازش'' کے ''اثبات'' کی راہ ہموار کی جاسکے۔

---

❶ شاہکار رسالت، ص ۴۱۹۔

(۵) قاتلِ عمر رضی اللہ عنہ...... ابولؤلؤ فیروز

''سازش کا انکشاف'' کے زیرِ عنوان، ''مفکرِ قرآن'' نے، قاتلِ عمر کے تعارف کے ضمن میں، یہ لکھا ہے کہ:

> حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قاتل کا نام، ابولؤلؤ فیروز تھا۔ یہ نصرانی المذہب ایران کا باشندہ تھا۔ نہاوند کی جنگ میں پکڑا گیا، اور والی کوفہ حضرت مغیرہ بن شعبہ کی تحویل میں آ گیا، اور انہی کے ہاں رہنے لگا۔ ①

سوال یہ ہے کہ والی کوفہ، حضرت مغیرہ بن شعبہ کا اس نصرانی المذہب باشندے کے ساتھ کیا تعلق تھا؟ ''مفکرِ قرآن'' جناب پرویز صاحب، اسے واضح نہیں کرنا چاہتے، اپنے ذہنی تحفظات کے پیشِ نظر، وہ اصل حقیقت کو مستور رکھنا چاہتے ہیں۔ آخر یہ کیوں؟ اس کی بھی ایک مصلحت ہے جس کی خاطر، انہوں نے یہ قلمی چابکدستی دکھائی ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباسات، اس تعلق کی وضاحت کرنے کے لیے کافی ہیں۔

۱: مدینہ منورہ میں، فیروز نام کا ایک پارسی غلام تھا، جس کی کنیت، ابولؤلؤ تھی۔ ②

۲: ایک مرتبہ حضرت مغیرہ بن شعبہ کے پارسی غلام، ابولؤلؤ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے شکایت کی کہ...... ③

۳: خرج عمر بن الخطاب يطوف يومًا فی السوق فلقيه ابولؤلؤ غلام المغيرة ابن شعبة وكان نصرانيًا، فقال............ ④

ایک دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ، بازار میں گھومنے کے لیے نکلے، تو مغیرہ بن شعبہ کا عیسائی غلام، ابولؤلؤ فیروز انہیں ملا اور کہا......

۴: فعرض له ابولؤلؤ غلام المغيرة بن شعبه، پس مغیرہ بن شعبہ کا غلام ابولؤلؤ، ان کے درپے ہوا۔ ⑤

---

① شاہکارِ رسالت، ص ۴۲۷۔
② الفاروق، ص ۲۸۱
③ تاریخ اسلام، ج ۱، ص ۱۸۳۔
④ الکامل، ج ۳، ص ۴۹۔
⑤ الامامۃ والسیاسۃ، ج ۱، ص ۲۱۔

۵: مدینہ منورہ میں، مغیرہ بن شعبہ کا ایک نصرانی غلام فیروز نامی، جس کی کنیت، ابولؤلؤ تھی، رہتا تھا۔ ❶

۶: مدینہ منورہ میں مغیرہ بن شعبہ کا ایک ایرانی غلام، ابولؤلؤ" رہتا تھا۔ ❷

۷: مدینہ میں حضرت مغیرہ بن شعبہ کا ایک ایرانی غلام، ابولؤلؤ فیروز نامی تھا۔ اس نے ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے شکایت کی۔ ❸

ان اقتباسات سے یہ واضح ہے کہ ابولؤلؤ فیروز، حضرت مغیرہ بن شعبہ کا غلام تھا، اور وہ اس کے آقا و مالک تھے، اور تکمیل نزول قرآن کے آٹھ نو برس بعد، تقریباً ۲۰ ھ میں، نہاوند کی جنگ میں وہ گرفتار ہو کر، صحابی رسول، حضرت مغیرہ بن شعبہ کی غلامی میں آیا، جو اس بات کا قطعی اور واضح ثبوت ہے کہ غلامی کا رواج، خلافت راشدہ تک میں بھی برقرار رہا ہے۔ لیکن "مفکر قرآن" صاحب، مغرب کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہو کر، چونکہ فاما منا بعد و اما فداء کی غلط تاویل کی بناء پر، غلامی کا دروازہ قطعی بند کر چکے ہیں، اور قرآن کریم میں جن غلاموں کا ذکر ما ملکت ایمانکم وغیرہ کے الفاظ میں آیا ہے، ان کے بارے میں یہ موقف اپنا چکے ہیں کہ وہ

> اُن غلاموں اور لونڈیوں (مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ) سے متعلق ہیں، جو نزول قرآنِ کریم کے وقت، عربوں کے معاشرہ میں موجود تھے۔ انہیں یک لخت آزاد کر دینا نہ مناسب تھا، نہ ممکن۔ ❹

اس لیے وہ یہ نہیں چاہتے کہ خلافت راشدہ میں، کسی کا غلام ہونا ثابت ہو۔ بس یہی وہ مجبوری تھی جس نے "مفکر قرآن" کو اُکسایا کہ ان کی تحریر میں، ابولؤلؤ فیروز کی غلامی و مملوکیت اور حضرت مغیرہ بن شعبہ کی آقائی و مالکیت کا ذکر نہ آنے پائے۔ اس لیے وہ یہ کہنے کی

---

❶ تاریخ اسلام، از اکبر شاہ نجیب آبادی، ص ۳۱۶۔

❷ تاریخ ملت (از قاضی زین العابدین میرٹھی) ج ۲، ص ۱۹۷۔

❸ تاریخ الامت (از اسلم جیراجپوری) ج ۲، ص ۱۴۳۔

❹ تفسیر مطالب الفرقان، ج ۱، ص ۲۶۰۔

بجائے، کہ ''ابولولؤ فیروز، حضرت مغیرہ بن شعبہ کی غلامی میں آ گیا۔'' یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ ''ان کی تحویل میں آ گیا اور انہی کے ہاں رہنے لگ گیا۔'' تا کہ خلافت راشدہ کی تاریخ ''مطابقِ قرآن'' ہو جائے۔

(۶) قتلِ عمر رضی اللہ عنہ کا محرک

ابولولؤ فیروز نے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو قتل کیوں کیا؟ وجہ قتل اور محرکِ قتل کیا امر تھا؟ اس کی وضاحت میں، پرویز صاحب لکھتے ہیں:

> تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ایک دفعہ یہ شخص (ابولولؤ فیروز) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور کہا کہ مغیرہ بن شعبہ، مجھ پر زیادتی کرتے ہیں۔ میں کام زیادہ پیسوں کا کرتا ہوں اور وہ مجھے بہت کم مزدوری دیتے ہیں۔ آپ نے تفصیل معلوم کرنے پر کہا کہ اس کی شکایت بے جا ہے۔ حضرت مغیرہ، اس پر زیادتی نہیں کر رہے ہیں۔ یہ سُن کر وہ ہونے کو تو واپس ہو گیا، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خلاف، انتقام کی آگ کو سینے میں چھپائے رکھا۔ ❶

''مفکر قرآن'' نے یہاں جو کچھ فرمایا ہے، اس کا ماخذ پیش نہیں کیا۔ پھر اصل واقعہ کو بھی بالکل اور ہی رنگ میں پیش کیا ہے، اور اپنے قارئین کو یہ تاثر دیا ہے کہ ابولولؤ فیروز کو، اپنے آقا سے شکایت یہ تھی کہ۔ ''وہ ان سے جتنا کام لیتے ہیں، اتنی مزدوری نہیں دیتے۔'' مجھے تاریخ، حدیث، سیر یا شروح حدیث کی کسی کتاب میں یہ شکایت مرقوم نہیں ملی۔ معلوم نہیں ''مفکر قرآن'' نے کہاں سے اخذ کیا ہے۔ اُس نصرانی غلام کی اصل شکایت کیا تھی؟ وہ مندرجہ ذیل اقتباسات سے ظاہر ہے۔

> (۱)...... مدینہ منورہ میں، مغیرہ بن شعبہ کا ایک نصرانی غلام فیروز نامی، جس کی کنیت ابولولؤ تھی، رہتا تھا۔ اس نے ایک روز بازار میں فاروق اعظم سے شکایت

---

❶ شاہکار رسالت، ص ۴۲۷۔

کی کہ میرا آقا مغیرہ بن شعبہ، مجھ سے زیادہ محصول لیتا ہے، آپ کم کرا دیجیے۔ فاروق اعظم نے اس سے دریافت کیا کہ کس قدر محصول وہ وصول کرتا ہے۔ ابولؤلؤ نے کہا کہ دو درہم (سات آنے) روزانہ۔ فاروق اعظم نے دریافت فرمایا کہ تو کیا کام کرتا ہے؟ اس نے کہا آہنگری، نقاشی اور نجاری۔ آپ نے فرمایا کہ ان صنعتوں کے مقابلہ میں یہ رقم زیادہ نہیں ہے۔ یہ سن کر ابولؤلؤ اپنے دل میں سخت ناراض ہوا۔ ❶

(۲)...... ایک مرتبہ حضرت مغیرہ بن شعبہ کے پارسی غلام، ابولؤلؤ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے شکایت کی کہ اس کے آقا اس سے بہت بھاری ٹیکس وصول کرتے ہیں، اور اسے کم کرنے کی درخواست کی۔ آپ رضی اللہ عنہ نے پوچھا کتنا محصول لیتے ہیں؟ ابولؤلؤ نے کہا دو درہم روزانہ۔ پوچھا تم کیا کرتے ہو؟ اس نے کہا آہن گری، نجاری اور نقاشی۔ فرمایا ان پیشوں کے مقابلہ میں یہ رقم زیادہ نہیں ہے۔ ❷

(۳)...... خرج عمر ابن الخطاب یطوف یومًا فی السوق فلقیه ابولؤلؤةِ غلام المغیرة ابن شعبه وکان نصرانیًا فقال یا امیر المومنین، اعنّی علی المغیرة ابن شعبه فان علی خراجًا کثیرا قال کم خراجك؟ قال درهمان کل یوم۔ قال ایش صناعتك؟ قال نجار نقاش وحداد۔ قال فما اری خراجك کثیرًا علی ما تصنع من الاعمال۔ ❸

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک دن بازار میں گھومنے پھرنے کے لیے نکلے، تو انہیں مغیرہ بن شعبہ کا غلام، ابولؤلؤ ملا جو عیسائی تھا اُس نے کہا اے امیر المومنین! مغیرہ کے خلاف میری مدد فرمایئے، اس نے مجھ پر بہت زیادہ خراج (محصول) عائد کر رکھا

---

❶ تاریخ اسلام، (از اکبر شاہ) ص، ۳۲۱۔ ❷ تاریخ اسلام، ج۱، ص۱۸۳۔

❸ الکامل فی التاریخ، ج۳، ص۴۹۔

> ہے (اسے کم کرادیجئے) آپ نے فرمایا کتنا خراج ہے؟ اس نے کہا دو درہم روزانہ۔ آپ نے پوچھا تم کام کیا کرتے ہو؟ اس نے کہا بڑھئی، لوہار اور نقاشی کا کام کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا تیرے ان صنعتی اعمال کے مقابلہ میں، میں نہیں سمجھتا کہ تم پر خراج زیادہ عائد کیا گیا ہے۔
>
> (۴)...... مغیرہ بن شعبہ کے ایک پارسی غلام، فیروز نامی نے، جس کی کنیت ابولؤلؤ تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اپنے آقا کے بھاری محصول مقرر کرنے کی شکایت کی۔ شکایت بے جا تھی، اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے توجہ نہ کی۔ ❶
>
> (۵)...... مدینہ میں حضرت مغیرہ بن شعبہ کا ایک ایرانی غلام، ابولؤلؤ فیروز تھا، اس نے ایک دن بازار میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے شکایت کی کہ مغیرہ نے مجھ پر محصول زیادہ لگا رکھا ہے، اس کو کم کرادیجئے۔ پوچھا کس قدر ہے؟ اس نے کہا دو درہم روزانہ۔ کہا تم کیا کرتے ہو؟ اس نے جواب دیا نجاری نقاشی اور آہن گری۔ فرمایا ان دستکاریوں کے ساتھ، تو دو درہم روزانہ کچھ زیادہ نہیں۔ وہ اس فیصلہ سے ناراض ہوا۔ ❷

یہ اقتباسات، اس امر کو واضح کردیتے ہیں کہ مغیرہ بن شعبہ کے غلام کی اصل شکایت کیا تھی؟ لیکن ''مفکر قرآن'' نے اپنی تحریفی عادت کے تحت اگر اسے توڑ مروڑ کر پیش نہیں کیا، بلکہ واقعتاً کسی کتاب سے من وعن بیان کیا ہے، تو انہیں اپنے ماخذ کا حوالہ دینا چاہیے تھا۔

محرکِ قتل اور ''مفکر قرآن''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب فیروز کی شکایت کو بے جا قرار دیا، تو اُس نے آپ کو قتل کرنے کی ٹھانی، اور مسجد میں، جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، آپ پر قاتلانہ حملہ کردیا۔ وجہِ قتل اور محرکِ قتل پر، بحث کرتے ہوئے، ''مفکر قرآن'' صاحب فرماتے ہیں:

---

❶ خلفاء راشدین (از حاجی معین الدین ندوی)، ص ۱۱۹۔

❷ تاریخ الامت، ج ۲، ص ۱۴۳۔

> حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے اتنی سی بات، فیروز کو ایسے سنگین اور جرأت آزما جرم کے ارتکاب پر آمادہ کرنے کے لئے جذبۂ محرکہ قرار نہیں پا سکتی۔ مدینہ جیسے دارالخلافہ میں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے سربراہِ مملکت کے لئے، اس سے کہیں زیادہ قوی محرکہ کی ضرورت تھی۔ ①

یہ لکھتے ہوئے، ''مفکر قرآن'' کے ذہن سے یہ بات محو ہو گئی کہ قاتل اگر خدا ترس مسلمان ہوتا، تو یقیناً وہ اتنی سی معمولی بات پر کسی عام آدمی کا بھی خون نہ بہاتا، کجا یہ کہ وہ امیر المومنین کو قتل کر ڈالتا، لیکن ایک کافر اور مال پرست آدمی کو قطعاً اس بات کی پرواہ نہیں ہوتی کہ وہ اپنی خواہشات کی راہ میں حائل شخص کو قتل کرنے کے لئے، قوی یا ضعیف محرکات میں فرق و امتیاز کرتا پھرے۔ اُسے تو بہر حال اور بہر طور اپنی نفسانی خواہشات کی تسکین مطلوب ہوتی ہے، خواہ یہ کیسے ہی ذرائع اور کیسے ہی محرکات کے تحت ہو اور قاتلِ خلیفہ ثانی، بہر حال، ایسا ہی خود غرض، مال پرست، خدا ناشناس اور سفاک شخص تھا جس نے اپنے عمل سے اپنے کردار کا ثبوت فراہم کر دیا۔

تاہم اگر ''مفکر قرآن'' صاحب، اس قتل کے لئے کسی قوی تر محرک کو ضروری سمجھتے ہیں تو ہم عرض کئے دیتے ہیں کہ تاریخ نے اس سے قوی تر محرک کا بھی ذکر کیا ہے۔

> حضرت مغیرہ بن شعبہ نے اس پر دو درہم روزانہ ٹیکس عائد کیا تھا۔ پھر انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اس کے ٹیکس میں اضافہ کر دیں۔ وہ بڑھئی نقاش اور لوہار ہے، اور آپ رضی اللہ عنہ نے اس کے ٹیکس میں اضافہ کر دیا کہ وہ ہر ماہ ایک سو درہم ادا کیا کرے۔ ②

اگرچہ قتل عمر رضی اللہ عنہ کے لئے یہ محرک، اول الذکر محرک سے بڑا ہے، لیکن پھر بھی ہمیں یقین ہے کہ ''مفکر قرآن'' کے لئے یہ محرک بھی قابل تسلیم نہیں ہوگا، کیونکہ مزعومہ ''عجمی سازش'' کے

---

① شاہکار رسالت، ص ۴۲۷ تا ۴۲۸۔

② البدایہ والنہایہ (اردو ترجمہ) ج ۷، ص ۲۷۸۔

"اثبات" کی راہ ہموار کرنے کے لیے، یہ بھی ایک حقیر وصغیر محرک ہے، اس لیے ان کا تقاضا یہ ہے کہ لوگ بلا سوچے سمجھے ان کے بیان کردہ محرک ہی کو تسلیم کر لیں۔

یہاں یہ حقیقت بھی ابھر کر سامنے آ جاتی ہے کہ اسلوبِ استدلال میں مرزائیت اور پرویزیت تشابھت قلوبھم کے مصداق ہیں۔ مرزا غلام احمد قادیانی کو "مسیح موعود" "ثابت" کرنے کے لیے، یہ اندازِ استدلال اپنایا جاتا ہے کہ چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام وفات پا چکے ہیں، اور کوئی دیگر شخص، اس کا مدعی بھی نہیں ہے۔ اس لیے ثابت ہوا کہ مرزا صاحب ہی مسیح موعود ہیں، اور پرویزیت بعینہٖ اسی ڈگر پر چلتے ہوئے یہ کہتی ہے کہ "قتل عمر رضی اللہ عنہ کا جو محرک تاریخ بیان کرتی ہے وہ چونکہ قوی محرک نہیں ہے، اور کسی دوسرے محرک کو بھی ہم مطلوبہ حد تک قوی نہیں پاتے، لہٰذا، ثابت ہوا کہ قوی محرک وہی ہے جسے "عجمی سازش" کے فسانہ میں "مفکر قرآن" صاحب نے بیان کیا ہے۔

بے سروپا روایات کا سہارا

اس کے بعد، "مفکر قرآن" صاحب، اپنی مزعومہ "عجمی سازش" کے "اثبات" کی راہ کو ہموار کرنے کے لیے، بغیر کسی ماخذ کی نشاندہی کیے، لکھتے ہیں:

> اس جذبۂ محرکہ کی نشاندہی اس خنجر نے کر دی جس سے فیروز نے حملہ کے بعد، خودکشی کر لی تھی۔ جب حضرت عبد الرحمٰن بن عوف نے وہ خنجر دیکھا تو کہا کہ میں نے اس خنجر کو کل ہرمزان اور جفینہ کے پاس دیکھا تھا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ تم اس چھری سے کیا کرو گے؟ تو انہوں نے کہا ہم اس سے گوشت کاٹیں گے کیونکہ ہم گوشت کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ یہ دو دھارا خنجر اس مقصد کے لیے بڑا موزوں ہوتا ہے۔ اس کے بعد عبد الرحمٰن بن ابوبکر نے کہا کہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قاتل، ابولؤلؤ کے پاس سے گزرا، جفینہ اور ہرمزان، اس کے پاس تھے اور وہ آپس میں چپکے چپکے باتیں کر رہے تھے۔ میں دفعتاً ان کے پاس پہنچا تو وہ بھاگ گئے، اور ایک خنجر ان کے ہاتھوں سے گر پڑا جس کے دو پھل اور بیچ میں دستہ

> تھا۔ ذرا دیکھوں کہ وہ خنجر کیسا ہے؟ جس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو شہید کیا گیا ہے۔ جب انہوں نے خنجر کو دیکھا تو کہا کہ یہ تو وہی خنجر ہے جس کا میں نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے۔ ❶

ان روایات کی بابت، سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ''مفکر قرآن'' نے ان کا حوالہ و ماخذ قطعاً پیش نہیں کیا۔ میں نے کتب تاریخ میں انہیں تلاش کرنے کی کوشش کی اور مقدور بھر سعی و جہد کے بعد بھی، صدر اول کی مشہور اور متداول کتبِ تاریخ میں، مجھے یہ روایات نہ مل پائیں۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ روایات، پایۂ صحت و ثقاہت سے گری ہوئی ہیں، ورنہ ضرور ان میں مذکور ہوتیں۔ بہر حال، ہفتہ عشرہ بھر کی تلاش و جستجو کے بعد، جب ان روایات کا ایک ماخذ ملا، اور اس کے راویوں پر نظر ڈالی تو انہیں ناقابل احتجاج پایا۔

مزاجِ پرویز کا ایک پہلو

یہاں، ہمارے سامنے مزاجِ پرویز کا ایک خاص پہلو اجاگر ہوتا ہے۔ کتب احادیث ہوں یا کتبِ تاریخ۔ وہ ان میں مذکور ہر اس روایت کو قرآن کے نام کی آڑ میں قبول کر لیتے ہیں جو ان کے پیشِ نظر مقصد کے ساتھ مطابقت رکھتی ہو، خواہ وہ اصولِ روایت و درایت کے اعتبار سے کیسی ہی گری پڑی روایت کیوں نہ ہو۔ اس سلسلہ میں ان کی اصولی دلیل یہ ہوتی ہے کہ

> دین میں سند اور حجت، خدا کی کتاب، قرآن مجید ہے جو اپنی تفسیر آپ کرتا ہے، ہماری کتب روایات و تفسیر میں جو باتیں قرآنی تعلیم کے مطابق ہیں، انہیں صحیح سمجھنا چاہیے، اور جو اس کے خلاف ہیں، انہیں مسترد کر دینا چاہیے۔ ❷

لیکن شہادتِ عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ، قرآن مجید میں نفیاً یا اثباتاً، اشارتاً یا کنایتاً، تلمیحاً، یا استعارتاً، حقیقتاً یا مجازاً، کہیں بھی مذکور نہیں ہے، کیونکہ یہ واقعہ، تکمیل نزولِ قرآن کے برسوں بعد پیش آیا تھا۔ اب شہادت عمر رضی اللہ عنہ کے سلسلہ میں، وہ، جن روایات کو قبول کر رہے ہیں، وہ اس

---

❶ شاہکار رسالت، ص ۳۲۸۔

❷ شاہکار رسالت، ص ۳۴۶۔

بناء پر نہیں کہ وہ مطابق قرآن ہیں، اور جن روایات کو مسترد کر رہے ہیں، وہ بھی اس بناء پر نہیں کہ وہ خلافِ قرآن ہیں، بلکہ یہ سب رد و قبول، صرف اور صرف، اس بنیاد پر ہے کہ اب کون سی روایت، مزعومہ ''عجمی سازش'' کے اثبات میں معاون ہے، اور کون سی مخالف ہے۔ پھر ان روایات کو درج کرتے ہوئے حرام ہے جو کہیں ان کے ماخذ کا حوالہ دیا گیا ہو، لیکن دعویٰ پھر بھی یہی ہے کہ:

> میں نے انتہائی کوشش کی ہے کہ جو کچھ بیان کیا جائے، تاریخ اور روایات کی سند سے بیان کیا جائے۔ ①

ابولؤلؤ فیروز نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو قتل کی دھمکی دی، تو اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک کافر غلام سے یہ شدید وعید سننے کے بعد، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے، نہ اپنی حفاظت کی پروا کی، نہ ہی فیروز کو گرفتار کیا، نہ اسے جیل میں محبوس رکھا، اور نہ ہی اسے شہر بدر کیا اور نہ ہی کم از کم، یہ کیا فیروز پر ایسے جاسوس متعین کر دیئے جاتے، جو ہر آن، اس پر گہری نظر رکھتے، حالانکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس سے کہیں ہلکے پھلکے امور میں، لوگوں پر کڑی نگاہ رکھنے کے عادی تھے۔ دور دراز صوبوں کے گورنروں پر بھی، وہ بڑے حدید البصر واقع ہوئے تھے۔ چلو مان لیا، کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنی جان کی پرواہ نہ تھی۔ لیکن کیا انہوں نے فیروز جیسے کافر غلام کے مدینہ میں برقرار رہنے کو (اپنے لیے نہ سہی) عام مسلمانوں کے حق میں بھی خطرہ نہ سمجھا۔ جو شخص، خلیفۃ المسلمین کو دھمکی دے سکتا تھا، وہ عام مسلمانوں کے لیے کیونکر خطرہ قرار نہیں پا سکتا تھا۔ اس پہلو سے اگر وہ غور کرتے تو احتیاطی تدابیر کو لازم جانتے۔ ایسی تدابیر سے غفلت کو، بیش از بیش، ایک تسامح قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن وہ ''عجمی سازش'' جس کی بُو کو، ساڑھے تیرہ سو سال بعد، سیکریٹریٹ کے ایک شاطر بابو کی حساس ناک نے سونگھا، اُسے اصحابؓ رسولؐ نہ سونگھ سکے۔ اور وہ اپنی، دانائی و زیرکی، فہم و فراست، اور بصیرت و تدبر کی روشنی میں، اسی نتیجہ پر پہنچے کہ شہادت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ سانحہ محض ایک نجی وارداتِ قتل ہی ہے۔

---

① شاہکار رسالت، ص ۲۴۷۔

(۷) ہرمزان کا کردار

مندرجہ بالا بے سروپا روایات میں، ہرمزان اور جفینہ کا ذکر بھی کیا گیا ہے، قرینِ مصلحت ہے کہ ان کے بارے میں بھی کچھ وضاحت ہو جائے تا کہ ''مفکرِ قرآن'' نے شہادتِ عمر رضی اللہ عنہ کی سازش میں جس طرح، انہیں ملوث کرنے کی کوشش کی ہے، اس کی بھی پردہ دری ہو جائے۔

ہرمزان کے بارے میں، پرویز صاحب نے، شاہکارِ رسالت، میں مختلف مقامات پر کچھ نہ کچھ تحریر کیا ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نگارشات کے ذریعہ، ہرمزان کے کردار کو واضح کر دیا جائے، اس مقصد کے پیشِ نظر، مندرجہ ذیل اقتباسات کا مطالعہ کافی ہے۔

> (۱)...... ہرمزان، ایران کا ایک نامور گورنر، جری سپہ سالار، ماہر سیاست دان اور نہایت مکار اور عیار حریف تھا قادسیہ میں شکست کھانے کے بعد، وہ اہواز کی طرف بھاگ گیا، اور وہاں ازسرِنو فوجوں کو منظم کر کے، مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے میدان میں اتر آیا۔ جب وہ وہاں بھی مصیبت میں گھرا، تو مسلمانوں سے صلح کی درخواست کی جسے انہوں نے منظور کر لیا۔ وہ صلح کے بعد وہاں سے نکلا تو معاہدۂ صلح کو پس پشت ڈال کر پھر میدان جنگ میں آ گیا۔ جب وہاں پھر گھر گیا تو دوبارہ معاہدۂ صلح کی درخواست کی جسے بحکم امیر المومنین منظور کر لیا گیا۔ اس نے پھر معاہدہ شکنی کی، اور رامہرمز کے مقام پر پھر میدان کارزار میں اتر آیا۔ وہاں سے شکست کھائی تو بھاگ کر خوزستان کے دارالسلطنت جا پہنچا۔ ایران میں یہ صوبہ بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ مسلمانوں نے اس کا تعاقب کیا اور گرفتار کر لیا۔ اس نے درخواست کی کہ اُسے وہیں قتل کرنے کی بجائے، امیر المومنین کے پاس مدینہ بھیج دیا جائے، چنانچہ اسے انس بن مالک اور احنف بن قیس کی معیت میں مدینہ روانہ کر دیا گیا۔ ①

---

① شاہکارِ رسالت، ص ۱۸۵۔

قبل اس کے کہ ہرمزان کی بابت، جناب پرویز صاحب کی دیگر عبارتیں پیش کی جائیں، یہاں قارئین کرام، ذرا توقف فرما کر، اس امر پر غور فرمائیں کہ پے در پے شکست کھانے اور مسلسل نقضِ عہد کے بعد، جب ہرمزان گرفتار ہوتا ہے تو اسے پورا یقین ہے کہ اس کی سزا، قتل کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔ اس کے قلب و ذہن پر، سزائے قتل سے بچنے کے سوا، کوئی اور سوال سوار نہیں ہے۔ زندگی ہی کے ساتھ، دنیا کے عیش و عشرت، اور اقتدار و اختیار کی قدر و قیمت ہے۔ زندگی نہ ہو تو یہ سب کچھ کس کام کا؟ ہرمزان، اپنی سزائے موت کو ٹالنے کے لیے اور اپنی زندگی کو باقی و برقرار رکھنے کے لیے یہ درخواست کرتا ہے کہ ''اُسے وہیں قتل کرنے کی بجائے، امیر المومنین کے پاس مدینہ بھیج دیا جائے تاکہ فوری سزائے قتل کا خطرہ ٹل جائے۔ پھر جب اس کی درخواست قبول کی جاتی ہے، اور اسے امیر المومنین تک پہنچنے کے لیے مہلت مل جاتی ہے، تو وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، کوئی ایسی تدبیر سوچتا ہے جو اسے مدینہ میں بھی سزائے قتل سے بچا سکے، کیونکہ اُس وقت اس کے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہی تھا کہ وہ خود کو مقتول ہونے سے بچائے، (نہ یہ کہ وہ ایران کی پیوند خاک ہوتی ہوئی استبدادی ملوکیت اور ظالمانہ تہذیب کے خاتمہ کا انتقام لے)۔ وہ ذہین اور جہاں دیدہ تو تھا ہی، اس نے بہرحال جان بچانے کی ایک تدبیر سوچ لی۔ جب اسے مدینہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے روبرو پیش کیا گیا، تو اب:

> ہرمزان وہی گورنر تھا جو پا بجولاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا تھا (اور پانی کا پیالہ زمین پر گرا کر) ایک پرفریب چال سے قتل ہونے سے بچ گیا تھا۔ بعد میں وہ مسلمان ہو کر مدینہ ہی میں قیام پذیر ہو گیا۔ ①

پرویز صاحب، ہرمزان کے اسلام لانے کو مخلصانہ ایمان کی بجائے، منافقانہ ایمان اور پرفریب چال قرار دیتے ہیں، اور انہیں شہادت عمر رضی اللہ عنہ کی سازش میں شریک سمجھتے ہیں، اور مدینہ میں اس کی اقامت پذیری کو، آستین میں سانپ پالنا قرار دیتے ہیں، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بابت یہ لکھتے ہیں کہ

---

① شاہکار رسالت، ص ۳۲۸۔

ظاہر ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہرمزان کو امان نہیں دی تھی۔ اس کے جرائم کو معاف نہیں کر دیا تھا۔ اسے صرف اس امر کی ضمانت دی تھی کہ وہ اطمینان سے پانی پی لے۔ اس نے الفاظ کے ہیر پھیر سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ایک مکارانہ چال چلی۔ اگر دوسرے لوگ اس کے فریب میں آ گئے تھے تو کم از کم حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے تو اس کی توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ اس کے فریب کا پردہ چاک کر دیتے۔ وہ جانتے تھے کہ ہرمزان دھوکہ دے رہا ہے۔ انہوں نے واضح طور پر کہا تھا کہ میں ایک مسلمان کی وجہ سے دھوکہ کھا رہا ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور یوں دھوکہ کھا جائے!!! اگر الفاظ کا ایسا ہی پاس تھا تو ہرمزان کو قید میں رکھنا چاہیے تھا۔ اس کے بعد، جب وہ پیاس سے تنگ آتا تو خود ہی پانی مانگتا اور اسے پی لیتا تو اسے کیفر کردار تک پہنچا دیا جاتا۔ اور اگر وہ اپنی ضد پر اڑا رہتا اور پانی نہ مانگتا تو شدت پیاس سے ہلاک ہو جاتا۔ حیرت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایسا بھی نہ کیا اور ایک زخم خوردہ سانپ کو دودھ دے دے کر پالتے رہے، یعنی نہ صرف یہ کہ اس کی جاں بخشی کر دی بلکہ اسے مدینہ میں رہنے کی اجازت دے دی، اور اس سے مشورے بھی لیتے رہے۔ ❶

اس اقتباس سے یہ واضح ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے خلاف خود سازش کی۔ اپنی موت کا آپ سامان کیا، وہ خود مرنا چاہتے تھے، اور ''ظالم ہرمزان'' بھی، انہیں (بقول پرویز) قتل کرنا چاہتا تھا۔ یا بقول ایک پنجابی شاعر

کجھ شہر دے لوک وی ظالم سَن　　کجھ مینوں مرن دا شوق وی سی

نیز، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور مدینہ میں مقیم دیگر اصحابؓ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنی بھی عقل و فراست اور دانش و دور اندیشی حاصل نہ تھی جتنی کہ ہمارے ''مفکر قرآن'' کو ارزاں ہوئی تھی۔

اس اقتباس کے متصل بعد ہی، وہ تحریر کرتے ہیں۔

---

❶ شاہکار رسالت، ص ۱۸۷۔

آپ کو معلوم ہے کہ اس سانپ کے پالنے کا نتیجہ کیا نکلا؟ خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت، جو اسی ہرمزان کی سازش سے ہوئی۔ ❶

ہرمزان کے متعلق، خود پرویز صاحب، یہ تسلیم کرتے ہیں کہ (۱) وہ مسلمان ہو گیا تھا (۲) حضرت عمر رضی اللہ عنہ، فتح ایران کے سلسلہ میں، اس سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ اب، اس کا قبولِ اسلام، آیا اخلاص اور نیک نیتی پر مبنی تھا؟ یا محض نفاق اور مصلحت پرستی پر؟ مولانا شبلی نعمانی کا یہ اقتباس، جس میں ہرمزان کی مدینہ میں آمد مذکور ہے، اس امر کو واضح کر دیتا ہے کہ

> ہرمزان مسجد میں داخل ہوا تو سینکڑوں تماشائی ساتھ تھے جو اس کے زرق برق لباس کو بار بار دیکھتے تھے اور تعجب کرتے تھے، لوگوں کی آہٹ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آنکھ کھلی تو عجمی شان و شوکت کا مرقع سامنے تھا۔ اوپر سے نیچے تک دیکھا اور حاضرین کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ "یہ دنیائے دوں کی دلفریبیاں ہیں۔" اس کے بعد ہرمزان کی طرف مخاطب ہوئے۔ اس وقت تک مترجم نہیں آیا تھا۔ مغیرہ بن شعبہ کچھ کچھ فارسی سے آشنا تھے، اس لئے انہوں نے ترجمانی کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پہلے وطن پوچھا۔ مغیرہ وطن کی فارسی نہیں جانتے تھے، اس لئے کہا کہ "از کدام ارضی؟" پھر اور باتیں شروع ہوئیں۔ قادسیہ کے بعد ہرمزان نے کئی دفعہ سعد سے صلح کی تھی اور ہمیشہ اقرار سے پھر جاتا تھا۔ شوستر کے معرکے میں دو بڑے مسلمان افسر اس کے ہاتھ سے مارے گئے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان باتوں کا اس قدر رنج تھا کہ انہوں نے ہرمزان کے قتل کا پورا ارادہ کر لیا تھا۔ تاہم اتمام حجت کے طور پر عرض معروض کی اجازت دی۔ اس نے کہا کہ "اے حضرت عمر رضی اللہ عنہ! جب تک خدا ہمارے ساتھ تھا، تم ہمارے غلام تھے۔ اب خدا تمہارے ساتھ ہے اور ہم تمہارے غلام ہیں۔" یہ کہہ کر پینے کا پانی مانگا۔ پانی آیا تو پیالہ ہاتھ میں لے کر درخواست کی کہ "جب تک پانی نہ پی لوں، مارا نہ

---

❶ ایضاً

جاؤں۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منظور کیا۔ اس نے پانی ہاتھ سے رکھ دیا اور کہا کہ میں پانی نہیں پیتا، اس لئے شرط کے موافق تم مجھ کو قتل نہیں کر سکتے۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ، اس مغالطہ پر حیران رہ گئے۔ ہرمزان نے کلمۂ توحید پڑھا اور کہا کہ "میں پہلے ہی اسلام لا چکا تھا، لیکن یہ تدبیر اس لئے کی کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ میں نے تلوار کے ڈر سے اسلام قبول کیا۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نہایت خوش ہوئے، اور خاص مدینہ میں رہنے کی اجازت دی۔ ایک مکان دیا۔ اس کے ساتھ ہی دو ہزار سالانہ مقرر کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، فارس کی مہم میں اکثر اس سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ ❶

تاریخ ابن خلدون میں بھی یہ واقعہ، اسی طرح بیان کیا گیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے کہ ہرمزان نے، اپنی جان بچانے کی تدبیر کے بعد، کس طرح اسلام قبول کیا۔

> "فاروق اعظم، اس مغالطے پر حیران ہو کر بولے "تو جھوٹ کہتا ہے۔" ہرمزان کچھ بولنے نہ پایا تھا کہ انس رضی اللہ عنہ بول اٹھے۔ امیر المومنین! یہ سچ کہتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جب تک پورا حال نہ کہہ لو، کسی قسم کا خوف نہ کرو، اور جب تک پانی نہ پی لو گے کسی خطرے میں نہ ڈالے جاؤ گے۔" انس رضی اللہ عنہ کی اس تقریر کو سن کر حاضرین جلسہ نے بھی ان کے قول کی تائید کی۔ فاروق اعظم نے ہرمزان سے کہا "تو نے مجھے دھوکہ دیا، لیکن میں تجھے دھوکہ نہ دوں گا، مناسب ہے کہ مسلمان ہو جا۔" ہرمزان نے مسکرا کر جواب دیا "میں تو پہلے ہی سے ایمان لا چکا تھا۔" یہ کہہ کر ہرمزان نے کلمۂ توحید پڑھا۔ فاروق اعظم بہت خوش ہوئے۔ مدینہ میں قیام کی اجازت دی، ایک مکان دیا اور ساتھ ہی دو ہزار سالانہ تنخواہ بھی مقرر کر دی۔ مہم فارس میں اکثر اس سے مشورہ لیتے تھے۔ ❷

---

❶ الفاروق، ص ۲۴۵ تا ص ۲۴۶۔

❷ تاریخ ابن خلدون، حصہ اول، ص ۳۵۷۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہرمزان سے آیندہ کی مہمات کے بارے میں مشورہ لینا، فتوح البلدان میں بھی مذکور ہے۔

> عن معقل بن يسار ان عمر ابن الخطاب شاور الهرمزان فسال ما ترى، انبدء باصبهان او باذربيجان؟ فقال الهرمزان: اصبهان الرأس واٰذربيجان الجناحان، فان قطعت الرأس سقط الجناحان والرأس . ❶

> معقل بن یسار سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہرمزان سے مشورہ طلب کرتے ہوئے پوچھا "ہم حملے کا آغاز اصفہان سے کریں یا آذربیجان سے؟ اس نے جواب دیا۔ اصفہان سر ہے اور آذربیجان بازو ہیں۔ سقوطِ سر کے ساتھ بازو بھی گر جاتے ہیں۔

ان حقائق کی روشنی میں یہ واضح ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ہرمزان کے بارے میں کوئی شک اور تردد نہ تھا۔ جان بچانے کے لئے اس نے جو چال چلی تھی، وہ اس سے پہلے ہی اپنے دل میں مسلمان ہو چکا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مسجد میں سادہ فرش پر لیٹے ہوئے، بغیر کسی حاجب اور باڈی گارڈ کے، جب پہلی بار، اُس نے دیکھا تو بے ساختہ پکار اٹھا:

> فينبغي ان يكون نبيا قالوا بل يعمل بعمل الانبياء . ❷

> اس کے شایانِ شان تو یہ ہے کہ وہ نبی ہو۔ لوگوں نے کہا "(نبی تو نہیں) لیکن اس کا طرزِ عمل، نبیوں کا سا ہی ہے۔

ان شواہد و بینات کی موجودگی میں، ہرمزان کے اسلام پر شک کرنا، اور اس کے ایمان کو نفاق سے آلودہ کرنا، حقائق کا منہ چڑانے والی حرکت ہے۔ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تو، ہرمزان کے اخلاص پر کبھی شبہ تک نہ ہوا، بلکہ انہیں اپنے قرب سے نوازے رکھا،

---

❶ فتوح البلدان، للبلاذری، ص ۳۰۰۔

❷ الکامل فی التاریخ، ج ۲، ص ۵۴۸۔

اور مستقبل کی فتوحات میں، اس سے مشورہ طلب کرتے رہے، اور ہمیشہ ہی اُسے مخلص الایمان اور امین المشاورت پایا، اور ایک مرتبہ بھی، انہیں اس کے منافق الایمان اور خائن المشاورت ہونے کا تجربہ نہیں ہوا۔ مزید برآں، ہرمزان، بغیر کسی جبر و اکراہ کے، اپنی قلبی آمادگی کے ساتھ برضا و رغبت ایمان لایا تھا، اور ایمان بھی ایسا کہ عین سکرات موت کے لمحات میں بھی، اس کی زبان، توحید و رسالت کی شہادت دے رہی تھی۔

> فعلاه عبيد الله بالسيف فلما وجد حر السيف قال لا اله الا الله...... ❶
>
> جب عبید اللہ بن عمر بن خطاب تلوار کے ساتھ، اس پر حاوی ہوگیا اور اس نے تلوار کی حدت محسوس کی تو کہا لا الہ الا اللہ......

لیکن چودہ صدیوں کے بعد، ''مفکر قرآن'' کو اس کا ایمان بھی کھوٹا نظر آیا اور اس کا کردار بھی سازشی دکھائی دیا۔ صرف اس لئے کہ وہ، اپنی مزعومہ ''عجمی سازش'' کی عمارت کی بنیاد، ہرمزان کی ہڈیوں پر استوار کرنا چاہتے تھے۔ پھر وہ، اپنی اس موہومہ دسیسہ کاری کے لئے، اس وقت کے جملہ صحابہ کرام کو دبے لفظوں میں، یوں ''شریک سازش'' قرار دیتے ہیں کہ ان سب کے نزدیک:

> اس معاملہ کو نجی اور انفرادی وارداتِ قتل اور ذاتی انتقام تک محدود رکھا گیا، اور حکومت نے اس سازش کی تحقیقات کے سلسلہ میں کوئی اقدام نہ کیا۔ ❷

(۸) جفینہ کا کردار

شہادت عمر رضی اللہ عنہ کی زیر بحث روایات میں، پرویز صاحب نے جس دوسرے فرد کا ذکر کیا ہے، وہ جفینہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

---

❶ الاصابہ، المجلد الثالث، الجزء السادس، ص ۷۷۔

❷ شاہکار رسالت، ص ۳۲۸ تا ۳۲۹۔

> اور جفینہ حیرہ کا رہنے والا عیسائی تھا جو حضرت سعد بن ابی وقاص کا دودھ شریک بھائی تھا۔ وہ اس رشتے سے اُسے مدینہ میں لے آئے تھے، جہاں وہ لوگوں کو پڑھایا لکھایا کرتا تھا۔ ①

اس اقتباس میں جفینہ کے حق میں دو باتوں کو، خود پرویز صاحب نے بھی تسلیم کیا ہے۔ (۱) وہ سعد بن ابی وقاص کا رضاعی بھائی تھا (۲) اور وہ مدینہ میں معلّمانہ حیثیت سے تعلیم دیا کرتا تھا۔ یہ دونوں باتیں (قطعی اور حتمی طور پر نہ سہی، لیکن بہرحال) اس کے مسلمان ہونے کے قرائن ہو سکتے ہیں۔ تاہم اگر وہ اپنی عیسائیت پر برقرار بھی رہا ہو، تب بھی کسی بے سروپا روایت کی بنیاد پر، اسے شریک سازش قرار نہیں دیا جا سکتا، بالخصوص، جب کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی، اور ان کے بعد کے اہل علم نے بھی، اُسے یکے از سازشی افراد قرار نہیں دیا۔ صرف جوش جذبات میں، محض قاتل کی ہم وطنی، اور پھر ہم وطنوں کے مابین باہمی میل ملاقات کے شبہ میں، حضرت عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ہی نے، انہیں متہم قرار دے کر نشانۂ تلوار بنایا۔ مرتکب جرم، خود انہوں نے بھی قرار نہیں دیا۔

باقی رہیں، ہرمزان، جفینہ اور ابولؤلؤ کی باہمی ملاقاتیں، تو یہ ظاہر ہے کہ وہ ایک ہی وطنِ متروک کے باشندے تھے۔ پردیس میں، اپنے ہم وطنوں کی باہم ملاقاتیں، ایسے ہی معمول کی ملاقاتیں تھیں، جیسی آج کے دور میں، امریکہ یا برطانیہ میں مقیم پاکستانیوں میں، ہم وطنیت کے احساس کے تحت ہوا کرتی ہیں۔ ملاقات بجائے خود دلیل سازش نہیں۔ یہ صرف، پرویز صاحب کی زبردست قوتِ شامہ کا کمال ہے کہ چودہ صدیوں قبل ہونے والے واقعات میں، انہوں نے سازش کی بُو پالی۔

(۹) شہادتِ عمر رضی اللہ عنہ اور کعب احبار

''مفکر قرآن'' نے، اپنی من گھڑت ''عجمی سازش'' کے سلسلہ میں، جن لوگوں کو کڑیاں

---

① شاہکار رسالت، ص ۴۲۸۔

بنایا ہے، ان میں سے ایک شخصیت کعب بن ماتع کی بھی ہے، جو بالعموم کعب احبار کے نام سے معروف ہیں۔ ''مفکر قرآن'' نے، اپنی کتاب......شاہکار رسالت...... کے مختلف مقامات پر، کعب کے متعلق، جو کچھ لکھا ہے، اسے ہم تین عنوانات کے تحت سمیٹتے ہوئے، اس کا جائزہ لے رہے ہیں۔

الف: نماز کے لئے استشارِ عمر رضی اللہ عنہ اور مشورہ کعب

ب: کعب احبار کا قبول اسلام۔

ج: شہادتِ عمر میں کعب کا کردار۔

(الف) استشارِ عمر رضی اللہ عنہ اور مشورۂ کعب

فتح بیت المقدس کے احوال میں، خلیفۂ ثانی، جب قابلِ زیارت مقامات پر تشریف لے جاتے ہیں تو اس ضمن میں کعب احبار کا ذکر پرویز صاحب بایں الفاظ کرتے ہیں۔

> ان زیارت گاہوں میں، کعب احبار بھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے گرجا سے باہر آ کر نماز پڑھنے کا ارادہ کیا، تو کعب سے پوچھا کہ نماز کہاں پڑھی جائے؟ ''انہوں نے کہا کہ آپ صخرہ کے پیچھے نماز پڑھیں، سارا بیت المقدس، آپ کے سامنے ہوگا'' آپ نے ان سے کہا ''تم میں ابھی تک یہودیت کا اثر باقی ہے جو یہ مشورہ دے رہے ہو۔ میں نے دیکھا کہ تم نے صخرہ کے قریب آ کر جوتی اتار دی تھی۔'' اور آپ رضی اللہ عنہ نے کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی کہ وہی مسلمانوں کا قبلہ ہے۔ ①

حرام اور قطعی حرام ہے، جو ''مفکر قرآن'' نے کہیں اس کا حوالہ دیا ہو۔ پھر اگر کہیں یہ واقعہ مذکور بھی ہو، تو ''مفکر قرآن'' کے کردارِ کذب گوئی اور خیانت کاری وفریب دہی جیسی صفاتِ رذیلہ کو دیکھتے ہوئے، یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے واقعہ کو صحیح اور اصلی رنگ میں پیش کیا ہوگا۔ ایک طرف تو ''مفکر قرآن'' کی یہ مستقل عادت ہے کہ وہ اکثر و بیشتر بلا حوالہ

---

① شاہکار رسالت، ص ۲۰۲۔

اور بلا ماخذ بات کرتے ہیں، اور دوسری طرف بڑے دھڑلے سے یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ میں نے انتہائی کوشش کی ہے کہ جو کچھ بیان کیا جائے، تاریخ اور روایات کی سند سے بیان کیا جائے۔ ❶

اب ''مفکر قرآن'' کی بلا سند اور بلا ماخذ بیان کردہ اس روایت کو، ان کے اندھے مقلدین نے تو یقیناً آسمانی وحی سمجھ کر قبول کر لیا ہوگا، لیکن مجھے اس کی تلاش میں جو محنت شاق اور زحمت شدیدہ اٹھانا پڑی۔ اور پھر اس جستجو میں میرا جتنا وقت صرف ہوا، وہ صرف میں یا میر اللہ ہی جانتا ہے۔

اس واقعہ کو، امام احمد بن حنبل نے مندرجہ ذیل سند سے بیان کیا ہے:

رواها الامام احمد من طريق حماد بن سلمة عن ابى سنان [عيسىٰ بن سنان القسملى] عن عبيد ابن ادم قال سمعت عمر يقول لكعب: اين ترىٰ ان اصلى؟ قال ان اخذت عنّى صليت خلف الصخره وكانت القدس كلها بين يديك فقال عمرضا هيت اليهودية، لا، ولكن اصلى حيث صَلّٰى رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم. ❷

امام احمد نے اسے ''حماد بن سلمہ عن ابی سنان (عیسیٰ بن سنان القسملی) عن عبید ابن آدم'' کی سند سے بیان کیا ہے کہ میں (عبید بن آدم) نے عمر رضی اللہ عنہ کو کعب سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ ''تیری رائے میں، میں کہاں نماز پڑھوں؟'' اس نے کہا ''اگر آپ میری رائے لیں، تو صخرہ کے پیچھے نماز پڑھیں، یوں پورا بیت المقدس آپ کے سامنے ہوگا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ''تم نے یہودیت سے مشابہت اختیار کی۔ نہیں بلکہ میں تو وہیں نماز پڑھوں گا جہاں حضور اکرم ﷺ نے پڑھی تھی۔

---

❶ شاہکار رسالت، ص ۲۴۴۔

❷ الانوار الکاشفہ، ص ۱۰۷۔

سب سے پہلے تو یہ واقعہ، ''مفکرِ قرآن'' کے اس دروغ و کذب کی تردید کر رہا ہے کہ کعب، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ حکومت میں اسلام لایا تھا، اور وہ بیت المقدس کے سفر میں، یونہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہولیا تھا۔ (جیسا کہ آگے مذکور ہے)۔ یہ قطعی غیر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ، دینِ یہود پر قائم رہتے ہوئے، غیر مسلم کی حیثیت سے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہم سفر رہا ہو۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ پوچھنا کہ ''میں نماز کہاں پڑھوں؟'' خود کعب کے مسلمان ہونے کی دلیل ہے، آخر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کیوں کسی مسلمان سے یہ سوال پوچھنے کی بجائے، کسی یہودی سے ایسا استفسار کرتے؟ اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ کعب کی رائے کو، یہودیت کے ساتھ مشابہت، اُسی وقت قرار دیا جاسکتا ہے جب کہ وہ مسلمان ہوکر، ایسی بات کہے جس سے یہودیت کے ساتھ مشابہت لازم آتی ہو۔ اگر کعب، اُس وقت تک تھا ہی یہودی، تو اسے ضَاهَيْتَ اليهودية کہنا، فضول، بے فائدہ اور لایعنی بات ہے۔

مزید برآں، اس واقعہ سے ''مفکرِ قرآن'' کا یہ جھوٹ بھی عیاں ہو رہا ہے کہ کعب کی رائے سن لینے کے بعد، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی۔ حالانکہ روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ''میں وہاں ہی نماز پڑھوں گا جہاں حضور اکرم ﷺ نے پڑھی۔'' اور ظاہر ہے کہ حضور ﷺ نے یہ نماز سفرِ اسراء میں پڑھی تھی، چونکہ ''مفکرِ قرآن'' اس کے منکر ہیں، اس لیے انہیں تحریفِ واقعہ کی سوجھی۔

یہاں ''مفکرِ قرآن'' چوہدری غلام احمد پرویز کی خوئے قطع و برید اور مسخ و تحریفِ واقعات کا بھی، ایک کرشمہ ملاحظہ فرمائیے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا استفسار، یہ نہیں تھا کہ ''نماز کس طرف منہ کر کے پڑھی جائے؟'' بلکہ یہ تھا کہ ''میں نماز کہاں پڑھوں؟'' پھر کعب احبار کا یہ جواب کہ ''آپ ایسی جگہ نماز پڑھیں، جہاں سے پورا بیت المقدس، نگاہوں کے سامنے رہے، اور وہ جگہ صخرہ کے عقب ہی میں واقع ہے''، ایک معقول جواب ہے جو سوال کے عین مطابق ہے۔ لیکن ''مفکرِ قرآن'' نے تحریفِ واقعہ کرتے ہوئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جواب، جن الفاظ میں بیان کیا ہے، اُن سے متبادر یہ ہوتا ہے کہ استفسارِ عمر رضی اللہ عنہ، ''مقامِ نماز'' کے متعلق نہیں تھا، بلکہ ''جہتِ نماز اور سمتِ قبلہ'' کے متعلق تھا۔ چنانچہ وہ ''نماز کہاں پڑھی جائے؟'' کے سوال کے

بعد، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جوابی طرزِ عمل، بایں الفاظ بیان کرتے ہیں ...... "آپ ﷺ نے کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی کہ وہی مسلمانوں کا قبلہ ہے"...... حالانکہ روایت میں "مقامِ نماز" ہی کا ذکر ہے، اور اسی کے مطابق، فرمانِ عمر رضی اللہ عنہ، ان الفاظ پر مشتمل ہے کہ...... "میں تو نماز، وہیں پڑھوں گا جہاں رسول اللہ ﷺ نے پڑھی تھی"......

حقیقت یہ ہے کہ تحریفِ واقعات، مسخِ حقائق اور تقلیبِ امور میں "مفکرِ قرآن" جناب چودھری غلام احمد پرویز صاحب اُن مستشرقین پر بھی بازی لے گئے ہیں، جنہیں کتر بیونت، مسخ و تحریف اور ہیر پھیر کرنے میں یدطولیٰ حاصل ہے۔

علاوہ ازیں، مجھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ بھی کہیں نظر نہیں آئے جو انہوں نے کعب سے خطاب کرتے ہوئے، یوں کہے کہ "میں نے دیکھا کہ تم نے صخرہ کے قریب آ کر جوتی اتار دی تھی۔" حوالۂ ماخذ پیش نہ کرنے کا یہی تو فائدہ ہے کہ "مفکرِ قرآن"، جہاں، جب، جو چاہیں، بیان کر ڈالیں۔ اُن کے وہ اندھے مقلدین، جنہوں نے اپنا ایمان، ان کی جیب میں ڈال رکھا ہے، اُن کی ہر بے سند اور بلا حوالہ بات کو، وحی الٰہی سمجھ کر قبول کر لیں گے۔ رہے باقی لوگ، تو وہ بھاڑ میں جائیں۔ نہیں مانتے تو نہ مانیں، اُن کی بلا سے۔

"نماز کہاں پڑھوں؟" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کعب رحمہ اللہ سے رائے لی۔ کعب نے بیت المقدس کی فضیلت کے پیشِ نظر (جو قرآن کریم کی نص سے ثابت ہے)، اور اس امر کے پیشِ نظر کہ یہ مسلمان کا قبلۂ اول رہا ہے، یہ مشورہ دیا کہ "اگر آپ رضی اللہ عنہ صخرہ کے پیچھے نماز پڑھیں تو پورا بیت المقدس آپ کے سامنے رہے گا۔" لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے میں ایسا کرنے سے، یہودیت کے ساتھ، مشابہت لازم آتی ہے، جس سے رسول اکرم ﷺ نے خالفوا الیھود کہہ کر منع فرمایا تھا۔ اور یہ بات عین ممکن ہے کہ حدیث الاسلام ہونے کے باعث، کعب رحمہ اللہ، اس فرمانِ نبوی سے ناواقف ہوں، اس لیے، انہوں نے وہ رائے پیش کی جس پر عمل درآمد کو، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہودیت کے ساتھ مشابہت قرار دیا۔ اور وہاں نماز پڑھی جہاں خاتم الانبیاء ﷺ نے پڑھی تھی۔

"مفکرِ قرآن" اپنے استشراقی اساتذہ کی اندھی تقلید میں، محض اپنی طباعی کے زور سے،

اس سادہ سے واقعہ میں سے، وہ کچھ کشید کر ڈالتے ہیں، جو سرے سے اس میں موجود ہی نہیں ہے۔ اور یہ دراصل، دوسروں کی عبارت میں، اپنے ہی خیالات کو پڑھنے کی عادت کا کرشمہ ہے۔ چنانچہ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ کعب ؒ کی رائے پر عمل کرنے کو، جب حضرت عمر ؓ نے یہودیت کے ساتھ مشابہت قرار دیا، تو ''مفکر قرآن'' نے، کعب ؒ کو، اپنی ''عجمی سازش'' کے رتھ میں جوتنے کے لیے، اس کے قلب و دماغ کو دینِ یہودیت کے رنگ میں مصبوغ ظاہر کرنے کے لیے، یہ لکھ مارا کہ

> حضرت عمر ؓ کا یہ قیاس وقتی نہیں تھا۔ یہودیت کے اثرات، اس کے خون کے ذرات تک میں حلول کر چکے تھے۔ ①

حالانکہ کعب ؒ کا مشورہ نیک نیتی پر مبنی تھا۔ اور حضرت عمر ؓ نے اس سے اختلاف صرف اس لیے کیا تھا کہ اس سے یہود کے ساتھ مشابہت پائی جاتی ہے۔

اب آخر میں، زیر بحث، اس روایت کی قدر و قیمت کے بارے میں، یہ بھی جان لیجئے کہ عبید ابن آدم نے ابوسنان کے علاوہ، کسی راوی کا ذکر نہیں کیا، اور اسے (ابوسنان کو) خود امام احمد نے بھی، اور ابن معین نے بھی، ضعیف قرار دیا ہے۔ ان دونوں ماہرین حدیث کے علاوہ، دیگر ماہرین نے بھی، اس کی تضعیف کی ہے، اور امام ابوزرعہ کے نزدیک، وہ نہ صرف ضعیف ہی ہے بلکہ خلط ملط کرنے والا بھی ہے۔

(ب) کعب ؒ کا قبولِ اسلام

کعب احبار نے کب اسلام قبول کیا؟ اس امر میں بھی ''مفکر قرآن'' نے، تاریخی حقائق کو پسِ پشت ڈال کر، اپنا الگ موقف ایجاد کیا ہے۔ وہ، اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> یہ یہودیوں کا بہت بڑا عالم تھا، اور نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں، اکثر حاضر ہوتا رہتا تھا، لیکن اسلام نہیں لایا تھا۔ کہا کرتا تھا کہ میں اسلام کا اعلان اس وقت کروں گا جب میں دیکھ لوں گا کہ اس سے وہ تمام علامات ظہور میں آ گئی ہیں جو دینِ حقہ کے سلسلے میں ہمارے ہاں مذکور ہیں۔ حضرت عمر ؓ کے زمانے میں

---

① شاہکار رسالت، ص ۲۰۴۔

بھی، اُس نے اپنے اسلام کا اعلان نہیں کیا تھا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیت المقدس کے سفر میں ویسے ہی آپ ؓ کے ساتھ ہولیا تھا۔ ①

"مفکر قرآن" نے پھر یہاں اپنا ماخذ بیان نہیں کیا۔ مزید برآں، جو کچھ انہوں نے لکھا ہے، وہ بھی مبنی بر دروغ و کذب ہے۔ "کعب کے خون کے ذرّات میں، یہودیت حلول کر چکی تھی یا نہیں"، اسے اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ لیکن ایک نہیں، متعدد واقعات، اس امر پر شاہدِ عدل ہیں کہ کذب و زور اور دروغ و جھوٹ، خود "مفکر قرآن" کے خون کے ذرات تک میں حلول کر چکے تھے۔ چنانچہ، اقتباسِ زیر بحث میں، انہوں نے پہلا جھوٹ تو یہ لکھا ہے کہ "کعب، نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتا رہتا تھا۔" ممکن ہے کہ زندگی میں کہیں اُس نے حضور کو پایا ہو، لیکن یہ بات کہ وہ اکثر حاضرِ خدمت رسول ﷺ ہوا کرتا تھا، قطعی غلط ہے، بلکہ اس کے خلاف، یہ امر ثابت ہے کہ وہ زیارتِ نبی ﷺ سے محروم رہا ہے۔

> عن سعيد ابن عمرو الانصارى، عن ابيه، قال صحبت كعب الاحبار، وهو يريد الاسلام، فلم ار رجلا لم ير رسول الله ﷺ اوصف لرسول الله ﷺ. ②

> حضرت سعید بن عمرو انصاری، اپنے باپ (عمرو) سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا "میں کعب ؒ کے ساتھ رہا، وہ اسلام قبول کرنا چاہتے تھے۔ میں نے کسی آدمی کو نہیں دیکھا، جو زیارتِ نبی ؑ سے مشرف نہ ہونے کے باوجود، کعب ؒ سے زیادہ، حضور اکرم ﷺ کے اوصاف بیان کرنے والا ہو۔

یہ اقتباس، اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ کعب ؒ، زیارتِ رسول ﷺ سے محروم رہا۔ لیکن بہرحال، وہ اسلام سے متاثر ہو چکا تھا، اور یہ چاہتا تھا کہ اسلام قبول کر لے۔

---

① شاہکار رسالت، ص ۲۰۳ تا ۲۰۴۔

② الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ، ج ۴، ص ۵۷۹۔

"مفکر قرآن" کا دوسرا جھوٹ یہ ہے کہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بھی اسلام نہیں لایا۔ وہ کب مسلمان ہوا؟ اس کے متعلق "مفکر قرآن" لکھتے ہیں:

> حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کا معاملہ طے ہوگیا، تو اُس نے اپنے اسلام کا اعلان کردیا۔ ❶

حالانکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ وہ عہد فاروقی ہی میں مسلمان ہو چکا تھا۔ عہد عثمانی میں و فوت ہوا تھا۔

(۱)...... کعب اسلم فی خلافة عمر "کعب، خلافتِ فاروقی میں مسلمان ہوا" ❷

(۲)...... مات ابو الدرداء وکعب لسنتین بقیتا من خلافة عثمان، وقال الواقدی وجماعة سنة اثنتین وثلاثین۔ وقال ابن عبد البر: انه مات بعد صفین والاصح عند اصحاب الحدیث انه مات فی خلافة عثمان ❸

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دو سال باقی تھے جب حضرت ابوالدرداء اور کعب فوت ہوئے۔ جبکہ واقدی اور ایک جماعت کا قول ہے کہ وہ ۳۲ھ میں فوت ہوئے۔ اور ابن عبدالبر یہ فرماتے ہیں کہ ان کی موت، جنگ صفین کے بعد واقع ہوئی ہے، لیکن علماءِ حدیث کے نزدیک صحیح ترین بات یہی ہے کہ وہ خلافتِ عثمانی میں فوت ہوئے۔

تیسری بات یہ کہ "مفکر قرآن" کا کعب کی طرف منسوب یہ قول کہ "میں اسلام کا اعلان، اس وقت کروں گا، جب میں دیکھ لوں گا کہ وہ تمام علامات ظہور میں آ گئی ہیں، جو دین

---

❶ شاہکار رسالت، ص ۲۰۴۔

❷ الاصابہ فی تمییز الصحابۃ، ج ۳، ص ۵۷۹۔

❸ الاصابہ فی تمییز الصحابۃ، ج ۴، ص ۶۲۲۔

حقہ کے سلسلہ میں ہمارے ہاں مذکور ہیں۔" بھی بے اصل اور بے بنیاد ہے، جو مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ پھر مزید ستم یہ کہ "مفکر قرآن" نے اس کا کوئی ماخذ بھی بیان نہیں کیا۔ کعب احبار نے خود اپنے تاخیرِ اسلام کی جو وجہ بیان کی ہے، وہ مندرجہ ذیل اقتباس سے ظاہر ہے:

> قال العباس لكعب ما منعك ان تسلم فى عهد رسول الله ﷺ وابى بكر؟ قال: ان ابى كان كتب لى كتابا من التوراة، فقال: اعمل بهذا، وختم على سائر كتبه، واخذ علىّ بحق الوالد الاافض الختم عنها فلما رءيت ظهور الاسلام، قلت لعل ابى غيب عنى علما، ففتحتها فاذا صفة محمد وامته، فجئت الآن مسلما. ❶

> حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کعب سے کہا "عہد نبوی اور عہد صدیقی میں تیرے قبولِ اسلام میں کیا چیز مانع ہوئی؟" کعب نے جواب دیا "میرے والد نے توراۃ میں سے میرے لیے ایک تحریر لکھی تھی۔ اور مجھے حکم دیا کہ میں اس پر عمل کروں۔ اور اپنی جملہ کتابوں پر مہر لگا دی، اور والد ہونے کی حیثیت سے، اپنا حق جتلاتے ہوئے، انہوں نے مجھ سے یہ عہد لیا کہ میں مہروں کو نہیں توڑوں گا۔ پھر جب میں نے غلبۂ اسلام کو دیکھا، تو میں نے کہا کہ شاید میرے والد نے کوئی علمی حقیقت مجھ سے چھپائے رکھی ہے۔ تب میں نے مہروں کو توڑا، تو مجھے حضرت محمد ﷺ اور ان کی امت کی صفات معلوم ہوئیں، تب میں مسلمان ہونے کے لیے (مدینہ) آ گیا۔

اسی حقیقت کی وضاحت کے لیے، اب ایک اردو کتاب کا یہ اقتباس بھی ملاحظہ فرمائیے:

> کعب رحمہ اللہ مشہور تابعی ہیں۔ قبولِ اسلام سے پہلے جید علماء میں شمار کیے جاتے تھے۔ عہد رسالت میں موجود تھے لیکن صحیح روایت کے مطابق، اس عہد بابرکت

---

❶ الاصابہ فی تمییز الصحابۃ، ج ۵، ص ۳۸۲۔

میں وہ اسلام کی سعادت حاصل نہ کر سکے، اور ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے، کہ اسی زمانہ میں مشرف باسلام ہو گئے تھے۔ کعب رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ علی رضی اللہ عنہ، جب یمن آئے تو ان کی خدمت میں حاضر ہو کر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف پوچھے۔ انہوں نے بتائے تو میں مسکرایا۔ علی رضی اللہ عنہ نے مسکرانے کا سبب پوچھا۔ میں نے کہا "ہمارے یہاں (نبی آخر الزماں کے) جو علامات بتائے گئے ہیں، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق آتے ہیں، اسی لیے مجھے ہنسی آ گئی۔ اس سوال و جواب کے بعد میں مسلمان ہو گیا، اور لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے لگا لیکن قیام یمن ہی میں رہا۔ عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں ہجرت کر کے مدینہ گیا۔ کاش، مَیں نے اس سے پہلے ہجرت کی ہوتی۔ ایک روایت یہ ہے کہ وہ حضرت ابوبکر کے زمانہ میں اسلام لائے، لیکن یہ دونوں روایتیں کمزور ہیں۔ اس باب میں صحیح ترین روایت وہ ہے جو طبقات ابن سعد میں، کعب کے حلیف حضرت عباس سے مروی ہے، جس سے خود کعب کی زبان سے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں، ان کا اسلام لانا ثابت ہوتا ہے۔ سعید بن مسیب کا بیان ہے کہ حضرت عباس نے کعب کے اسلام لانے کے بعد، ان سے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں قبولِ اسلام میں کیا چیز مانع تھی کہ عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اسلام لائے۔ جواب دیا کہ میرے والد نے مجھ کو توراۃ سے ایک تحریر نقل کر کے دی تھی اور ہدایت کی تھی کہ اس پر عمل کرنا، دوسرے اپنی تمام مذہبی کتابوں پر مہر لگا کر، مجھ سے حق ابوت کا واسطہ دلا کر، وعدہ لیا تھا کہ اس کو نہ توڑنا، تو میں نے اس کو نہیں توڑا۔ اور والد، جو تحریر دے گئے تھے، اس کے مطابق عمل کرتا رہا۔

جب اسلام کی اشاعت اور اس کا غلبہ ہونے لگا اور کسی کا خوف باقی نہیں رہ گیا تو اس وقت میں نے دل میں خیال کیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ والد نے مجھ سے کچھ علم چھپایا ہے مجھے ان کتابوں کو کھول کر دیکھنا چاہیے۔ چنانچہ میں نے مہر کو توڑ کر

> کتابیں پڑھیں تو مجھ کو نظر آیا کہ ان میں محمد (ﷺ) اور ان کی امت کے اوصاف لکھے ہیں۔ اس وقت مجھ پر اصل حقیقت روشن ہوئی۔ اور آ کر مسلمان ہو گیا۔ قبولِ اسلام کے بعد وہ آنحضرت ﷺ کے چچا، حضرت عباس کے حلیف بن گئے۔ ❶

منکرین حدیث کے ہاں، کعب رحمہ اللہ کے علمی مقام کے بارے میں بھی نہایت غلط باتیں متداول رہتی ہیں، اس لئے مناسب یہ ہے کہ کعب رحمہ اللہ کا علمی فضل و کمال بھی واضح کر دیا جائے۔

> کعب یہود کے بڑے ممتاز اور نامور علماء میں سے تھے۔ یہودی مذہب کے متعلق ان کی معلومات نہایت وسیع تھیں۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ وہ علم کا ظرف اور اہل کتاب کے علماءِ کبار میں سے تھے۔ امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ان کے وفور علم اور توثیق پر سب کا اتفاق ہے۔ وہ اپنی وسعت علم کی وجہ سے کعب احبار اور کعب الحبر کہے جاتے تھے۔ ان کے مناقب بکثرت ہیں، اور ان کے اقوال و حکم بہت مشہور ہیں۔ اکابر صحابہ، ان کی وسعتِ نظر کے معترف تھے۔ ابو درداء انصاری کا حمص میں بڑا ساتھ رہا تھا۔ فرماتے تھے کہ ابن حمیریہ کے پاس بڑا علم ہے۔ امیر معاویہ کہتے تھے کہ ابو درداء حکماء میں ہیں اور کعب، علماء میں ہیں۔ ان کے پاس سمندر جیسا اتھاہ علم تھا۔
>
> چونکہ ایک مذہب کے وہ ایک بڑے عالم تھے، اس لئے اسلامی علوم کے ساتھ بھی انہیں خاص مناسبت ہو گئی تھی۔ مدینہ میں صحابہ سے انہوں نے کتاب و سنت کی تعلیم حاصل کی تھی اور صحابہ نے ان سے اہل کتاب کے علوم سیکھے تھے۔
>
> کتاب و سنت میں، انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت صہیب رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے استفادہ کیا تھا، اور اسرائیلیات میں صحابہ میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ،

---

❶ سیر الصحابہ، ج ۶، حصہ دوازدہم (بارھواں)، ص ۲۶۳ تا ص ۲۶۴۔

معاویہ رضی اللہ عنہ ، ابن عباس رضی اللہ عنہ ، اور تابعین میں مالک بن ابی عامر، اصحی، عطاء بن ابی رباح، عبد اللہ بن رباح انصاری، عبد اللہ بن حمزہ سلولی، ابو رافع سائغ، عبد الرحمٰن بن شعیب اور ایک کثیر جماعت، ان سے فیض یاب ہوئی تھی۔ ❶

(ج) شہادتِ عمر رضی اللہ عنہ اور کعب رحمہ اللہ

جیسا کہ میری کتاب ”جناب غلام احمد پرویز، اپنے الفاظ کے آئینے میں“ سے واضح ہے، ”مفکر قرآن“ کو اپنی سخن سازی کے لیے، کذب بیانی اور دروغ بافی سے شمہ بھر بھی دریغ نہ تھا۔ چنانچہ اپنی من گھڑت ”عجمی سازش“ کے خاکہ میں رنگ بھرنے کے لیے، وہ کعب رحمہ اللہ احبار کو بھی، شہادتِ عمر رضی اللہ عنہ کی سازش میں ملوث قرار دیتے ہوئے، رقمطراز ہیں:

> بعض قرائن اس کے غماز ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کی سازش میں، اس کا بھی ہاتھ تھا، یا کم از کم اسے اس کا علم تھا۔ تفصیل، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت سے متعلق باب میں آئے گی۔ ❷

چنانچہ شہادت عمر رضی اللہ عنہ کے باب میں، کعب کے حوالہ سے جو تفصیل دی گئی ہے، وہ درج ذیل ہے:

> سب سے اہم روایت، آپ رضی اللہ عنہ کی زوجہ مطہرہ (حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی) حضرت ام کلثوم کی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دن دیکھا کہ وہ رو رہی ہیں۔ دریافت کرنے پر انہوں نے کہا ”کعب کہتا ہے کہ آپ جہنم کے دروازے پر کھڑے ہیں۔“ آپ نے کعب کو بلا کر پوچھا تو اس نے کہا ”امیر المومنین! جلد بازی سے کام نہ لیجیے، ذی الحجہ ختم نہیں ہوگا کہ آپ جنت میں داخل ہو جائیں گے۔“ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ”کبھی کہتے ہو جہنم میں اور کبھی کہتے ہو جنت میں۔“ اس نے کہا ”یا امیر المومنین! ہم کتاب خداوندی میں آپ کو جہنم کے دروازے

---

❶ سیر الصحابۃ، ج ۶، حصہ بارھواں، ص ۲۶۴ تا ص ۲۶۵۔

❷ شاہکار رسالت، حاشیہ بر صفحہ ۲۰۴۔

پر پاتے ہیں کہ آپ لوگوں کو اس میں گرنے نہ دیں۔ پھر جب آپ کی وفات ہو جائے گی تو لوگ قیامت تک جہنم میں دھڑا دھڑ گرتے جائیں گے۔" اس کے بعد، وہ، ایک دن پھر حاضر ہوا، اور کہا کہ "اے امیر المؤمنین! آپ وصیت کر دیجئے، آپ تین دن کے اندر اندر وفات پا جائیں گے۔" آپ رضی اللہ عنہ نے کہا "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" اس نے کہا "ہم کتاب خداوندی میں ایسا لکھا پاتے ہیں۔" آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا "کیا توراۃ میں عمر ابن خطاب کا ذکر ہے؟" اس نے کہا "آپ کے نام سے تو آپ کا ذکر نہیں، لیکن اس میں جو قرائن و شواہد اور حلیہ و شمائل مذکور ہیں، وہ بالکل آپ کے سے ہیں، اس سے میں نے یہ اندازہ لگایا ہے۔" اس کے بعد، وہ، دو دن متواتر، آپ کے پاس آتا رہا ہے، اور جس صبح کو، یہ ناشدنی واقعہ ہونا تھا، اس سے پہلی رات کو آ کر، واضح الفاظ میں کہا کہ اب وقت باقی نہیں رہا۔

کعب احبار، مدینہ میں یہودیوں کا بہت بڑا عالم تھا۔ اسلام تو نہیں لایا تھا، لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں اکثر حاضر ہوتا رہتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بھی، عام مسلمانوں اور امیر المؤمنین سے خلا ملا رکھتا تھا۔ جب حضرت عثمان کی خلافت کا فیصلہ ہو گیا، تو پھر اسلام لے آیا۔ ❶

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ تاریخ و سیر اور حدیث کے علماء و ماہرین نے، اس حکایت کو کھوٹے سکوں میں شمار کیا ہے، اور دوسری بات یہ ہے کہ خود پرویز صاحب نے بھی، شرح صدر کے ساتھ، صحیح قرار دینے میں تامل کیا ہے، اور یہ لکھا ہے کہ

جو روایات، اوپر درج کی گئی ہیں، ہم ان کی بالکلیہ صداقت کو تسلیم نہیں کرتے۔ ❷

یہاں "مفکر قرآن" کی یہ "نیمے دروں، نیمے بروں" حالت ملاحظہ فرمائیے، سچ اور

---

❶ شاہکار رسالت ص ۴۳۰ تا ۴۳۱۔

❷ شاہکار رسالت، ص ۴۳۱۔

جھوٹ کے درمیان جھولا جھول رہے ہیں نہ "ان کی بالکلیہ صداقت کو تسلیم کرتے ہیں" اور نہ ہی رد کرتے ہیں۔ صداقت میں شکوک وشبہات کے باوجود، وہ، ان روایات کو محض، اس لئے قبول کرنے پر مجبور ہیں کہ "عجمی سازش" کی جس حویلی کو وہ تعمیر کرنا چاہتے ہیں، اس کے لئے اینٹ گارا، انہی روایات سے فراہم ہوتا ہے۔

بہرحال، قدرے آگے چل کر، کعب کی بابت لکھتے ہیں۔

> کعب احبار نے اسے، جو کتاب خداوندی کا نقاب اوڑھایا ہے، تو اس میں بھی غالباً اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تک وارننگ بھی پہنچ جائے، اور وہ اس کے لئے (Committed) بھی قرار نہ پائے۔ ❶

سوال یہ ہے کہ "مفکر قرآن" کو کس آسمان سے یہ وحی نازل ہوئی ہے کہ کعب نے شہادتِ عمر رضی اللہ عنہ کی جو پیشگی خبر دی ہے، اُسے اُس نے "کتاب خداوندی کا نقاب اوڑھایا ہے۔" یہ دراصل "مفکر قرآن" کی اپنی مزاج شناسیٔ خدا ہے، جسے چھپانے کے لئے، وہ دوسروں کے خلاف، مزاج شناس رسول، ہونے کا پروپیگنڈا کرنے پر مجبور تھے۔

اب جب کہ خود کعب، یہ بیان کر رہا ہے کہ "میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے متعلق، سابقہ آسمانی کتاب میں اشارات پائے ہیں، تو اس کے مقابلہ میں "مفکر قرآن" کے پاس، (ظن وتخمین اور قیاس وگمان کے سوا) وہ کون سے ٹھوس علمی شواہد اور قوی براہین ہیں، جن کے بل بوتے پر، وہ کعب کو کاذب قرار دے رہے ہیں، حالانکہ کعب کی پوری اسلامی زندگی، اُن اکاذیب و اباطیل سے قطعی پاک ہے، جن سے، خود "مفکر قرآن" کا دامنِ حیات، ہمیشہ، داغ داغ رہا ہے۔

کیا یہ ممکن نہیں کہ صحائفِ اہل کتاب میں، اس امر کا اشارہ موجود ہو، جس کی خبر کعب نے دی ہے؟ کیا تورات وانجیل میں صحابہ کرام کا مذکور ہونا، قرآنی الفاظ (مثلھم فی التوراۃ ومثلھم فی الانجیل) میں مذکور نہیں؟

---

❶ شاہکار رسالت، ص ۴۳۱۔

ہاں البتہ، اس امر میں استنکار کا پہلو ضرور پایا جاتا ہے کہ کتب سابقہ میں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے وقتِ وفات کا تقرر و تعین بھی موجود ہو۔ یہ بات عقلاً بعید ہے، اور خود کعب رحمہ اللہ نے بھی، کتب سابقہ میں، نہ تو وقتِ موت کے تعین کا ذکر کیا ہے، اور نہ ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نام کا مذکور فی التوراۃ ہونا، بیان کیا ہے۔ اس نے خلیفہ ثانی کے بعض قرائن و شواہد اور حلیہ و شمائل ہی کا ذکر کیا ہے۔ وقتِ موت کے تعین میں، کتب سابقہ کے اشارات کے علاوہ، ممکن ہے کہ کعب نے موجود الوقت بعض آثار و علائم سے مدد لی ہو۔ مثلاً یہ بات تو صحابہ کرام میں مشہور تھی ہی، کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے، شہادت کی پیشینگوئی فرمائی تھی، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اپنے آخری حج سے واپسی پر، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مندرجہ ذیل دُعاء کا بھی، کعب کو علم ہو۔

اللھم کبرت سنی و ضعفت قوّتی و انتشرت رعیتی فاقبضنی الیك غیر مضیع ولا مفرط . ❶

اور علاوہ ازیں، وہ اکثر یہ دعاء بھی کیا کرتے تھے کہ

اللھم ارزقنی شھادۃ فی سبیلك وموتا فی بلد رسولك . ❷

اے اللہ! مجھے اپنے رسول کے شہر میں موت اور اپنی راہ میں شہادت عطا فرما۔

اور سب سے بڑھ کر، یہ امر کہ خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے مندرجہ ذیل خواب کو، اس کی تعبیر کے ساتھ، برسرِ عام، اپنے آخری خطبۂ جمعہ میں، بیان فرمایا تھا۔

رءیت دیکًا نقرنی ثلاث نقرات ولا اراہ الا حضور اجلی . ❸

میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک مرغ نے مجھے تین ٹھونگیں ماری ہیں، اور میں یہی سمجھتا ہوں کہ میری اجل قریب آ گئی ہے۔

ان جملہ آثار کو، ممکن ہے کہ کعب جیسے حاذق حازی (قیافہ شناس) نے کتب سابقہ کے اشارات سے ملا کر، وہ نتیجہ اخذ کیا ہو، جو خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے خواب سے اخذ کیا تھا۔

---

❶ الریاض النضرہ فی مناقب العشرہ، جلد٢، ص٩٠ .

❷ بخاری، کتاب فضائل صحابہ، باب ١٢، حدیث: ١٨٩٠ .

❸ فتح الباری، جلد ٧، ص٦٣ .

کیا کعب رحمہ اللہ، شریکِ سازش تھا؟

اب رہا ''مفکرِ قرآن'' کا یہ فرمان کہ...... ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کی سازش میں، کعب احبار کا بھی ہاتھ تھا، یا کم از کم اسے اس کا علم تھا''...... تو یہ بات بھی صحیح نہیں ہے، یہ محض ''مفکرِ قرآن'' کی کعب رحمہ اللہ کے بارے، انتہائی بدگمانی کا نتیجہ ہے۔ ''مفکرِ قرآن'' اپنی جس عقل و دانش کی کسوٹی پر، تاریخ کے واقعات اور احادیث کے حقائق کو پرکھنے کے عادی تھے، اُسی کسوٹی پر، اگر اس واقعہ کی بھی جانچ پڑتال کرتے، تو اسے بھی بعید از عقل و صحت پاتے۔

شہادتِ عمر رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے کعب احبار کی دو ہی حالتیں ممکن ہیں۔ اس سازش کا علم ہوجانے کے بعد......(۱)...... یا تو وہ قتلِ عمر رضی اللہ عنہ کے متمنی ہوتے۔ یا......(۲)...... اُن کی زندگی کے خواہاں ہوتے۔

اگر وہ، واقعی قتلِ عمر رضی اللہ عنہ کے متمنی ہوتے، تو وہ مکمل سکوت اختیار کرتے، اور اس سازش کو اس قدر اور اس طرح مخفی رکھنے کی کوشش کرتے کہ جب تک حضرت عمر رضی اللہ عنہ شہید نہ ہوجاتے، اس کی بھنک بھی کسی کو نہ پڑنے دیتے، کیونکہ پردۂ اخفاء سے نکلنے پر یہ سازش ناکام ہوجاتی، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ شہید ہونے سے نہ صرف یہ کہ بچ جاتے، بلکہ ابولؤلؤ فیروز کی گرفتاری بھی عمل میں آجاتی، اور کعب احبار خود بھی سازش میں ملوث قرار پاتے۔ اور نتیجتاً ایک طرف، کعب رحمہ اللہ کی قتلِ عمر رضی اللہ عنہ کی تمنا بھی بر نہ آتی، اور دوسری طرف، وُہ خود بھی یکے از سازشی افراد ہونے کی بناء پر، مصیبت میں پھنس جاتے۔

لیکن اگر وہ، قتلِ عمر رضی اللہ عنہ کے خواہش مند نہ ہوتے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی درازیٔ حیات کے خواہاں ہوتے، تو وہ، اشاروں کنایوں میں، اس کا ذکر کرنے کی بجائے، برسرِ عام اس سازش کو بے نقاب کر ڈالتے، اور سازشی افراد کی دسیسہ کاری کا بھانڈا عین چوراہے میں پھوڑ دیتے، اور ایک ایک سازشی کو، اس کا نام لے لے کر ظاہر کرتے، تاکہ انہیں کیفرِ کردار تک پہنچایا جاتا۔ ایسا کرنے سے جملہ اصحابِ رسول کے ہاں بھی، اور اہلِ مدینہ کی نظروں میں بھی،

بلکہ پوری امت مسلمہ کے ہر فرد کی نگاہ میں بھی، وہ، انتہائی قدر و منزلت کے مستحق قرار پاتے، اور خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ، ذاتی طور پر، کعب رحمہ اللہ کے زیر بار احسان ہوتے۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ کعب رحمہ اللہ احبار نے، موجود الوقت قرائن و آثار کو، جب، تورات کی پیشینگوئی کے ساتھ ملا کر دیکھا، تو وہ اسی نتیجہ پر پہنچے جس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ، اپنے خواب کی رو سے پہنچے تھے۔ اس سادہ سے واقعہ میں، نہ تو کعب کے کسی سازش میں ملوث ہونے کا شائبہ تک پایا جاتا ہے، اور نہ ہی، صراحتاً اور اشارتاً بات کرنے میں، کوئی مصلحت پائی جاتی ہے۔ انہوں نے جو کچھ موجود الوقت قرائن و آثار، اور کتب سابقہ کی روشنی میں محسوس کیا، اسے، نیک نیتی کے ساتھ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے بیان کر دیا۔ اور پھر نہ صرف، خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے، بلکہ جملہ صحابہ کرام کے جم غفیر میں سے کسی ایک شخص نے بھی، کعب کو متہم بالمؤامرۃ نہیں کیا۔ تیرہ چودہ صدیوں بعد، یہ اتہام بازی، ”مفکر قرآن“ کے حصہ میں آئی، تاکہ وہ، ایک طرف، اپنا نامۂ اعمال سیاہ کرتے رہیں، اور دوسری طرف، ”عجمی سازش“ کا شور مچا کر، اپنی اُس سازش کو مخفی رکھنے کے لئے پردہ فراہم کر سکیں، جو مغرب کی فاسد معاشرت کے اجزاء کے ساتھ، اشتراکیت کی پیوندکاری کے نتیجہ میں، خود انہوں نے کر رکھی تھی۔

(۱۰) مسلمانوں کی قوت کا راز

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کی قوت کا راز، دراصل یہ حقیقت ہے کہ خود خدائے قدوس ان کی پشت پر موجود ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کی یہ وہ معیت ہے جس پر بھرپور اعتقاد و ایمان ہی امت مسلمہ کی قوت کا سرچشمہ ہے۔ اسی قوتِ اعتقادیہ کی بناء پر، صدیوں سے جمی ہوئی حکومتوں کو، اُن بدوؤں نے پیوند خاک کر ڈالا، جو مویشی چرانے کا سلیقہ بھی نہیں رکھتے تھے۔ ہرمزان، جو اپنی جان بچانے کی تدبیر کرنے سے پہلے ہی قلباً اور اعتقاداً گرویدۂ اسلام ہو چکا تھا، اور مدینہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر پہلی نظر ڈالتے ہی، ان کے پیغمبر اور نبی ہونے کا گمان کر بیٹھا تھا، خود اپنی شکست کی وجہ (بقول پرویز صاحب) ان الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ:

> اس سے پہلے جب جنگ ہوتی تھی تو ایک طرف ایرانی ہوتے تھے اور دوسری طرف عرب۔ ایرانیوں کے لیے تنہا عربوں کو شکست دینا کچھ بھی مشکل نہیں تھا، لیکن اب جو جنگ ہوتی ہے تو اس میں ایک طرف تنہا ایرانی ہوتے ہیں اور دوسری طرف عرب اور ان کے ساتھ ان کا خدا۔ ہمارے لیے ان دو قوتوں کا مقابلہ کرنا ممکن نہیں، اس لیے ہم شکست کھا جاتے ہیں۔ ❶

اس سے ذرا آگے چل کر، پرویز صاحب رقمطراز ہیں:

> ایرانی اس حقیقت کو پا گئے تھے کہ جب تک خدا مومنین کے ساتھ ہے، ہم (یا دنیا کی کوئی طاقت) اُن پر غالب نہیں آ سکتی۔ لہٰذا، ان سے اپنی شکستوں کا انتقام لینے کے لیے ضروری ہے کہ اُن سے اُن کے خدا کا ساتھ چھڑا دیا جائے۔ ❷

یہاں پھر، اپنی مزعومہ "عجمی سازش" کی زیب داستاں کے لیے، جس انتقام کا ذکر کیا گیا ہے، وہ تاریخی لحاظ سے ایک بے بنیاد چیز ہے۔ "عجمی سازش" کے افسانہ میں رنگ آمیزی کے لیے، انتقامِ ھزیمت کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ لیکن ایسا کرنے والوں نے یہ کبھی سوچا تک نہیں کہ جب ایران کی ظالمانہ حکومت مٹ گئی، ان کی تہذیب فاسد کا خاتمہ ہو گیا۔ یزدجرد، محروم تاج و تخت ہو کر، ذلت و خواری میں محض اپنی جان بچانے کے لیے در بدر کی ٹھوکریں کھاتے ہوئے لقمۂ اجل بن گیا۔ اس کے اعوان و انصار، اس سے الگ ہو کر، مسلمان ہو گئے، اور ایرانی رعایا، ملوکیت کے شکنجہ ہائے ظلم و ستم سے نجات پا چکی، اور اسلام نے ان لوگوں کو، جو اپنے آبائی مذہب (آتش پرستی) پر قائم رہ گئے تھے، پوری پوری مذہبی آزادی عطا فرمائی، اور جن لوگوں نے دین اسلام کو قبول کیا، خلیفۃ المسلمین نے، انہیں، عزت و احترام، اخوت و مساوات اور عدل و انصاف کی آغوش میں جگہ دی، اور مفتوحین میں سے ہر فرد کو، وہ، سکون و طمانیت، آرام و راحت، آسودگی و خوشحالی اور حریت و آزادی میسر آئی، جس کا

---

❶ شاہکار رسالت، ص ۴۳۹۔

❷ شاہکار رسالت، ص ۴۴۰۔

ایرانی بادشاہت میں انہیں خواب تک نہ آیا تھا، تو پھر وہ سرزمین ایران کا کون سا فرزند تھا جس کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ پھر حیرت ہے کہ اس ''آتشِ انتقام'' کا سراغ، نہ صحابہ کو ملا، نہ تابعین و تبع تابعین کو، اور نہ ان کے بعد کسی عالم کو، حتیٰ کہ فتنۂ انکار حدیث کے ہندوستانی علمبرداروں میں سے بھی، نہ مولوی عبداللہ چکڑالوی کو اس کا سراغ مل پایا، نہ مولوی حشمت علی کو، نہ خواجہ احمد دین کو، نہ رفیع الدین عثمانی اور مولوی چراغ دین کو، پونے چودہ سو سال بعد، یکا یک، اس کا انکشاف یا تو وابستگانِ طلوع اسلام کو ہوا، یا پھر اس کی وحی کاشانۂ جیراجپوری میں اتری۔

(۱۱) ''خدا کا ساتھ چھڑا دو'' کا مفہوم

اس کے بعد، ''مفکر قرآن'' صاحب، اپنے افسانے کی ''انتقام جوئی'' کی کڑی کے بعد، اگلی کڑی یہ بیان کرتے ہیں کہ ایرانیوں نے کوشش کی کہ مسلمانوں سے ان کے خدا کا ساتھ، چھڑا دیا جائے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

> اور اس کے بعد، ہماری ساری تاریخ، اس اجمال کی تفصیل ہے کہ ہم سے ہمارا خدا کس طرح چھڑایا گیا۔ ظاہر ہے کہ خدا مسلمانوں کا ساتھ دینے کے لئے، بہ نفس نفیس، زمین پر نہیں آ جاتا تھا۔ خدا کے ساتھ ہونے کا مطلب یہ تھا کہ اس زمانے میں مسلمان، خدا کی کتاب کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ، ان کے دین کا تمکن اور خدا کے اس وعدے کا عملی ثبوت تھا کہ ﴿وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا﴾ (۴:۱۴۱) خدا کافروں کو مومنوں پر کبھی غلبہ حاصل نہیں ہونے دے گا۔ ان کے ہاتھوں شکست خوردہ قوموں کی سازش یہ تھی کہ ان سے خدا کی کتاب کو الگ کر دیا جائے۔ ①

یہاں ''مفکر قرآن'' نے، اپنے ''ذہنی تحفظات'' کے پیشِ نظر، ''خدا کے ساتھ'' ہونے کا

---

① شاہکار رسالت ص ۴۴۰۔

مطلب "عمل بالقرآن" کی صورت میں، جو بیان کیا ہے، وہ، اطاعتِ نبی ﷺ اور اتباعِ رسول سے گریزاں ذہنیت کا کرشمہ ہے۔ وہ شخص، جس کا دعویٰ یہ ہے کہ اس کی ساری عمر، قرآن کریم کو سمجھنے اور سمجھانے میں گزری ہے، اور جس کے متعلق، اس کے اندھے مقلدین، یہ کہتے نہیں تھکتے کہ

(۱)...... بابا جی کہ جو غلام احمد پرویز تھے، کی زندگی کے وہ حاصلِ حیات پچاس سال، جو انہوں نے قرآن کو خالصتاً قرآن کے ذریعے سمجھنے اور سمجھانے میں بسر کیئے، روشنی کی ایک واضح لکیر کی صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ❶

(۲)...... وہ، تہجد کی تنہائیوں میں قرآن کے گرد آلود غلاف کو صاف کرتا تھا۔ ❷

(۳)...... ان اٹھارہ سالوں میں صرف ایک ہی آواز تھی، جو رجعت الی القرآن کا نعرہ بلند کرتی رہی۔ قرآن کے ابدی حقائق کو ابھار اور نکھار کر منظر عام پر لاتی رہی۔ یہ مفکر قرآن محترم پرویز صاحب کی شخصیت تھی۔ ❸

چھوڑیئے اس بات کو، کہ "مفکر قرآن" نے، قرآن کو خالصتاً قرآن کے ذریعہ سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی یا تہذیب مغرب کے ذریعہ۔ اسے بھی نظر انداز کیجئے کہ تہجد کی تنہائیوں میں، اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرنا، اور نم دیدہ وگریاں کیفیت کے ساتھ سر بسجود ہونا، وقت کا صحیح مصرف ہے یا کسی گرد وغبار سے اٹے ہوئے غلاف کو صاف کرنا۔ اور اس امر سے بھی چشم پوشی کیجئے کہ قرآن کے ابدی حقائق کو ابھار اور نکھار کر منظر عام پر، وہ لاتے رہے ہیں، یا یورپ کی فاسد معاشرت کے طور طریقوں اور اشتراکیت کے معاشی نظام کو، وہ اُس قرآن کے جعلی پرمٹ پر درآمد کرتے رہے ہیں، جس کے بغیر ہی، آج کی بگڑی ہوئی دنیا، اسے اپنائے ہوئے ہے۔ فی الحال، تو اس بات پر غور فرمائیے کہ جس نے ساری عمر، قرآن کی تعلیمات کی

---

❶ طلوع اسلام، اپریل ۱۹۸۵ء، ص ۳۳۔

❷ طلوع اسلام، اپریل ۱۹۸۵ء، ص ۲۳۔

❸ طلوع اسلام، جون ۱۹۶۵ء، ص ۳۹۔

تحقیق و ریسرچ میں بسر کر ڈالی، اُسے یہ تک نہ معلوم ہوسکا کہ خدا کی معیت کا جو معنیٰ، خود انہوں نے بیان کیا ہے، اس سے کہیں زیادہ محکم، قوی اور اقرب الی الصحت معنیٰ یہ ہے کہ نبی کا ساتھ دیا جائے۔ کیونکہ خدا کی معیت پانے کا ذریعہ بلکہ واحد ذریعہ، نبی کا ساتھ دینا ہے، جس طرح رسول کی اطاعت ہی، اللہ کی اطاعت کا واحد ذریعہ ہے، بالکل اُسی طرح، نبی کی معیت ہی، اللہ کی معیت کا ذریعہ ہے، اور یہ نبی کا ساتھ دینے کا عمل، دامے، درمے، قدمے، سخنے، ہر طرح اور ہر پہلو سے اور ہر معاملہ میں مقصود ہے، اس لئے کہ قرآن بھی ہمیں نبی کے توسط سے ملا ہے (نہ کہ نبیؐ، قرآن کے توسط سے)۔ ''مفکر قرآن'' نے یہ معنیٰ تعلیم بلا معلم، پیغام بلا پیغمبر، اور قرآن بغیر محمد ﷺ کے نامعقول مسلک کی پاسداری میں بیان کئے ہیں۔ قرآن نے صراحت کے ساتھ، بغیر کسی ابہام و اشتباہ کے، اللہ کی معیت کو، ہر دور میں، اس شرط کے ساتھ مشروط کیا ہے کہ لوگ، رسولوں کی تعظیم و نصرت کے ذریعہ، ان کا ساتھ دیں۔

﴿قَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مَعَكُمْ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَیْتُمُ الزَّكٰوةَ وَ اٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ وَ عَزَّرْتُمُوْهُمْ﴾ (المائدہ: ۱۲)

''اللہ نے فرمایا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں بشرطیکہ تم نماز ادا کرتے رہو، زکوٰۃ دیتے رہو، اور میرے رسول پر ایمان لا کر، ان کی تعظیم و نصرت کرتے رہو۔''

عامۃ الناس تو رہے ایک طرف، انبیاء و رسل تک سے، اللہ تعالیٰ نے بطور خاص، حضور اکرم ﷺ کی حمایت و نصرت کا وعدہ لیا۔

﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَاۤ اٰتَیْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ﴾ (آل عمران: ۸۱)

''اور جب اللہ نے نبیوں سے وعدہ لیا کہ جب میں تمہیں کتاب اور حکمت دوں، اور پھر تمہارے ہاں ایک رسول آئے جو اس چیز کی تصدیق کرے جو تمہارے پاس ہو، تو تمہیں لازماً اس پر ایمان لانا ہوگا اور اس کی مدد کرنا ہوگی۔''

یاد رکھئے کہ پہلی آیت میں عزرتموھم کا جو لفظ استعمال ہوا ہے، اس کی وضاحت دوسری آیت میں لَتَنْصُرُنَّهٗ کے لفظ نے کر دی تاہم تعزیر کے مفہوم میں نصرت اور احترام و تعظیم دونوں مفہوم پائے جاتے ہیں۔ خود پرویز صاحب نے اس کا اعتراف کیا ہے۔

التعزیر، نصرت کو بھی کہتے ہیں جس میں تعظیم کا جذبہ شامل ہو۔ ❶

''معیت خدا'' کا معنی، اتباعِ رسول مع تعظیم نبی

اور پھر ''خدا کی معیت'' کا معنی، فی الواقع، ''ایمان بالرسول کے بعد، تعظیم و نصرت کے ذریعہ، اس کا ساتھ دینا'' اُن بیسیوں آیات سے ثابت ہے، جن میں لوگوں کی دنیا میں نجات (اور اخروی فوز و فلاح) کو، رسول کی معیت کا نتیجہ و ثمرہ قرار دیا گیا ہے۔ چند آیات بطور امثلہ، ملاحظہ فرمائیے:

﴿فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَیْنٰهُ وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗ فِی الْفُلْكِ﴾ (الاعرف: ٦٤)

''پس قوم نے نوح کو جھٹلایا، ہم نے انہیں اور اُن کو جو ان کے ساتھ تھے نجات دی۔''

﴿فَاَنْجَیْنٰهُ وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا﴾ (الاعراف: ٧٢)

''پس ہم نے اُسے اور جو ان کے ساتھ تھے، سب کو اپنی رحمت سے نجات دی۔''

﴿فَنَجَّیْنٰهُ وَ مَنْ مَّعَهٗ فِی الْفُلْكِ﴾ (یونس: ٧٣)

''پس ہم نے، اسے اور جو ان کے ساتھ تھے، سب کو نجات دی۔''

﴿نَجَّیْنَا هُوْدًا وَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ﴾ (هود: ٥٨)

''ہم نے ہود کو، اور جو ایمان والے ان کے ساتھ تھے، سب کو نجات دی۔''

﴿نَجَّیْنَا صٰلِحًا وَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ﴾ (هود: ٦٦)

''ہم نے صالح اور ان کے صاحب ایمان ساتھیوں کو نجات دی۔''

﴿نَجَّیْنَا شُعَیْبًا وَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ﴾ (هود: ٩٤)

''ہم نے شعیب اور ان کے اہل ایمان ساتھیوں کو نجات دی۔''

---

❶ لغات القرآن ۱۱۵۶۔

﴿وَاَنْجَيْنَا مُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗۤ اَجْمَعِيْنَ﴾ (الشعراء: ٦٥)

"ہم نے موسیٰ علیہ السلام، اور جو ان کے ساتھ تھے، سب کو نجات دی۔"

قرآن کریم میں، جن مومنین کے ساتھ، اللہ کا ہونا مذکور ہے (مثلاً بقول پرویز صاحب)

﴿اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (الانفال: ١٩)

"خدا مومنین کے ساتھ ہے۔" اور

﴿وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (الروم: ٤٧)

"مومنین کی مدد کرنا ہم پر واجب ہے۔"

تو ان سے، فی الواقع، وہی مومن مراد ہیں، جو نبی کا ساتھ دینے والے ہیں، جیسا کہ درج ذیل آیات سے واضح ہے:

﴿وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ﴾ (البقرہ: ٢١٤)

"وہ خوب ڈگمگائے گئے یہاں تک کہ رسول اور اس کے مومن ساتھی پکار اٹھے۔"

﴿وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ﴾ (آل عمران: ١٤٦)

"اور کتنے ہی نبی تھے جن کے ساتھ ہو کر بکثرت اللہ والوں نے جنگ کی۔"

﴿لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ﴾ (التوبہ: ٨٨)

"لیکن رسول، اور صاحب ایمان، اُس کے ساتھی......"

﴿وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ﴾ (هود: ٤٠)

"اور نہ ایمان لائے، ان کے ساتھ والے، مگر چند ایک۔"

﴿وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰۤى اَمْرٍ جَامِعٍ﴾ (النور: ٦٢)

"اور جب وہ، رسول کے ساتھ، کسی اجتماعی کام پر ہوں، تو......"

﴿اقْتُلُوْۤا اَبْنَآءَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ﴾ (المومن: ٢٥)

"موسیٰ علیہ السلام کے جو صاحب ایمان ساتھی ہیں، ان کے بیٹوں کو قتل کر ڈالو۔"

﴿وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ﴾ (الفتح: ٢٩)

''محمد ﷺ کے جو ساتھی ہیں، وہ کفار پر نہایت گراں اور سخت ہیں۔''

﴿اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ﴾ (الممتحنه : ٤)

''ابراہیم علیہ السلام اور اس کے صاحب ایمان ساتھیوں میں نمونہ پیروی (ہے)۔''

﴿يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ﴾ (التحريم : ٨)

''جس روز، اللہ، اپنے نبی اور اس کے صاحب ایمان ساتھیوں کو رسوا نہیں کرے گا۔''

اور آخرت میں فوز و فلاح سے محروم، اور وبال آخرت سے دو چار شخص، ''نبی کا ساتھ'' نہ دینے پر یوں کف افسوس ملے گا:

﴿يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا﴾ (الفرقان : ٢٧)

ان آیات کو دیکھ کر، ہر شخص، خود محسوس کر سکتا ہے کہ ''خدا کی معیت'' کا معنی، وہ ہے، جسے ''مفکر قرآن'' نے پیش کیا ہے، یا وہ، جسے خود قرآن یا مُنَزِّلِ قرآن نے بیان کیا ہے۔

''مفکر قرآن'' کا یہی وہ معنی ہے، جسے ''عجمی سازش'' کی تعمیر کے لیے، بطور اساسی اینٹ کے استعمال کیا گیا ہے، اور پھر یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ...... ''ہماری تاریخ اس اجمال کی تفصیل ہے کہ ہم سے ہمارا خدا کس طرح چھڑایا گیا، (یعنی) شکست خوردہ قوموں کی سازش یہ تھی کہ ان سے خدا کی کتاب کو الگ کر دیا جائے۔'' چنانچہ اس ''عجمی سازش'' کی بنیاد میں یہ ٹیڑھی اینٹ رکھ دینے کے بعد، اس پر جو کچھ بھی ایستادہ کیا گیا ہے، وہ تا ثریا ٹیڑھا ہے۔

اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے، یہ واضح کر دینا ضروری ہے، کہ ''مفکر قرآن'' کا یہ کہنا کہ...... ''خدا کے ساتھ ہونے کا مطلب یہ تھا کہ اس زمانے میں، مسلمان، خدا کی کتاب کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے......'' ایک ادھوری حقیقت کا بیان ہے، جب کہ پوری حقیقت یہ ہے کہ اُس دور میں فرزندان اسلام، کتاب کی اُس تشریح کے مطابق، زندگی بسر کیا کرتے تھے، جسے علماء کرام حدیث یا سنتِ رسول کہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بعد میں آنے والے واضعین حدیث نے کتاب اللہ کی پیغمبرانہ تبیین و توضیح سے، لوگوں کو دور رکھنے کے لیے، وضع حدیث کا

فتنہ اٹھایا۔ ورنہ اگر قرآن کریم کی نبوی وضاحت کی کوئی قدر و قیمت ہی نہ ہوتی، تو احادیث گھڑنے کا فتنہ کھڑا ہی نہ ہوتا۔ آخر جعل ساز، وہی کرنسی تو جعلی بنایا کرتے ہیں جس کا بازار میں چلن ہو، جو کرنسی بازار میں چلتی ہی نہ ہو، تو کون بے وقوف، اس کو جعلی بنانے کی زحمت اٹھائے گا۔

(۱۲) کیا ایرانیوں کا ایمان کھوٹا تھا؟

''عجمی سازش'' کی تکمیل کے سلسلہ میں، جس چیز کو اگلی کڑی کے طور پر اختیار کیا گیا ہے، وہ یہ تصور ہے کہ ایران کے ارباب فکر و دانش کی غالب اکثریت، اپنے ''جذبۂ انتقام'' کی تسکین کے لئے، مصلحت کا لبادہ اوڑھ کر، منافقانہ ایمان لائی تھی، تا کہ مسلمانوں میں شامل ہو کر، اسلام اور اہل ایمان کو زک پہنچائیں۔ چنانچہ ''مفکر قرآن'' صاحب لکھتے ہیں

> فتوحات کے بعد، یہ لوگ جوق در جوق اسلام لاتے چلے گئے۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے (نہ کہنا چاہتے ہیں) کہ یہ (سب اسلام لانے والے) دل میں کوئی کھوٹ لے کر مسلمان ہوئے تھے، لیکن (جیسا کہ آگے چل کر نظر آئے گا) ان کے ارباب فکر و دانش کا بیشتر حصہ، اسی مقصد کے لئے زمرۂ امت مسلمہ میں داخل ہوا تھا کہ اس طرح وہ مسلمانوں میں اپنے قدیم مجوسی نظریات و معتقدات، آسانی سے پھیلا سکیں۔ ①

مغالطہ آفرینی، چکمہ بازی اور فریب دہی، ہمارے ''مفکر قرآن'' کے ''جہاد قرآنی'' کی مستقل شمشیریں ہیں۔ یہاں ایرانی ارباب فکر و نظر کے، سب سے پہلے تو دو گروہ بتائے گئے ہیں۔ ایک اقلیتی اور دوسرا اکثریتی گروہ۔ اول الذکر گروہ کے اسلام پر جو ''قرآنی فتویٰ'' رسید کیا گیا ہے، اس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ یہاں صرف یہ دیکھئے کہ اکثریت پر مشتمل جو گروہ ایمان لایا، اس کے متعلق ''مفکر قرآن'' کی عقلِ عیار (جسے وہ اپنی ''قرآنی بصیرت'' کہا

---

① شاہکار رسالت، ص ۴۴۲۔

کرتے تھے) یہ کہتی ہے کہ ان کے اسلام لانے کا مقصد، ''مسلمانوں میں مجوسی معتقدات و نظریات کو پھیلانا'' تھا۔ ہم جناب پرویز صاحب کی زبان سے ''مزاج شناس رسول'' کا تذکرہ سنتے ہیں، لیکن ان کی اپنی یہ تحریر، ہمارے سامنے، ''مزاج شناسِ خدا'' کا سراپا پیش کر ڈالتی ہے۔ اور اپنے اسی سراپا کو مخفی رکھنے کے لیے، شاید، ان کا حربہ تھا کہ ''مزاج شناس رسول'' کا لیبل، مولانا مودودی پر چسپاں کر کے، اتنا شدید پراپیگنڈہ کیا جائے، کہ لوگوں کی توجہ ''مزاج شناس خدا'' کی طرف مبذول نہ ہو سکے۔

''مفکر قرآن'' نے یہاں مغالطہ آفرینی سے کام لیا ہے۔ یقیناً یہ لوگ جس رفتار سے دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے، اُس رفتار سے ان کی ذہنی تطہیر، قلبی پاکیزگی، عملی اصلاح اور اخلاقی تربیت نہ کی جا سکی۔ اور اس بناء پر سابقہ جاہلیت کے بھی کچھ نہ کچھ اثرات ان میں موجود رہے۔ ان اثرات کو دیکھتے ہوئے، یہ کہنا کہ ان کے اسلام لانے کے مقصد ہی میں یہ بدنیتی شامل تھی کہ وہ مسلمانوں میں ''مجوسی نظریات و معتقدات کو پھیلانا'' چاہتے تھے۔ حقیقتِ حال کی قطعی غلط تعبیر ہے۔ پھر جاہلیت کے ایسے اثرات، صرف ایران ہی کے نومسلموں میں نہیں پائے جاتے تھے، بلکہ ہر ملک اور ہر علاقے کے لوگوں میں موجود تھے۔ حتیٰ کہ فتح مکہ کے بعد، خود عرب میں بسنے والے قبائل کے جو لوگ، جوق در جوق دائرۂ اسلام میں آئے، ان کی بھی یہی کیفیت تھی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ''مفکر قرآن'' کی طرف سے، عائد ہونے والے بدنیتی کے فتویٰ کو صرف ایرانی ارباب فکر و نظر تک ہی محدود رکھا گیا ہے؟ اس کی وجہ آخر اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ ''مفکر قرآن'' کو چونکہ، اپنی مزعومہ ''عجمی سازش'' کی ساخت کے لیے اینٹ روڑے اور گارا یہیں سے سمیٹنا تھا، اس لیے سارا زور، ایران اور ایرانیوں پر ہی ڈالا گیا ہے۔

اب رہا ایرانی ارباب فکر و نظر کا اقلیتی گروہ، تو اس کے افراد کے قبولِ اسلام کے متعلق ''مزاج شناسِ خدا'' کا فتویٰ یہ ہے کہ:

> ان میں سے جو لوگ نیک نیتی سے بھی مسلمان ہوئے تھے، ان کا اسلام لانا ایسا

> ہی تھا جیسا ان بدوی قبائل کا اسلام لانا، جن کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا۔ یہ بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا ان سے کہو کہ تم ایمان نہیں لائے۔ وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا تمہیں یہ کہنا چاہیے کہ تم نے اسلامی حکومت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے۔ اس لیے کہ وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (۱۴/۴۹) ایمان تمہارے دلوں کی گہرائیوں میں (ابھی تک۔ قاسمی) نہیں اُترا۔ ❶

سمجھ میں نہیں آتا کہ ’’مفکر قرآن‘‘ کے اس فتویٰ کی بناء پر، انہیں عالم الغیب سمجھا جائے، یا مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح، وحی پانے کا دعویدار سمجھا جائے، یا ’’مزاج شناس خدا‘‘ تسلیم کیا جائے۔ کیونکہ بدویانِ عرب کے متعلق خود قرآن کریم نے یہ کہہ دیا ہے کہ ......’’تم ایمان نہیں لائے، صرف اطاعت قبول کی ہے، اس لیے کہ ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہو سکا ہے‘‘...... اُن کے متعلق یہ حقیقتِ حال، خدائے علیم بذات الصدور کے قطعی، حتمی اور یقینی علم پر مبنی ہے، لیکن ایرانیوں کے اسلام کی یہی حالت جو بیان کی گئی ہے، وہ محض ’’مفکر قرآن‘‘ کے ظن وگمان پر مبنی ہے جو اپنے مقصود باطل کے اثبات کے لیے، قرآن کا نام لے کر، اپنی راہ ہموار کرنا چاہتے ہیں۔

(۱۴) شہادتِ عمر رضی اللہ عنہ کا الزام، ہرمزان پر

اس کے بعد، ’’مفکر قرآن‘‘ صاحب، یہ فرماتے ہیں کہ ان نام نہاد مسلمانانِ ایران کو، کام کا مسلمان بنانے کے لیے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، کوئی پروگرام بنانا چاہتے تھے، مگر وہ ہرمزان کی سازشِ قتل کا نشانہ بن گئے، اور وہ کچھ کر نہ پائے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ان (حضرت عمر رضی اللہ عنہ) کے پیشِ نظر یہ پروگرام تھا کہ ان نومسلموں کی مناسب تعلیم وتربیت سے ان کے اندر ایسی تبدیلی پیدا کر دی جائے کہ ایمان، ان کے دل

---

❶ شاہکار رسالت ص ۴۴۲۔

> کی گہرائیوں میں اُتر جائے، لیکن قبل اس کے کہ وہ اس پروگرام کو بروئے کار لاتے، ہرمزان کی سازش کامیاب ہوگئی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ مسلمانوں سے انتقام لینے کے راستے میں، سب سے بڑی رُکاوٹ (حضرت) عمر رضی اللہ عنہ کا وجود ہے۔ جب تک اسے راستے سے ہٹایا نہیں جائے گا، ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ وہ رُکاوٹ دور ہوگئی، تو اگلا راستہ صاف اور آسان ہوگیا۔ نومسلم عوام کی تعلیم و تربیت بھی نہ ہو سکی، اور ان کے عیّار طبقہ کے لیے مسلمانوں میں، اپنے خیالات پھیلانے کے لیے فضا بھی سازگار ہوگئی۔ ❶

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ''مسلمانوں سے انتقام لینے کے راستے میں، سب سے بڑی رکاوٹ، وجود عمر رضی اللہ عنہ تھا۔'' ہرمزان کا اگر یہ خیال تھا، تو کتب تاریخ میں کوئی گری پڑی کتاب بھی، ہرمزان کے اس خیال کا تذکرہ نہیں کرتی۔ پھر آخر ''مفکر قرآن'' کی یہ بات، کس آسمان سے اترنے والی وحی پر مبنی ہے؟

امر واقعہ یہ ہے کہ یہ سرے سے کوئی سازش تھی ہی نہیں، کجا یہ کہ اسے کسی عیار طبقہ کی طرف منسوب کیا جائے یا کسی اور کی طرف۔ البتہ اِسے سازش کا نقاب اوڑھا دینا، فی الواقع، اس عیار شخص کا کارنامہ ہے جس نے یکے از ملوکِ ایران کے نام پر، خود کو ملقب کر رکھا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فتوحات کی وسعت کے ساتھ، معمول کے نظام تعلیم و تربیت کو بھی مقبوضہ علاقوں میں وسعت دی، اور اس طرح یہ سلسلۂ اصلاح و تربیت جاری رہا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، ہر علاقے میں، خواہ حال ہی میں مفتوح ہوا ہو، یا اس سے کبھی پہلے اسلامی قلمرو میں شامل ہوا ہو، ایسے حکام کو معلم بنا کر بھیجا کرتے تھے، جو لوگوں کو دین اور سننِ رسول کی تعلیم دیں، اور یہ آپ کا وہ عمل تھا جس پر آپ نے عند الموت، اللہ تعالیٰ کو شاہد ٹھہراتے ہوئے، یہ فرمایا تھا:

((اَللّٰھُمَّ اِنِّی اُشْھِدُكَ عَلٰی اُمَرَاءِ الْاَمْصَارِ فَاِنِّی اِنَّمَا بَعَثْتُھُمْ

---

❶ شاہکار رسالت ص ۴۴۲۔

لِيُعَلِّمُوا النَّاسَ دِيْنَهُمْ وَسُنَّةَ نَبِيِّهِمْ .))①

> ''خدایا! میں شہروں کے حکام پر تجھے گواہ ٹھہراتا ہوں کہ میں نے ان کو اس لئے بھیجا تھا کہ وہ لوگوں کو ان کا دین اور ان کے نبی کی سنت سکھائیں۔''

اور لوگوں کی تعلیم و تربیت کا دوسرا طریقہ یہ تھا کہ جن لوگوں کو مفتوحہ علاقوں میں فوجی کارروائیوں کے لئے یا نظم و نسق کے لئے متعین کیا کرتے تھے، انہیں یہ تاکید تھی کہ وہ مفتوحین کے ساتھ، عملی برتاؤ میں، باہمی میل جول میں، ان سے معاملات کے طے کرنے میں، اسلام کی مکمل نمائندگی کریں، تاکہ اسلام کا ایک جیتا جاگتا نقشہ، ان کے سامنے آجائے، اس اعتبار سے مسلمانوں کا ہر فرد، خواہ وہ تاجر ہوتا یا صنعتکار، فوجی ہوتا یا سول افسر، اس کی پوری زندگی بجائے خود، ذریعہ تبلیغ اسلام تھی۔ خود پرویز صاحب لکھتے ہیں۔

> لیکن یہ سپاہی، یہ حزب اللہ کے جانباز، زمینوں کو فتح کرنے والے ہی نہیں تھے انسانی قلوب کو مسخر کرنے والے بھی تھے۔ یہ اشاعت اسلام کا مؤثر ترین ذریعہ بھی تھے۔ ان کی وجہ سے اسلام بڑی تیزی سے پھیلا۔ لیکن ان کی تلوار سے نہیں، ان کی سیرت و کردار سے، ان کے حسنِ اخلاق سے، ان کی پاکیزگی قلب و نگاہ سے، ان کی دیانت و امانت سے، ان کی خوش معاملگی سے۔ آپ نے ''فتوحات'' کے باب میں دیکھا نہیں کہ ایرانیوں اور رومیوں کا جو وفد بھی، ان کے پاس آیا، اُس نے واپس جا کر یہی رپورٹ دی کہ یہ لوگ جس حسن سیرت اور پاکیزگی کردار کے حامل ہیں، اس کے پیشِ نظر، دنیا کی کوئی قوم بھی ان کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ اس لئے ہمیں ان سے صلح کر لینی چاہیے۔ پاکیزگی کردار کے علاوہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، جس فوجی افسر کا انتخاب کرتے، یہ دیکھ لیتے کہ اسے دین کا علم اور تفقہ حاصل ہے، چنانچہ ان فوجیوں کے جو وفد ایرانی اور رومی درباروں میں پہنچے، انہوں نے وہاں اسلام کی خصوصیات اور اس کی انقلاب آفریں تعلیم کے اصول و

---

① صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوۃ، باب نھی من اکل ثوما او بصلا۔

مبانی کس حسنِ بلاغت سے پیش کیے تھے۔ ①

ایران میں، اگر کبھی مفتوحین کی طرف سے نقضِ عہد کی صورت پیدا ہوجاتی، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہی گمان گزرتا کہ شاید مفتوحین کے ساتھ، اسلامی معیار کے مطابق حسنِ سلوک میں، ہمارے اہل کاروں سے کوئی کوتاہی، اس کا سبب بنی ہے، چنانچہ وہ تحقیق کرتے، اور مفتوحین کے نقضِ عہد کے وجوہ تلاش کرتے، جیسا کہ ہرمزان کو مدینہ لانے والے وفد سے آپ رضی اللہ عنہ کی گفتگو سے ظاہر ہے:

> قال عمر للوفد: لعل المسلمين يؤذون اهل الذمه فلهذا ينتقضون بكم؟ قالوا: ما نعلم الا وفاءً. قال: فكيف هٰذا؟ فلم يشفه احد منهم. الا ان الاحنف قال له: يا امير المؤمنين. انك نَهَيْتَنَا عن الانسياح فى البلاد وان ملك فارس بين اظهرهم وَلا يَزَالُون يُقَاتِلُونَنَا مَا دام ملكهم فيهم ولم يجتمع ملكان متفقان حتى يخرج احدها صاحبه وقد رءيت انا لم ناخذ شيئًا بعد شىء الا بانبعاثهم وغدرهم وان ملكهم هو الذى يبعثهم ولا يزال هٰذا دأبهم حتى تاذن لنا بالانسياح فنسيح فى بلادهم ونُزيل ملكهم فهنالك ينقطع رجاء اهل فارس. فقال صدقتنى والله! ونظر فى حوائجهم وسرّحهم واتى عمر الكتاب باجتماع اهل نهاوند، فاذن بالانسياح فى بلاد الفارس. ②

بجائے اس کے کہ اس عربی اقتباس کا ترجمہ پیش کیا جائے، اس میں جو کچھ مذکور ہے، اسے مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی کے قلم سے ملاحظہ فرمایئے۔

اس کے بعد، فاروق اعظم نے انس بن مالک اور احنف بن قیس وغیرہ ارکانِ

---

① شاہکار رسالت، ص ۲۳۵۔

② الکامل فی التاریخ، ج ۲، ص ۵۴۹ تا ۵۵۰۔ (لابن الاثیر۔ دار صادر للطباعة والنشر، بیروت ۱۳۸۵/۱۹۶۵۔

> سفارت سے مخاطب ہو کر کہا کہ شاید تم لوگ ذمیوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے، اسی لئے وہ بار بار بغاوت اختیار کرتے ہیں۔ یہ سن کر حضرت احنف بن قیس نے جواباً عرض کیا کہ اے امیر المومنین! ہم ہمیشہ اپنے وعدوں کا ایفاء کرتے ہیں، اور رأفت و محبت کا برتاؤ ذمیوں سے کرتے ہیں لیکن ان لوگوں کی بار بار سرکشی اور بغاوت کا سبب صرف یہ ہے کہ آپ نے ہمیں بلاد فارس میں آگے بڑھنے سے ممانعت کر دی ہے، اہل فارس کا بادشاہ یزدگرد، فارس کے شہروں میں موجود ہے۔ جب تک یزدگرد، فارس کے ملک میں زندہ و سلامت موجود رہے گا، اس وقت تک اہل فارس لڑنے اور ہمارا مقابلہ کرنے سے باز نہیں آئیں گے۔ فاروق اعظم نے احنف کے کلام کی تصدیق کی، اور اس کے بعد بلاد فارس میں اسلامی فوجوں کو پیش قدمی کی اجازت دے دی۔ ❶

یہ جملہ اقتباسات، اس امر کو واضح کر دیتے ہیں کہ ایران کے نومسلموں کی دینی تعلیم، اور ان کی اخلاقی تربیت کا انتظام بالکلیہ مفقود نہیں تھا جیسا کہ "مفکر قرآن" نے محض، اپنی "عجمی سازش" کی بات بنانے کے لئے گمان کر رکھا تھا۔ البتہ اس تربیتی اور تعلیمی کام کی رفتار، اس قدر تیز نہ تھی جس قدر تیزی سے لوگ مفتوح ہو کر یا مصالحت کے نتیجہ میں معاہد ہو کر، دائرہ اسلام میں آ رہے تھے۔

باقی رہا یہ امر کہ...... "ہرمزان کی شہادتِ عمر رضی اللہ عنہ کی سازش کامیاب ہو گئی، جس کی بناء پر نومسلموں کی اخلاقی و دینی تربیت کا پروگرام بھی بروئے کار نہ آ سکا، اور مجوسی نظریات کو پھیلنے کا موقع مل گیا......" تو یہ تصور بجائے خود ایک سازش ہے جس کا تانا بانا، طلوع اسلام کی کھڈی میں بُنا گیا، اور اس ہرمزان کو شریکِ قتلِ عمر رضی اللہ عنہ، قرار دیا گیا ہے، جس نے بغیر کسی دباؤ اور جبر و اکراہ کے، از خود اسلام قبول کیا، خلیفہ عمر رضی اللہ عنہ کو آئندہ فتوحات کے سلسلہ میں اخلاص و دیانت کے ساتھ، مفید اور درست مشوروں سے نوازتا رہا، اور جب محض تہمت کی بناء پر، جو

---

❶ تاریخ اسلام (از اکبر شاہ نجیب آبادی)، ج ، ص ۳۱۴۔

محض شک اور بدگمانی پر قائم کی گئی تھی، اُس پر تلوار کا وار کیا گیا، تو عین سکراتِ موت میں بھی، اس کی زبان پر کلمہ توحید جاری تھا۔ ایسے شخص کو، ابولؤلؤ فیروز کی ذاتی وارداتِ قتل میں شریک کرنا محض اس لیے ہے کہ ''عجمی سازش'' کے افسانہ کی تشکیل میں، اسے، ایک کڑی بنا دیا جائے۔

(۱۴) ''انتقامِ عجم'' کا سیاسی محاذ

''مفکر قرآن'' کے ہاں، انتقام عجم کے دو محاذ ہیں، ان دونوں محاذوں پر کام کرنے کی راہ، (بقول ان کے) شہادتِ عمر رضی اللہ عنہ نے کھولی، جو ہرمزان کی سازش کا نتیجہ تھی۔ ان محاذوں میں سے ایک سیاسی محاذ تھا جس کا مقصد، اسلامی سلطنت کو کمزور کر کے سیاسی غلبہ حاصل کرنا تھا، اور دوسرا دینی محاذ تھا جس کا مقصد، لوگوں کو ''قرآن سے دور'' کر کے، انہیں ''احادیث میں الجھا'' دینا تھا۔ بلکہ سیاسی غلبہ حاصل کرنا بھی، مقصود بالذات نہیں تھا بلکہ وہ بھی دوسرے مقصد کا ایک ذریعہ تھا۔

ان دونوں محاذوں پر، ''مفکر قرآن'' اپنی مزعومہ ''عجمی سازش'' کی تفصیلات بیان کرنے سے قبل، وہ، ایک زوردار تمہید اٹھاتے ہیں کہ وہ جس وادی میں اسپ تحقیق دوڑانے چلے ہیں، وہ بڑی خطرناک وادی اور انتہائی نازک مقام ہے، جس میں انہیں مخالفتوں کے ہجوم اور عداوتوں کی یلغار سے سابقہ پیش آنے والا ہے، کمزور اعصاب کا آدمی تو رہا ایک طرف، مضبوط اعصاب کا کوئی فرشتہ یا جن بھی یہاں قدم رکھتے ہوئے خوف زدہ ہے لیکن یہ قرآن کے ساتھ، ان کے ''عشق'' کا تقاضا ہے کہ وہ بے خوف و خطر، مردانہ وار اس وادی میں کود جائیں، اور کسی مخاصمت و منازعت اور چپقلش و کشمکش کی پروا نہ کریں۔ اس وادی میں قدم رنجہ ہوتے ہوئے، نہ وہ اصحاب شریعت سے ڈریں اور نہ اصحاب طریقت سے خوف کھائیں کیونکہ یہ سب لوگ، اُس ''قرآنی اسلام'' کو برداشت نہیں کر پائیں گے، جس کے اجزاء، آج مغرب کی فاسد معاشرت اور اشتراکیت کے اقتصادی نظام ہی میں، بغیر کسی قرآن کے پائے جاتے

ہیں۔ پھر علماء شریعت ہوں یا اصحاب طریقت ہوں، وہ سب، اس ''قرآنی اسلام'' کی مخالفت میں، اور اپنے ''عجمی اسلام'' کی مدافعت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کریں گے۔ لہٰذا، وہ مجبور ہیں کہ ایک ''قرآنی مجاہد'' بن کر، مخالفتوں کے بحر ظلمات میں اپنے گھوڑے دوڑا دیں۔

لیجیے، ملاحظہ فرمائیے، ''مفکر قرآن'' کا یہ تمہیدی اقتباس۔

> یہ وہ وادی ہے جس میں قدم رکھتے ہوئے، فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں، اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ہمارے مروجہ اسلام کا کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں، جو اس ''عجمی سازش'' کا شکار، اور غیر اسلامی تصورات سے ملوث نہ ہو چکا ہو۔ یہ اسلام، ارباب شریعت کا ہو، یا اصحاب طریقت کا، اور اربابِ شریعت میں سے بھی کسی فرقہ یا مسلک کا ہو، اس پر عجمی (غیر قرآنی) تصورات کا ٹھپہ ضرور لگا ہوا ہوگا۔ اب ظاہر ہے کہ جب مروجہ اسلام کے متعلق کہا جائے کہ یہ غیر اسلامی معتقدات و نظریات سے ملوث ہے، تو یہ بات ہمارے مذہب پرست طبقہ پر یقیناً گراں گزرے گی۔ اس لیے کہ وہ اس پر مصر ہوتے ہیں کہ جس اسلام کے وہ پیرو ہیں، وہ حقیقی اسلام ہے۔ بظاہر یہ بات، ناقابل فہم اور تعجب انگیز سی نظر آتی ہے کہ اگر کسی مروجہ عقیدہ یا مسلک کے متعلق بتا دیا جائے کہ وہ قرآن کریم کی نص صریح کے خلاف ہے تو یہ حضرات اس پر کیسے مصر ہو سکتے ہیں کہ حقیقی اسلام وہی ہے جس پر وہ کاربند ہیں، لیکن یہ چیز کتنی ہی ناقابل فہم اور تعجب انگیز کیوں نہ ہو، ہے یہ حقیقت۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک دین میں سند اور حجت، روایات اور تاریخ ہیں، اور قرآن کا وہی مفہوم قابل قبول ہوسکتا ہے جس کی تائید روایات اور تاریخ سے ہوتی ہو، یعنی یہ حضرات بجائے اس کے کہ روایات اور تاریخ کو قرآن کے تابع رکھیں، قرآن کو روایات اور تاریخ کے تابع رکھتے ہیں۔ ❶

---

❶ شاہکار رسالت، ص ۴۴۳۔

علماء پر اتہامات

اس اقتباس میں، ''مفکرِ قرآن'' نے حسبِ عادت، مغالطہ آرائی اور بہتان تراشی سے کام لیا ہے، اور علماء کرام پر، ایک الزام تو یہ عائد کیا ہے کہ وہ مروجہ اسلام ہی کو حقیقی اسلام سمجھتے ہیں۔ حالانکہ کسی عالم دین نے مروجہ اسلام کو کہیں بھی حقیقی اسلام قرار نہیں دیا۔ سب یہی کہتے ہیں کہ جو اسلام، آج ہماری زندگیوں میں عملاً رائج ہے، وہ خواہ معیشت معاشرت، سیاست، عدالت، مقننہ، انتظامیہ، تعلیم اور صلح و جنگ کے معاملات ہوں یا قومی اور بین الاقوامی امور ہوں، ان سب میں بگاڑ پیدا ہو چکا ہے۔ مروجہ اسلام میں جاہلیت جدیدہ اور جاہلیت قدیمہ، دونوں کے بعض امور داخل ہو چکے ہیں۔ خالص اور بے آمیز اسلام کی طرف رجوع کے لیے، ایسے رسول کی طرف آیئے جس کے ہاتھ میں صحف مطہرہ ہوں۔

﴿رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً﴾ (البينة : ۲)

''خدا کی طرف سے (آنے والا وہ) رسول، جو پاکیزہ صحیفے تلاوت فرماتا ہے۔''

لیکن ''مفکرِ قرآن'' صاحب، محض اپنے ذہنی تحفظات کی پاسداری اور سنت رسول سے بیزاری کے پیش نظر، صرف قرآن ہی کو مرجع قرار دیتے ہیں، حالانکہ قرآن ہمیں براہِ راست نہیں بلکہ اس رسول ہی کے توسط سے ملا ہے، جس کی پوری حیاتِ طیبہ، اتباع و پیروی کے پیش نظر، اسوہ حسنہ قرار دی گئی ہے۔ پھر قرآن نازل کرنے والے نے بھی، تنہا قرآن کو ہدایت کے لیے کافی نہیں سمجھا، بلکہ ایک رسول کے ساتھ اسے اتارا، تاکہ اپنے اوّلین مخاطبین کو قرآنی تعلیمات کی وضاحت کر دے، اور پھر ہدایت پانے کے نقطۂ نظر سے، قرآن اور رسول میں سے اصلی اور بنیادی عامل کتاب نہیں بلکہ پیغمبر ہے، یہی وجہ ہے کہ اتباع کتاب کی بجائے، اتباع رسول کے متعلق، یہ کہا گیا ہے کہ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ ''جس نے رسول کی اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی'' یہ اس لیے کہ رسول کی اطاعت میں، قرآن کی پیروی اور اللہ کی اطاعت بھی شامل ہے۔ لیکن تنہا اللہ کی اطاعت، خود قرآن ہی کی رو سے اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک رسول، جس کے توسط سے قرآن ہمیں ملا ہے، کتاب اللہ کی

وضاحت نہ کردے۔ اس لیے اتباعِ قرآن یا اطاعتِ خدا کی تنہا اور واحد صورت، صرف اطاعت رسول ہی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں، پرویز صاحب ہی کا ایک اقتباس پیش کر دیا جائے:

> اصل یہ ہے کہ رسول کا اتباع ہی، قرآن کا اتباع ہے، کیونکہ رسول کو خود حکم دیا گیا ہے کہ اتبع ما اوحی الیك من ربك’’ جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر وحی کی جاتی ہے، اس کا اتباع کرو۔‘‘ لہٰذا، ان احکام کی موجودگی میں اب یہ کسی کی اپنی مرضی ومنشا کے ماتحت نہ رہا کہ جس طرح جی چاہے، قرآن کا اتباع کر لے۔ بلکہ قرآن کا اتباع ہو ہی اس شکل میں سکتا ہے جس شکل میں رسول نے کیا یا کرنے کا حکم دیا............ چونکہ اس تعمیل اور نمونہ کے بغیر خدا کی اطاعت ممکن نہ تھی، اس لیے جہاں قرآن میں اطیعوا اللہ آیا ہے، اس کے ساتھ ہی اطیعوا الرسول بھی آیا ہے۔ کہیں ایک جگہ بھی اکیلا اطیعوا اللہ نہیں آیا، اور چونکہ اطیعوا الرسول میں اطاعتِ خداوندی خود بخود آ جاتی ہے اس لیے خالی اطیعوا الرسول قرآن میں بعض جگہ آیا ہے، مثلاً اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ (نور: ٥٦) ’’رسول کی اطاعت کرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے‘‘ اور جہاں جہاں اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول آیا ہے، وہاں درحقیقت، اطیعوا اللہ سے مراد، اطاعتِ رسول ہی ہے۔ ❶

الغرض، یہ اقتباسِ پرویز، اس امر کو واضح کر دیتا ہے کہ خدا کی اطاعت کا واحد ذریعہ، صرف اطاعت رسول ہے، لیکن پھر بعد میں ’’مفکر قرآن‘‘ نے اپنی تضاد گوئی اور تناقض کلامی کی پالیسی کو نبھاتے ہوئے، یہ راگ الاپنا شروع کر دیا کہ اطاعتِ خدا کا واحد ذریعہ (اطاعت رسول نہیں، بلکہ) اتباعِ قرآن ہے، اور اب اسی نظریہ کے ماتحت، وہ شاہکارِ رسالت میں پہلے یہ فرماتے ہیں کہ...... (۱)...... قرن اول کے مسلمانوں کی فتوحات اور عجم کی شکستوں کی وجہ یہ

---

❶ معارف (اعظم گڑھ، انڈیا) اپریل ۱۹۳۵ء، ص ۲۸۲ تا ۲۸۳۔

تھی کہ مسلمانوں کا خدا، ان کے ساتھ تھا، اور پھر ......(۲)......''خدا کے ساتھ'' ہونے کا مطلب یہ کہ اس زمانے میں مسلمان، خدا کی کتاب کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے۔ حالانکہ کتاب، مجرد الفاظ پر مشتمل ایک چیز ہے، اور عملاً جو کچھ مطلوب ہے، وہ الفاظ قرآن نہیں بلکہ معانیٔ قرآن ہیں، جس کا واحد سرچشمہ اسوۂ رسول ہے، لہٰذا، اُس دور میں ''خدا کے ساتھ'' ہونے کا مطلب، صرف یہ تھا کہ لوگ متبعینِ رسول تھے جس کے نتیجہ میں انہیں نہ صرف معیت ایزدی بلکہ محبتِ خداوندی بھی حاصل تھی۔ ان كنتم تحبون الله فاتبعوني يحببكم الله۔ اور پھر......(۳)...... ''خدا کا ساتھ'' چھڑا دینے کا مطلب یہ طے کیا کہ لوگوں کو کتاب اللہ سے الگ کر کے، روایات و تاریخ میں منہمک کر دیا جائے۔ یہ ہے وہ تمہید جسے مزعومہ ''عجمی سازش'' کے سیاسی اور دینی محاذ کی اساس بنایا جا رہا ہے۔

(۱۵) علماء پر دوسرا الزام

اس کے بعد، ''مفکرِ قرآن'' نے الزام تراشی کرتے ہوئے، علماء کرام کے کھاتہ میں، یہ ''جرمِ بے گناہی'' لا ڈالا، کہ

> یہ حضرات، بجائے اس کے کہ روایات اور تاریخ کو، قرآن کے تابع رکھیں، قرآن کو روایات اور تاریخ کے تابع رکھتے ہیں۔ ❶

''مفکرِ قرآن'' نہ صرف یہ کہ تضاد گو اور متناقض الکلام تھے، بلکہ انتہائی دروغ گو بھی تھے، جیسا کہ میری کتاب ''جناب غلام احمد پرویز، اپنے الفاظ کے آئینے میں'' میں ناقابلِ تردید دلائل سے واضح کیا گیا ہے۔ پھر اس پر مستزاد، ان کا یہ عیارانہ اور فریب کارانہ رویہ، کہ خود اپنی خصلت بد کو، اپنے مخالفین کے کھاتے میں ڈالا کرتے تھے، اور پھر اس قدر شدید پراپیگنڈہ کیا کرتے تھے کہ اس کی آڑ میں خود ان کی اپنی گھناؤنی روش چھپ جایا کرتی تھی۔ چالاک، عیار اور مکار لوگ، بلند نصب العین کا لبادہ اوڑھ کر، تنقید کے پردے میں تنقیص و توہین کرتے

---

❶ [illegible] رجحانات، ص ۴۴۳۔

ہوئے، دوسروں پر کیچڑ اچھالا کرتے ہیں، تاکہ ان کی اپنی سیاہ عملی مستور و مخفی رہے۔ اس نفسیاتی حقیقت کو، ایک مقام پر، خود طلوع اسلام نے بھی بیان کیا ہے، اس لیے ہم وابستگانِ طلوع اسلام کے سامنے، اُسی اقتباس کا آئینہ پیش کیے دیتے ہیں، تاکہ وہ خود بھی:

> اپنی روش کا نفسیاتی تجزیہ کر کے دیکھیں کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان کا نفس، دوسروں کی تنقیص میں اس لیے مصروف ہے کہ اس کی اپنی سہل انگاری ڈھکی رہے، اور اسے چھپانے کے لیے، اس نے بلند نصب العین کو آڑ بنا رکھا ہو، فریب نفس سے اکثر ایسا ہوا کرتا ہے۔ ❶

اب یہاں، قارئین کرام، اس امر پر توجہ فرمائیں کہ تاریخ کی روایات کو، قرآن کریم پر حاوی رکھنے کی عادت، خود ''مفکر قرآن'' کی اپنی عادت تھی، لیکن وہ اب اپنی اس عادت کو منسوب کرتے ہیں علماء کرام کی طرف۔ اس امر کی صرف ایک مثال ملاحظہ فرمائیے:

''مفکر قرآن'' نے اپنے ایک مقالہ میں، تاریخ کا ایک اقتباس، بایں الفاظ پیش کیا ہے:

> ......سعد رضی اللہ عنہ نے، عمر رضی اللہ عنہ کی داڑھی پکڑ لی۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ''چھوڑو، اگر اس کا ایک بال بھی بیکا ہوا تو تمہارے منہ میں ایک بھی دانت نہیں رہے گا...... ❷

اس سے اگلے صفحہ پر، ''داڑھیاں نوچنا'' کی سرخی دے کر، ''مفکر قرآن'' نے تحریر فرمایا ہے:

> ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ سقیفہ کے تنازعے میں، حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی داڑھی پکڑ لی تھی۔ تاریخ طبری ہمیں بتاتی ہے کہ ایک دوسرے کی داڑھیاں نوچنا (معاذ اللہ) ان حضرات کا معمول سا ہو گیا تھا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ جب حضرت اسامہ کی امارتِ عساکر کے مسئلہ میں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ میں اختلاف رائے ہوا، تو
>
> ابوبکر رضی اللہ عنہ، جو بیٹھے ہوئے تھے، غصے سے اچھل پڑے اور بڑھ کر انہوں نے

---

❶ طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۴۰ء، ص ۱۳۔

❷ طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۸۱ء، ص ۲۸۔

> حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی داڑھی پکڑ لی، اور کہا ''اے ابن خطاب! اللہ تیری ماں کا بُرا کرے کہ تم مر جاتے۔ بھلا جس شخص کو رسول اللہ نے اس پر فائز کیا ہے، تم مجھ سے کہتے ہو، کہ میں اسے علیحدہ کر دوں۔ ❶

ایسے واقعات، جن میں صحابہ کی بعض کمزوریوں اور فروگذاشتوں کا ذکر ہے، انہیں ''مفکر قرآن'' صاحب، بڑی زحمت کشی کرتے ہوئے، تاریخ کی کتابوں سے ڈھونڈا کرتے تھے تاکہ یہ ثابت کیا جائے کہ ہماری کتب تاریخ، صحابہ کرام کے بارے میں توہین آمیز مواد سے اٹی پڑی ہے۔ لہٰذا، اسے دریا برد ہی کر دینا چاہیے، اور نئے سرے سے ''مطابق قرآن'' تاریخ کو مرتب کرنا چاہیے۔

یہاں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ علماءِ کرام، قطعاً اور ہرگز یہ نہیں کہتے کہ تاریخ میں جو کچھ مذکور ہے، وہ سو فیصد درست ہے، اور اس میں کوئی بات بھی غلط نہیں ہے، سب کے سب تاریخ کے مواد میں اغلاط کی موجودگی تسلیم کرتے ہیں، اور تاریخ کو قرآن وسنت کی روشنی میں پرکھتے ہیں، لیکن ''مفکر قرآن'' کو چونکہ سنت کے نام ہی سے کھجلی ہونے لگ جاتی تھی، اس لیے، وہ یہ کہا کرتے تھے، کہ تاریخی واقعات، کو صرف قرآن کی کسوٹی پر ہی پرکھا جائے۔

ہمارے ''مفکر قرآن''، ''داڑھی نوچنے'' کے ان واقعات کو صحیح سمجھتے ہیں۔ اگر غلط سمجھتے ہوتے، تو صاف کہہ دیتے کہ ''یہ واقعات غلط ہیں لہٰذا، ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔'' اگر وہ ان واقعات کی صحت پر ایمان نہ لائیں، تو تاریخ پر اعتراض کرنے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ اس لیے وہ، ایسے واقعات کو درست تسلیم کرتے ہوئے ہی، کتب تواریخ کو مورد طعن و تشنیع بناتے ہیں۔

مزید برآں، ''مفکر قرآن'' صاحب، ان واقعات کو رد کرنے کے لیے، یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ چونکہ ان میں اہانتِ صحابہ کا پہلو پایا جاتا ہے، لہٰذا، یہ ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہیں، کیونکہ اُن ہی کا بیان کردہ یہ اصول ہے کہ روایت، خواہ کتب حدیث میں درج ہو یا کتب تاریخ

---

❶ طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۸۱ء، ص ۲۹۔

میں، اس کی صحت اور قبولیت کے لئے ''مطابق قرآن'' ہونے کا علاوہ، یہ شرط بھی ہے۔

> جہاں تک احادیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو، یا جس سے حضور نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کبار رضی اللہ عنہم کی سیرت داغ دار نہ ہوتی ہو۔ ①

لیکن اگر، ان تاریخی واقعات کو، اس بناء پر ''مفکر قرآن'' رد کریں (جیسا کہ اس اصول کا تقاضا ہے) کہ یہ واقعات موہمِ توہینِ صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں، تو پھر انہیں غلط اور نا قابل قبول واقعات تسلیم کر لینے کے بعد، لوگوں کو کتب تواریخ سے بدظن اور بیزار کرنے کی گنجائش نہیں رہتی۔ یہ ہے وہ مجبوری، جس کی بناء پر، ''مفکر قرآن'' صاحب، ایسے واقعات کو درست جانتے ہیں، اور پھر اسی بنیاد پر، پورے تاریخی ریکارڈ کو دریا برد کرنے کے لئے اپنا فلک بوس قصرِ استدلال ایستادہ کرتے ہیں کیونکہ تاریخ پر کلوخ اندازی کا یہ موقع، صرف اسی صورت میں برقرار رہتا ہے جب کہ ان واقعات کو مبنی بر صحت قرار دیا جائے۔ لیکن اس صورت میں، ایک اور مشکل پیدا ہو جاتی ہے، اور وہ یہ کہ جیسی لغزش، صحابہ کرام کی، ان تاریخی واقعات میں مذکور ہے، ویسی ہی ایک لغزش خود قرآن میں بھی مذکور ہے، اور اس کا تعلق، صحابہ کرام سے نہیں، بلکہ ایک جلیل القدر پیغمبر سے ہے، جو قباحت اور شناعت میں صحابہ کے تاریخی واقعات سے بڑھ کر ہے۔ قرآن کریم میں یہ مذکور ہے کہ جب کوہِ طور پر، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو، اللہ تعالیٰ سے یہ اطلاع ملی کہ حضرت ہارون علیہ السلام کی موجودگی میں سامری نے ان کی قوم کو گمراہی میں ڈال دیا ہے، تو وہ غیظ وغضب کی حالت میں پلٹے، اور اپنے بڑے بھائی کے سر اور داڑھی کو پکڑا بھی، اور اپنی طرف کھینچا بھی۔ اس پر ہارون علیہ السلام، اپنے بھائی سے یوں مخاطب ہوئے۔

﴿يَبْنَؤُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي إِنِّي خَشِيتُ﴾ (طه: ٩٤)

''اے میرے ماں جائے بھائی! میری داڑھی اور میرا سر نہ پکڑیئے میں ڈرا کہ......''

اب ''مفکر قرآن'' صاحب، اس مشکل سے نکلنے کے لئے، یہودیوں کی وہ روش اپناتے

---

① طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۷۸ء، ص ۳۰ + مارچ ۱۹۷۷ء، ص ۷۔

ہیں جو قرآن میں يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ کے الفاظ میں مذکور ہے، اور اپنے عمل سے ’’قرآنی کتاب الحیل‘‘ کی داغ بیل ڈالتے ہوئے، اس کا مفہوم اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ ’’داڑھی اور سر کو پکڑنے‘‘ کا ذکر ہی مفقود ہو جاتا ہے۔

> ہارون بولا ’’اے میرے عزیز بھائی! تو مجھ پر اس طرح خفا نہ ہو، اور نہ ہی مجھے یوں ہدف ملامت بنا، (میں نے اگر سختی میں کمی کی، تو صرف اس خیال سے کہ) میں ڈرا کہ...... ①

اب ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے کہ ’’مفکر قرآن‘‘ نے تاریخی واقعہ کو صحیح سمجھ کر، محض اس پر اعتراض وارد کرنے کے لیے، قرآن کے مفہوم میں تحریف کی ہے، یا قرآن کے مفہوم کو درست قرار دیتے ہوئے، تاریخی واقعہ کو رد کر دیا ہے؟

پھر یہاں یہ بات بھی لائق توجہ ہے کہ ’’مفکر قرآن‘‘ کی ناوک افگنی سے قرآن تک محفوظ نہیں رہا، اور کس طرح محض اپنی بات بنانے کے لیے، اپنی سنگباری کی لپیٹ میں قرآن کریم کو بھی لے ڈالا، اور پھر یوں اپنے جرم کو، اپنے مخالفین کے سر منڈھ ڈالا ؏

ایسا بلند سب کا ذوق نظر کہاں!

(١٦) ’’مفکر قرآن‘‘ کی رنگ آمیزی اور دروغ گوئی

اس کے بعد، ’’مفکر قرآن‘‘ کتب حدیث پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے، جو کچھ لکھتے ہیں، اس میں زیب داستان کے لیے رنگ آمیزی بھی ہے، اور صریح جھوٹ بھی۔ بیانِ واقعات میں کتر بیونت بھی ہے اور مسخ و تحریف بھی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> لیکن انہیں (یعنی کتب احادیث کو) مقدس ایسا بنا دیا گیا ہے کہ ان پر کسی قسم کی تنقید کرنا، کفر قرار دے دیا جاتا ہے۔ ان کی تقدیس کے سلسلہ میں صرف ایک واقعہ بیان کرنا کافی ہوگا۔ ہمارے ہاں یہ امر بطور مسلمہ مانا جاتا ہے کہ حضرت

---

① برق طور، ص ١٠١۔

> عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر، بوقت نکاح چھ برس کی تھی۔ یہ بات ایک طرف، قرآن کریم کی واضح تعلیم کے خلاف ہے جس کی رو سے بلوغت، نکاح کی عمر ہے۔ دوسری طرف، اس سے حضور نبی اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ کے خلاف، جس قسم کا اعتراض وارد ہوتا ہے، اس پر مستشرقین کی تصنیفات شاہد ہیں۔ راقم الحروف نے ایک مدت کے تجسس وکاوش کے بعد، بالتحقیق ثابت کر دیا کہ یہ روایت غلط ہے۔ نکاح کے وقت، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر، سترہ اور انیس برس کے درمیان تھی۔ اس پر ان حضرات کو سجدۂ شکر ادا کرنا چاہئے تھا کہ غلط روایات نے دامنِ رسالت پر جو داغ لگایا تھا، اور جس کی وجہ سے دشمنانِ اسلام کو دریدہ دہنی کا موقع مل جاتا تھا، اس تحقیق سے وہ داغ دھل گیا۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ ان حضرات کی طرف سے ردعمل کیا ہوا؟ انہوں نے کہا کہ اس سے بخاری شریف کی روایت کو غلط تسلیم کرنا پڑتا ہے، جو کفر ہے، لہٰذا، یہ شخص منکرِ حدیث اور دائرۂ اسلام سے خارج ہے، چنانچہ میرے خلاف، ایک ہزار علماء نے کفر کا فتویٰ صادر فرما دیا۔ ①

اس اقتباس میں "مفکر قرآن" نے، مسخ وتحریف، کذب وزور اور خدع وفریب کے جو کمالات دکھائے ہیں، ان میں سے چند ایک درج ذیل سطور میں، مع جائزہ، پیش کیے گئے ہیں۔

(۱)...... "کتب حدیث پر تنقید کرنا، کفر ہے۔" معلوم نہیں کہ اسے "مفکر قرآن" کی طرف سے مغالطہ آرائی کہا جائے یا صریح جھوٹ۔ بہرحال، جو کچھ بھی اس ضمن میں کہا گیا ہے، وہ قطعی غلط ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کے اقوال وافعال اور تقاریر کے متعلق جو خبر یا اطلاع پہنچتی ہے، وہ محض خبر یا اطلاع ہونے کی حد تک معرضِ تحقیق وتنقید میں رہتی ہے۔ اس خبر پر آپ جس قدر بھی چاہیں، تنقید کر سکتے ہیں۔ یہ تنقید سے بالاتر نہیں ہے۔ لیکن تحقیق وتدقیق کے بعد، جب اس خبر کا قولِ رسول، فعلِ نبی یا تقریرِ پیغمبر کا ہونا ثابت ہو جائے، تو پھر وہ تنقید سے بالاتر ہو جاتی ہے، اور اس کا ماننا لازم ہو جاتا ہے، اب اس کا انکار صریح کفر

---

① شاہکار رسالت، ص ۴۴۵ تا ۴۴۶۔

ہے۔ پھر اگر کوئی شخص یہ کہے کہ یہ قولِ رسول ﷺ یا عملِ نبی ﷺ ہو بھی، تو میں اسے نہیں مانتا، تو اس کے کفر میں رتی برابر بھی شک نہیں ہے کیونکہ وہ مامور من اللہ نمایندۂ خدا کی اُس اطاعت کا منکر ہے، جو قرآن کی صدہا محکم آیات سے ثابت ہے۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ ”میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، یہ فرمانِ خداوندی ہے، لہٰذا، اس پر عمل کیجئے۔“ آپ قائل کی اس خبر کے مطابق، بلاسوچے سمجھے، اس کی بیان کردہ بات کو ”فرمان خداوندی“ نہیں سمجھ لیتے، بلکہ اس کی تحقیق کرتے ہیں کہ آیا وہ فرمانِ خداوندی ہے بھی یا کہ نہیں۔ اگر اس کی یہ اطلاع غلط پائی جاتی ہے، اور جو کچھ وہ کہہ رہا ہے، اور اس کا فرمانِ خداوندی ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ تو آپ اسے رد کر سکتے ہیں، اس پر عمل کرنا لازم نہیں ٹھہرتا۔ لیکن اگر آپ اس کی خبر و اطلاع کو درست پاتے ہیں، اور جسے وہ فرمانِ خداوندی کے طور پر پیش کرتا ہے اس کا فرمودۂ خدا ہونا ثابت ہو جاتا ہے، تو آپ نہ تو اسے رد کر سکتے ہیں، اور نہ ہی اس پر عمل پیرا ہونے سے گریزاں ہو سکتے ہیں۔ اب اسے قولاً اور عملاً قبول کرنا، آپ پر لازم ہے۔ دنیا میں ایسے لوگ یقیناً موجود رہے ہیں جو اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی عبارتوں کو، فرمانِ خدا کہہ کر پیش کیا کرتے تھے۔ يَكْتُبُوْنَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔ دور حاضر میں، منکرین حدیث میں بھی کسی حد تک یہ بیماری پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق نے، اپنی کتاب ”دو اسلام“ کے اولین ایڈیشن میں، سبوح قدوس رب الملائکۃ والروح، کے الفاظ کو قرآنی آیت کے طور پر پیش کیا تھا۔ ممکن ہے کہ یہ دیدہ دانستہ غلطی نہ ہو، محض غفلت و ذہول کا نتیجہ ہو۔ اب ایسی صورت میں، یہ لازم ہو جاتا ہے کہ جسے آیت قرآن کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، اس پر عمل پیرا ہونے سے پہلے یہ تحقیق کر لی جائے، کہ آیا واقعی وہ آیت قرآن ہے بھی یا نہیں۔ بالکل یہی حال، احادیث رسول ﷺ کا بھی ہے، جس قول یا فعل کو قولِ رسول ﷺ اور فعلِ پیغمبر کے طور پر پیش کیا گیا ہو، اگر بعد از تحقیق، منسوب الی الرسول قول یا فعل کا ایسا ہونا ثابت ہو جائے، تو اس پر سر تسلیم خم کرنا لازم ہو جاتا ہے۔ یہ ہے وہ اصل حقیقت، جسے ”مفکر قرآن“ نے اپنی سوءِ تعبیر کے ساتھ پیش

کیا ہے۔

(۲)...... باقی رہا یہ امر کہ...... "بوقت نکاح، حضرت عائشہ کی عمر چھ برس تھی، اور یہ چیز خلاف قرآن ہے، کیونکہ قرآن نے بلوغت کو، نکاح کی عمر قرار دیا ہے"...... تو یہ پھر ایک مغالطہ انگیزی ہے۔ جس آیت میں بلوغت کو، (بقول "مفکر قرآن") عمرِ نکاح قرار دیا گیا ہے، وہ مدنی دور میں جنگ احد کے بعد نازل ہوئی تھی، جب کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا نکاح، ہجرت سے بھی ڈیڑھ دو سال پہلے، ہوا تھا۔ یعنی جس آیت کی مخالفت میں، نکاح عائشہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ پیش کیا جا رہا ہے، وہ آیت، واقعۂ نکاح کے وقت نازل ہی نہیں ہوئی تھی، نکاح اور نزول آیت کے درمیان، کم از کم چار سال کا عرصہ حائل ہے۔ اب "مفکر قرآن" کی طرف سے، واقعہ نکاح اور حکم آیت میں منافات ثابت کرنا، یا تو صریح مغالطہ آرائی ہے، یا پھر صریح جھوٹ ہے۔

(۳)...... جہاں تک "مفکر قرآن" کے اس بلند بانگ دعویٰ کا تعلق ہے کہ...... "انہوں نے تجسس و کاوش سے یہ ثابت کر دیا کہ نکاح کے وقت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر، چھ سال نہیں، بلکہ سترہ اور انیس سال کے درمیان تھی"...... تو یہ بھی محض يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا کے مصداق ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اس مسئلہ میں، جو کچھ انہوں نے پیش کیا ہے، وہ اور اس کے جملہ دلائل، بالکل وہی ہیں، جو قادیانیت کی لاہوری شاخ کے سربراہ، مولوی محمد علی نے سب سے پہلے، اپنے ایک انگریزی مقالے میں پیش کیے تھے۔ یہ مضمون، ۱۹۲۸ء میں "لائٹ" میں چھپا تھا۔ اس کے بعد، اسی مضمون کا اردو ترجمہ، منشی دوست محمد، ایڈیٹر "پیغام صلح" نے خود کیا اور اپنے مجلّہ میں شائع کیا۔ "مفکر قرآن" نے مولوی محمد علی ہی کی چھوڑی ہوئی ہڈیوں کو، جب اپنے قلم سے اگل دیا، تو انہیں "تحقیق و تجسس" سے فراہم کردہ "تحقیقی دلائل" قرار دے دیا۔ پھر یہ بات بھی نہیں کہ محمد علی کے دلائل کا کسی نے جواب نہ دیا ہو۔ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ نے، ان کی ایک ایک دلیل کا جواب، اپنے رسالہ معارف (جولائی ۱۹۲۸ء اور جنوری ۱۹۲۹ء) کے شماروں میں تفصیل سے دیا ہے۔ پرویز صاحب کی یہ عادت تھی کہ وہ ان

کاموں کے کر ڈالنے کا سہرا بھی اپنے سر پر سجا لیتے تھے، جو خود انہوں نے نہیں (بلکہ دوسروں نے) کئے ہوتے تھے۔ جیسا کہ میری کتاب ''جناب غلام احمد پرویز، اپنے الفاظ کے آئینے میں'' سے واضح ہے۔

(۴)...... اپنے اقتباس کے آخر میں ''مفکر قرآن'' نے یہ صریح جھوٹ بولا ہے کہ علماءِ کرام نے، ان پر فتوائے کفر، اس لئے عائد کیا تھا کہ انہوں نے ثابت کر ڈالا تھا کہ حضرت عائشہ کی عمر، شادی کے وقت ۱۷ سے ۱۹ برس کے درمیان تھی۔ حالانکہ مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ کے فتویٰ میں (جس کی تائید ایک ہزار علماء نے کی تھی، اور جس کی عبارت کو، خود طلوع اسلام نے ۱۹۶۲ء کے مارچ تا مئی کے شماروں میں شائع کیا تھا) اس مسئلہ کا ذکر تک نہیں ہے۔ بہر حال، ''مفکر قرآن'' نے اجرائے فتویٰ کی جو وجہ بیان کی ہے، وہ ایک ایسا جھوٹ ہے جس میں سچائی کا شائبہ تک نہیں ہے۔

(۱۷) مسلکِ پرویز سے اختلافِ علماء کی وجہ

کتب احادیث و تاریخ کی بابت، وہ کچھ لکھنے کے بعد، جس پر گزشتہ صفحات میں تنقید کی گئی ہے، ''مفکر قرآن'' صاحب فرماتے ہیں۔

> ان حالات میں آپ سوچئے کہ جب ہم ان تاریخی بیانات اور روایات کو وضعی قرار دیں گے جن پر ہمارے مروجہ اسلام کے خلافِ قرآن نظریات ومعتقدات کی بنیاد ہے تو ہمارا قدامت پرست طبقہ، اس سے کیسے متفق ہو سکے گا؟ روایات اور تاریخ کے بارے میں میرا جو مسلک ہے...... مختصراً وہ (مسلک) یہ ہے
>
> (۱) دین میں سند اور حجت، خدا کی کتاب قرآن مجید ہے جو اپنی تفسیر آپ کرتا ہے، ہماری کتب روایات وتفسیر میں، جو باتیں قرآنی تعلیم کے مطابق ہیں، انہیں صحیح سمجھنا چاہئے، اور جو اس کے خلاف ہیں، انہیں مسترد کر دینا چاہئے۔
>
> (۲) حضور اکرم ﷺ کی رسالت پر ہمارا ایمان ہے، اور جملہ صحابہ کرام کے مومنِ حقا ہونے پر قرآن کی شہادت۔ اس لئے کتبِ روایات اور تاریخ میں جو

> باتیں ایسی ہیں، جن سے حضور کی سیرت مقدسہ داغدار ہوتی ہو، یا صحابہ رضی اللہ عنہم کے خلاف کسی قسم کا طعن پڑتا ہو، انہیں صحیح تسلیم نہ کیا جائے۔ ❶

اس میں ذرہ برابر بھی شک نہیں کہ جو اسلام، آج ہماری زندگیوں میں پایا جاتا ہے، اس میں بہت سا بگاڑ پیدا ہو چکا ہے، لیکن علماء کرام، قرآن وسنت پر مبنی، جس اسلام کے علمبردار ہیں، وہ چونکہ اُس ‘‘اسلام’’ کے قطعی برعکس ہے، جس کو قرآن کے نام پر، ‘‘مفکر قرآن’’ صاحب، مغرب کی فسادزدہ معاشرت کے ساتھ، کارل مارکس کی اشتراکیت کا پیوند لگا کر پیش کرتے رہے ہیں۔ اس لئے وہ، قرآن وسنت پر اساس پذیر اسلام کو، کبھی ‘‘مروجہ اسلام’’ کہہ کر مطعون کیا کرتے تھے، اور کبھی ‘‘عجمی اسلام’’ کہہ کر۔ اور پھر اس ‘‘مروجہ’’ اور ‘‘عجمی اسلام’’ کو ‘‘خلافِ قرآن’’ کہہ کر، جب وہ ساری اخلاقی حدود کو پھاند کر، اپنے ‘‘دوغلے اسلام’’ (Hybrid Islam) کو ‘‘مطابق قرآن’’ قرار دیا کرتے تھے، تو ہر وہ شخص انگشت بدنداں رہ جاتا تھا، جو ان کے ‘‘مطابق قرآن’’ اور ‘‘خلاف قرآن’’ ہونے کے نت نئے بدلتے ہوئے معیارات سے واقف ہوا کرتا تھا (اور ہے)۔ مثال کے طور پر، ایک زمانہ تھا، جب ‘‘مفکر قرآن’’ صاحب، اشتراکیت کو ہر پہلو سے، ‘‘خلافِ اسلام’’ قرار دیا کرتے تھے، اور افراد کی ذاتی ملکیت اور نجی پراپرٹی کے بھی قائل تھے، اسلامی معاشرے میں تفاضل فی الرزق اور معاشی تفاوت کو بھی تسلیم کرتے تھے۔ اڑھائی فیصد زکوٰۃ کا وجود بھی، انہیں، مسلّم تھا۔ اپنے ان تصورات کی بناء پر، وہ تمام احادیث اور جملہ تاریخی واقعات بھی، انہیں ‘‘مطابق قرآن’’ نظر آتے تھے جن میں انفرادی ملکیت، اور پھر اسی بنیاد پر، معاشی درجہ بندی میں خوشحال اور خستہ حال افراد کا وجود، اور اڑھائی فیصد زکوٰۃ کا تصور پایا جاتا ہے، لیکن جب ان کی فضائے دماغی میں اشتراکیت سے مرعوبیت کی لہر اٹھی، اور عجل اشتراکیت کی محبت، ان کے رگ وپے میں سرایت کر گئی، تو پھر ذاتی پراپرٹی کا وجود ‘‘خلافِ قرآن’’ قرار پا گیا، اور تفاضل فی الرزق، ‘‘دولت کی غیر مساوی اور غلط تقسیم’’ قرار پا گئی۔ اور وہ ساری احادیث بھی، ‘‘خلاف قرآن’’ ہو گئیں، جن میں ۲ ۱/۲ فیصد زکوٰۃ مذکور ہے، اور ‘‘خوش حال اور صاحب ثروت صحابہ’’ اب

---

❶ شاہکار رسالت، ص ۲۴۶۔

''سرمایہ دار'' قرار پاگئے۔ اور وہ تمام روایات اور تاریخی واقعات بھی، ''خلافِ قرآن'' قرار پاگئے، جو ''مفکرِ قرآن'' کے بدلے ہوئے معاشی تصورات کے ساتھ میل نہیں کھاتے۔

یہ ہے دراصل وہ قلمی ٹیکنیک، جس کے ذریعے، ''مفکرِ قران'' صاحب، مرغ بادنما کی طرح، آئے دن اپنے بدلتے ہوئے ''قرآنی معیارات'' کی روشنی میں، تاریخی بیانات اور روایات کو وضعی قرار دینے کا ڈھونگ رچاتے ہوئے، اشتراکیوں اور کمیونسٹوں سے بھی بڑھ کر، کمیونزم کا راستہ ہموار کیا کرتے تھے۔ ان کی اس روش پر، جب علماء کرام، تردید ونکیر کیا کرتے تھے، تو وہ یہ ڈھنڈورا پیٹا کرتے تھے کہ...... ''ہمارا قدامت پرست طبقہ ''خلافِ قرآن'' نظریات و معتقدات کو سینے سے لگائے ہوئے ہے، اور میرے ''مطابق قرآن اسلام'' کی مخالفت کرتا ہے۔''

(۱۸) حضرت علی رضی اللہ عنہ اور بنوعباس کی طلبِ اقتدار

اس سے پہلے یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ (بقول پرویز صاحب) ''عجمی سازش'' کے دو محاذ تھے، ایک سیاسی اور دوسرا مذہبی محاذ۔ چنانچہ ''سیاسی محاذ'' پر، ''عجمی سازش'' کے علمبرداروں نے، جس مسئلہ کی آڑ میں ''انتقام'' لیا، وہ خلافت کا مسئلہ تھا۔ جو اگرچہ صحابہ کرام کے اتفاق سے، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سریرآرائے خلافت ہونے کے باعث طے ہوگیا تھا، لیکن بنوعباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دلوں میں (بقول پرویز صاحب) خلیفہ بننے کی خواہش دبی رہی۔ چنانچہ ''مفکرِ قرآن'' صاحب، اس بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

> بنوعباس نے یہ دعویٰ کیا کہ وراثت کی بناء پر خلافت، ان کا حق ہے، نہ کہ حضرت علی اور ان کی اولاد کا۔ ان کی پیش کردہ دلیل یہ تھی کہ شریعت کی رو سے چچا کی موجودگی میں، چچا کے بیٹے کو حقِ وراثت نہیں پہنچتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت، حضور کے چچا، حضرت عباس موجود تھے، لہٰذا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت کے حق دار وہ تھے، نہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کے لڑکے حضرت علی رضی اللہ عنہ۔'' ①

---

① شاہکار رسالت، ص ۴۲۸۔

بنوعباس کا حضرت علیؓ کے مقابل، سزاوارِ خلافت ہونے کا یہ حریفانہ استدلال اور مخالفانہ دعویٰ، معلوم نہیں، کہ "مفکر قرآن" نے کہاں سے لیا ہے؟ ، اس کا کوئی ماخذ پیش نہیں کیا۔

قرآنِ کریم میں نصب امارت اور انعقادِ خلافت ہی کے بارے میں نہیں بلکہ جملہ اُمور کو نمٹانے کے لیے وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کا حکم موجود ہے، جس کی بنا پر، امارت وخلافت، ایک شورائی منصب قرار پاتا ہے (نہ کہ موروثی منصب)۔ اس منصب کی یہ (شورائی) حیثیت، اس وقت قطعی صراحت کے ساتھ واضح ہو جاتی ہے، جب کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کی موجودگی میں، یہ فرمانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پیش کیا کہ " لا نورث ، ما ترکنا صدقة " ① اور اسی حدیث کی بنا پر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی وارث کو بھی، آپ کے ترکہ میں سے کچھ نہ دیا۔

پھر یہ چیز کہیں بھی مذکور نہیں ہے کہ بنوعباس نے یا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ، بر بناءِ وراثت، خود کو مستحق خلافت قرار دیا ہو۔ بنوعباس کی بابت "مفکر قرآن" کا دعوائے استحقاقِ خلافت، بے بنیاد ہے۔ اَب رہے حضرت علی رضی اللہ عنہ، تو وہ بھی اگر موروثی بنیاد پر خود کو خلافت وامارت کے حق دار سمجھتے ہوتے، تو اپنی زندگی ہی میں، اپنے کسی بیٹے کو، ولی عہد مقرر کر ڈالتے، جس طرح، بنواُمیہ، حکومت وامارت کو، ذاتی جاگیر سمجھتے ہوئے کرتے رہے ہیں۔

مزید برآں، تقسیم وراثت کا تعلق، متروکہ مال وجائیداد سے ہے (نہ کہ منصب امارت اور انعقادِ خلافت سے)۔ پھر تقسیم میراث کا یہ حکم بھی، عام اہل ایمان کے لیے ہے (نہ کہ انبیاء ومرسلین کے لیے)۔ گروہ انبیاء میں، جو میراث چلتی ہے، وہ دولت زَر کی بجائے دولتِ علم وفکر کی میراث ہے۔

اب کیا حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کو دین اسلام کی سمجھ بوجھ، اور فہم قرآن و حدیث سے اس قدر کورا سمجھ لیا جائے کہ وہ (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) امر خلافت کو موروثی ترکہ جان کر، دعوائے استحقاق پیش کر رہے تھے؟

(۱۹) رجعت کا عقیدہ اور ابن سبا

سیاسی محاذ پر، "انتقام عجم" کی اگلی کڑی میں، عبد اللہ بن سباء کا کردار واضح کرتے

---

① بخاری ، کتاب الفرائض، باب قول النبی لا نورث ما ترکنا صدقة

ہوئے، ''مفکر قرآن'' خالص جھوٹ کی بجائے، ''جھوٹ اور سچ'' کا ایک ملغوبہ پیش کرتے ہیں، کیونکہ خالص جھوٹ کی نسبت، وہ جھوٹ، زیادہ غارت گر ہوتا ہے جس میں سچ کی بھی آمیزش ہو۔ لیکن قبل، اس کے کہ صدق و کذب کا ملغوبہ پرویز پیش کیا جائے، یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ عبداللہ بن سبا نام کی شخصیت کوئی واقعی اور حقیقی شخصیت تھی یا ''عجمی سازش'' کی طرح، کوئی فرضی اور من گھڑت ہستی تھی جس کا تاریخی وجود، بجائے خود، محتاجِ ثبوت ہے۔ طلوع اسلام لکھتا ہے

> سب سے پہلے جس شخص نے، ان کی (یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی) الوہیت کی دعوت دی، وہ عبداللہ بن سبا یہودی تھا۔ ❶

یہ اقتباس، ایک مصری منکر حدیث، محمد امین کا ہے، جس میں عبداللہ بن سبا کے وجود کو تسلیم کیا گیا ہے، طلوع اسلام نے، اس پر یہ حاشیہ، اسی صفحہ کے آخر میں لکھا ہے۔

> بعض محققین کا خیال ہے کہ عبداللہ بن سبا محض ایک فرضی کردار ہے، جس کا تاریخی حیثیت سے کوئی محقق وجود ثابت نہیں۔ ❷

قطع نظر اس کے کہ عبداللہ بن سبا، کوئی فرضی کردار تھا، یا حقیقی شخصیت تھی، اس نے ''مفکر قرآن'' کی فرضی اور من گھڑت ''عجمی سازش'' کی کامیابی میں جو کچھ کیا، اس کا ذکر، انہوں نے بایں الفاظ کیا ہے۔

> اس نے پہلے یہ کہا کہ مجھے مسلمانوں کی سادگی پر تعجب آتا ہے کہ وہ اس کے تو قائل ہیں کہ حضرت عیسیٰ دوبارہ دنیا میں آئیں گے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دوبارہ دنیا میں آنے کو نہیں مانتے۔ ان کی مراجعت دنیا میں ضرور ہوگی۔ ❸

حقیقت یہ ہے کہ ''مفکر قرآن'' از حد جھوٹے، انتہائی متناقض الکلام اور بہت تضاد گو تھے

---

❶ طلوع اسلام، اپریل مئی ۱۹۵۸ء، ص ۹۰۔

❷ ایضاً۔

❸ شاہکار رسالت ص ۳۵۰۔

(اس کے دلائل و شواہد سے میری کتاب "جناب غلام احمد پرویز، اپنے الفاظ کے آئینے میں" بھری پڑی ہے۔ انہوں نے جہاں، جس جھوٹ کی ضرورت محسوس کی، اسے لکھ ڈالا، بغیر اس بات کی پروا کیے کہ ان کے اس جھوٹ سے کس قدر تضادات و تناقضات پیدا ہو رہے ہیں۔

اب یہاں دیکھیے کہ ان کی عبارت، اس امر کو بغیر کسی شک وشبہ کے، یہ واضح کر رہی ہے کہ خلافت راشدہ میں (بعد کے دور ملوکیت میں نہیں بلکہ خلافت علی منہاج النبوت میں) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاں یہ عقیدہ مسلم اور شائع و ذائع تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام، دنیا میں دوبارہ تشریف لائیں گے، اور (بقول پرویز صاحب) عبداللہ بن سبا نے، اسی عقیدہ کو اساس بنا کر، رجعت محمدی کا عقیدہ گھڑا، جو (بقول اُن کے) امت مسلمہ میں رائج نہ ہو سکا۔ لیکن دوسری طرف، کتاب اللہ کے یہی متناقض الکلام "مفسر"، اور یہی تضاد گو "مفکر" یہ کہتے ہیں کہ

> جب ہم نزول مسیح کے عقیدہ کو قرآن کی رو سے دیکھتے ہیں، تو اس عقیدہ کے غیر قرآنی ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا۔ ①

اور ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

> وہ مسلمان، جو دین کی سند قرآن کریم سے لاتے ہیں، نہ حضرت عیسیٰ کی تشریف آوری کا عقیدہ رکھتے ہیں، نہ کسی مہدی یا مجدد کی آمد کا۔ اس لیے کہ قرآن، اس قسم کے کسی عقیدہ کی تائید نہیں کرتا۔ ②

پھر "مفکر قرآن" صاحب، یہ راگ بھی الاپا کرتے تھے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہاں دین کی سند، صرف قرآن کریم تھا۔ اور خلافت راشدہ میں "قرآنی نظام" ہی قائم تھا۔ اب اگر پرویز صاحب کی یہ بات تسلیم کر لی جائے، تو درایتاً یہ ماننا پڑتا ہے کہ صحابہ کرام کو، نزول مسیح کے عقیدہ کا ازروئے قرآن، منکر ہونا چاہیے، لیکن شاہکار رسالت کا اس ضمن میں اوپر پیش کیا گیا اقتباس، غیر مبہم انداز میں، صحابہ کے ہاں نزول مسیح کے عقیدہ کی اشاعت و قبولیت کی وضاحت

---

① طلوع اسلام، نومبر ۱۹۵۳ء، ص ۳۷۔۳۸۔

② طلوع اسلام، مئی ۱۹۵۷ء، ص ۵۵۔

کرتا ہے، کیونکہ اسی عقیدہ کو بنیاد بنا کر، عبد اللہ بن سبا نے، رجعتِ محمدی کا عقیدہ تراش کر، امت میں پھیلانے کی کوشش کی تھی۔ اب یا تو یہ بات مان لیجیے کہ صحابہ کے ہاں نرا قرآن، دستورِ حیات نہ تھا۔ بلکہ سنتِ رسول بھی اسی حیثیت کی حامل تھی۔ یا پھر یہ تسلیم کر لیجیے کہ خلافتِ راشدہ میں بھی صحابہ کرام جیسے لوگ، ''غیر قرآنی عقائد'' کو اپنے سینوں سے لگائے ہوئے تھے۔

پھر یہاں ''مفکرِ قرآن'' کا یہ تضاد بھی ملاحظہ فرمائیے کہ ایک طرف، تو ان کی ایک عبارت، نزولِ مسیح کے عقیدہ کو خلافتِ راشدہ میں مقبول و متداول قرار دیتی ہے (اور اسی کی بنیاد پر، ابن سبا نے رجعتِ محمدی کا عقیدہ تراش ڈالا) اور دوسری طرف، وہ یہ بھی فرماتے ہیں، کہ رفعِ مسیح اور نزولِ مسیح جیسے تصورات، امتِ مسلمہ میں اس وقت پیدا ہوئے تھے، جب امت کی گاڑی، قرآنی پٹڑی سے اتر گئی تھی:

> یہ تصورات، اس وقت پیدا ہوئے تھے، جب امت کی نگاہوں سے قرآنی نظام اوجھل ہو چکا تھا۔ ❶

حقیقت یہ ہے کہ ''مفکرِ قرآن'' کا پورا لٹریچر، مداری کی ایسی پٹاری ہے، جس میں تضادات و تناقضات کا وافر ذخیرہ، ہر وقت موجود رہتا تھا، اور وہ، جب اور جہاں، جس تصور کو پیش کرنا مفیدِ مطلب سمجھتے تھے، اسے پیش کر ڈالتے تھے۔ اور پھر اگر کسی دوسرے مقام پر، کوئی اور تصور پیش کرنا قرینِ مصلحت ہوتا، تو بلا جھجک وہ پیش کر ڈالتے تھے، اس طرح، ان کے تضادات و تناقضات میں، ماشاء اللہ دن دگنی رات چوگنی ترقی ہوتی رہتی تھی۔ لیکن وہ، اس اعتبار سے انتہائی خوش بخت اور خوش نصیب تھے کہ انہیں ایسے اندھے مقلدین کا ایک ٹولا میسر آ گیا، جنہیں یا تو یہ صریح تضادات نظر ہی نہیں آتے تھے یا پھر وہ یہ محسوس کرتے تھے، کہ ''مصلحت اندیشیوں کی دیمک نے انہیں چاٹ کر'' فی الحقیقت کالعدم کر دیا ہے اور اب یہ تضادات، انہیں دکھائی ہی نہیں دیتے، اور وہ یہ ڈھنڈورہ پیٹنے میں، خود کو ''حق بجانب'' سمجھتے

---

❶ طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۵۳ء، ص ۳۸۔

ہیں کہ

> پرویز صاحب کی تحریروں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ نہ کبھی پرانی ہوتی ہیں، اور نہ ہی ان میں کہیں تضاد واقع ہوتا ہے، یہ اس لئے کہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں، قرآن کریم کی روشنی میں لکھتے ہیں، اور قرآن کا یہ اعجاز ہے کہ اس کے حقائق کبھی پرانے نہیں ہوتے۔ ❶

لیکن بیچارے اندھے مقلدین کے بارے میں تو یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ پرویز صاحب اور طلوع اسلام کے برسوں پر پھیلے ہوئے تضادات پر ان کی نگاہ حاوی نہ ہو سکی ہو، اس لئے وہ تضاداتِ پرویز کی نفی کرنے کے اعلان میں معذور ہوں، لیکن خود پرویز صاحب پر تو، بہر حال، یہ بات عیاں تھی کہ وہ کس قدر متناقض الکلام اور تضاد گو واقع ہوئے تھے، اس لئے، اُنہیں تو دنیا بھر کو یہ تحدی پیش کرتے ہوئے شرمانا چاہئے تھا کہ

> ان کی اشاعتوں کے انبار میں سے آپ کوئی سے دو پرچے اٹھا لیجئے۔ جہاں تک قرآنی فکر کا تعلق ہے، آپ کو ان میں کوئی تضاد، کوئی تخالف نہیں ملے گا۔ ❷

لیکن اس شرم و حیا کو بالائے طاق رکھتے ہوئے، ''مفکر قرآن'' صاحب، نہ صرف یہ کہ اپنے تضادات کے عدم وجود کا اعلان کیا کرتے تھے، بلکہ وہ، اپنے ساتھ قرآن مجید کو بھی گمراہی کے کھڈ میں لے گرا کرتے تھے، اور یہ کہا کرتے تھے کہ ان کے لٹریچر میں تضاد و تناقض کے عدم وجود کی وجہ، ان کا قرآن کریم کی روشنی میں لکھنا ہے، اور چونکہ قرآن، خود تضادات سے بالاتر ہے، اس لئے ان کی تحریریں بھی تضادات سے پاک ہیں۔

> میں نے جو کچھ ۱۹۳۸ء میں کہا تھا، ۱۹۸۰ء میں بھی وہی کہتا ہوں، کیونکہ یہ قرآنی حقائق پر مبنی ہے، اور قرآنی حقائق ابدی اور غیر متبدل ہیں...... قرآن کو سند اور حجت ماننے والے کے لئے، یہ ناممکن ہے کہ وہ آج کچھ کہہ دے اور کل کچھ اور

---

❶ طلوع اسلام، فروری ۱۹۸۳ء، ص ۲۶۔

❷ طلوع اسلام، جولائی ۱۹۸۴ء، ص ۳۳۔

..........قرآن کا متبع، نہ مداہنت کرسکتا ہے نہ کسی سے مفاہمت۔ ①

ہر وہ شخص، جس کی نگاہ ۱۹۳۸ء تا ۱۹۸۵ء، پرویز صاحب کی وفات تک کی طلوع اسلام کی فائل پر حاوی ہے، یہ جانتا ہے کہ طلوع اسلام اور کتب پرویز، تضادات و تناقضات کا بحر ناپیدا کنار ہیں جس کا احاطہ اس لیے ممکن نہیں کہ ؎ سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے اور نزول مسیح کی بابت، ان کا یہ تضاد، اسی بحر بیکراں کا محض ایک قطرہ ہے۔

(۲۰) حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق عقیدۂ وصایت

عبداللہ بن سبا کی طرف سے رجعت محمدی کے جس عقیدے کی ابتداع و اختراع اور پھر تبلیغ و اشاعت کی گئی، وہ امت محمدیہ میں رائج نہ ہوسکا، لیکن ایک دوسرا عقیدہ، امت مسلمہ کے ایک شرذمۂ قلیلہ میں بار پا گیا۔ پرویز صاحب لکھتے ہیں:

> اس کے بعد، اس (عبداللہ بن سبا) نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہر پیغمبر کا ایک خلیفہ اور وصی ہوتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے وصی، حضرت علی ہیں۔ حضور ﷺ کی نص (واضح ارشاد) کے مطابق، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو، آپ ﷺ کے بعد، خلیفہ ہونا چاہیے تھا۔ جن لوگوں نے انہیں خلیفہ نہیں بننے دیا، انہوں نے ان کے حق کو غصب کیا ہے۔ ②

یہاں دو باتیں، قابل غور ہیں:

(۱)......پہلی بات تو یہ کہ امت محمدیہ کا مجموعی مزاج، ہر عصر و مصر میں اور بالخصوص صدر اول میں، یہ رہا ہے کہ مسلمانوں کو، بعد از خدا، سب سے زیادہ محبت، حضور نبی اکرم ﷺ ہی کے ساتھ رہی ہے، جس کا تقاضا یہ تھا کہ اس شدید محبت کی بناء پر، آپ ﷺ کے بارے میں، ہر وہ تصور مقبول ہو جاتا جس میں کسی بھی طرح، آپ ﷺ کی عزت افزائی، فضیلت

---

① طلوع اسلام، نومبر ۱۹۸۳ء، ص ۵۲۔

② شاہکار رسالت، ص ۴۵۰۔

مآبی، اور علو مرتبت کا اظہار پایا جاتا ہو۔ اس اعتبار سے ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جس طرح عیسائیوں میں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ان کی غالی محبت کے باعث، غلط معتقدات پھیل گئے، اُسی طرح، آپ ﷺ کی بابت بھی، رجعت محمدی کا عقیدہ پھیل جاتا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں (اور ''مفکر قرآن'' کو بھی اس کا اعتراف ہے) کہ امت مسلمہ میں رجعتِ محمدی کا عقیدہ رائج نہ ہو سکا۔ لیکن دوسری طرف (بقول پرویز صاحب) صرف شیعہ حضرات کے ہاں، ان کے ائمہ کے متعلق یہ عقیدہ پھیل گیا، اور انہوں نے اس بناء پر، نبی علیہ الصلاۃ والسلام کے بعد، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آنحضرت ﷺ کا خلیفہ اور وصی تسلیم کرتے ہوئے، امامت کا حق دار قرار دیا۔ اور اولین خلفاءِ ثلاثہ کو غاصب امامت تسلیم کیا۔ ان تصورات کی ابتداء و ابتداع، خواہ عبداللہ بن سبا کے ہاتھوں ہوئی ہو، یا خود بعد کے شیعہ حضرات کے ہاتھوں، بہرحال، یہ عقائد و نظریات پوری امت میں مقبول نہ ہو پائے۔ ان کا دائرۂ اثر، شیعہ حضرات تک ہی محدود رہا، جو ہمیشہ سے بحیثیت مجموعی، امتِ مسلمہ کا انتہائی حقیر و صغیر اور قلیل و ضعیف طبقہ رہا ہے۔ پھر اس عقیدہ کی حیثیت، عبداللہ بن سبا کے دور میں، اگر تھی بھی، تو محض سیاسی حیثیت تھی، مذہبی ہرگز نہ تھی۔ مذہبی حیثیت، اسے بہت بعد میں حاصل ہوئی۔ لیکن ہمارے ''مفکر قرآن'' صاحب، اسے اس انداز میں بیان کرتے ہیں کہ گویا پوری امت مسلمہ، اس عقیدے کا شکار ہو کر، ''عجمی سازش'' کا نشانہ بن گئی۔

(۲)...... دوسری بات یہ ہے کہ رجعتِ امام کا عقیدہ، عقل و دانش کی رو سے، رجعت محمدی کے عقیدہ سے انتہائی کمزور اور بودا عقیدہ ہے، رجعتِ عیسیٰ علیہ السلام اور رجعتِ محمد ﷺ میں، بہرحال، ایک قیاسی مماثلت پائی جاتی ہے۔ لیکن رجعتِ امام کے عقیدہ میں، تو سرے سے کوئی مماثلت پائی ہی نہیں جاتی۔ اب کیا یہ بات، باعث تعجب اور موجب حیرت نہیں کہ امت کے کسی طبقہ میں بھی، رجعتِ محمد ﷺ کا قوی عقیدہ بار نہ پا سکا، لیکن رجعتِ امام کا بودا نظریہ، اگر مقبول ہوا بھی، تو صرف ایک محدود سے گروہ میں۔ آخر یہ کیوں؟ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح، رجعتِ عیسیٰ پر قیاس کرتے ہوئے، رجعت محمد ﷺ کا عقیدہ، اختراعی اور

اختلاقی عقیدہ ہے، بالکل اسی طرح رجعت امام کا عقیدہ بھی وضعی اور من گھڑت عقیدہ ہے۔ حضور اکرم ﷺ سے، نہ خود اپنی ہی رجعت کا عقیدہ ماثور ہے اور نہ ہی رجعت امام کا، اور نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وصی اور خلیفہ ہونے کا۔ اگر خود عبداللہ بن سبا نے، خلافتِ علی رضی اللہ عنہ اور وصایت علی رضی اللہ عنہ کا عقیدہ پیش کیا بھی ہو، تو وہ، اس وقت، اُسی طرح مقبول نہ ہو پایا۔ جس طرح رجعتِ محمد ﷺ کا عقیدہ مقبول نہ ہوسکا تھا۔ شیعہ حضرات کا رجعتِ امام کا عقیدہ، بہت بعد کا اپنایا ہوا عقیدہ ہے۔ عبداللہ بن سبا کی شورش، محض ایک سیاسی شورش تھی، جس کا مقصد، محض حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی پالیسیوں پر، ان کے ساتھ اختلاف و ناراضگی کے باعث، اُن کو ان کے منصب خلافت سے معزول کر ڈالنا تھا۔ اس سے زاید جو کچھ بھی، ''مفکر قرآن'' نے بیان کیا ہے، وہ، صرف اور صرف ''عجمی سازش'' کی تکمیلِ عمارت کے لیے، خود اپنی طرف سے، اینٹ گارا مہیا کرنے کی کوشش کی ہے۔

(۲۱) ''عجمی سازش'' کا ایران سے تعلق، بذریعہ شہر بانو

''مفکر قرآن'' نے اپنی مخترعہ ''عجمی سازش'' کا تعلق، ایران سے جوڑنے کے سلسلہ میں، جن کڑیوں کا ذکر کیا ہے، ان میں ایک کڑی، یزدگرد کی اس بیٹی کو بھی قرار دیا گیا ہے جو عہد فاروقی میں، ایرانی اسیرات میں شامل ہوکر، مدینہ آئی تھی، اور پھر اس نے امام حسین رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں رہنا قبول کرلیا تھا۔ یہ کڑی بھی، ''مفکر قرآن'' کے خارزار تضادات میں اضافہ کا سبب ہے۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب شاہکار رسالت کے صفحہ ۱۸۸ اور ۱۸۹ پر ''دلائل و براہین'' کے ساتھ یہ ''ثابت'' کرتے ہیں کہ فتح ایران کے بعد، بناتِ یزدگرد کا اسیرانِ جنگ میں شامل ہوکر، مدینہ آنا، اور پھر ان میں سے، ایک کا حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونا، غلط اور باطل قصہ ہے۔ لیکن اسی کتاب کے آخری باب میں، جو ''عجمی سازش'' پر لکھا گیا ہے، وہ، نہ صرف علماء مغرب کے، بلکہ شیعہ حضرات کی کتب سے بھی، ایسے اقتباسات پیش کرتے ہیں، جو یکے از بناتِ یزدگرد کا، زوجۂ حسین رضی اللہ عنہ ہونا ثابت کرتے ہیں،

تا کہ اس کے ذریعے، اپنی خود ساختہ ''عجمی سازش'' کو ایران کے ساتھ مربوط کیا جا سکے۔ چنانچہ پرویز صاحب، محمد حسین ہیکل کی کتاب ''عمر فاروق اعظم'' میں سے، اُس ''تاریخ المؤرّخ'' کا ایک طویل اقتباس پیش کرتے ہیں، جو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی شائع کردہ ہے۔ اس طویل اقتباس کا وہ متعلقہ حصہ ملاحظہ فرمایئے جس میں بنت یزدگرد کو، امام حسین رضی اللہ عنہ کی زوجہ قرار دیا گیا ہے:

> جب حضرت علی رضی اللہ عنہ وفات پا گئے تو ایرانی، ان کے صاحبزادوں (حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ) کے گرد جمع ہوگئے، اور ان کے بعد، ان کی اولاد کے گرد۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اکاسرۂ بنی ساسان کے آخری تاجدار کی بیٹی سے شادی کی تھی۔ چنانچہ اس ازدواج سے ''امامت'' مقدس حق کے ساتھ رشتہ بدامن ہوگئی۔ پھر کربلا کے میدان میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے خون نے اس وحدت کو متبرک بنا دیا، جو اسلام اور قدیم ایران کے درمیان قائم ہوئی تھی۔ ❶

اس کے بعد، شیعہ حضرات کی ایک کتاب، اصول الکافی، کے حوالہ سے، ذکر مولدِ علیؒ بن الحسین رضی اللہ عنہ کے ضمن میں، پرویز صاحب نے یہ لکھا ہے:

> ان کی والدہ کا نام سلامہ (زیادہ مشہور شہر بانو ہے، ممکن ہے یہ نام اسلامی ہو) بنت یزدگرد بن شہریار بن شیرویہ بن کسریٰ تھا، اور یزدگرد، ایران کا آخری بادشاہ تھا۔ ❷

اب یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ شاہکارِ رسالت کے چھٹے باب میں (شہر بانو کے زوجۂ حسین رضی اللہ عنہ ہونے کے) جس قصے کو ''بوجوہ غلط'' قرار دیا گیا ہے، آخری باب میں اسی قصہ کو صحیح اور واقعی حقیقت قرار دیتے ہوئے، پرویز صاحب، ایران کی اس شاہی خاتون کے دو

---

❶ شاہکار رسالت، ص ۴۵۲۔

❷ شاہکار رسالت ص ۴۵۲ تا ۴۵۳۔

ناموں میں سے ایک نام کے اسلامی ہونے کو ممکن بتا رہے ہیں۔ ایسی ہی باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ انسان خواہ کتنا ہی چوکنا، محتاط اور بیدار مغز ہو کر جھوٹ بولے، وہ بہرحال اسے دوام کے ساتھ نبھا نہیں سکتا ہے، کہیں نہ کہیں سچی بات، اس کے منہ یا قلم سے نکل ہی جاتی ہے، جو اس کے جھوٹ کے ڈھول کا پول کھول دیتی ہے، خود پرویز صاحب لکھتے ہیں:

> حقیقت کے بیان میں کبھی تعارض و تناقض نہیں ہوتا کسی واقعہ کی جزئیات، آپ جس قدر زیادہ سے زیادہ بیان کرتے چلے جائیں، کڑیوں سے کڑیاں ملتی چلی جائیں گی، لیکن جو بات، واقعہ کے خلاف گھڑی جائے گی، اس کی جزئیات بیان کرتے وقت، کہیں نہ کہیں سچی بات بھی منہ سے نکل ہی جاتی ہے، اس لیے کہ انسان کا حافظہ اتنا قوی نہیں ہوتا کہ وہ قدم قدم پر زندگی بھر اپنے تصنع کا خیال رکھ سکے، لہٰذا اس کی جزئیات میں آپ کو تعارض و تناقض کے بہت ہی بھونڈے نمونے نظر آئیں گے۔ ①

بہرحال، اس کے بعد، شیعہ حضرات کی کتاب کا حوالہ ملاحظہ فرمایئے، جسے تردیداً نہیں، بلکہ تائیداً، استدلالاً اور استشہاداً پیش کیا گیا ہے:

> امام باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ جب بنت یزدگرد، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئیں تو مدینہ کی باکرہ لڑکیاں، اس کا حسن و جمال دیکھنے بالائے بام آئیں۔ جب مسجد میں داخل ہوئیں تو چہرہ کی تابندگی سے مسجد روشن ہوگئی۔ عمر رضی اللہ عنہ نے جب اُس کی طرف دیکھا تو انہوں نے اپنا چہرہ چھپالیا، اور کہا کہ ”برا ہو، ہرمز کا کہ اس کی سوءِ تدبیر سے یہ روز بد دیکھنا نصیب ہوا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ”کیا تو مجھے گالی دیتی ہے (کہ میرے دیکھنے کو روز بد کہا) اور ان کی اذیت کا ارادہ کیا۔ امیر المؤمنین نے کہا ”ایسا نہیں ہے، اس کو اختیار دو، کہ یہ مسلمانوں میں سے کسی کو اپنے لیے اختیار کرلے، اس کے حصہ غنیمت میں، اس کو سمجھ لیا جائے، جب اختیار دیا گیا تو

---

① طلوع اسلام، جون ۱۹۵۳ء، ص ۳۹۔

وہ لوگوں کو دیکھتی ہوئی چلیں (اور امام حسین رضی اللہ عنہ کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا) امیر المومنین نے کہا "تمہارا نام کیا ہے؟" کہا "جہاں شاہ" حضرت نے فرمایا "نہیں، بلکہ شہر بانو۔" پھر امام حسین رضی اللہ عنہ سے فرمایا "اے ابوعبد اللہ! تمہارا ایک بیٹا اس کے بطن سے ہوگا جو اہل زمین میں سب سے بہتر ہوگا چنانچہ علی بن الحسین پیدا ہوئے، پس وہ بہترین عرب تھے، ہاشمی ہونے کی وجہ سے، اور بہترین عجم تھے، ایرانی ہونے کی وجہ سے۔ (کتاب الشافی ج ۱، ص۷۹ـ۵۷۸، ترجمہ اصول کافی، جلد اوّل) ❶

اب ذرا اسی کتاب (شاہکار رسالت) کے صفحہ ۱۸۸ کا یہ اقتباس بھی ملاحظہ فرمائیے۔ جس میں شہر بانو کے حلیلۂ حسین رضی اللہ عنہ ہونے کا انکار کیا گیا ہے۔

ہمارے ہاں یہ قصہ بھی مشہور ہے کہ جب فارس فتح ہوا، تو یزدگرد شہنشاہ فارس کی تین بیٹیاں گرفتار ہوکر مدینہ آئیں۔ حضرت عمر نے حکم دیا کہ انہیں عام لونڈیوں کی طرح سر بازار فروخت کردیا جائے، اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ خاندانِ شاہی کے ساتھ اس قسم کا سلوک نہیں کرنا چاہیے، ان لڑکیوں کی قیمت کا اندازہ لگالیا جائے، اور انہیں اسی قیمت کے عوض، معزز اشخاص کے سپرد کردیا جائے۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں، خود اپنی سپرد داری میں لے لیا، اور ان میں سے ایک امام حسین رضی اللہ عنہ کو، ایک محمد بن ابی بکر کو، ایک عبد اللہ بن عمر کو عنایت کردی۔ جو لڑکی امام حسین کو ملی، وہ ان کی زوجۂ محترمہ شہر بانو کے نام سے مشہور ہے۔

یہ قصہ بوجوہ باطل ہے۔ ❷

قصۂ شہر بانو کے وجوہِ بطلان کا اجمالی جائزہ

اس کے بعد، جو وجوہِ بطلان بیان کئے گئے ہیں، ان میں سے بعض قرآن کریم کی آیت

---

❶ شاہکار رسالت ص۴۵۳۔

❷ شاہکار رسالت، ص۱۸۸۔

فاما منا بعد واما فداءً کے غلط ترجمہ ومفہوم پر مبنی ہیں۔ کیونکہ ''مفکر قرآن'' کا طریقۂ واردات یہ ہوا کرتا تھا کہ وہ غلط ترجمۂ آیت اور باطل تفسیر کے ذریعہ، قرآن کے گلے ایک خود ساختہ مفہوم مڑھ دیا کرتے تھے، اور پھر اسے معیار جان کر، ہر اُس حقیقت کا انکار کر ڈالتے تھے، جو ان کے منسوب الی القرآن مفہوم کے خلاف ہوتی تھی۔ اور بعض وجوہِ بطلان ایسی بیان کی ہیں جو اُس وقت کے حالات کو پیش نظر رکھنے کی بجائے، دورِ حاضر کے احوال کو ملحوظ خاطر رکھ کر، اس انداز میں پیش کی گئی ہیں کہ آج کا انسان اسے غیر مناسب سمجھنے پر مجبور ہو جائے۔ اور کہیں یہ دلیل پیش کی ہے کہ اس قصہ میں متعلقہ افراد کی عمریں اتنی قلیل ہیں کہ ان کے متعلق یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ اس قلت عمر میں، واقعہ ویسا ہی ہے جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے۔ مثلاً پرویز صاحب، لکھتے ہیں

> امام حسین رضی اللہ عنہ کی پیدائش ۵ھ میں ہوئی، اور مدائن کی فتح ۱۶ھ میں۔ اس لحاظ سے اس وقت ان کی عمر، ۱۱ یا ۱۲ برس کی تھی۔ یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں اتنی چھوٹی عمر میں لونڈی عطا فرما دی ہو۔ ❶

گویا کسی حقیقت کے حقیقت ہونے کے لئے، یہ شرط لازم ہے کہ ''مفکر قرآن''، اسے ''باور کر سکیں''۔ اگر ان کی طرف سے یہ باور نہ کیا جا سکتا ہو، تو وہ حقیقت، حقیقت ہونے کے باوجود بھی ''نا قابل باور'' ہے۔

''مفکر قرآن'' اور دیگر منکرین حدیث کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص، اور ان کے والد محترم (حضرت عمرو بن العاص) کی عمروں میں صرف بارہ سال کا فرق تھا۔ علامہ ابن قتیبہ، اپنی کتاب المعارف میں، عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے متعلق لکھتے ہیں۔

> وکان بین عبد الله ابن عمرو وبین ابیه اثنتا عشرة سنة . ❷

---

❶ شاہکار رسالت، ص۱۸۹۔

❷ المعارف، ص۱۲۵۔

عبداللہ بن عمرو اور ان کے والد (عمرو بن العاص) کے درمیان صرف ۱۲ سال کا تفاوت تھا۔

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جب حضرت عبداللہ بن عمرو پیدا ہوئے تھے، تو اُس وقت، ان کے والد (حضرت عمرو بن العاص) کی عمر بارہ سال تھی۔ اور اسی عمر میں وہ باپ بھی بن گئے تھے، اگر حضرت عبداللہ بن عمرو بطن مادر میں، چھ ماہ کی اقل مدت سے لے کر، نو ماہ تک بھی رہے ہوں، تو اس کا معنی یہ ہے کہ سوا گیارہ یا ساڑھے گیارہ سال کی عمر میں، عمرو بن العاص، بالغ تھے۔

اسی مقام پر، ابن قتیبہ نے حسن بن صالح کے حوالہ سے یہ بھی بیان کیا ہے کہ

كانت لنا جارية بنت احدى وعشرين سنة وهي جدة . ①

ہمارے ہاں اکیس سال کی ایک کنیز تھی، جو نانی بن چکی تھی۔

اکیس سال کی عمر میں کسی خاتون کا نانی بن جانا، یہ معنی رکھتا ہے کہ ماں کی عمر ساڑھے دس سال کے لگ بھگ ہوگی۔

حقائق اور واقعات کی دنیا میں، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے لیے گیارہ بارہ سال کی عمر میں، کسی لونڈی کا فراہم کیا جانا، نہ تو عقل و دانش کے خلاف ہے، نہ ہی نقل و روایت کے۔ نہ یہ کوئی انوکھا واقعہ ہے، نہ نرالا، اور نہ کسی واقعہ کا واقعہ ہونا، اس شرط پر موقوف ہے کہ وہ ہمارے ''مفکر قرآن'' کے ''باور'' کرنے کے قابل ہو۔

عمروں کی قلت سے استدلال کرتے ہوئے، پھر یہ بات، ''مفکر قرآن'' کے لیے ''باور'' کیے جانے کے لائق نہیں، کہ یزدگرد کی اکیس سالہ عمر میں ان کی تین بیٹیاں، اس قابل ہوں کہ انہیں بطور لونڈیاں تقسیم کیا جاسکے۔ طبری کے ہاں جب یزدگرد تخت نشین ہوا تھا تو اس کی عمر اکیس سال تھی، اور فتح مدائن کے وقت وہ تقریباً ۲۴ سال کا تھا۔ اگر اکیس برس کی عمر میں، ایک عورت نانی بن سکتی ہے تو ۲۴ سال کے نوجوان کی تین بیٹیاں کیوں بالغ نہیں ہوسکتیں۔

---

① المعارف، ص ۱۲۵۔

پھر یہ بھی ممکن ہے کہ یزدگرد کی عمر ۲۴ سال سے زائد ہی ہو، اس بات کا امکان بھی بعید از قیاس نہیں ہے کہ وہ لڑکیاں یزدگرد کی بیٹیاں نہ ہوں، بلکہ شاہی خاندان کی خواتین ہوں، بہرحال، پرویز صاحب کے انتہائی کمزور احتمالات (جو مبنی بروہم وگمان ہیں) کی بنیاد پر، علماء انساب کی کثیر التعداد، ان شہادات کو ردّ نہیں کیا جاسکتا، جو ایران کے شاہی خاندان کی ان تینوں اسیرات کو بالترتیب، امام حسین رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، اور محمد بن ابی بکر کی ازواج قرار دیتی ہیں، اور پھر ان ہی خواتین کے بطن سے، امام زین العابدین، سالم بن عبداللہ بن عمر، اور قاسم بن محمد بن ابی بکر متولد ہوئے۔ اور یہ تینوں باہم خالہ زاد بھائی تھے۔ لیکن ہم کتب انساب سے اس حقیقت پر شاہد اقتباسات پیش کرنے کی بجائے، طلوع اسلام ہی کی فائل سے چند حوالے نذرِ قارئین کر رہے ہیں۔

(۱)...... ان کے علاوہ، بہت سے علماء ہیں، جن کے ماں باپ عربی اور عجمی ہیں جیسا کہ سالم بن عبداللہ بن عمر بن الخطاب، قاسم بن محمد بن ابی بکر، علی بن الحسین بن علی بن ابی طالب معروف بہ زین العابدین۔ زمخشری نے بیان کیا ہے کہ ان سب کی مائیں، یزدگرد کی بیٹیاں تھیں، اور مثلاً شعبی، جو تابعین کے علامہ شمار ہوتے ہیں، ان کے والد بھی عربی ہیں مگر ان کی والدہ، جلولاء کی گرفتار شدہ عورتوں میں سے ہیں۔ ❶

(۲)...... زمخشری نے اپنی کتاب ربیع الابرار میں بیان کیا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں، جب ایرانی اسیرانِ جنگ کو لے کر، مدینہ میں آئے، تو ان اسیرانِ جنگ میں یزدگرد (شہنشاہِ ایران) کی تین بیٹیاں بھی تھیں۔ لوگوں نے ان قیدیوں کو فروخت کر دیا، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یزدگرد کی بیٹیوں کو بھی فروخت کرنے کا حکم دے دیا، تو حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ شہزادیوں کے ساتھ وہ سلوک تو نہیں کیا جاسکتا جو دوسرے عام لوگوں کے ساتھ

---

❶ طلوع اسلام، ستمبر ۱۹۵۷ء ص ۶۹۔

> کیا جا سکتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ پھر ان کے ساتھ کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ان کی قیمت لگائی جائے، اور جتنی قیمت ان کی لگے، وہ کوئی شخص بیت المال کو ادا کر دے چنانچہ ان کی قیمت لگائی گئی، اور حضرت علی نے وہ قیمت ادا کر کے ان تینوں لڑکیوں کو لے لیا، ان میں سے ایک لڑکی، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو عطا فرمائی، اور دوسری اپنے صاحبزادے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو، اور تیسری حضرت محمد بن ابی بکر الصدیق کو مرحمت فرمائی۔ چنانچہ حضرت عبد اللہ کے ہاں، اس کے بطن سے سالم پیدا ہوئے، اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ہاں زین العابدین پیدا ہوئے، اور محمد کے ہاں، ان کے لڑکے قاسم پیدا ہوئے تھے۔ یہ تینوں آپس میں خالہ زاد بھائی ہیں، اور ان کی مائیں یزدگرد کی بیٹیاں ہیں بعض محققین نے اس میں شک کیا ہے کہ یہ تینوں لڑکیاں یزدگرد کی بیٹیاں نہ تھیں۔ لیکن بظاہر اس میں کوئی شک نظر نہیں آتا کہ ایرانی قوم کے کسی اچھے گھرانے کی لڑکیاں ہوں۔ مبرد کی کتاب الکامل میں ہے کہ مدینہ کے لوگ، باندیوں کے پیٹ سے بچے پیدا کرنے کو پسند نہیں کرتے تھے، مگر جب علی ابن الحسین، قاسم بن محمد اور سالم بن عبد اللہ بڑے ہوئے، اور تینوں فقہ اور پرہیزگاری میں، مدینہ منورہ کے دوسرے نوجوانوں سے فائق ثابت ہوئے، تو لوگوں کو باندیوں کی طرف کافی رغبت ہوگئی۔ ①

خلافت راشدہ بلکہ عہد فاروقی کے یہ واقعات، منکرین حدیث کے سرخیل ''مفکر قرآن'' کے اس مفہوم کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکتے ہیں'' جس کے تحت فاما منا بعد واما فداء'' کو غلامی کے قطعی انسداد و خاتمہ کی شاہ کلید قرار دیتے ہیں۔

اب اگر ''مفکر قرآن'' کا بیان کردہ مفہوم ہی صحیح مفہوم ہوتا اور اسیرانِ حرب کو غلام بنانا ممنوع وحرام قرار پا چکا ہوتا، تو جنگِ نہاوند میں وہ شخص، غلام نہ بنایا گیا ہوتا، جو بعد میں حضرت

---

① طلوع اسلام، مارچ ۱۹۵۶ء، ص ۵۹۔

عمر رضی اللہ عنہ کا قاتل بنا، اور وہ خاتون بھی خلیفہ رابع کی ملکیت میں نہ آ پاتی، جس کے بطن سے محمد بن حنفیہ پیدا ہوئے۔ اور نہ ہی، زین العابدین، قاسم اور سالم کی مائیں، لونڈیاں بن کر، اجلۂ اصحاب رسول کی حلائل قرار پاتیں۔

(۲۲) حضرت سلمان رضی اللہ عنہ فارسی

''عجمی سازش'' کے افسانہ کو، حقیقت کا رنگ دینے کے لئے، ایک اور کڑی کا ذکر، ''مفکر قرآن'' بایں الفاظ کرتے ہیں۔

> حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ، اہل ایران کے سلسلۂ روابط کی ایک کڑی (تاریخی روایات کی رو سے) ایک اور شخصیت بھی ہیں، یعنی حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ، جو مشہور صحابی ہیں۔ ❶

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ فارسی، محض ایک ایرانی ہونے کی بناء پر اس قابل ٹھہرتے ہیں کہ انہیں، اہل ایران کے ساتھ سلسلۂ روابط کی ایک کڑی قرار دے کر ''عجمی سازش'' کے خاکہ میں، ''مفکر قرآن'' صاحب، تفصیلات کا رنگ بھریں۔ لیکن ماسواء، اس کے کہ وہ ایک ایرانی تھے، اور اہل اسلام کی ایران پر چڑھائی سے بہت پہلے، وہ مسلم ہو کر، مدینہ میں رہائش پذیر ہو چکے تھے۔ ان کا کوئی ادنیٰ اور خفیف سا تعلق بھی، وہ ''عجمی سازش'' سے نہیں جوڑ سکے ہیں، حالانکہ رائی کا پہاڑ بنانا تو ایک طرف، وہ، بغیر رائی کے بھی پہاڑ بنا ڈالنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اسی طرح، وہ ان شاہی خواتین کا بھی کوئی تعلق، ''عجمی سازش'' سے پیدا نہ کر سکے، جو حضرات حسین رضی اللہ عنہ، عبد اللہ بن عمر اور محمد بن ابی بکر کی ملکیت میں آئیں، اور نہ ہی ان کے بطون سے پیدا ہونے والے، ان فرزندان عالی شان ہی کا کوئی کردار ''عجمی سازش'' میں ثابت کر سکے ہیں، جو آسمانِ علم و تقویٰ پر، درخشندہ ستارے بن کر چمکے، اور جن کا باندی زادہ ہونا، معاشرے میں باندیوں کی قدر افزائی کا ذریعہ بن گیا۔

---

❶ شاہکار رسالت، ص ۴۵۳۔

یہاں طلوع اسلام کے مزاج کا یہ پہلو بھی، قارئین کرام کی توجہ کا طالب ہے کہ مختلف بلکہ متضاد و متناقض امور وہ اس لیے پیش کرنے کا عادی ہے کہ جس وقت، جہاں، جس چیز کا پیش کرنا، تقاضائے مصلحت پرستی ہو، وہاں وہ چیز پیش کر ڈالی جائے، اور چونکہ وقتاً فوقتاً مصلحتیں بدلتی رہتی ہیں، اس لیے وہ مجبور ہے کہ اپنے آراء و نظریات کو بھی بدلتا رہے، اور دراصل یہی اس کا وہ رویہ ہے جس نے تضادات کے حوالے سے اس کے جملہ لٹریچر کو عمرو عیار کی ایسی زنبیل بنا ڈالا ہے جس میں تضادات و تناقضات کے تیروں کا وافر ذخیرہ ہر وقت موجود رہتا ہے، اور جس وقت جس چیز کو چاہا، اسے پیش کر ڈالا۔ اب یہاں دیکھیے، جب ''عجمی سازش'' کی کڑیوں کا ذکر آیا، تو حضرت سلمان رضی اللہ عنہ فارسی کو ''مشہور صحابی'' کے طور پر تسلیم کر لیا، لیکن جب مصلحت کی دیوی نے اپنا رخِ جلوہ تبدیل کیا، تو ان کی، نہ صرف یہ کہ، صحابیت کا انکار کر ڈالا، بلکہ ان کی شخصیت کو لاشئے قرار دے دیا۔ اور انہیں، ایک ایسی من گھڑت ہستی قرار دیا گیا، جس کا اس دنیا میں کوئی تاریخی وجود ہی نہ تھا۔

ملاحظہ فرمائیے، یہ اقتباس:

> اگر داعی بنو ہاشم سے وابستہ رہتے تو روح ایران جلوہ ریز نہ ہوتی، اور زنادقہ کا اصل مقصد فوت ہو جاتا، اس لیے ایک شخصیت، سلمان رضی اللہ عنہ فارسی کے نام سے، احادیث کے ساتھ گھڑی گئی، یہ کوئی تاریخی شخصیت نہیں۔ ❶

الغرض، جہاں مصلحت کا تقاضا ہوا، وہاں یہ موقف اپنا لیا کہ حضرت سلمان فارسی، ایک تاریخی شخصیت بھی تھے اور صحابیِ رسول بھی تھے، اور اہل ایران کے ساتھ سلسلۂ روابط کے حوالہ سے، ایک کڑی بھی تھے، اور جہاں ''نظریہ ضرورت'' کے ''قرآنی اصول'' کا تقاضا بدل گیا وہاں یہ کہہ دیا کہ وہ تو کوئی تاریخی شخصیت تھے ہی نہیں، جس طرح، احادیثِ رسول من گھڑت تھیں، اسی طرح یہ شخصیت بھی من گھڑت تھی۔

---

❶ طلوع اسلام، نومبر ۱۹۵۴ء، ص ۴۹۔

(۲۳) ''عجمی سازش'' یا عربوں کی قبائلی عصبیت

''مفکر قرآن'' صاحب، جس چیز کو ''عجمی سازش'' کا نام دے کر، شوروغوغا اٹھایا کرتے تھے، اور اُسے اہل ایران کی ریشہ دوانیاں کہا کرتے تھے، اس کا بنظر غائر جائزہ لیا جائے، تو اس کی تہہ میں، جو چیز نظر آتی ہے، وہ محض عرب قبائل کی باہمی چپقلش ہے، نہ کہ شکست خوردہ ایرانیوں کی کوئی سازش۔ لیکن خود ''مفکر قرآن'' کے ہاتھوں، جس ''عربی سازش'' کی داغ بیل ڈالی جا چکی ہے، اس پر پردہ ڈالے رکھنے کے لئے، ایرانیوں کی ''عجمی سازش'' کا خوب ڈھنڈورا پیٹا کرتے تھے۔ چنانچہ اپنے اس افسانے کی بناوٹ و ساخت کے دوران، یہ لکھتے ہیں کہ

> اگرچہ ایرانی اس گھرانے کو تاج نہ پہنا سکے جنہیں تاج پہنانے کے لئے انہوں نے اپنی کوششیں صرف کر دی تھیں، لیکن انہوں نے سلطنت بنوامیہ کے ہاتھ سے چھین کر، بنوعباس کے ہاتھ میں دے دی، جو رسول اللہ کے قرابتدار تھے۔ چونکہ ہمارے پیش نظر مقصد، یہ بتانا ہے کہ اس زمانے کے ایرانیوں نے کس طرح اسلامی مملکت میں خلفشار پیدا کر کے، اسے کمزور کر دیا۔ اس لئے تاریخ کا یہ گوشہ بھی ہمارے موضوع سے متعلق ہو جاتا ہے کہ انہوں نے، ان سازشوں کا سلسلہ کس طرح جاری رکھا، جس کے نتیجہ میں سلطنت، بنوامیہ کے ہاتھ سے نکل کر، بنوعباس کی طرف منتقل ہو گئی، اور پھر سقوط بغداد کے بعد، اس کا خاتمہ ہی ہو گیا۔ ①

اور قدرے آگے چل کر، پھر فرماتے ہیں

> جب سلطنت بنی امیہ کی طرف منتقل ہو گئی تو ایرانیوں کی سازشوں کا رخ بھی، ان ہی کی طرف پھر گیا۔ اس مقصد کے لئے، انہیں بنی عباس کی شکل میں ایک مؤثر مہرہ ہاتھ آ گیا۔ بنی عباس اور بنی امیہ، ایک ہی شجر کی دو شاخیں تھیں۔ ②

---

① شاہکار رسالت، ص ۴۵۵۔

② شاہکار رسالت، ص ۴۵۶۔

ان اقتباسات میں، چند امور قابل غور ہیں۔

(ا)...... یہ کہنا کہ...... ''شکست خوردہ ایرانی، ساسانی بادشاہوں کو دوبارہ تاج پہنانا چاہتے تھے (اگر چہ وہ ایسا کر نہ سکے)''...... قطعی جھوٹ اور بے اصل بات ہے، کیونکہ جہاں تک ایرانی عوام کا تعلق ہے، وہ ایرانی بادشاہوں کے ظلم وستم کا نشانہ بنے ہوئے تھے، ان کے زمیندار، بھاری ٹیکسوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔ ان کی شخصی آزادی کچلی جارہی تھی۔ ان کے حقوق پامال ہورہے تھے۔ اسلام نے ظلم وستم کی جگہ، عدل وانصاف کی فضا مہیا کی۔ ان پر سے وہ بوجھ اتار ڈالے جن کے نیچے وہ دبے ہوئے کراہ رہے تھے۔ انہیں ہر طرح کی آزادی، امن، چین، سکون اور اطمینان عطا کیا، لہٰذا، یہ ناممکن تھا کہ جو اسلامی تعلیمات سے بے حد متاثر تھے وہ، مسلمانوں کے خلاف، اُن ساسانی بادشاہوں کے حق میں جدوجہد کرتے، جن کے ستم و جور سے اسلام نے انہیں نجات دلائی تھی۔ اب رہے وہ سرداران قوم، جو ایران میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے، اور مختلف علاقوں کے والی، اور صوبوں کے حاکم تھے، تو وہ اس وقت تک اسلامی عساکر کی مزاحمت کرتے رہے جب تک ایرانی سلطنت کا مکمل خاتمہ نہیں ہوا، اور یزدگرد مارا نہیں گیا۔ پھر ان سرداروں کی یہ مزاحمت بھی، کسی ''عجمی سازش'' کا حصہ نہ تھی۔ بلکہ محض اپنے اقتدار کو محفوظ رکھنے کے لیے تھی، جیسا کہ مولانا شبلی نعمانی فرماتے ہیں:

> وہاں (یعنی ایران میں) سلطنت کے نیچے، بہت سے بڑے بڑے رئیس تھے، جو بڑے بڑے اضلاع اور صوبوں کے مالک تھے۔ وہ، سلطنت کے لیے نہیں، بلکہ اپنی ذاتی حکومت کے لیے لڑتے تھے۔ ❶

اور جب ان کا اقتدار بھی باقی نہ رہا، تو ان کی مزاحمت بھی ختم ہوگئی۔ اب رہا وہ ''انتقام'' جس کی تسکین کے لیے، ''عجمی سازش'' کا فسانہ تراشا گیا، تو وہ، نہ ایرانی عوام اور ان کے سرداروں کے دماغوں میں موجود تھا، اور نہ ہی وہ کسی سازش کا محرک بنا۔ یہ سب کچھ تو صدیوں بعد، طلوع اسلام کے دفتر میں تیار کیا گیا ہے۔

---

❶ الفاروق، ص ۲۹۵۔

(۲)...... پھر بنوامیہ کی بجائے، بنوعباس ہی کو رسول اللہ ﷺ کے قرابتدار قرار دینا بھی، ایک ادھوری حقیقت کا اظہار ہے، جب کہ پوری حقیقت یہ ہے کہ بنوامیہ اور بنوعباس، دونوں ہی آپ ﷺ کے رشتہ دار تھے، خود پرویز صاحب یہ تسلیم کرتے ہیں کہ "بنی عباس اور بنی امیہ، ایک ہی شجر کی دو شاخیں تھیں۔" اور ان دونوں قریشی خانوادوں میں، باہمی رشتہ داریاں، زمانہ جاہلیت اور دورِ اسلام، ہر دور میں برقرار رہی ہیں۔ خود پرویز صاحب نے، ایک مقام پر، اس قرابتداری کا ذکر، بایں الفاظ کیا ہے:

> امام حسین رضی اللہ عنہ کی بھتیجی، یعنی حضرت عبداللہ بن جعفر طیار کی صاحبزادی سیدہ امّ محمد، یزید کے عقد میں تھیں، اور امام حسین کی زوجۂ محترمہ (والدۂ حضرت علی اکبر) امیر معاویہ کی حقیقی بھانجی تھی۔ ①

لہٰذا، الفاظ کی ساحری کے ذریعے، یہ تاثر دینا، کہ بنی عباس تو رسول اللہ کے قرابتدار تھے، اور بنی امیہ نہیں تھے، نہ صرف، اپنی خودساختہ "عجمی سازش" کی راہ ہموار کرنے کی ایک بھونڈی کوشش ہے، بلکہ یہ "مفکر قرآن" کی خوئے چکمہ بازی کا واضح ثبوت بھی ہے۔

(۳)...... شاہکار رسالت کے مندرجہ بالا (زیر بحث) اقتباسات میں، سب سے زیادہ زور جس بات پر دیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ...... "ایرانیوں نے اپنی سازشوں کے ذریعے، اسلامی مملکت میں اندرونی خلفشار پیدا کیا۔ خلافتِ راشدہ میں، اس سازش کا آغاز ہوا، بنی امیہ کے دور میں، اس کا رخ، اموی حکومت کی طرف ہوگیا، اور نتیجتًا اقتدار کی باگ ڈور، بنوامیہ کے ہاتھوں سے منتقل ہوکر، بنی عباس کے ہاتھوں میں آ گئی، اور پھر بالآخر سقوطِ بغداد کے ساتھ ہی "عجمی سازش" اپنے اختتام کو پہنچ گئی"...... یہ واقعات کی قطعی غلط تصویر ہے۔ خلافت راشدہ کے عثمانی عہد میں، حضرت عثمان کی نرم پالیسی، اور اپنے افرادِ خاندان سے ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ کے طرزِ عمل کے برعکس رویہ اپنانے کے نتیجہ میں، لوگوں میں شکایات پیدا ہوئیں۔ سازشی، خواہ کتنے ہی عیار و مکار اور ہوشیار و چالاک ہوں، بہرحال، وہ اُس وقت تک کچھ نہیں کرسکتے،

---

① شاہکار رسالت، ص ۴۵۶۔

جب تک کہ ایسے اسباب نہ پیدا ہو جائیں، جو لوگوں کے دلوں میں کبیدگی اور ناراضگی پیدا کر دیں۔ پس حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نرم روی، اور اپنے خاندان کے افراد کی طرف، ان کا شدید رجحان ہی دراصل، وہ چیز تھی، جو شورش پیدا کرنے کا سبب بنی۔ اس شورش کی تہہ میں جو جذبات کام کر رہے تھے، وہ دراصل، بنوامیہ اور بنو ہاشم کے درمیان، منافست و رقابت کے وہ جذبات تھے جو اسلامی تعلیمات کے زیر اثر، عہد نبوی سے لے کر خلافتِ فاروقی تک دبے رہے، لیکن عہد عثمانی میں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نیک دل اور نیک نیت ہونے کے باوجود، ان کے طرز عمل سے قبائلی رقابت کی ان دبی ہوئی چنگاریوں کو ہوا ملی، اور یوں یہ دم توڑتی ہوئی چنگاریاں، بھڑک اٹھیں۔ ان چنگاریوں کے زندہ ہونے اور مرور ایام کے ساتھ، مزید بھڑک اٹھنے کے اسباب، خود عربوں ہی نے فراہم کیے تھے، نہ کہ عجمیوں نے۔ قرآن وسنت سے بُعد اختیار کرنے کا کام بھی، عربوں ہی سے آغاز پذیر ہوا، نہ کہ ایرانیوں سے۔ شہادت عثمان کے بعد، علی رضی اللہ عنہ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی باہمی آویزش میں، آخر، کون سی ''عجمی سازش'' اپنا کردار ادا کر رہی تھی۔ دونوں طرف، عرب ہی تھے، جن کی تلواریں باہم ٹکرا رہی تھیں۔ خلافت راشدہ میں، اور بالخصوص علوی دور میں، جو شیعہ اور خارجی تحریکیں اٹھیں، وہ بھی کسی ''عجمی سازش'' کی پیدا کردہ نہ تھیں، بلکہ خالص عربوں ہی کی اٹھائی ہوئی تھیں۔ اموی اور عباسی حکمران، اگر کتاب وسنت کو پس پشت ڈال کر، اپنی سیاسی مصلحتوں ہی کی روشنی میں طرز عمل اختیار کرتے رہے تھے، تو اس کا سبب آخر، اس کے سوا کیا تھا کہ انہیں اپنی سیاسی مصلحتیں، دینی مصالح سے عزیز تر تھیں۔ اس راستے پر وہ خود چلے تھے، نہ کہ اہل عجم نے ان کو چلایا تھا۔ ان حقائق پر بجائے، اس کے کہ ہم مستند کتب تاریخ سے شواہد پیش کریں، طلوع اسلام ہی سے ایک اقتباس پیش کرنا مناسب سمجھتے ہیں:

> قرآن سے برگشتگی اور بے رخی کے اصل سازشی خود عرب ہی تھے نہ کہ عجم، جیسا کہ آزاد خیال لوگوں کا ایک طبقہ مسلسل اس خیال کا اظہار کر رہا ہے۔ دراصل، جب تک کوئی قوم، گمراہ ہونے کے لیے، خود آمادہ نہ ہو، خارجی عوامل ناکام رہ

> جاتے ہیں۔ لا یضرکم من ضل اذا اھتدیتم (المائدہ: ۱۰۵) اور پھر عرب کو پاک اور معصوم قرار دینا یا دین کی حفاظت کا تنہا انہیں ہی امین بنانا، کہاں کی دانشمندی ہے؟ کیا اللہ کی بے پایاں رحمتوں اور حکمتوں کے خزانوں کے دروازے عجم پر بند ہو گئے؟ اور وہ ہر بات میں، عرب ہی کے دریوزہ گر بن کر رہ گئے؟ ہمارے خیال میں عجم سے جو کچھ ہو سکا، اُس نے ایمان بالغیب سے لے کر، دلائل و مشاہدات کے ذرائع تک اسلام کی خدمت کی، اور جوں توں اس کے جھنڈے کو تھامے رکھا۔ یہ عرب ہی تھے جنہوں نے جاہلیتِ اولیٰ سے کام لے کر، مدینہ پر چڑھائی کی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگائی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مارا۔ معاویہ رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ، حسین رضی اللہ عنہ اور یزید رضی اللہ عنہ، علی رضی اللہ عنہ اور عائشہ رضی اللہ عنہا میں پھوٹ ڈالی۔ ابن جریج نے مکہ میں، اور امام مالک نے مدینہ میں احادیث لکھیں۔ عرب قبائل نے اپنے مناقب میں اور مخالف کے مثالب میں احادیث جمع کر لیں۔ یہاں کسی بھی جگہ، عجمی نظر نہیں آئے گا۔ البتہ جب عباسی دور آیا، اور فلسفہ یونان نے عربی اثرات کو مٹانا چاہا، تو اس وقت علم کلام کی ایجاد ہوئی، جس میں عربوں کی بہ نسبت، عجمی اہل علم و فضل نے قلم کے جوہر دکھائے۔ اور قرآن کے لغات اور محاورے جمع کیے، جس سے مجبوراً یونانی فلسفے کو ہزیمت اٹھانا پڑی۔ .... یاد رہے کہ شیعہ اور خارجی تحریکیں بھی عربی ہی تھیں، عجمی نہیں۔ ❶

طلوع اسلام کے اس اقتباس کی روشنی میں، ہر شخص، خود دیکھ سکتا ہے کہ حقیقت کیا ہے۔ حقائق کو مسخ کر کے ”عجمی سازش“ کے اثبات کی راہ ہموار کرنا، ایک قطعی من گھڑت افسانہ

---

❶ طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۵۸ء، ص ۳۱۔۳۲۔

پرویز ہے۔ تاہم، برسبیلِ تنزل، اسے اگر ''عجمی سازش'' کا نام دیا بھی جائے، تو ''سازشی'' بہرحال، اول و آخر مسلمان ہی تھے، اور مسلمان بھی مخلص و نیک نیت۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل اقتباس سے ظاہر ہے۔

> قرنِ اول میں جب مختلف ممالک کے لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوتے رہے، تو نہ حضور ﷺ نے، اور نہ ہی خلفائے راشدین نے کسی قوم کی زبان کو قومی یا صحیح تر الفاظ میں عربی کے ساتھ ساتھ ملی زبان بنایا۔ ملت کی سرکاری زبان عربی ہی رہی اور عجمی مسلمانوں کو عربی زبان سیکھنے اور اس کے غالب بنے رہنے پر، کبھی بھی کوئی کد نہ ہوئی، کیونکہ وہ اول و آخر مسلمان تھے۔ ①

یہ عجم کے ان ابتدائی مسلمانوں کا حال ہے جن کے بارے میں یہ ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے کہ وہ اپنی ظالمانہ تہذیب اور جابرانہ حکومت کے خاتمہ پر، اُس اسلام سے انتقام لینے کے لئے مسلمان ہوئے تھے جس نے انہیں ظلم و استبداد کے شکنجوں سے آزاد کیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح عرب نیک نیتی سے اسلام لائے، بالکل اسی طرح عجم بھی اخلاص کے ساتھ مسلمان ہوئے۔ جس طرح، عربوں نے اسلام کی خدمت کی، اسی طرح اہل عجم نے بھی کی۔ جس طرح، اسلام کی سادہ اور عملی تعلیم کے سامنے عرب کی جاہلیت نہ ٹھہر سکی، اسی طرح عجم کی جاہلیتیں بھی نہ ٹھہر سکیں۔ تاہم خلافت راشدہ کے بعد، جس طرح عربی معاشرہ انحطاط کا شکار ہوا، اسی طرح عجم کے مسلمان بھی نشانۂ زوال بنے۔ ہر گل کے ساتھ، خار کا ہونا، ہر خوبی کے ساتھ عیب کا ہونا، اور ہر کمال کے ساتھ نقص کا ہونا، ہر یسر کے ساتھ عسر کا ہونا، اور ہر دن کے ساتھ رات کا ہونا، ایک اٹل اور فطری امر ہے، ہمیں نہ تو عربوں کی خوبیوں کے ساتھ، ان کے عیوب کی موجودگی سے انکار ہے، اور نہ ہی عجم کے محاسن کے ساتھ، ہم ان کے نقائص کے منکر ہیں، جس چیز کا ہمیں انکار ہے، وہ صرف یہ ہے کہ اہل عجم کے معائب اور نقائص کو ''عجمی سازش'' کی بنیاد قرار دیا جائے، یہ کمزوریاں اور کوتاہیاں، خواہ اہل عجم میں ہوں

---

① طلوع اسلام، جون ۱۹۶۵ء، ص ۷۵۔

یا اہل عرب میں، خواہ خلافت راشدہ میں ہوں یا بنوامیہ و بنوعباس کے دور میں۔ انہیں بہرحال "عجمی سازش" کے رتھ میں، جوت ڈالنا غلط ہے۔ یہ ہے وہ بات، جس کے ہم منکر ہیں۔ خلافت راشدہ تک بہرحال، اہل عرب، پورے عالم اسلام میں، علمی قیادت کے حامل تھے، بعد میں، وابستۂ امورِ حکومت ہونے کی بناء پر، اور کچھ قبائلی عصبیتوں میں مبتلا ہوتے ہوئے، باہمی چپقلشوں کا شکار ہونے کی بناء پر، علمی قیادت، عربوں کے ہاتھ سے نکل کر عجم کی طرف منتقل ہوگئی، اور ہر عصر و مصر میں دیکھا گیا کہ علمی اعتبار سے مرجع انام، عربوں کی بہ نسبت، عجم بہت زیادہ تھے، لیکن "مفکر قرآن" کا معکوس ذہن، عجم کی اس علمی قیادت کو "عجمی سازش" کے ساتھ نتھی کر ڈالتا ہے حالانکہ اسلام، قرآن، حدیث، فقہ اور علم و ادب کی خدمت میں، جس طرح، عرب مخلص تھے، اسی طرح عجم بھی مخلص تھے، کیونکہ دونوں ہی قبولِ اسلام میں مخلص اور نیک نیت تھے۔ اس حقیقت کی وضاحت، کتب تاریخ سے کرنے کی بجائے، طلوع اسلام ہی کے اوراق سے کرنا مناسب ہے، اس لیے کہ ؎ مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری

> (۱)...... عربوں کے علاوہ، دوسری قومیں بھی مخلصانہ طور پر اسلام میں داخل ہوئیں، اور اس امر پر ایمان لائیں کہ ان کی سعادت و فلاح کا یہی ایک راستہ ہے۔ اس کے بعد، دونوں قرآن پر متوجہ ہوئے تاکہ اسے سمجھیں۔ حدیث پر متوجہ ہوئے، تاکہ اسے جمع کریں، اور اس کی شرح کرسکیں، اور دونوں سے انہوں نے، ان حوادث و وقائع سے متعلق، احکام و قوانین کا استنباط شروع کر دیا جو اس نئی مملکت کو، جس کی حدود دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں، نت نئے انداز سے پیش آرہے تھے۔ ①

یہ اقتباس، اس امر کو واضح کر دیتا ہے کہ (۱) قرآن و سنت کا چولی دامن کا ساتھ ہے (۲) جس طرح، امت نے قرآن سے تمسک اختیار کیا، اسی طرح حدیث سے بھی کیا (۳)

---

① طلوع اسلام، جنوری ۱۹۵۹ء، ص ۳۳۔

جمع وتدوین کے اعتبار سے بھی، قرآن وحدیث کو یکساں اہمیت وحیثیت دی گئی۔ (۴) اسلام کے سرچشمۂ قانون اور ماخذ اسلام ہونے میں بھی، دونوں کا یکساں مقام ومرتبہ ہے۔

(۲)...... عجمی عوام، مسلمانوں میں دین اسلام کے نظام سے بہت متاثر تھے، اور وہ محسوس کرتے تھے کہ انسانیت کی عزت وتکریم، دین برحق کی تابعداری ہی میں ہے۔ معاشرہ میں بلندیوں اور پستیوں کے تفاوت عظیم نے ان کی زندگیوں کو جہنم بنا رکھا تھا چنانچہ یہی وہ اثر تھا جس نے عراق، شام، ایران، روم اور دیگر مفتوحہ علاقوں کے لوگوں کو فوری طور پر اسلام قبول کرنے کی ترغیب دی۔ ورنہ فتح و شکست سے کبھی کوئی اپنے مسلک زندگی سے یوں نہیں ہٹ جاتا۔ ①

(۳)...... مسلمان، اسلام کا علم لے کر عرب سے نکلے تو انہوں نے اپنے حسن کردار سے قوموں کی قوموں اور ملکوں کے ملکوں کو مسلمان بنا دیا، لیکن جب غیر مسلم اقوام مسلمان ہوگئیں تو مسلمانوں اور نومسلموں میں کوئی امتیاز باقی نہ رہا۔ ②

یہ اقتباسات، اس امر کو واضح کر ڈالتے ہیں کہ عرب وعجم میں سے جس نے بھی، اسلام قبول کیا، خلوصِ قلب کے ساتھ کیا۔ البتہ عرب وعجم کے اسلام میں ایک فرق ضرور تھا۔ اور وہ یہ کہ عربوں کے ابتدائی مسلمان بالخصوص اور بعد کے اہل اسلام بالعموم، وہ صحابہ کرام تھے، جن کی تربیت (۱) خود رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں سے ہوئی تھی، اور (۲) دشمنانِ اسلام کی طرف سے مسلط کردہ انفرادی اور اجتماعی آزمائشوں کی بھٹی میں تپ کر، وہ، کندن بن چکے تھے، اور جس بلند سطح پر، ان کی ایمانی حالت اور اخلاقی تربیت پہنچ چکی تھی، اس مقام پر عجمی مسلمان نہیں پہنچ پائے تھے۔ مقبوضہ علاقوں میں، اسلامی عساکر کے بلند پایہ کردار، اور وہاں کے ارباب نظم ونسق کی اخلاقی سیرت سے متاثر ہونے کے باوجود بھی، ان میں جاہلیت کے اثرات باقی رہ گئے تھے۔ ان جاہلی اثرات اور عملی کوتاہیوں کو بنیاد بنا کر، ''عجمی سازش'' کی

---

① طلوع اسلام، اگست ۱۹۶۰ء، ص ۵۸۔

② طلوع اسلام، اپریل ۱۹۶۷ء، ص ۱۳۔

فلک بوس عمارت تعمیر کر ڈالنا، دراصل، ایسی کھوکھلی زمین پر، اساس رکھنے کے مترادف ہے جسے قرآن کریم، مَن اَسَّسَ بنیانه علی شفاجرف هَارٍ فانهار به فی نار جهنم کے الفاظ سے تعبیر کرتا ہے۔ اور ایسی کوتاہیوں کا رہ جانا، اور اُن کی وجہ سے نزغِ شیطانی کا شکار ہو جانا، کوئی امر محال نہیں ہے۔ خود صحابہؓ کرام میں بھی، بعض اوقات، جاہلیت کے ایسے اثرات کی نشاندہی، خود رسول اللہ ﷺ نے فرمائی ہے۔ مثلاً ایک مقام پر، آپ ﷺ نے اوس اور خزرج کے دو قبائل میں، سابقہ قبائلی عصبیت و عداوت کے جذبات کو اس حد تک ابھرتے ہوئے پایا کہ دونوں قبیلے تلواریں سونت کر، برسر پیکار ہونے پر آمادہ ہو چکے تھے، تو آپ ﷺ نے انہیں فرمایا:

> یا معشر المسلمین ابدعوی الجاهلیة وانا بین اظهرکم بعد اذ اکرمکم الله بالاسلام وقطع عنکم امر الجاهلیة والف بینکم ترجعون الی ما کنتم علیه کُفَّارًا۔ ❶
>
> اے گروہ مسلمین! کیا میری موجودگی میں تم یہ جاہلانہ پکار اٹھا رہے ہو، جب کہ اللہ نے تمہیں اسلام کے ذریعے سرخرو کیا، اور امرِ جاہلیت کو تم سے قطع کیا، اور تمہارے درمیان الفت ڈال دی۔ (کیا) تم کافر بن کر سابقہ جاہلیت کی طرف پلٹ رہے ہو؟

ایک اور مقام پر آپ ﷺ نے حضرت ابوذر غفاری سے یہ فرمایا تھا:

> یا اَبا ذر! انك امرء فیك جَاهلیة . ❷
>
> اے ابوذر! تو ایک ایسا آدمی ہے، جس میں (ابھی تک) جاہلیت (کی خوبو) پائی جاتی ہے۔

الغرض، ہمیں اس امر کو تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ عجم کے نومسلموں میں بھی

---

❶ تفسیر خازن، ج۱، ص ۳۲۶۔

❷ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب المعاصی من امر الجاهلیة۔

اثراتِ جاہلیت موجود تھے، لیکن ہمیں اس بات سے انکار ہے کہ ان اثرات کا مسلم سوسائٹی میں پایا جانا، کسی "عجمی سازش" کا حصہ تھا (یا اس کا نتیجہ تھا)۔ "مفکرِ قرآن" کو بے لاگ اور مبنی بر عدل تحقیق سے کبھی بھی کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ تقلیدِ مغرب میں، یا اپنی مصلحتوں کے پیشِ نظر، کسی نظریہ کو پہلے اپنا لیا کرتے تھے، اور پھر اس کی حمایت و ہمنوائی کے لیے، دلائل تلاش کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اس روش پر چلتے ہوئے، نہ انہیں مسخِ واقعات میں دریغ ہوتا تھا، نہ تقلیبِ امور میں تامل، نہ تنکیسِ حقائق میں ہچکچاہٹ، اور نہ ہی معاملات کے ہیر پھیر میں کوئی خلش، ان کے پیشِ نظر، صرف اپنے مزعومہ نظریات ہی کی پاسداری ہوا کرتی تھی، خواہ اس کے لیے، اُنہیں اپنی امانت و دیانت اور حق و انصاف کا خون ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ "عجمی سازش" کا یہ افسانہ، ان کے اسی "ذوق و شوق" کا شاہکار ہے۔

(۲۴) ایک غلط فہمی اور اس کا ازالہ

بعض لوگوں نے، جن میں ہمارے "مفکرِ قرآن" بھی شامل ہیں، قرنِ اول میں حصولِ اقتدار کے لیے، حسینی اور حسنی سادات کی کوششوں کو خاندانی اور موروثی استحقاق پر مبنی قرار دیا ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک، یزید کے خلاف امام حسین کی جدوجہد، اموی حکومت کے خلاف امام زین العابدین کے صاحبزادے حضرت زید، اور پھر ان کے فرزند حضرت یحییٰ بن زید کی محاذ آرائی، اور پھر آگے چل کر، عباسی حکومت میں حضرت محمد (نفس زکیہ، اور ان کے بھائی ابراہیم کی مجاہدانہ سرگرمی کی تہہ میں، جو تصور، مقصودِ اصلی اور غایتِ اولیٰ کی حیثیت رکھتا ہے، وہ یہی ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی مسندِ امارت پر بیٹھنا، ان کا موروثی استحقاق تھا۔ جس طرح دوسرے لوگ، ہوسِ اقتدار میں مبتلا ہوتے ہیں، اسی طرح یہ (خروج کرنے والے) سادات بھی، گویا (معاذ اللہ) اقتدار ہی کے بھوکے تھے۔ بس اگر کوئی فرق تھا تو وہ صرف یہ کہ دوسروں کے مقابلہ میں، یہ مسلح مجاہدین، نبی آخر الزمان ﷺ سے اپنے نسلی قرب کی بناء پر، خود کو واحد حقدار قرار دیا کرتے تھے۔ یہ ایک غلط اور گمراہ کن تصور ہے، جو روحِ اسلام کے قطعی

خلاف ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے، نبی علیہ السلام پر جو وحی آتی تھی، دوسروں سے پہلے آپ ﷺ ہی اس کے اتباع پر مامور تھے۔ حکمِ خداوندی کے سامنے، آپ ہی سب سے پہلے سرِ تسلیم خم کرنے کے سزاوار تھے، جیسا کہ درج ذیل آیت سے واضح ہے:

﴿وَ بِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ﴾ (الانعام: ۱۶۳)

”مجھے اسی بات کا حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلے سرِ تسلیم خم کرنے والا ہوں۔“

دین اسلام کی دعوت، سب سے پہلے آپ ﷺ، جن لوگوں کو دینے پر مامور تھے، وہ آپ ﷺ کے قریب ترین رشتہ دار تھے:

﴿وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ﴾ (الشعراء: ۲۱۴)

”اور اپنے قریب کے رشتہ داروں کو ڈرسنا دو۔“

اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والے احکام کی بجا آوری کا فریضہ، سب سے پہلے جن لوگوں پر عائد ہوتا ہے، وہ آپ ہی کے اہل خانہ تھے۔

﴿وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَ اصْطَبِرْ عَلَیْهَا﴾ (طه: ۱۳۲)

”اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم کرو، اور اس پر قائم رہو۔“

معاشرتی ہدایات کا نزول ہوا، تو ان کی پیروی کا آغاز، آپ ہی کی ازواج مطہرات اور بناتِ کریمات سے ہوا۔

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ﴾ (الاحزاب: ۵۹)

”اے نبی ﷺ! اپنی بیویوں، بیٹیوں اور اہل ایمان کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر چادروں کے پلو لٹکا لیا کریں۔“

عام مسلمانوں کا تعلق، حضور اکرم ﷺ سے محض مسلکی تعلق تھا۔ لیکن آپ ﷺ کے

رشتہ دار، آپ ﷺ سے قرابتداری کا تعلق بھی رکھتے تھے، اور دینی و مسلکی تعلق بھی۔ اس دہرے تعلق کا تقاضا یہ تھا کہ دوسروں سے کہیں پہلے اور آگے بڑھ کر، دین کی گاڑی کو، اس پٹڑی میں ڈال دیں، جس سے وہ خلافت راشدہ کے بعد، منحرف ہوچکی تھی۔ آپ کے قرابتداروں میں سے جو، جس قدر، آپ ﷺ سے زیادہ قریب تھا، وہ اسی قدر آپ ﷺ کے لائے ہوئے دین کی اقامت کا خود کو ذمہ دار سمجھتا تھا۔ اور یہ لازم جانتا تھا کہ اصلاح حکومت کے لیے جدوجہد کرنا، دوسروں سے کہیں زیادہ ان کا فریضہ ہے۔ اس لیے ان کی کوشش یہ تھی کہ فسادِ حکومت اور اس کے نتیجہ میں عوامی زندگی میں جنم لینے والے بگاڑ کی اصلاح کے لیے، خلافت راشدہ کے کھرے اسلامی نظام کو بحال کیا جائے۔ بنوامیہ اور بنی عباس کے خلاف حسینی اور حسنی سادات کے خروج و احتجاج کی جو تحاریک اٹھتی رہی ہیں، ان کی تہہ میں یہی جذبات کارفرما تھے۔ جن لوگوں نے، ان بزرگوں کی اصلاحی کاوشوں میں، محض نسلی بنیاد پر طلب اقتدار کا داعیہ، بیان کیا ہے، انہوں نے حقائق پر بھی اور ان بزرگوں پر بھی سخت ظلم کیا ہے۔ پھر خروج و احتجاج کرنے والے ان بزرگوں کی ذاتی زندگی، جس قدر اسلام کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی، اسے دیکھتے ہوئے یہ باور نہیں کیا جاسکتا کہ محض ہوس اقتدار کی تسکین کے لیے، حضور اکرم ﷺ کے ساتھ، اپنے خاندانی اور نسبی تعلق کو، انہوں نے بہانہ بنایا ہوگا۔ ہاں، یہ ممکن ہے کہ ان تحاریک میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوں، جو ان بزرگوں کا ساتھ، محض اس لیے دے رہے ہوں کہ وہ، انہیں، ریاست نبوی کی امارت و قیادت کا موروثی حقدار سمجھتے ہوں۔ لیکن یہ بہرحال، ایسے افراد کا انفرادی معاملہ ہے جسے اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ رہے ان تحاریک کے سرغنہ اور قائدین، تو وہ بہرحال نیک نیتی سے، وقت کی حکومتوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، اس لیے نہیں کہ وہ اقتدار کو اپنا موروثی حق سمجھتے تھے، بلکہ اس لیے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ، جو ان کا دینی اور نسبی دُہرا تعلق تھا، اس کی بناء پر وہ اقامت دین کے لیے، دوسروں سے آگے بڑھ کر جدوجہد کرنا، اپنا فریضہ سمجھتے تھے۔

(۲۵) ابو مسلم خراسانی

"عجمی سازش" کے افسانہ میں رنگ آمیزی کے لئے، دیگر افراد کے علاوہ، جس تاریخی کردار کو "مفکر قرآن" نے چنا ہے، وہ ابو مسلم خراسانی ہے، اس کے تعارف کے سلسلہ میں، وہ، لکھتے ہیں۔

> ابراہیم بن عثمان بن بشار، اس کا نام تھا۔ یہ ایرانی الاصل اور بزرجمہر کی اولاد میں سے تھا۔ اصفہان میں پیدا ہوا، اور کوفہ میں ابتدائی پرورش پائی۔ بلا کا ذہین اور اعلیٰ تنظیمی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ پراپیگنڈہ کے فن میں، اس کا کوئی حریف نہیں تھا۔ محمد (عباسی) کے بیٹے، ابراہیم نے اس کی صلاحیتوں کو بھانپا، اور پراپیگنڈہ کا شعبہ، اس کے سپرد کر دیا۔ اس نے اہل بیت کے نام سے، اس قدر شد و مد سے پراپیگنڈہ کیا کہ سلطنت بنوامیہ کی بنیادوں میں تزلزل واقع ہو گیا۔ اس دوران فاطمیین نے بھی بنی امیہ کے خلاف محاذ آرائیاں کیں۔ مثلاً ۶۱ھ میں کربلا کا واقعہ ظہور میں آیا۔ ۱۲۲ھ میں، امام زین العابدین کے فرزند، زید نے کوفہ سے بغاوت کی۔ ۱۲۶ھ میں، زید کے بیٹے یحییٰ نے خراسان سے۔ ان کے علاوہ حضرت جعفر طیار کی اولاد میں سے عبداللہ بن معاویہ نے ۱۲۷ھ میں کوفہ سے علم بغاوت بلند کیا، لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ ①

"مفکر قرآن" کا یہ اقتباس، صدق و کذب کا ایک ملغوبہ اور تلبیس حق و باطل کا ایک نمونہ ہے، جیسا کہ سطور ذیل سے واضح ہے۔

۱۔۔۔ اس میں شک نہیں کہ ابو مسلم خراسانی بلا کا ذہین اور تنظیمی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ مزید برآں، وہ بہترین مقرر تھا۔ لوگ، اس کی خطیبانہ صلاحیت سے بہت متاثر تھے۔ بیان و خطابت کی ان خوبیوں کا سیدھا سادا اعتراف کرنے کی بجائے، "مفکر قرآن" انہیں

---

① شاہکار رسالت، ص ۴۵۸۔

"پراپیگنڈے" کا نام دیتے ہیں۔ تاکہ اپنے "عجمی سازش" کے فسانے کی اسے بھی ایک کڑی بنالیا جائے۔

۲۔۔۔ جس حقیقت کو اس اقتباس میں بنوامیہ کے خلاف، فاطمیین کی محاذ آرائیاں، اور زید بن زین العابدین کی بغاوت، اور پھر کتاب شاہکار رسالت کے آخری باب میں، ان "بغاوتوں" کا محرک، امامتِ سیاست اور قیادتِ ریاست کا موروثی حق ہونا قرار دیا گیا ہے۔ اس کا منطقی تقاضا یہ قرار پاتا ہے کہ ان جملہ باغیوں کو ایسا جاہل، کودن دماغ، بلید الذہن اور روحِ دین سے کورا سمجھ لیا جائے کہ انہیں اسلام کی اس تعلیم کا علم ہی نہ ہو کہ سربراہی مملکت کا منصب موروثی منصب نہیں، بلکہ امت کے اہل شوریٰ کا شورائی منصب ہے۔

۳۔۔۔ پھر قرآن وسنت کی اساس سے ہٹی ہوئی حکومت کو (خواہ اموی حکومت ہو یا عباسی) "حق قرار دیتے ہوئے، ان کے خلاف اٹھنے والوں کو، "باغی" قرار دینا بھی، تلبیس حق و باطل کا کرشمۂ پرویز ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ حکومت (جو نہ تو علماءِ امت کے مطابق، قرآن وسنت پر مبنی ہو، اور نہ ہی "مفکر قرآن" کے مطابق، "قرآنی حکومت" ہو) کیا ایک جائز، قانونی، شرعی، اور اسلامی حکومت ہوتی ہے؟ کیا ایسی حکومت کے خلاف خروج کرنا، بغاوت ہے؟ اور کیا خروج کرنے والے شرعاً "باغی" ہیں۔ پھر یہ "باغی" اگر کامیاب ہوجاتے، اور ان کے ہاتھوں، خلافت راشدہ کا نظام عود کر آتا، تو مجھے یقین ہے کہ پھر یہ "باغی"، ہمارے "مفکر قرآن" کے نزدیک بھی "باغی" نہ رہتے بلکہ مصلحین امت اور مجددین ملت قرار پاتے۔ دنیا نے باطل حکومت کے خلاف اٹھنے والی ہر اصلاحی کوشش کو، ابتداء و آغاز میں، "بغاوت" ہی قرار دیا ہے۔ اس مقام پر، میری لوحِ ذہن پر، مولانا آزاد کا وہ تاریخی عدالتی بیان ابھر رہا ہے، جو اپنی گرفتاری پر، برطانوی حکومت کے خلاف، انہوں نے دیا تھا:

> *مجھ پر (Sedation) سیڈیشن کا الزام عائد کیا گیا ہے۔ لیکن مجھے بغاوت کا معنی*

سمجھ لینے دو۔ ''بغاوت'' آزادی کی اس جدوجہد کو کہتے ہیں جو ابھی کامیاب نہیں ہوئی ہے۔ اگر ایسا ہے تو میں اقرار کرتا ہوں لیکن ساتھ ہی یاد دلاتا ہوں کہ اس کا قابل احترام نام حب الوطنی بھی ہے جب وہ کامیاب ہو جائے۔ کل تک آئر لینڈ کے مسلح لیڈر باغی تھے، لیکن ڈی ویرا اور گریفتھ کے لئے برطانیۂ عظمٰی کون سا لقب تجویز کرتی ہے۔ آئرلینڈ کے پارنل (Parnel) نے ایک مرتبہ کہا تھا:

> ہمارا کام، ہمیشہ ابتداء میں بغاوت، اور آخر میں حب الوطنی کی مقدس جنگ تسلیم کیا گیا ہے۔ ①

لیکن یہ الفاظ تو کسی غیر مسلم کے ہیں۔ بدقسمتی کی انتہاء یہ ہے کہ مسلم گھرانے میں پیدا ہونے والے، ''مفکر قرآن'' صاحب بھی، اس حکومت کے خلاف، خروج واحتجاج کو بغاوت قرار دیتے ہیں، جو خود، ان کے نقطۂ نظر سے بھی، ''غیر قرآنی'' حکومت تھی۔

(۲۶) ابو مسلم خراسانی......کوچۂ سیاست، میں

ابو مسلم خراسانی، اپنی ذہانت و فطانت اور زیرکی و دانائی کی بناء پر، ابتداء ہی سے کوئی بڑی شخصیت بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ شہرت و ناموری پالینے کی آرزو، اسے ہر وقت بے چین اور متفکر رکھتی تھی۔ دن، اسی فکر میں، اور راتیں، اسی سوچ بچار میں بیت جاتی تھیں۔ وہ ہر وقت اسی بے تابی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتا کہ معالی کا حصول کیسے ہو، جیسا کہ مندرجہ ذیل اقتباس سے واضح ہے۔

> ابتدائے جوانی ہی سے اس کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات موج زن رہتے تھے۔ ان ہی دنوں میں بعضوں نے دیکھا کہ رات رات بھر ٹہلتا رہتا ہے۔ نیند نہیں آتی۔ پوچھا گیا کیا حال ہے؟ اس نے کہا ''کیا پوچھتے ہو۔ میرا دماغ ہر وقت شدید تگ و دو میں مبتلا رہتا ہے۔ حد سے زیادہ میرا ذہن صاف ہے، نتیجے

---

① ابوالکلام آزاد، (از شورش کاشمیری) ص ۲۹۸۔

تک فوراً پہنچ جاتا ہے۔ ارادے میں حد سے زیادہ بلندی پیدا ہوگئی ہے، چوبیس گھنٹے یہی خبط دماغ پر مسلط رہتا ہے کہ کوئی بڑا کام مجھے کرنا چاہیے، لیکن سادہ زندگی کے ساتھ، یہی خیال مجھے بے چین رکھتا ہے۔ جانتا ہوں کہ صرف (شب بیداری سے دل کی بے چینی کا ازالہ نہیں ہوسکتا، لیکن آخر کروں کیا؟'' کہا گیا کہ جو تیرے جی میں آرہا ہے، کرگزر۔ بولا ''سلطنت کے حصول کے بغیر مجھے تسلی نہیں مل سکتی'' کہا گیا کہ تو اسی راہ میں کوشش کر۔ بولا ''ہائے ہائے، یہی تو مشکل ہے۔ یہ میری بدبخت عقل مجھے آگے بڑھنے نہیں دیتی۔ خطرات میں گھسے بغیر حکومت مل نہیں سکتی، اور عقل خطرے میں اپنے آپ کو ڈالنے سے مانع ہے۔'' لوگوں نے کہا کہ بھائی! پھر تو یونہی گھٹ گھٹ کر مر جائے گا۔ تب اس نے کہا کہ ''میں اس کی تیاری کر رہا ہوں کہ اپنی عقل کے کچھ حصہ کو جہل و ناعاقبت اندیشی سے بدل دوں، اور جس نصب العین کی تکمیل، جہالت اور مصلحت سوزی کے بغیر نہیں ہوسکتی، اس کو میں، اسی جہل سے حاصل کر کے رہوں گا، اس کے بعد پھر عقل سے ان چیزوں کو سلجھاؤں گا جو عقلی تدبیر کے بغیر سلجھ نہیں سکتیں۔'' آخر میں اس نے کہا کہ میں ایک ایسی زندگی گزارنا چاہتا ہوں جو موت نہ معلوم ہو۔ گمنامی اور نیستی ایک ہی چیز ہے، اور عالم کا باپ وہی ہے جس نے شہرت حاصل کی۔ ①

پھر فطرت کی کرم گستری سے اس نے مسحور کن شخصیت پائی تھی، جسے دیکھتے ہی ہر کوئی، اس سے متاثر اور گرویدہ ہوجاتا تھا، جسمانی محاسن کے ساتھ ساتھ، علمی خوبیوں سے بھی وہ خوب آراستہ تھا:

> ابومسلم، اپنے باپ کے مرنے کے بعد پیدا ہوا، بعض فارغ البال اسلامی خاندانوں میں اسے پناہ دی گئی۔ جہاں اچھی تعلیم و تربیت پانے کا اسے موقع ملا۔ وہ عربی اور فارسی دونوں زبانوں کا غیر معمولی خطیب تھا۔ رنگ گورا، آنکھیں بڑی

---

① امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی (از مناظر احسن گیلانی) ص ۲۲۸۔

بڑی، چوڑی پیشانی، اور گٹھا ہوا بدن دیکھ کر ہی اس کی شخصیت سے لوگ متاثر ہوتے تھے۔

ایسی پُر محاسن اور باکمال شخصیت کی قسمت نے یاوری کی۔ بنوعباس، جو بنی امیہ کو نیچا دکھانے کے لیے پرتول رہے تھے، انہوں نے ابومسلم خراسانی کو اپنے مہرہ کے طور پر استعمال کرنے کی ٹھانی، اور ابومسلم کو یکایک یہ محسوس ہوا کہ حصولِ سلطنت کا راستہ، اس کی نگاہوں کے سامنے کھل گیا ہے الغرض، بنوعباس، اُسے اپنے مقصد کے لیے، اور وہ خود، بنی عباس کو اپنی تمناؤں کے پورا کرنے کے لیے، آلۂ کار بنا رہا تھا۔ بنوامیہ کے خلاف اس مشترکہ جدوجہد میں، دونوں اپنے اپنے مقاصد کو پیش نظر رکھے ہوئے تھے:

> ابومسلم، اس کے بعد تیار ہوا، اور عباسی، جو بنی امیہ کے زوال سے فائدہ اٹھانے کی فکر میں تھے، ان سے ملتا ہے۔ عباسیوں نے تو یہ سمجھا کہ وہ ہمارا آلۂ کار ہے، اور میرا (یعنی سید مناظر احسن گیلانی کا۔ قاسمی) خیال ہے کہ ابومسلم، عباسیوں کو اپنے آلۂ کار کی حیثیت سے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ ①

دونوں کے دل میں چور ہے، بیٹھے ہیں سامنے   وہ دل لیے ہوئے، ہم تمنا لیے ہوئے

امر واقعہ یہ ہے کہ وہ خود، آغاز شباب ہی سے حکومت پانے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس لیے سید مناظر احسن گیلانی مرحوم کا یہ خیال صحیح ہے کہ وہ اپنے مقصد کی بازیابی کے لیے بنی عباس کو آلۂ کار بنانے پر تلا ہوا تھا۔ تاہم ابومسلم جو کچھ کر رہا تھا، اس کی تہہ میں ''عجمی سازش'' یا ''انتقام عجم'' نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ وہ اگر اپنے مقصد میں کامیاب ہو بھی جاتا، اور اس کی حکومت قائم ہو بھی جاتی، تب بھی وہ حکومت ہوتی تو عجمی ہی، لیکن جس ''عجمی سازش'' کا افسانہ، پرویز صاحب نے گھڑا ہے، اس کے ساتھ، اس ''عجمی حکومت'' کا کوئی رشتہ و تعلق ہرگز نہ ہوتا۔ ''مفکر قرآن'' نے محض، اپنی ''عجمی سازش'' کے خاکہ میں رنگ بھرنے کے لیے، یہ بے پر کی اڑائی ہے کہ

---

① امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی، ص ۲۳۸۔

ابو مسلم، ایرانی سلطنت کے احیاء کا عزم لے کر آیا تھا۔ ①

بہر حال، بنو امیہ کے خلاف، بنو عباس کے ساتھ مل کر، ابو مسلم نے جو جدوجہد کی، اس کا آغاز، بنو امیہ کے مظالم کے تذکروں سے ہوا، اور پھر پیغمبر علیہ السلام کے اہل خاندان میں، حکومت کو لانا بھی، ایک مقصد قرار پایا۔ جیسا کہ درج ذیل اقتباس سے ظاہر ہے:

> ابتداء میں اپنے حسین وجمیل چہرے اور فصیح و بلیغ گفتگو سے لوگوں پر اُس (ابو مسلم) نے یہی ظاہر کیا کہ بنی امیہ کے ظلم سے نجات حاصل کر کے، پیغمبر کے خاندان والوں میں اسلامی حکومت کا لانا میرا مقصد ہے۔ ②

ابو مسلم خراسانی کی کارگزاری کا ذکر کرتے ہوئے، پرویز صاحب لکھتے ہیں:

> اس زمانے میں ایک آنے والے مہدی کا عقیدہ بھی عام ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ، اس قسم کی روایات بھی پھیلائی جا رہی تھیں کہ وہ آنے والا خراسان کی طرف سے آئے گا۔ اس کے لشکر کا لباس بھی سیاہ ہوگا، اور جھنڈے بھی سیاہ رنگ کے۔ ابو مسلم نے اس آنے والا کا پراپیگنڈہ بھی شد و مد سے کیا، اور جب دیکھا کہ فضا سازگار ہو گئی ہے، تو وہ سیاہ لباس اور سیاہ جھنڈے کے ساتھ، ایک لشکر جرار کے ساتھ نکلا، اس نے ۱۲۸ھ میں خراسان فتح کر لیا۔ ۱۳۲ھ میں، ایک فیصلہ کن جنگ کے بعد، بنی امیہ کا خاتمہ ہو گیا، اور سلطنت بنو عباس کی طرف منتقل ہو گئی۔ ان کا پہلا خلیفہ عبداللہ تھا جو سفاح کے لقب سے مشہور ہے۔ ③

"مفکر قرآن" نے یہاں جو کچھ فرمایا ہے، اس کا ماخذ یا حوالہ دینے سے گریز کیا ہے۔ تاہم، مجھے نہ تو اس بات ہی کا کہیں سے کوئی ثبوت ملا ہے کہ...... "آنے والے مہدی کا عقیدہ، خاص، ان ہی دنوں میں، عام ہو رہا تھا"...... اور نہ ہی اس پراپیگنڈے کا کہ...... "لشکر مہدی کا لباس، سیاہ ہوگا"...... پھر جب میں، ان کی کذب بیانی، مغالطہ آرائی، فریب دہی اور

---

① شاہکار رسالت، ص ۴۶۴۔

② امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی، ص ۲۳۸ تا ۲۳۹۔

③ شاہکار رسالت، ص ۴۵۹۔

مسخ حقائق کی مستقل عادت کو دیکھتا ہوں، تو مجھے ان کا یہ اقتباس بعید از حقیقت دکھائی دیتا ہے، کیونکہ اپنے موقف کی ہمنوائی اور پاسداری کے لیے، ایسے اختراعات و افتراءات سے کام لینے میں وہ کوئی تامل نہیں کیا کرتے تھے۔ اور نہ وہ کسی ایسے ضمیر کے مالک تھے جو اس قسم کی حرکات پر، کوئی بوجھ محسوس کرتا ہو۔

۲۷۔ خاندانِ برامکہ

ابومسلم خراسانی کے بعد، ''مفکر قرآن'' اپنی ''عجمی سازش'' کے سلسلہ کی اگلی کڑی، خاندان برامکہ کو قرار دیتے ہوئے، فرماتے ہیں:

> ابومسلم، ایرانی سلطنت کے احیاء کا عزم لے کر آیا تھا۔ یہ اپنے اس ارادے میں کامیاب نہ ہوا، تو اس کے بعد، ایک ایرانی فرد نہیں، بلکہ خاندان، اسی عزم کو لے کر، عباسیوں کے ہاں آ گیا۔ یہ خاندان بھی ایرانی سلطنت کو زندہ تو نہ کر سکا۔ لیکن اس نے اس عظیم مملکت عباسیہ میں، نہ اسلام رہنے دیا، نہ عربیت۔ دونوں کی جگہ عجمیت نے لے لی۔ اور یہ ایرانی سازش کی بڑی نمایاں کامیابی تھی۔ تاریخ میں یہ خاندان، برامکہ کے لقب سے مشہور ہے۔ ❶

حقیقت یہ ہے کہ ابومسلم خراسانی کا نہ یہ مقصد تھا کہ اُس ظالمانہ ایرانی سلطنت کا احیاء کرے جس کی جگہ اسلام نے، اہل ایران کو، حریت و آزادی عدل و انصاف اور انسانی مساوات و اخوت پر مبنی نظام عطا کیا تھا، اور نہ ہی ایرانی تہذیب و سلطنت کے محو و فنا کے وقت، وہ موجود ہی تھا کہ کسی درجہ میں بھی، وہ اس حادثہ سے متاثر ہوتا۔ ابومسلم ۱۰۰ھ میں پیدا ہوا، اور ۱۳۷ھ میں دوسرے عباسی حکمراں کے ہاتھوں مقتول ہوا، وہ صرف اور صرف اپنے شخصی اقتدار کا خواہاں تھا۔ ایرانی سلطنت کا احیاء، اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ ''مفکر قرآن'' نے محض اپنی خود ساختہ ''عجمی سازش'' کے خاکہ میں رنگ بھرنے کے لیے، یہ افسانہ گھڑا ہے،

---

❶ شاہکار رسالت، ص ۴۶۴۔

ورنہ حقائق سے اس کا دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پرویز صاحب نے، بغیر مستند تاریخی حوالوں کے، اس افسانہ کو محض اپنی خلاق ذہن کے کرشمہ کے طور پر، اپنے ذہنی مفروضات اور لفاظی کا مرکب بنا کر پیش کیا ہے...... اور یہی حال خاندانِ برامکہ کا ہے۔ ایرانی سلطنت کا احیاء، ان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھا۔ اس خاندان کو، ایرانی تہذیب و سلطنت کے احیاء کا علمبردار بنا کر پیش کرنا بھی، پرویز صاحب کی تسویل نفس کا کرشمہ ہے۔ دورِ اموی ہو یا عہد عباسی، ان میں اٹھنے والی حکومت مخالف تحاریک کے اوّلین اور اساسی علمبردار خود عرب تھے، نہ کہ عجم، جیسا کہ اس سے قبل طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۵۸، ص ۳۱ کے حوالہ میں گزر چکا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان تحاریک کے روبہ عمل ہو جانے کے بعد، ان کی حمایت میں اہل عجم بھی شامل تھے۔ لیکن ان کی حیثیت اور ان کا مقام، بالعموم، صف اوّل کے قائدین کا نہ تھا، بلکہ آخری صفوں میں شامل ہونے والے حامیوں ہی کا تھا۔ البتہ ابومسلم خراسانی کا معاملہ الگ ہے، کیونکہ وہ خود اپنی ذہانت و فطانت اور وجاہت و خطابت کے بل بوتے پر، اپنے شخصی اقتدار کے لیے، (نہ کہ ایرانی سلطنت کے احیاء کے لیے) بنی عباس کو اپنے آلۂ کار کے طور پر استعمال کر رہا تھا، اور بنی عباس اُسے، اپنے اقتدار کے لیے مہرہ بنا رہے تھے۔

(۲۸) برامکہ کی اصل

''مفکر قرآن'' صاحب، برامکہ کی اصل کے متعلق، اپنی ''تحقیق'' کو بایں الفاظ بیان کرتے ہیں:

> اس لفظ کی اصلیت ''برماہ گاہ'' ہے، یعنی ایرانیوں کے سب سے بڑے آتشکدہ کا اعلیٰ ترین متولی یا پجاری...... اس مندر میں چاند کے دیوتا کا مجسمہ نصب تھا، اور نوبہار کہلاتا تھا۔ برمکیوں کا جدامجد، جاماسپ بن یشتاسپ تھا جو گشتاسپ کے زمانہ میں نوبہار کا پہلا موبد مقرر ہوا، اور اس خدمت کے اعزاز میں اسے پوری مملکت کا موبد موبداں (قاضی القضاۃ یا چیف جسٹس) بھی بنا دیا گیا۔ ❶

---

❶ شاہکار رسالت، ص ۲۶۵۔

برامکہ کی اصل کے متعلق، جو کچھ، ''مفکر قرآن'' نے لکھا ہے۔ اول تو وہ بلا حوالۂ ماخذ ہے، اور دوسرے، یہ کہ، وہ یا تو ان کی جاہلانہ فریب خوردگی کا کرشمہ ہے یا پھر دانستہ فریب دہی کا، کیونکہ برمک یا برامکہ کی فی الواقع وہ اصل ہے ہی نہیں جو انہوں نے بیان کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بلخ میں بدھ مت کے معبد کے مہتمم کا نام برمک تھا۔ اور عباسی سلطنت کے وزراء، اسی برمک کی اولاد میں سے تھے، جیسا کہ درج ذیل اقتباسات سے واضح ہے۔

(۱)...... ان کا جد اعلیٰ برمک، بلخ کے آتشکدۂ نوبہار کا موبد اور مجوسیوں کا بڑا معزز اور محترم پیشوا تھا۔ ❶

(۲)...... بلخ میں بدھ مت کا ایک بہت بڑا عبادت خانہ تھا جس کے مہتمم کا نام برمک تھا۔ عباسیہ خاندان کے مشہور وزراء، اسی برمک کی اولاد میں سے تھے۔ ❷

(۳)...... برامکہ کا جد اعلیٰ، برمک، بلخ کے بدھ مندر نوبہار کا متولی اور پجاری تھا، اسی لیے خراسانی اُسے بڑی عزت اور وقعت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ❸

بعض مورخین کا خیال ہے کہ برمک، کسی شخصیت کا اسم علم نہیں بلکہ کسی خانقاہ یا معبد کے سب سے بڑے پجاری کے عہدے کا نام ہے جیسا کہ درج ذیل اقتباس سے ظاہر ہے:

(۴)...... برمک، کسی شخص کا نام نہیں، بلکہ لفظ برمک، بلخ کی بدھ خانقاہ کے سب سے بڑے پجاری کے عہدے کو ظاہر کرتا ہے جو موروثی تھا۔ یہ پجاری تقریباً ۷۰۰ مربع میل جاگیر کے مالک تھے، جو بدھ خانقاہ یا مندر سے منسلک تھی۔ بعض عرب سیاحوں نے اس خانقاہ کو آتشکدے کی بجائے بتکدہ لکھا ہے، لیکن خانقاہ یا مندر کو، ایک ایسی جگہ قرار دیا جاسکتا ہے، جہاں آتش پرست لوگ، پرستش کے لیے جمع ہوتے ہوں گے، کیونکہ اس زمانہ کے لوگوں کا مذہب مجوسیت تھا، نہ کہ بت پرستی۔ ❹

---

❶ تاریخ الامت، ج ۴، ص ۱۴۹۔

❷ آب کوثر (از شیخ محمد اکرم) ص ۳۴۔

❸ تاریخ اسلام، ج ۳، ص ۱۱۶۔

❹ تاریخ اسلام، ص ۶۲۔ (از شیخ محمد رفیق + سید مسعود حیدر بخاری۔ ایڈیشن ۳ جنوری ۱۹۷۱ء)۔

> (۵)...... برمک، جو روایت کی رو سے خاندان کی مورثِ اعلیٰ کا نام ہے۔ بعض عرب مصنفین کی رائے میں کسی خاص شخص کا نام نہیں، بلکہ ایک لقب ہے جو بلخ کے نزدیک نوبہار کی پرستش گاہ کے پجاریوں کے رئیس کو، جس کا عہدہ موروثی تھا، اعزازاً دیا جاتا تھا۔ ❶

برمک، کسی شخص کا اسم علم ہو، یا کسی عہدہ و منصب کا نام ہو، بہر حال، ''مفکر قرآن'' کی یہ بات قطعی بیجا ہے کہ اس کی اصلیت ''برماہ گاہ'' ہے۔ یہ ان کی پہلی غلطی ہے۔ اور دوسری غلطی یہ ہے کہ موبد موبداں سے مراد، قاضی القضاۃ یا چیف جسٹس'' لیا گیا ہے۔ حالانکہ اس کا اصل مفہوم ''عبادت گاہوں کا سب سے بڑا متولی یا پیشوائے پجاریان'' ہے۔ اس اعتبار سے، اُسے ''پروہتِ پروہتاں'' بھی کہا جاسکتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ پرویز صاحب نے اس دوسری غلطی کا ارتکاب (نیک نیتی سے) قرونِ اولیٰ کے ایک معتزلی جاحظ کی اقتداء میں کیا ہو، کیونکہ سب سے پہلے اس غلطی کا وقوع، اُن ہی کے قلم سے ہوا تھا، اور ''مفکر قرآن'' نے مکھی پر مکھی مارتے ہوئے، اس غلط معنی کو صرف اس لیے قبول کرلیا ہے کہ یہ تاثر ابھارا جائے کہ عباسیوں نے ''قاضی القضاۃ یا چیف جسٹس'' کا جو عہدہ اپنے دورِ حکومت میں قائم کیا تھا، اس کا تصور، ایرانیوں سے ماخوذ تھا۔ تاکہ اسے بھی ''عجمی سازش'' کی ایک کڑی قرار دیا جائے۔

بہر حال، موبد موبدان کے اس معنی کی غلطی کی پردہ دری، ہمارے عہد میں، سید مناظر احسن گیلانی مرحوم نے بایں الفاظ کی ہے:

> واقعہ یہ ہے کہ موبد، دراصل، ایرانیوں کے پروہت کو کہتے ہیں۔ یہ ایک قسم کا مذہبی مقتداء ہوتا تھا، اور مذہبی رسوم و عبادات وغیرہ کا نگران ہوتا تھا۔ محکمہ عدل و انصاف سے اولاً اس کا کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ تھوڑا بہت اگر تھا بھی، تو اس کی حیثیت ثانوی کام کی تھی۔ حقیقی فرائض، موبذوں (یا موبدوں) کے پوجا پاٹ، رسوم وغیرہ کی راہنمائی تھی مگر کیا کیجئے، جاحظ نے چونکہ قضاء القضا کے لفظ سے،

---

❶ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، ج ۴، ص ۲۷۴۔

> غلط یا صحیح، اس کا ترجمہ کردیا ہے پس حریفوں کو آگ بنا لینے کے لیے چنگاری مل گئی۔ ❶

یہ ہے تحقیق کا وہ انداز، جس میں ''مفکر قرآن'' صاحب کو، اگر رائی کے برابر بھی کوئی چیز، اپنی مزعومہ ''عجمی سازش'' کی حمایت میں مل گئی تو اُسے پہاڑ بنا کر پیش کردیا کرتے تھے۔

(۲۹) برامکہ کا عروج

''مفکر قرآن'' صاحب، اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> بنوعباس کے سب سے پہلے خلیفہ ہی کے زمانہ میں، اس خاندان نے اس قدر اثر و رسوخ پیدا کرلیا۔ خلیفہ کے ساتھ خالد کے تعلقات کا اندازہ اس سے لگایئے کہ خلیفہ کی بیٹی کو خالد کی بیوی نے دودھ پلایا تھا، اور خالد کی بیٹی کو خلیفہ کی بیوی نے۔ خلیفہ المہدی کے زمانے میں خالد کو صوبہ فارس کا حاکم مقرر کردیا گیا تھا۔ خالد کا بیٹا یحیٰی اس سے بھی زیادہ زیرک اور قابل تھا۔ خلیفہ منصور نے اسے آذربائیجان کا حاکم مقرر کردیا، لیکن خالد نے اس کے لیے، اس سے بھی زیادہ اہم اور مؤثر گوشہ تلاش کیا، یعنی اسے ولی عہد، ہارون الرشید، کا اتالیق مقرر کردیا۔ یہ اتالیقی، خاندان برامکہ کے لیے، انتہائی عروج اور سطوت کا موجب بن گئی، اور ایک گونہ موروثی قرار پاگئی۔ فضل اور جعفر، یحیٰی کے دو بیٹے، باپ اور دادا سے بھی زیادہ قابل تھے۔ خلیفہ ہارون الرشید کے عہد میں کیفیت یہ تھی کہ سلطنت کا سارا کاروبار، یحیٰی کے سپرد تھا جسے وہ اپنے دونوں بیٹوں کے مشورہ سے انجام دیتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ خلافت نام کو عباسیوں کے ہاتھ میں تھی، لیکن درحقیقت برامکہ کی تحویل میں۔ ❷

---

❶ امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی، ص ۴۴۳۔

❷ شاہکار رسالت، ص ۴۶۵۔

اس میں قطعاً شک نہیں کہ خاندان برامکہ کے ذہین وفطین اور زیرک ودانا افراد، اپنی ذاتی قابلیتوں اور شخصی خوبیوں کی بناء پر، عباسی دور کے آغاز ہی سے عروج وارتقاء کا سفر شروع کر چکے تھے۔ اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ شاہی خاندان کے بعض افراد کے ساتھ، برامکہ کے رضاعی تعلقات بھی قائم تھے۔ اس میں بھی کوئی اشتباہ نہیں کہ سربراہانِ عباسیہ نے جو خدمات بھی، ان کے سپرد کیں، انہوں نے اپنی بہترین صلاحیتوں کے ساتھ، انہیں، انجام دیا۔ اس امر سے بھی ہمیں انکار نہیں کہ اپنی وجاہتِ علم وفضل ہی کے باعث، وہ شہزادوں کے اتالیق مقرر ہوئے تھے۔ لیکن یہ بات کہ اپنے عین عروجِ اقتدار میں، وہ سلطنت ایران کے خاتمہ پر، آتشِ انتقام میں جل بھن رہے تھے، اور اپنے اقتدار وسطوت کو، وہ ایرانی سلطنت کے احیاء کا ذریعہ بنا رہے تھے، ذہن پرویز کا محض افترائی اور اختراعی کرشمہ ہے، پھر درایتاً بھی یہ بات خلافِ عقل ہے کہ عباسی دور میں، انہیں جو وسیع اختیارات حاصل تھے، ان کے مقابلہ میں، وہ اُس پُرانے ایرانی نظام سلطنت کو قائم کرنے کے متمنی تھے، جس میں ان کے مورث اعلیٰ کا حلقۂ اقتدار، موبد موبدان (یعنی پروہتِ پروہتاں) کی حیثیت سے صرف عبادت گاہ کی چار دیواری تک محدود تھا، جب کہ یہاں ان کے اقتدار کا یہ عالم تھا کہ ہارون الرشید نے خلیفہ بنتے ہی، یحییٰ برمکی کو منصب وزارت دیتے ہوئے، برملا یہ کہہ دیا تھا:

> میں ملک کا سارا کاروبار اپنے کندھے پر سے اتار کر تمہارے کندھے پر رکھتا ہوں، تم سیاہ وسپید کے مالک ہو، جو چاہو کرو، جس کو چاہو، رکھو۔ اور جس کو چاہو معزول کرو۔ ①

لیکن اس قدر وسیع اختیار واقتدار کے باوجود، نہ کبھی ان کے حاشیہ خیال میں یہ بات آئی کہ ایرانی سلطنت کا احیاء کریں، اور نہ کبھی اس مقصد کے پیش نظر، کہیں انہوں نے بغاوت کی تاہم فوج اور سول حکومت کے بہت سے شعبے، یحییٰ اور اس کے چاروں بیٹوں کے سپرد تھے۔ کچھ تو اس قدر وسیع اختیارات نے، ان میں بے احتیاطی بلکہ خودسری پیدا کر دی، اور کچھ

---

① تاریخ الامت، ج ۴، ص ۱۵۳۔

برامکہ کے حُسّاد نے، ان کے خلاف خلیفہ کے کان بھرنے شروع کیے، اور کچھ خلیفہ کو بھی، ان کا ہر شعبہ میں بڑھتا ہوا اقتدار، ایک خطرہ محسوس ہوا، اتفاق سے جعفر برمکی سے ایک غلطی یہ سرزد ہوگئی کہ خلیفہ کے اس قیدی کو اس نے چھوڑ دیا جسے ان کی تحویل میں دیا گیا تھا۔ اس حرکت سے خلیفہ برامکہ سے بدظن ہوا، اور پھر ان کا زوال شروع ہوگیا جس کے نتیجہ میں، ان کا عمل دخل حکومتی معاملات میں بالکل ختم ہوگیا۔ وہ اس طرح کہ ہارون:

> کے دل میں کھٹک پیدا ہونی شروع ہوئی، جو آہستہ آہستہ برامکہ کی تباہی کا موجب بنی۔ اس نے جعفر کو قتل کرادیا۔ یحییٰ اور فضل کو قید کردیا، اور اس قدر اذیتیں دیں کہ ان کی تفصیل سن کر روح کانپنے لگتی ہے۔ اس نے خاندانِ برامکہ کی تمام جائیدادیں ضبط کرلیں مملکت سے ان کا صفایا کردیا۔ ①

معلوم نہیں کہ ''مفکر قرآن'' نے برامکہ کے ارادوں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس کا ماخذ کیا ہے۔ بلاحوالہ ایسی باتیں شاید اس لئے لکھی جاتی ہیں کہ انہیں معلوم ہے کہ کوئی اور مانے یا نہ مانے، ان کے اندھے مقلدین تو ان کے اعتماد پر، مان ہی لیں گے، کیونکہ وابستگانِ طلوع اسلام کے نزدیک اس بھری دنیا میں، صرف وہی قابل وثوق اور لائق اعتماد ہستی ہیں۔

> کس قدر اطمینان بخش ہے یہ یقین کہ کم از کم اس دنیا میں، ایک انسان تو ایسا ہے، جس پر پورا پورا بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ ②

الحمد للہ! کہ ہم مسلمان ہیں اور ہمارے لئے یہی یقین اطمینان بخش ہے کہ اللہ ہی وہ ذات ہے جس پر پورا پورا بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ.

(۳۰) برامکہ کا ''عجمی اِسلام''

برامکہ کے زوال کے بعد، پرویز صاحب، ''عجمی سازش'' کے افسانہ کو آگے بڑھاتے ہوئے لکھتے ہیں۔

---

① شاہکار رسالت، ص ۲۶۷۔

② طلوع اسلام، ستمبر ۱۹۶۵ء، ص ۲۰۔

> برامکہ بے شک ختم ہوگئے، وہ ایرانی سلطنت کا احیاء بھی نہ کرسکے، لیکن وہ جس مقصد کو لے کر آئے تھے، اس میں بڑے کامیاب ہوئے۔ انہوں نے عباسیوں کی عربی مملکت کو خالصتاً ایرانی، ان کے معاشرہ کو یکسر غیر عربی، اور ان کے مذہب کو عجمی بنادیا۔ (آگے چل کر ہم دیکھیں گے جو اسلام اس کے بعد، آگے چلا، وہ عجمی تھا، محمد رسول اللہ کا لایا ہوا دین خداوندی نہیں تھا) ❶

یہ بات، تاریخ کی کسی گری پڑی کتاب میں بھی موجود نہیں ہے کہ برامکہ ایرانی سلطنت کے احیاء کے متمنی تھے حتیٰ کہ اس تاریخ الامت میں بھی نہیں ہے جسے خود طلوع اسلام ہی کے ایک ادارہ نے، اس تعریف وتوصیف کے ساتھ، شائع کیا ہے، کہ اس کتاب میں:

> جو بات تحقیقی تھی، وہی ثبت کردی، اور اختصار کی غرض سے واقعات صرف وہی منتخب کیے ہیں، جن سے تاریخی سلسلہ کا ربط قائم رہتا ہے۔ زبان میں بھی سلاست کا لحاظ رکھا، تاکہ ہر طبقہ کے لوگ آسانی سے سمجھ سکیں۔ ❷

پرویز صاحب، تلبیس حق و باطل میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے تھے۔ ان کا یہ کہنا کہ ...... ''برامکہ نے عباسیوں کی عربی مملکت کو خالصتاً ایرانی، ان کے معاشرہ کو یکسر غیر عربی اور ان کے مذہب اسلام کو یکسر عجمی بنا دیا تھا'' ...... حقیقت حال کی قطعی غلط ترجمانی ہے۔ جس چیز کو پرویز صاحب ''عجمی اسلام'' کہا کرتے تھے۔ وہ چیز، وجود برامکہ سے بھی بہت پہلے، اموی دور میں پیدا ہوچکی تھی۔ ''مفکر قرآن'' چودھری غلام احمد پرویز صاحب کے بعض بدیہی حقیقتوں کے انکار پر، انسان انگشت بدنداں ہوکر رہ جاتا ہے، اور یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ وہ جاہل مطلق تھے یا دیدہ دانستہ منکر حقائق تھے۔ اُن کا یہ کہنا کہ برامکہ کے بعد، امت میں جو اسلام چلا، وہ ''عجمی اسلام'' تھا۔ اور اس سے قبل، گویا، ''حقیقی اسلام'' موجود تھا، حقائق کا منہ چڑانے کے مترادف ہے۔ خلافت راشدہ کے بعد، بنوامیہ کا موروثی ملوکیت کو اپنانا، اور بیت المال کو

---

❶ شاہکار رسالت، ص ۲۶۷۔

❷ تاریخ الامت، جلد اوّل، ص ۱۲۔

ذاتی خزانہ سمجھتے ہوئے بے جا تصرف کرنا، اور لوگوں سے آزادیٔ اظہار رائے کو سلب کرنا، عدلیہ کی آزادی کو پامال کرنا، اور ایسے اشخاص کو منصب قضاءۃ پر رکھنا، جن کے فیصلے حکمرانوں کے اشارۂ ابرو پر ہی موقوف ہوں، شاہی خاندان کے افراد ہی کو نہیں، بلکہ ان کے غلاموں اور کنیزوں تک کو قانون سے بالاتر قرار دینا، انتقام کے جوش میں لاشوں کی بے حرمتی کرنا، اور مقتولین کے سر کاٹ کر، ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجنا، نومسلموں پر کفار کی طرح جزیہ عائد کرنا، حجاج جیسے سفاک اور ظالم شخص کو گورنر بنا کر، اسے جوروستم کرنے کا کھلا لائسنس دینا، نسلی، قبائلی اور وطنی عصبیتوں کو سیاسی اغراض کے لیے بھڑکانا...... کیا یہی محمد رسول اللہ ﷺ کا لایا ہوا، وہ ”دین اسلام“ تھا، جسے برامکہ نے ”عجمی اسلام“ میں تبدیل کر ڈالا تھا؟ اگر بنوعباس کی حکومت بھی، ان تمام برائیوں میں لتھڑی ہوئی تھی، جن میں خاندانِ برامکہ کے برسر اقتدار آنے سے قبل، بنوامیہ کی حکومت ملوث تھی، تو پھر برمکی وزراء نے کس ”عجمی اسلام“ کو پیش کیا تھا؟ کیا برامکہ سے قبل، دورِ اموی میں، موروثی ملوکیت کا وجود نہیں پایا جاتا تھا؟ اور پھر کیا بعد کے عباسی دور میں نسلی اقتدار کا خاتمہ ہو کر، ”شوروی خلافت“ قائم ہو گئی تھی؟ کیا بیت المال کا یہ تصور کہ وہ خدا اور اس کے بندوں کی امانت ہے، برامکہ سے قبل ہی صرف اموی دور ہی کا طرۂ امتیاز تھا؟ اوز بعد میں برامکہ کے اقتدار کے باعث، یہ طرۂ امتیاز ختم ہو گیا؟ کیا برامکہ کے مسندِ وزارت پر متمکن ہونے سے پہلے، لوگوں کو اظہار رائے کی آزادی حاصل تھی، اور اب برامکہ کے سبب، یہ آزادی مسلوب ہو کر، ”عجمی اسلام“ کا شعار بن گئی؟ کیا عروجِ برامکہ سے قبل، اموی عہد حکومت ہی میں عدلیہ آزاد تھی؟ اور اب دورِ عباسی میں محض برمکی وزراء کی وجہ سے یہ آزادی ختم ہو گئی؟ کیا اقتدارِ برامکہ سے قبل، اسلامی قانون کی حکمرانی قائم تھی؟ اور اب برمکی اقتدار ہی کے باعث، شریف و وضیع، ادنیٰ و اعلیٰ، راعی و رعایا، خواص و عوام کے لیے، الگ الگ قانونی ضابطے مقرر ہوئے؟ کیا اقتدارِ برامکہ سے قبل، جاہلانہ اور وحشیانہ حرکات کا وجود عنقا تھا؟ اور ان حرکات کے وجود میں آنے کا سبب، برامکہ کا اقتدار تھا؟ کیا اموی دور میں ظالم اہلِ کار اور ستم پیشہ گورنر موجود نہیں تھے؟ اور ایسے جائر و مستبد حکمران، جو ”عجمی اسلام“ ہی کا

لازمہ ہیں، برامکہ کے اقتدار ہی کا نتیجہ تھے؟ الغرض، جب اسلام کے معیارِ مطلوب کے قطعی برعکس عمال اور اعمال، دونوں ہی اموی اور عباسی دور میں قائم و برقرار رہے ہیں، تو پھر "مفکر قرآن" کے اس فرمان کا کیا مطلب ہے کہ...... انہوں (یعنی برامکہ) نے عباسیوں کی عربی حکومت کو خالصتاً ایرانی، ان کے معاشرہ کو یکسر غیر عربی، اور ان کے مذہب (اسلام) کو عجمی بنا دیا۔

مزاجِ پرویز کا ایک پہلو

یہاں مزاجِ پرویز کا یہ پہلو بھی لائقِ توجہ اور قابل غور ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے ایک موقع پر، یہ دیکھتے ہوئے کہ عرب کے مخصوص حالات میں، (جہاں قریش کی سیادت و قیادت صدیوں سے مسلم چلی آ رہی ہے) اگر آپ ﷺ کے بعد، غیر عرب (یعنی عجمی) تو رہا ایک طرف، اگر غیر قریشی بھی خلیفہ بن گیا، تو باقی قبائل عرب، اسے قبول نہیں کریں گے، اور نتیجتاً، اُس اسلام کا تمکن خطرے میں پڑ جائے گا جس کے لیے آپ ﷺ نے اپنے جسم و جان کی صلاحیتوں کو، دل و دماغ کی قابلیتوں کو، اور اپنی شخصیت کے پورے سرمائے، کو کھپا ڈالا ہے۔ اس لیے آپ ﷺ نے یہ ہدایت فرما دی کہ اَلْاَئِمَّةُ مِنْ قُرَیْش (آئندہ امامت پر متمکن قریش ہی ہوں) لیکن دوسری طرف عرب کے مسلمانوں اور عجم کے نومسلموں میں، اسلام نے جو اخوت اور مساوات کی فضا پیدا کی، اس میں عربوں کی طرح عجمیوں نے بھی خدمتِ اسلام میں حصہ لیا۔ کسی کی راہ میں کوئی رکاوٹ حائل نہ تھی۔ جس عربی یا عجمی نے، علوم اسلامیہ میں سے جس علم کی خدمت کرنا چاہی، اس کے راستہ میں کوئی مزاحمت نہ تھی۔ اس معاشرتی مساوات سے فائدہ اٹھا کر، جس طرح اہل عرب، آسمان علم پر درخشاں ستارے بنے، اسی طرح اہل عجم بھی نجوم لامعہ بنے۔ عرب و عجم میں سے جو کوئی بھی، جس شعبہ علم میں آگے بڑھنا چاہتا، وہ اپنے لیے کھلا میدان پاتا تھا۔ اسی معاشرتی مساوات کے باعث، جب خدمت علم کی راہ میں مسابقت پیدا ہوئی، تو عجم کے شیدایانِ علم، بہت آگے بڑھ گئے، اور خود عرب پیچھے رہ گئے۔ لیکن عجم کے اس تقدم کو "مفکر قرآن" نے عربوں کے خلاف، "عجمی تعصب" قرار دے کر، اسے بھی "عجمی سازش" کی عینک لگا کر دیکھا، تو انہیں دنیا، اور ہی رنگ میں رنگی

ہوئی نظر آئی۔ محدثین کرام، عجم کی سرزمین سے وابستہ ہونے کی بناء پر، ''عجمی سازش'' کے علمبردار قرار پائے، اگر کسی عجمی کو کوئی اونچا سرکاری منصب مل گیا، تو وہ احیاءِ عجم کا داعی قرار پایا۔ کسی عجمی کو فوج میں اعلیٰ کمان ملی، تو فوج ہی عجمیت کا شکار ہوگئی۔ خدمت اسلام میں عجمی آگے بڑھے، تو اسلام ہی ''عجمی'' قرار پاگیا۔

اب امامتِ قریش کے معاملہ میں، جب حضور ﷺ نے جزوی طور پر، اصول مساوات کو معطل رکھتے ہوئے، خلافت کے لیے قرشیت کی شرط لگا دی، تو ''مفکر قرآن'' نے اسے ''اصول شکنی'' قرار دیا۔ اور جہاں معاشرتی مساوات موجود تھی۔ اور عجم اس سے مستفید ہوتے ہوئے، خدمت اسلام میں بالعموم، اور خدمت حدیث میں بالخصوص، آگے بڑھ گئے، تو اسے ''عجمی سازش'' کا ایک حصہ قرار دے دیا۔ یہ تضاد کیوں؟ صرف اس لیے کہ خلق خدا کو دھوکہ دے کر اپنے ساتھ ملانا مقصود ہے، خواہ یہ کام کسی بھی ذریعہ سے ہو۔

(۳۱) بیت الحکمت کا قیام اور مناظرے

''مفکر قرآن'' صاحب، یحییٰ برمکی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> یحییٰ نے بغداد میں بیت الحکمت قائم کیا، جس میں عجم کی تاریخ اور لٹریچر کا معتدبہ ذخیرہ، عربی زبان میں منتقل کر دیا گیا اس کے ساتھ ہی، اس نے بحث و مناظرہ کی مجالس بھی نہایت اعلیٰ پیمانہ پر قائم کیں، اور ان مجالس میں ایرانی، یہودی اور نصاریٰ علماء اور فلاسفر ایک طرف ہوتے تھے، اور مسلمان علماء دوسری طرف۔ اور موضوع بحث، اسلامی عقائد و نظریات ہوتے تھے۔ ان مباحث کا جو نتیجہ نکل سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ اول تو عرب سادہ سی قوم تھی جو فلسفیانہ نکتہ آفرینیوں اور منطقی موشگافیوں میں الجھنا جانتی ہی نہ تھی۔ پھر مملکت کی سیاسی مصلحتوں نے انہیں اس قدر دبا کر رکھا تھا کہ ان کا جذبۂ حریت ماؤف ہو چکا تھا۔ ①

اس اقتباس میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ صحت و سقم کا ملغوبہ ہے جس کی تنقیح ضروری ہے۔

---

① شاہکار رسالت، ص ۳۶۵ تا ۳۶۶۔

۱۔۔۔ اس میں شک نہیں کہ علوم عجم اور ادبیات عجم کا معتد بہ ذخیرہ، اس ادارہ میں جمع کیا گیا تھا جسے بیت الحکمت کہا جاتا ہے اور فلسفہ کی کتب اور دیگر علوم کو عربی میں منتقل بھی کیا گیا تھا۔ لیکن اس ادارہ کے کرتا دھرتا، وہ معتزلہ تھے جو آج کے منکرین حدیث کے فکری آباء و اجداد تھے، اور آج کے منکرین حدیث ہی کی طرح، وہ بھی عقل کی بالاتری کے قائل تھے۔ چنانچہ طلوع اسلام، ''عقل کا غلبہ'' کے زیر عنوان، ان کی مدح سرائی میں لکھتا ہے۔

> وہ عقل کے تسلط کے قائل تھے اور کہتے تھے کہ عقل خود حسن و قبح کی معرفت حاصل کرسکتی ہے، خواہ شریعت نے کسی بات کے حسن و قبح کو بیان کیا، یا بیان نہ کیا ہو۔ ①

اور پھر، ان لوگوں کی ''عقلیت پرستی'' کا مآل و نتیجہ یہ تھا کہ بیرونی فلسفوں کے زیر اثر، غیر اسلامی عقائد و تصورات کو، یہ لوگ، اسلامی تعلیمات، میں اس طرح داخل کر رہے تھے، جس طرح آج کے منکرین حدیث، مغربی معاشرت کے اجزاء کو، اشتراکیت کے ساتھ ملا کر، دینِ اسلام میں داخل کرنے پر جتے ہوئے ہیں۔ عقلیت پرستی کا نظریۂ معتزلہ، یہود و نصاریٰ کے ان ہی مناظروں کا پیدا کردہ تھا، جو شاہی درباروں میں منعقد ہوا کرتے تھے۔ پھر عقل کے یہ پرستار، بیرونی فلسفوں کو پوری طرح سمجھے بغیر ہی، یہ چاہتے تھے، کہ اس کے پیدا کردہ مسائل کو حل کرڈالیں۔ مسئلہ خلق قرآن بھی، انہی مباحث کی پیداوار تھا، جسے معتزلہ نے اپنا کر، اقتدارِ وقت کے ساتھ، ''ملی بھگت'' اور ''شریفانہ معاہدہ'' کرتے ہوئے، علماءِ امت اور اساطینِ علم کے خون کی ندیاں بہائیں۔

۲۔۔۔ اس کے بعد، یہ کہنا کہ...... ''اس وقت کے علماء امت اور محدثین کرام، فلسفیانہ نکتہ آفرینیوں اور منطقی موشگافیوں سے بے خبر اور بے نیاز تھے، اور ریاستی مصلحتوں کے زیر اثر، ان کے فکری سوتے خشک ہوچکے تھے، اور ان کا جذبۂ حریت ماؤف ہوچکا تھا''...... صرف اس لئے ہے کہ علماء و محدثین پر، معتزلہ کی عقلی برتری اور علمی فضیلت کا تاثر دیا

---

① طلوع اسلام، فروری ۱۹۶۲ء، ص ۷۰۔

جا سکے، حالانکہ محدثین میں سے، امام احمد بن حنبل، اور عبد العزیز بن یحییٰ ہی وہ عالم تھے، جنہوں نے تن تنہا، ان مناظروں اور مباحثوں میں، اپنے مخالفین کو شکست دے کر، لاجواب اور ساکت وصامت کر دیا تھا۔ لیکن ''مفکر قرآن'' صاحب ہیں کہ حقائق کو مسخ کرتے ہوئے، تنکوں کا پل تعمیر کر رہے ہیں، تاکہ ''عجمی سازش'' کے ہاتھی کو، اس پر سے گزارا جا سکے۔

(۳۲) فوج میں ایرانی عُنصر

''مفکر قرآن'' صاحب، ابو مسلم خراسانی کو ''عجمی سازش'' کے سلسلہ کی ایک کڑی قرار دیتے ہوئے، سیاسی محاذ پر، اس کی ایک کارگزاری کا ذکر، ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> اس نے ایرانی رضا کاروں کو عباسی فوج میں داخل کر کے، عسکری قوت کو بھی، غیر عربی بنا دیا تھا۔ اس نے خالد برمکی کو بھی اپنی فوج میں شامل کر لیا تھا، اور اسی کی سفارش پر اس نے عباسیوں کے دربار تک رسائی حاصل کی تھی۔ فضل برمکی نے، اپنے عہد وزارت میں، صوبہ خراسان میں جس قدر فوج بھرتی کی، وہ بھی خالص ایرانی تھی۔ ❶

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ اگر بنوعباس صرف عربوں ہی پر، اپنی افواج کو مشتمل رکھتے، تو ان پر ''عربیت'' کا الزام عائد کر دیا جاتا، اور اُسے عجم کے بالمقابل ''عربی عصبیت'' کا نام دیا جاتا۔ اور یہ کہا جاتا کہ جس مساوات کو اسلام نے معاشرت میں قائم کیا، اسے عسکریت سے دیس نکالا دے دیا گیا۔ لیکن اگر بنوعباس نے عجم کے افراد کو بھی، اپنی افواج میں شامل کیا، تو اب یہ اعتراض جڑ دیا گیا کہ ''اس سے عسکری قوت کو بھی غیر عربی بنا دیا گیا۔'' حالانکہ عسکری قوت کا سربراہ، اس دور میں، خواہ کوئی عجمی تھا، یا عربی، بہرحال وہ خلیفہ کے ماتحت اور زیر فرمان تھا، اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ خلیفہ کی مرضی کے خلاف، فوج نے کوئی حرکت کی ہو۔ لیکن

---

❶ شاہکار رسالت، ص ۴۶۷۔

اس کے برعکس، ہمارے وطن عزیز کے حالات پر ایک نگاہ ڈالیے، جس کے سب سے پہلے سربراہ، گورنر جنرل، جناب قائداعظم محمد علی جناح تھے۔ جن کی قرآنی بصیرت، دینی فراست اور قرآن مجید سے ان کے والہانہ عشق کا ڈھنڈورہ، طلوع اسلام خود بھی یہ کہہ کر پیٹتا رہا، اور دوسروں سے بھی پٹواتا رہا کہ:

> (۱)...... یہ درست ہے کہ قائداعظم کو فقہی موشگافیوں کا درک حاصل نہ تھا، لیکن جہاں تک اسلام کی دینی عظمت و برتری کا تعلق ہے، انہوں نے اس کی روح تک کو سمجھنے میں پوری عرق ریزی سے کام لیا تھا۔ ❶
>
> (۲)...... اس شخص (قائداعظم) کے متعلق، جس کی قران حکیم کے حقائق پر غائر نگہی کا اندازہ، اس ایک بات سے لگائیے کہ.......... ❷
>
> (۳)...... قائداعظم کے متعلق، جو میں عرض کرتا ہوں، وہ میری شنید نہیں، دید ہے۔ مجھے ان سے قریب دس سال تک ملاقات کا شرف حاصل رہا ہے۔ میرے اور ان کے درمیان، وجۂ اشتراک، قرآن کریم تھا۔ میں اپنے ذاتی تجربہ کی بناء پر شہادت دے سکتا ہوں کہ قرآنی حقائق اور دین کے اصول و اقدار، ان کے قلب کی گہرائیوں میں اترے ہوئے تھے۔ ❸

بطور جملہ معترضہ، یہ عرض کیے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے کہ ''مفکر قرآن'' صاحب کا جس قسم کا کردار تھا، اسے دیکھتے ہوئے، ایک صحیح اسلامی معاشرے میں، ان کی بیان کردہ روایت، سراپا کذب اور وہ خود مردود الشہادت ہی قرار پاتے ہیں۔

اب رہا دوسروں سے، قائداعظم کی ''قرآنی بصیرت'' کا پراپیگنڈہ کرانے کا معاملہ، تو ''مفکر قرآن'' ہی کے ایک فکری ہمنوا، (جو بظاہر ایک عالم دین اور خطیب مسجد تھے لیکن بباطن منکر حدیث تھے) یہ کہا کرتے تھے کہ:

---

❶ طلوع اسلام، اپریل ۱۹۶۹ء، ص ۳۲۔ ❷ طلوع اسلام، اگست ۱۹۷۶ء، ص ۲۳۔

❸ طلوع اسلام، ستمبر ۱۹۸۲ء، ص ۲۰۔

> میں نے سیاسی لیڈروں کو بھی دیکھا اور مذہبی راہنماؤں کو بھی۔ لیکن مجھے پوری زندگی میں قائداعظم سے بڑھ کر کوئی شخصیت متاثر نہ کر سکی۔ میں نے ہر ایک کو ان سے کم تر پایا۔ بلندئ کردار کے اعتبار سے بھی، اور قرآنی بصیرت کے نہج سے بھی۔ ❶

لیکن یہی قائداعظم، جنہوں نے ''فقہی موشگافیوں سے ناواقف ہو کر بھی، روحِ دین کو سمجھنے میں پوری عرق ریزی سے کام لیا تھا''۔ اور جن کی ''قرآن حکیم کے حقائق پر غائر نگہی'' پرویز صاحب کے نزدیک ایک مسلمہ حقیقت تھی، اور ''قرآنی حقائق اور دین کے اصول و اقدار'' جن کے ''قلب کی گہرائیوں میں اترے ہوئے تھے'' اور جس کے مقابل، ''قرآنی بصیرت کے نہج سے ہر ایک کو کم تر پایا گیا''۔ اُن کے ''قرآنی فہم'' اور ''اسلامی فراست'' کا یہ حال تھا کہ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل بنتے ہی، انہوں نے کسی مسلم کو نہیں، بلکہ ایک کافر عیسائی انگریز کو، (جس کا نام غالباً جنرل گریسی تھا) عالم اسلام کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کی افواج کا کمانڈر ان چیف بنا دیا تھا۔ پھر اسی کوتاہی کا یہ نتیجہ تھا کہ بھارتی حکومت، جب اپنی فوجی قوت کے بل بوتے پر، کشمیر کو ہڑپ کرنے پر تُل گئی، تو

> دریں اثناء، پاکستان نے کشمیر میں فوجی مزاحمت کرنے کا ارادہ کیا، لیکن پاکستان کے انگریز کمانڈر ان چیف نے قائداعظم کو صاف صاف کہہ دیا کہ اس کے پاس ایسی کوئی فوجی نفری نہیں ہے، جسے کشمیر میں ہندوستانی فوج کے خلاف مقابلے میں بھیجا جا سکے۔ فوجی جہاں متعین ہیں، وہاں سے انہیں ہٹانا ممکن نہیں۔ اس پر پاکستانی عوام نے اس خلاء کو پُر کیا، اور مجاہدین کی کافی تعداد، مجاہدین کشمیر کی امداد کو پہنچ گئی، جنہوں نے ٹوٹے ہوئے ہتھیاروں کی مدد سے اُس ہندوستانی فوج کو ناکوں چنے چبوا دیئے جسے ہوائی جہازوں کے ذریعے، لمحہ بہ لمحہ کمک اور جدید ہتھیار پہنچ رہے تھے۔ ❷

---

❶ طلوع اسلام، نومبر ۱۹۸۳ء، ص ۶۴۔

❷ تاریخ پاکستان۔ ص ۳۴۴ (از محمد عبد اللک ملک۔ ۱۹۸۳ء طابع عبد الصمد قریشی، ناشر قریشی برادرز، چوک اردو بازار، لاہور)

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ عباسی حکومتوں کے حکمرانوں میں سے، کسی نے بھی ''روحِ دین کو سمجھنے میں پوری عرق ریزی سے کام نہیں لیا ہوگا''، اور وہ ''قرآن حکیم پر غائر نگہی'' کا وصف نہیں رکھتا ہوگا، اور ''قرآنی حقائق اور اس کے اصول و اقدار، اس کے قلب کی گہرائیوں میں'' اتنے ''نہیں اُترے ہوں گے'' جتنے کہ قائداعظم کے دل کی گہرائیوں میں اُترے ہوئے تھے، لیکن پھر بھی، اگر، ان عباسی حکمرانوں نے، ایرانیوں کو، مسلم افواج میں بھرتی کیا تھا، تو وہ غیر مسلم نہیں تھے، اول و آخر مسلمان ہی تھے۔ پھر انہوں نے کبھی عباسی سربراہ کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کی جیسی حکمِ قائد کی، انگریز سربراہِ فوج نے کی ہے۔

پھر انہی قائداعظم کے حینِ حیات، سر ظفر اللہ خاں جیسے متعصب اور متشدد قادیانی کو، عالم اسلام کی سب سے بڑی ریاست کا وزیر خارجہ بنایا گیا، اور اس سے قبل، اسی قادیانی کو، محمد علی جناح نے، ریڈکلف کے باؤنڈری کمیشن میں، پاکستان کا پلیڈر بنا ڈالا تھا۔ پھر قائداعظم ہی نے، پاکستان اور مسلمانان پاکستان کی طرف سے، اس کافر قادیانی کو ہیگ (ہالینڈ) میں، انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کا جج بنایا تھا۔ اور یہی وہ کافر تھا، جسے ''مفکر قرآن'' کے ممدوح صدر، ایوب خاں نے، اسلامی جمہوریہ پاکستان کی طرف سے، یو این او کا مستقل نمایندہ بنا ڈالا تھا۔ اب کیا ''مفکر قرآن'' اور منکرینِ حدیث کا پورا ٹولہ، ''عجمی سازش'' کے دوران، عباسی سلطنت میں، کسی ایک بھی غیر مسلم اور سکہ بند کافر کو، سربراہ افواج کا منصب یا عہدۂ وزارت دیئے جانے کی، کوئی ایک بھی مثال پیش کر سکتا ہے؟ لیکن یہاں، نوزائیدہ مملکتِ پاکستان میں، کفار کو ایسے عہدے دینے کا کام اس قائداعظم کے ہاتھوں انجام پایا جو اگرچہ ''قرآنی حقائق پر غائر نگہی'' کا وصف تو رکھتے تھے، لیکن یہ معمولی سی بات نہیں جانتے تھے کہ

> اسلامی مملکت میں، غیر مسلموں کو تمام انسانی حقوق دیئے جائیں، لیکن انہیں شریکِ حکومت نہیں کیا جا سکے گا، کوئی حکومت بھی، جو کسی آئیڈیالوجی (نظریہ یا عقیدہ) پر مبنی ہو، ان لوگوں کو شریک حکومت نہیں کر سکتی، جو اس نظریہ یا عقیدہ کو نہ

مانتے ہوں۔ ①

آج کے سیکولر حکمران، جب جہاد کا ذکر کرتے ہیں، تو خود ہی ''مفتی'' بن کر، یہ فتویٰ داغتے ہیں کہ ''جہاد کرنا، افراد کا کام نہیں، بلکہ حکومت کا کام ہے''، حالانکہ پورا اور صحیح بیانِ حقیقت یہ ہے کہ ''یہ اسلامی حکومت کا کام ہے۔'' لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسلامی حکومت کا کہیں وجود ہی نہ ہو، تو کیا جہاد کرنا حرام ہوگا؟ اس سوال کے جواب سے گریز کیا جاتا ہے، حالانکہ جہاد، بعثت نبوی سے لے کر، قیامت تک جاری و ساری رہے گا، نہ اسے کسی عادل کا عدل روک سکے گا، اور نہ ہی کسی ظالم کا ظلم۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستانی افواج کے پہلے انگریز کمانڈران چیف کے کھلے کھلے انکار کے باوجود بھی، جہاد کالعدم نہ ہوا، بلکہ عام مسلمان مجاہدین، میدان میں نکلے اور بھارتی فوج کو ناکوں چنے چبواتے ہوئے، کشمیر کے اُس حصے سے بھارتی تسلط کو توڑ ڈالا، جسے آج آزاد کشمیر کہا جاتا ہے۔ اس آزاد کشمیر کا وجود، ہماری پاکستانی افواج کا مرہونِ منت نہیں ہے، بلکہ یہ مسلم مجاہدین کا کارنامہ ہے، وہی مسلم مجاہدین، جنہیں آج ''دہشت گرد''، ''مذہبی جنونی'' اور ''بنیاد پرست'' کہا جاتا ہے۔ رہی ہماری فوج، جس پر قوم کا آدھا سرمایہ خرچ ہوتا ہے، تو اُس نے آج تک دشمن کی ایک انچ زمین بھی فتح نہیں کی، بلکہ آدھا ملک گنوا کر، بھارتی افواج کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے، ''غازی'' کی بجائے ''نیازی'' قرار پائے۔ ہاں البتہ، دشمن کی تو نہیں۔ لیکن غیروں کی خوشنودی کے لیے، اپنوں کی حکومتوں کا تختہ الٹنے کے لیے، کفار کو ''لاجسٹک سپورٹ'' پیش کرتے رہے ہیں، اور وانا، جامعہ حفصہ، اور بلوچستان پر، ہماری شیر دل افواج نے فتح کے جھنڈے ضرور گاڑے ہیں، اور یہ جھنڈے گاڑنے کی صلاحیت بھی، اس غریب قوم نے اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر، اُس فوج میں پیدا کی ہے جس کی گولیاں، اپنی ہی قوم کے سینوں میں پیوست ہو رہی ہیں ☆:

جنہیں آغوش میں پالا، وہی تیغِ ستم نکلے
کیا بے درد موجوں نے کلیجہ چاک ساحل کا

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر عباسی حکومتوں میں، ایرانیوں کی مسلم افواج میں بھرتی،

---

① تفسیر مطالب الفرقان، ج ۴، ص ۱۹۴۔ ☆ خدا کرے ہماری افواج کی بابت، یہ عوامی تاثرات زائل ہو جائیں۔ آمین ثم آمین

"عجمی سازش" کے سلسلہ کی ایک کڑی قرار پاتی ہے، تو کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ پاکستان کا قائم کرنا، کافروں (انگریزوں) کی سازش تھی، کیونکہ فوج کا سربراہ انگریز کافر تھا، اور وہ بھی ایسا نافرمان، کہ قائداعظمؒ کے بحیثیت گورنر جنرل دیئے جانے والے حکم کی بھی، اُس نے پروا نہ کی، اور اُس کا وزیر خارجہ بھی وہ شخص تھا، جس کا تعلق، اس جماعت سے تھا، جس کا بانی بقولِ خود "انگریزوں کا خودکاشتہ پودا" تھا۔

کوئی ہے جو اس سوال کا جواب دے۔ ❶

(۳۴) فرقہ وارانہ کشمکش

جب کوئی شخص، اس بات پر اُدھار کھائے بیٹھا ہو، کہ حقائق کو قطع و برید، اور واقعات کو مسخ و تحریف کا نشانہ بنا کر، ان میں سے اپنے من پسند نتائج ہی کو اخذ کرتا ہے، تو پھر کسی عام آدمی کی تحریروں سے غلط مفہوم اخذ کرنے تک بات محدود نہیں رہتی، بلکہ ایسی ذہنیت کے ساتھ، تو خدا کی کتاب کو بھی، نشانۂ تحریف بناتے ہوئے، مطلب برآری کی جا سکتی ہے، خود "مفکر قرآن" ہی کا فرمان ہے:

> جب کوئی شخص، قرآن کو مسخ کرنے پر اُتر آئے، تو اُسے، اِس سے اپنی کون سی مصلحت کی سند نہیں مل سکتی۔ ❷

چنانچہ خلافتِ راشدہ کے بعد، جب زندگی کی گاڑی، قرآن وسنت کی پٹڑی سے اُتر گئی، اور مختلف سیاسی افکار کے نتیجہ میں، وجود میں آنے والے گروہ، بعد میں مذہبی فرقوں میں ڈھل گئے، اور سرکاری سرپرستی میں منعقد ہونے والے مناظروں نے فرقہ وارانہ کشمکش پیدا کر ڈالی، تو اس صورتِ حال کے ہر پہلو سے، "مفکر قرآن" کو "عجمی سازش" کی بو آنے لگی۔ اگر کہیں ایران میں شیعہ مسلک کی حکومت قائم ہوئی، تو اُسے "عجمی سازش" کی کڑی قرار دے

---

❶ طلوع اسلام، جون ۱۹۵۱ء، ص ۴ + اگست ستمبر ۱۹۵۲ء، ص ۱۳۱۔

❷ طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۷۹ء، ص ۱۳۔

ڈالا۔ پھر اس کے بعد، اگر کہیں، سُنیوں کی حکومت بن گئی، تو اسے، مرکز کی کمزوری، کا نام دے ڈالا، اور پھر اس ''کمزوری'' کو بھی، ''انتقام عجم'' کا مظہر بنا کر، ''عجمی سازش'' کے سلسلہ کی کڑی قرار دے دیا، حالانکہ ان فرقہ وارانہ نزاعات کا وجود، صرف اور صرف، تفرقہ بازی کا نتیجہ تھا، نہ کہ کسی ''عجمی سازش'' کا۔ پھر یہ فرقہ وارانہ نزاعات، صرف ایران تک ہی محدود نہ تھے، بلکہ غیر ایرانیوں میں بھی موجود تھے، لیکن چونکہ ''مفکر قرآن'' کے دل و دماغ کی تمام صلاحیتیں، ''عجمی سازش'' کا تعلق، صرف ایران ہی کے ساتھ جوڑنے پر مرکوز تھیں، اس لئے باقی علاقوں کے فرقہ وارانہ نزاعات سے چشم پوشی کرنا، لازم ٹھہرا۔

علاوہ ازیں، ''عجمی سازش'' میں، اہل ایران کے ''انتقام'' کو بنیادی عامل قرار دے کر، اس کے حق میں جو ''دلائل'' دیئے گئے ہیں، اُن پر یہ پنجابی محاورہ صادق آتا ہے ''کھالیاں دے گواہ ڈڈو'' (یعنی نالۂ آب کے گواہ مینڈک ہی ہوا کرتے ہیں)۔ یہ ''دلائل''، جن اقتباسات سے پیش کئے گئے ہیں، وہ شیعوں، ناصبیوں، اور خود منکرین حدیث (مثلاً خواجہ عباد اللہ اختر) کی کتب سے ماخوذ ہیں، جن کی مجموعی تعداد پوری امت مسلمہ میں، آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔ پھر ان قلیل التعداد منحرفین کی عبارات کے ذریعہ، امت مسلمہ کی اکثریت کے خلاف، دلیل و حجت لائی جاتی ہے، اور معدودے چند لوگوں کی گمراہی کو، پوری امت کی گمراہی قرار دے کر، اسے ''عجمی سازش'' کا شکار قرار دیا جاتا ہے۔

(۳۴) دینی انتقام

اب تک کی بحث، ''عجمی سازش'' کے اس پہلو پر محیط رہی ہے جو ''مفکر قرآن'' کے نزدیک، سیاسی انتقام کا پہلو ہے۔ اس ''سازش'' کا دوسرا پہلو، (بقول ان کے) دینی انتقام کا پہلو ہے۔ اپنی بحث کے پہلے پہلو کے اختتام پر، اور دوسرے پہلو کے آغاز پر، وہ لکھتے ہیں۔

> لیکن یہ وہ بدلہ تھا، جو انہوں نے عربوں یا مسلمانوں سے لیا۔ جو بدلہ انہوں نے اسلام سے لیا (جس نے ان کے مذہب مجوسیت کا خاتمہ کر ڈالا تھا)، اس کا

تذکرہ، اب سامنے آتا ہے۔ ①

اس کے بعد، وہ ''دینی انتقام'' کے ضمن میں، تمہیداً، سب سے پہلے اسلامی اساسات (عقائد خمسہ) کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ان میں سے تین کو نشانۂ تحریف بناتے ہیں، اور اپنے مدعائے مقصود کے اثبات کے لیے، یا اپنے ذہنی نقشہ کی تعمیر کے لیے، ٹیڑھی اینٹیں جماتے چلے جاتے ہیں۔

(۱)...... سب سے پہلی ٹیڑھی اینٹ، اُن کی وہ سخن سازی ہے، جس سے مفہوم وحی، صرف قرآن تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے، حالانکہ جو قرآن مجید، مَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ کے اتباع کا حکم دیتا ہے، وہی قرآن، اس سے کہیں زیادہ، اتباعِ رسول کی تاکید کرتا ہے، اور وہ بھی اس حد تک کہ ہدایت صرف اور صرف، اتباعِ رسول ہی میں ہے۔ وَاِنۡ تُطِيۡعُوۡهُ تَهۡتَدُوۡا (النور:۵۴)۔ اطاعتِ رسول ﷺ سے گریز اور حکم نبی ﷺ کی مخالفت کا نتیجہ، کسی فتنے یا عذاب الیم کا شکار ہونا ہے۔ فَلۡيَحۡذَرِ الَّذِيۡنَ يُخَالِفُوۡنَ عَنۡ اَمۡرِهٖۤ اَنۡ تُصِيۡبَهُمۡ فِتۡنَةٌ اَوۡ يُصِيۡبَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ (النور:۶۳)۔ خدا کی اطاعت کا ذریعہ یہ نہیں کہ کتاب بلا پیغمبر، تعلیم بلا معلم اور قرآن بلا محمد کا نامعقول مسلک اپناتے ہوئے، نرے قرآن کا، اپنے خود ساختہ معانی کے ذریعہ، اتباع کیا جائے، بلکہ یہ ہے کہ بے چون و چرا، رسول اللہ ﷺ کی پیروی کی جائے، کیونکہ قرآن کریم نے اطاعتِ رسول ہی کو اطاعتِ خدا قرار دیا ہے من يطع الرسول فقد اطاع الله۔ لیکن کہیں یہ نہیں کہا کہ ''جس نے قرآن کا اتباع کیا، اس نے خدا کی اطاعت کی''۔ پھر اگر، اہل ایمان کے باہمی نزاعات میں تصفیہ کے لیے، مَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ اور رسول دونوں کی طرف بلایا جائے، تو منافق، مَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ کی بجائے، رسول کی طرف آنے سے گریزاں ہوتا ہے، وَ اِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ تَعَالَوۡا اِلٰى مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوۡلِ رَاَيۡتَ الۡمُنٰفِقِيۡنَ يَصُدُّوۡنَ عَنۡكَ صُدُوۡدًا (النساء:۶۱)۔ کیوں؟ اس لیے کہ مَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ، اور رسول میں اصلی عامل، اور بنیادی چیز، ہستی رسول اور اس کا اتباع ہے، اور منافق پر

---

① شاہکار رسالت، ص ۲۷۴۔

یہی چیز گراں گزرتی ہے، قرآن، اس لیے گراں نہیں گزرتا، کہ اسے ہر "مفکر قرآن" اپنے من پسند معانی پہنا سکتا ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ کا اتباع، صرف اور صرف، اطاعت رسولؐ اور اتباع نبیؐ کے ذریعہ ممکن ہے۔ خود پرویز صاحب ہی کا فرمان ہے:

> اس کا یہ مطلب نہیں کہ (نعوذ باللہ) ان احکام میں تضاد ہے کہ کہیں قرآن کے اتباع کا حکم ہے، اور کہیں رسول کے اتباع کا، بلکہ اصل یہ ہے کہ رسول کا اتباع ہی، قرآن کا اتباع ہے۔ ①

(۲)...... دوسری ٹیڑھی اینٹ کی حیثیت، جس چیز کو حاصل ہے، وہ ان کا یہ باطل تصور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے، جو مملکت تشکیل دی تھی، وہ صرف اور صرف، قرآن کی اساس پر قائم ہوئی تھی۔ حالانکہ اس اولین اسلامی ریاست کی اساس کتاب اور سنت رسول اللہ تھیں۔ اور یہ وہ حقیقت باہرہ ہے، جس کا انکار، چودھری غلام احمد پرویز کے، پختہ مزاج کے منکرِ حدیث اُستاد، جناب اسلم جیراجپوری بھی نہیں کر سکے۔ وہ لکھتے ہیں:

> خلافت راشدہ میں تشریع کی بنیاد، قرآن اور سنت پر تھی۔ اگر کوئی ایسا واقعہ پیش آ جاتا جس کے بارے میں کوئی حکم ان دونوں میں نہ ملتا، تو امثال و نظائر پر قیاس کر کے، اس کا حکم نکالتے تھے۔ ②

ایک زمانہ تھا جب پرویز صاحب، قرآن کے ساتھ، بالالتزام حدیث کا، اور کتاب اللہ کے ساتھ، سنت رسول اللہ کا نام بھی لیا کرتے تھے، لیکن جب بعد میں، وہ "مفکر قرآن" بن گئے، تو تنہا قرآن کے اجارہ دار بن بیٹھے، اور اپنے اس بدلتے ہوئے موقف کے ساتھ، یہ بھی چاہا کہ دنیا کی ہر چیز بدل جائے، حتیٰ کہ زمین و آسمان بھی بدل جائیں، لغت، تاریخ اور مفہومِ قرآن، سب کچھ بدل جائے۔ الغرض ہر چیز کا بدلنا، اُن کے بدلنے پر موقوف ہو۔

ع جب میں چلوں، تو سایہ بھی میرا نہ ساتھ دے   جب تم چلو، زمیں چلے، آسماں چلے

---

① معارف، اپریل ۱۹۳۵ء، ص ۲۸۲۔

② تاریخ الامت، ج ۲، ص ۲۵۷۔

(۳)...... ''عجمی سازش'' کی بیل کو منڈھے چڑھانے کے لیے، تیسری ٹیڑھی اینٹ جو رکھی گئی ہے، وہ ''عجمیت کے مفہوم سے تعلق رکھتی ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک، قرآن وسنت پر مبنی وہ اسلام، جو رسول اللہ ﷺ نے، عرب میں قائم فرمایا تھا، اور جس کے علمبردار، علماء کرام ہیں۔ وہ ''عجمی تحریف'' کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے، اور ''عجمی تحریف'' کیا ہے؟ اس کا جواب، وہ، بایں الفاظ پیش کرتے ہیں:

> مفہوم، اس سے ہر وہ عقیدہ، تصور، نظریہ، مسلک و مشرب ہے جو قرآن کے خلاف ہو، خواہ وہ کہیں سے آیا ہو، اور اس کی نسبت کسی کی طرف بھی کیوں نہ کی جاتی ہو۔ ❶

''عجمیت'' کا یہ وہ مفہوم ہے، جو قرآن کے ہر بدلتے مفہوم کے ساتھ، متغیر ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ ایک وقت کے ''قرآنی مفہوم'' کے مطابق، جو چیز صحیح قرار پاتی ہے، وہی چیز، دوسرے وقت کے تبدیل شدہ مفہوم کے مطابق، غلط قرار پاتی ہے، اس طرح ''مفکر قرآن'' کے ہر بدلتے ہوئے مفہوم کے ساتھ، صحت و سقم، حق و باطل اور جائز و ناجائز کا معیار بھی، مرغ بادنما کی طرح بدل جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے شواہد، ''مفکر قران'' کے لٹریچر میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔

نت نئے بدلتے ہوئے مفاہیم

مندرجہ ذیل سطور میں چند ایسی مثالیں ملاحظہ فرمایئے، جن میں مرور ایام کے ساتھ، کس طرح قرآن میں سے مختلف معانی و مفاہیم کشید کیے گئے ہیں، پھر یہ مثالیں بھی، ''مفکر قرآن'' کے وسیع وعریض ذخیرۂ تضادات میں سے، مشتے نمونہ از خروارے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

(الف)...... ایک زمانہ تھا، جب پرویز صاحب پردے کے حامی تھے، خواتین کے لیے باپردہ مدارس کے قیام کے داعی تھے، اور پردے کو حصولِ تعلیم میں رکاوٹ نہیں سمجھتے تھے۔ جیسا کہ طلوع اسلام، اپریل ۱۹۳۹ء، صفحہ ۵۴، کی عبارت سے واضح ہے...... لیکن......

---

❶ شاہکار رسالت، ص ۴۷۳۔

پھر بعد میں، وہ، پردے کے اس قدر خلاف ہوگئے کہ پردہ، گھروں میں حبس بیجا (Illegal Detention) کا ہم معنی قرار پایا۔ اور جن باپوں اور بھائیوں نے اپنی بیٹیوں اور بہنوں کو پابند حجاب بنایا، وہ اس حبس بیجا کے مجرم قرار پائے۔ (دیکھیے طاہرہ کے نام، ص ۱۹۸)

(ب)...... قیام پاکستان سے قبل، وہ گانے اور موسیقی کے زبردست مخالف تھے، اور وہ بھی اس حد تک کہ گانا سننے والا مردود الشہادت قرار پاتا تھا، اس کے لیے، تاریخ میں سے قاضی شرف الدین بن عین الدولہ کا واقعہ بطور ثبوت پیش کیا جاتا تھا (طلوع اسلام، جون ۱۹۳۸ء، ص ۶۷)، اُن دنوں، اعمالِ رسول ﷺ کا بھی کچھ نہ کچھ احترام، پرویز صاحب کے دل میں پایا جاتا تھا، اور حضور ﷺ کا یہ عمل بیان کیا جاتا تھا کہ آپ ﷺ:

جن محفلوں میں باجہ اور راگ ہوتا تھا، اُن میں کبھی نہیں جاتے تھے۔ ①

لیکن پھر جوان کا ذہن پلٹا، تو اور تو اور، خود ''مفکر قرآن'' ہی بہترین گوشِ نغمہ شناس قرار پائے، اور ایک فلمی مغنیہ روشن آراء بیگم کے گانے سننے کے لیے ۲۵۔ گلبرگ بی کے لان میں محافل موسیقی، خاص ان کے اہتمام سے منعقد ہونے لگیں۔ اور کل کا فتوائے حرمت، آج کے فتوائے حلت میں بدل گیا۔ اور پھر اس فتویٰ کی رُو سے، محافل موسیقی اور گیت سنگیت، سب حلال قرار پاگئے۔ (بقولِ اکبرالہ آبادی)

سنا ہے حلتِ بادہ کا ہوگیا فتویٰ
خدا نے فضل کیا، حرام سے بچ گئے ہم

اب اس بدلے سے ہوئے فتویٰ کی روشنی میں، (جو قرآنی لفظ یُحْبَرُوْنَ پر اساس پذیر ہے) ''مفکر قرآن'' کا روشن آراء کے گانے سننا ''مطابق قرآن'' ہوگیا، اور نبی اکرم ﷺ کا محافل موسیقی سے اجتناب واحتراز ''خلاف قرآن'' قرار پاگیا۔

(ج)...... ماضی میں، پرویز صاحب کے نزدیک، مصوری وتمثال سازی، منافی اسلام تھی۔ (طلوع اسلام، فروری ۱۹۴۱ء، ص ۷۰)...... لیکن...... بعد میں ''مفکر قرآن'' کو پتہ چلا کہ یہ سب کچھ تو ''سنتِ سلیمان'' ہے، اور سنت بھی وہ جو خود، قرآن میں مذکور ہے۔ اس

---

① طلوع اسلام، مئی ۱۹۴۱ء، ص ۲۲۔

طرح، وہ جو، کل منافیِ اسلام امر تھا، آج کے قرآن کی رو سے جائز اور حلال قرار پا گیا۔ (دیکھیے طلوعِ اسلام، اگست ۱۹۶۶ء، ص ۶۹)

(د)...... قیامِ پاکستان سے قبل زمین کی شخصی ملکیت، از روئے قرآن، جائز تھی۔ اور پرویز صاحب یہ کہا کرتے تھے کہ...... "اگر کوئی اپنی محنت سے، زمین کو قابلِ کاشت، یا اپنے عمل سے کار آمد بنائے، تو اس پر اس کی ملکیت تسلیم کی جائے گی۔ (طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۴۰ء، ص ۴۹)...... لیکن...... بعد میں، جب کعبہ کی بجائے، "مفکرِ قرآن" کی جبینِ نیاز، اشتراکیت کے قبلہ پر سجدہ ریز ہو گئی، تو ان پر انکشاف ہوا کہ

> قرآن کریم کی رو سے وسائلِ رزق (ارض یعنی زمین) خدا کی پیدا کردہ ہیں، اور خدا ہی ان کا مالک ہے، لہٰذا، ان کے متعلق یہ خیال کرنا، کہ ان کا کوئی اور بھی مالک ہو سکتا ہے، شرک ہو گا۔ ①

(ر)...... ۱۹۳۹ء میں مال و دولت کی شخصی ملکیت از روئے قرآن، جائز اور درست تھی۔ اُن دنوں پرویز صاحب نے یہ تحریر فرمایا تھا کہ

> اشتراکیت، ذاتی اور انفرادیت ملکیت کو تسلیم نہیں کرتی، لیکن اسلام، ہر شخص کی کمائی کو، اس کی ذاتی ملکیت قرار دیتا ہے۔ ②

لیکن...... پاکستان بننے پر، اس کے افق پر، جو طلوعِ اسلام ہوا تو پھر یہ امر بھی "خلافِ قرآن ہو گیا"۔ اب یہ کہا جانے لگا کہ

> قرآن جس معاشی نظام کو پیش کرتا ہے، اس کی رو سے دولت کا اکتناز یا وسائل یا وسائلِ پیداوار پر انفرادی ملکیت جائز ہی نہیں۔ ③

(س)...... متحدہ ہندوستان میں ضبطِ تولید کو ناجائز سمجھا جاتا تھا، اور اس کی حمایت میں یہ اشعار زینت دہِ صفحاتِ طلوعِ اسلام تھے۔

---

① تفسیر مطالب الفرقان، ج ۱، ص ۲۹۷۔

② طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۳۹ء، ص ۵۷۔

③ طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۵۶ء، ص ۹۔

ع ہے نئی تہذیب میں بھی جاہلیت کا اثر   نوجوانوں کا گناہوں کی طرف ہے ربطِ نفس
آدمیت کی نظر سے دیکھ کر، فرمائیے   ضبطِ تولید آپ کو مطلوب ہے، یا ضبطِ نفس ①

لیکن...... پاکستان بنتے ہی، ضبطِ تولید کے جائز ہونے پر، یہ ''قرآنی دلیل'' دی گئی۔

> قرآن کی رو سے یہ چیز قابلِ اعتراض نہیں کہ اس قسم کی اجتماعی اور ہنگامی ضرورت کے لیے افزائشِ نسل پر پابندی عائد کر دی جائے۔ فطرت نے اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت کو انسان کی مرضی کے تابع رکھا ہی اس لیے ہے کہ اسے افزائشِ نسل پر کنٹرول رہے۔ ②

(ص)...... قیامِ پاکستان سے قبل، خلیفۃ اللہ اور خلافت الٰہیہ کا تصور، ایک اسلامی، اور ''قرآنی تصور'' تھا۔ اس زمانہ میں، پرویز صاحب، یہ کہا کرتے تھے...... ''جب تک اسلام کا مقصدِ اولین و آخرین، خلافت اللہ فی الارض کا قیام ہے، مسلمانوں کے لیے وہی ضابطۂ حیات رہے گا، جو اس کے اللہ نے تحریر فرمایا ہے'' ...... (دیکھئے طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۴۰ء، ص ۵۴)

...... لیکن...... پھر آزادی ملتے ہی، ''مفکرِ قرآن'' کا ضمیر بدل گیا اور علامہ اقبال کا یہ خیال، غلط قرار پا گیا کہ ''غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر''۔ آزادی کا پرویز صاحب پر الٹا اثر ہوا، کہ ان کا ضمیر سمتِ مخالف میں پلٹ گیا، اور وہ فرمانے لگے:

> اصل یہ ہے کہ اس قسم کے باطل تصورات کا بنیادی سبب، وہ عقیدہ ہے، جو ہمارے ہاں صدیوں سے چلا آ رہا ہے، کہ خدا نے انسان کو، اپنا خلیفہ بنایا ہے، یہ عقیدہ، قرآنی تعلیم کے یکسر خلاف ہے۔ ③

(ط)...... دورِ غلامی میں، موت کا وقت مقرر تھا، جس میں لمحہ بھر کی بھی کمی بیشی نہیں ہو سکتی تھی۔ اُس وقت پرویز صاحب کا یہ فرمان تھا...... ''یہ خیرات، اس موت کی مصیبت کو

---

① طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۴۱ء، ص ۱۶۔

② طلوعِ اسلام، جولائی، ۱۹۶۰ء، ص ۹۱۔

③ طلوعِ اسلام، جون ۱۹۷۳ء، ص ۱۶۔

ٹالنے کے لیے ہے جس کے متعلق قرآن کا فیصلہ ہے کہ اس کے وقت معین میں ایک ثانیہ کی بھی کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ ❶

لیکن...... آزادی کا یہ اثر ہوا کہ اب موت کا وقت مقرر نہ رہا۔ اور مقرر کیا چیز قرار پائی؟ قانون۔ چنانچہ ''مفکر قرآن'' نے اب یہ فتویٰ دیا۔

یاد رکھیے: موت کا وقت نہیں، قانون مقرر ہے۔ ❷

(ع)...... کیا انسان کی کوئی فطرت ہے؟ متحدہ ہندوستان میں، اس سوال کا جواب اثبات میں تھا:

انسان کو اس کے صحیح راستہ پر قائم رکھنے کے لیے، یہ ضروری ہے کہ اس کی فطرت، اگر بالکل خاموش کردی گئی ہے تو اس کی یاد تازہ کردی جائے، اگر وہ خارجی اثرات کے پردوں میں چھپ کر غافل ہو چکی ہے، تو اسے بیدار کر دیا جائے۔ ❸

لیکن...... پاکستان بننے کے بعد، ''مفکر قرآن'' نے الٹی زقند لگائی، اور یہ کہنا شروع کر دیا، کہ:

انسانی فطرت کا عقیدہ، وحی کے منکرین نے وضع کیا، لیکن اس کی تبلیغ، ان لوگوں کی طرف سے ہوتی ہے، جو وحی پر ایمان رکھنے کے دعویٰ سے مسلمان کہلاتے ہیں۔ ❹

(ف)...... متحدہ ہندوستان میں، ''دین'' اور ''مذہب'' مترادف المعنیٰ الفاظ تھے، اور خود پرویز صاحب، ان کو ہم معنیٰ سمجھ کر استعمال کیا کرتے تھے۔

جو تمہارے دین سے نکلتا جائے گا وہ دوسری قوم بنتا جائے گا، اور ایسے لوگوں کے خلاف اللہ، ایسی قوم پیدا کر دے گا جن میں ایمان والوں کی خصوصیات ہوں گی۔

دیکھ لیجئے، وجہ جامعیت مذہب ہے۔ ❺

---

❶ طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۴۰ء، ص ۶۷۔

❷ قرآنی فیصلے، ج ۱، ص ۳۶۳۔

❸ طلوع اسلام، مئی ۱۹۳۸ء، ص ۲۸۔

❹ طلوع اسلام، جولائی ۱۹۶۹ء، ص ۵۸۔

❺ طلوع اسلام، مئی ۱۹۳۸ء، ص ۲۸۔

اس عبارت کے پہلے جملے میں لفظ "دین" اور دوسرے جملے میں لفظ "مذہب" بالکل ہم معنی اور مترادف المفہوم ہیں...... لیکن...... پھر جو پاکستان بنا، تو "مفکر قرآن" کو آزادی کے صدقہ میں، حق کو باطل اور باطل کو حق قرار دینے کی بھی کھلی چھٹی مل گئی، اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ دونوں الفاظ، ہم معنی نہیں بلکہ مختلف المعنی ہیں، باہم مترادف نہیں، بلکہ متغائر ہیں۔

> حقیقت یہ ہے کہ مذہب کا لفظ ہی غیر قرآنی ہے قرآن نے یہ لفظ کہیں استعمال نہیں کیا۔ قرآن نے مسلمانوں کو مذہب نہیں دیا، دین عطا فرمایا ہے۔ ①

یہ "مفکر قرآن" کے وسیع وعریض تضادات میں سے، صرف دس تضادات ہیں اور لطف یہ ہے کہ یہ سارے تضادات "مفکر قرآن" نے (ماشاء اللہ) قرآن ہی سے کشید کر رکھے ہیں۔ پردہ وحجاب کا مسئلہ ہو، یا موسیقی کی حلت وحرمت کا۔ مصوری وتمثیل سازی کے جواز کا معاملہ ہو یا زمین کی شخصی ملکیت کا۔ نجی ملکیت مال کا سوال ہو، یا انسان کے خلیفۃ اللہ ہونے کا۔ ضبطِ تولید کا امر ہو یا وقتِ موت کے تعین کا۔ انسانی فطرت کے وجود کے اثبات کا مسئلہ ہو یا اسلام کے مذہب ودین ہونے کا۔ ان جملہ امور میں "مفکر قرآن" نے نہ صرف مختلف، بلکہ متضاد جوابات فراہم کیے ہیں۔ ان کے علاوہ، وہ لاتعداد، تناقضات وتضادات بھی ہیں جنہیں شاید ضبطِ تحریر میں لانا۔ اس لیے مشکل ہے کہ ؏

سفینہ چاہیے، اس بحرِ بیکراں کے لیے

اور یہ سب تضادات "مفکر قرآن کی پریشاں خیالی اور ذہنی ابتری پر دلالت کرتے ہیں۔ لیکن وہ ژولیدہ فکری کی اس حد تک پہنچ کر رک نہیں گئے تھے، بلکہ انہوں نے ایک ایسا نعرہ لگایا جسے اگر امت مسلمہ قبول کر لے تو پورے کا پورا اسلامی سرمایہ (قرآن مجید سمیت) اس ژولیدہ فکری کا شکار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، اور یہ دراصل ان کا مقصود ومطلوب بھی تھا۔ چنانچہ وہ اپنے اس نصب العین کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے، سب سے پہلے تاریخ کو ہدف بناتے ہیں، اور فرماتے ہیں:

> قرآن کو صحیح طور پر سمجھنے کے راستہ میں، سب سے بڑی روکاوٹ، ہماری

---

① طلوع اسلام، فروری ۱۹۶۰ء، ص ۳۱۔

غلط تاریخ ہے۔ ❶

لہٰذا، اس غلط تاریخ کو صحیح کرنا ضروری ہے، اور اس کی صورت اس کے سوا، اور کچھ نہیں کہ اسے ”مطابق قرآن“ بنایا جائے۔ اس کے بعد، دوسرے مرحلے میں تاریخ کے علاوہ احادیث، فقہ، تصوف، اور لغت، الغرض ہر چیز ہی کو ”مطابق قرآن“ کر ڈالنے کا اعلان کیا جاتا ہے۔

> سچ پوچھیے تو پوری اسلامی تاریخ، نیز فقہ، احادیث، تصوف اور لغت، سب پر نظر ثانی کی ضرورت ہے ❷

آخر یہ تبدیلی کس مفہوم قرآن کے مطابق

اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ”مفکر قرآن“ نے اس قدر متضاد اور متناقض ”قرآنی مفاہیم“ پیش کیے ہیں کہ اگر انہیں جمع کیا جائے، تو اچھا خاصا ضخیم موسوعہ تیار ہو جائے۔ جس ”مفکر قرآن“ کی ”قرآنی بصیرت“ دو ٹکے کی جنتری کی طرح، ہر سال بدل جایا کرتی ہو، اور ہر مقام پر ایک نیا ”قرآنی مفہوم“ پیش کر ڈالتی ہو، تو ان کے ان متضاد و متناقض ”مفاہیم قرآن“ میں سے، کس مفہوم کو معیار قرار دے کر، کتب احادیث اور کتب تواریخ کا از سر نو جائزہ لیا جائے؟ ایک منکر حدیث سے جب میری اس موضوع پر بحث ہوئی، تو میں نے پرویز صاحب کی ابتدائی کتب اور بعد کی کتب سے، جب درجن بھر متضاد ”مفاہیم آیات“ اس کے سامنے رکھے اور پھر اس سے پوچھا کہ...... ”آپ کس وقت کے اور کون سے ”مفہوم قرآن“ کو معیار قرار دے کر تاریخ و احادیث وغیرہ کو پرکھنا چاہتے ہیں؟ ایک ”مفہوم قرآن“ کی رو سے، جسے آپ صحیح قرار دیں گے، وہ پرویز صاحب ہی کے دوسرے ”مفہومِ قرآن“ کے اعتبار سے غلط اور غیر قرآنی ہوگا۔“ میرے اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا، ہے کوئی جو اس سوال کا جواب دے۔ ❸

---

❶ طلوع اسلام، جولائی ۱۹۵۹ء، ص ۱۰۔ ❷ طلوع اسلام، ۲۹ اکتوبر ۱۹۵۵ء، ص ۱۶۔

❸ طلوع اسلام، جون ۱۹۵۱ء، ص ۴ + اگست ستمبر ۱۹۵۲ء، ص ۱۳۲۔

پھر تضادات و تناقضات کے اس ذخیرہ میں...... ایک وقت ایسا بھی آیا کہ...... کوئی مزید اضافہ نہ ہو سکا۔ اس لیے نہیں کہ متفرق ''قرآنی مفاہیم'' میں سے کسی ایک مفہوم پر وہ مطمئن ہو گئے تھے، اور انتشارِ فکر کی بجائے، اتحادِ فکر کی منزل پر پہنچ گئے تھے، بلکہ اس لیے کہ موت نے، انہیں سطح زمین سے بطن ارض میں منتقل کر دیا، ورنہ ہمیں یقین ہے کہ وہ

ع اگر اور جیتے ہوتے، یہی ''انتشار'' ہوتا

قرآن کریم، کو ان تضادات و تناقضات کے باعث، مداری کی پٹاری بنائے رکھنا، اور قرآن کے نام پر، مغربی تہذیب کے عادات و اطوار کو، اشتراکیت کے ساتھ پیوند کاری کے نتیجہ میں، ''قرآنی دین'' کے طور پر پیش کرنا، دراصل ''عربی مفکر قرآن'' کی وہ ''عربی سازش'' ہے جس پر پردہ ڈالے رکھنے کے لیے، ''عجمی سازش'' کا شور و غوغا اٹھایا جا رہا ہے تاکہ اس بلند آہنگ شور میں، ان کی اپنی سازش کی طرف کسی کی توجہ نہ ہو سکے۔

(۳۵) شیعہ فرقے

اسلام کی اساسیات میں سے بعض کو نشانۂ تحریف بنانے کے بعد، ''مفکر قرآن'' شیعہ فرقوں کی تاریخ، اور ان کے عقائد پر روشنی ڈالتے ہیں۔ فرقہ کیسانیہ، امامیہ، زیدیہ، اسماعیلیہ وغیرہ کی تاریخ و تعارف پیش کرتے ہیں۔ شیعوں کے غالی فرقے، اسماعیلیہ کے عقائد، محرف قرآن، باطنی معانی، امامت، آغا خانی اور بوہرے، امامیہ یا اثنا عشری، اصول الکافی، محدث کا عقیدہ، جیسی سرخیوں کے تحت، ان اہل تشیع کے متعلق، قلم گھسیٹتے چلے گئے ہیں جن کے جملہ فرقوں کی مجموعی تعداد، امت مسلمہ میں، کبھی بھی (اور آج بھی) آٹھ دس فیصد سے زائد نہیں رہی، پھر اس شرذمۂ قلیلہ کے عقائد و تصورات کو، پوری امت مسلمہ کے معتقدات و ایمانیات کے طور پر پیش کر کے، اپنی ''عجمی سازش'' کی اسے دلیل بنانا، بناء فاسد علی الفاسد کی نہایت ''شاندار'' مثال ہے۔

اس کے علاوہ، ''مفکر قرآن'' قدم قدم پر، اس امر کا التزام کرتے رہے ہیں کہ ان کے

"دُہرے معیار" کا اصول، ان کے ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ چنانچہ ایک مقام پر وہ ائمہ کے متعلق، شیعہ افراد کا عقیدہ، یوں بیان کرتے ہیں۔

> ائمہ کے علم کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ ان کا علم، رسول اللہ سے بھی زیادہ تھا، یعنی علم کی ابتداء، رسول اللہ سے ہوئی، اور انتہاء ائمہ پر۔ ❶

لیکن بعینہٖ یہی عقیدہ، بعض منکرین حدیث کا بھی ہے۔ جس زمانے میں "مفکر قرآن" صاحب حامی حدیث اور مدافعِ سنت بن کر، منکرین حدیث کے خلاف، مضامین و مقالات لکھا کرتے تھے، اُس زمانے میں، انہوں نے اس عقیدہ کو بعض منکرین حدیث کا عقیدہ قرار دے کر، یہ انکشاف کیا تھا کہ:

> (۱)...... اہل قرآن نے تو اس باب میں اس حد تک غلو کیا ہے کہ ان کے نزدیک، خود نبی اکرم ﷺ کے زمانہ میں بھی ایسے لوگ موجود تھے، جو خود حضور ﷺ سے بہتر قرآن سمجھتے تھے۔ ❷

یاد رہے کہ یہ بات، خواجہ احمد دین امرتسری (منکر حدیث) نے، مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ کے ساتھ تحریری مباحثے کے دوران کہی تھی، اس پر، طنزاً پرویز صاحب نے یہ لکھا:

> (۲)...... آج یہ حالت ہے کہ عیسائی اور دیگر غیر مسلم مصنفین، جو حضور ﷺ کو نبی تسلیم نہیں کرتے، ان کی متفقہ رائے یہ ہے کہ عقل و فہم، حسنِ تدبیر، اور حکمت و موعظت کے اعتبار سے، محمد ﷺ، نہ صرف اپنے ماحول و زمانہ کے انسانوں میں، بلکہ تمام دنیا کے بڑے بڑے انسانوں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے، اور کئی غیر مسلم مشاہیر نے حضور ﷺ کو دنیا کا سب سے بڑا انسان قرار دیا ہے، باوصف اس امر کے کہ وہ حضور ﷺ کو مامور من اللہ تسلیم نہیں کرتے، لیکن دوسری طرف "اپنوں" کا یہ حال ہے کہ وہ حضور ﷺ کے علم و فہم کو، عرب کے

---

❶ شاہکار رسالت، ص ۴۸۵۔

❷ معارف، مارچ ۱۹۳۵ء، ص ۱۸۲۔

بدوؤں کے مقابلہ میں برابر کا تسلیم نہیں کرتے۔

ع جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے۔ ①

منکرینِ حدیث کے خلاف، یہ کچھ ''مفکرِ قرآن'' کے قلم سے، اس وقت نکلا تھا، جب وہ معتقدینِ حدیث کے لباس میں ملبوس ہو کر، حفاظتِ حدیث اور مدافعتِ سنت کا ڈھونگ رچایا کرتے تھے، لیکن جب وہ خود لبادۂ منافقت کو اتار کر، کھلے کھلے منکرِ حدیث بن گئے تو پھر کبھی علم نبی ﷺ کے متعلق، خواجہ احمد دین امرتسری کے ایسے عقائد کی تردید نہ کر سکے۔ پھر انہیں تردید کے لائق شیعہ افراد ہی نظر آئے۔ تاکہ اس جانبدارانہ رویہ سے، وہ، اہلِ تشیع کے عقائد سے ''عجمی سازش'' کی تعمیر کے لئے مسالہ لے سکیں۔ لیکن اگر ایسے ہی عقائد، کسی منکرِ حدیث کے ہوں، تو اسے نظر انداز کر دیا جائے، تاکہ ''عجمی سازش'' سے اسے لاتعلق قرار دیا جا سکے۔ یہ ہے وہ دُہرا معیار، جو ''مفکرِ قرآن'' کا ہمیشہ طرۂ امتیاز بنا رہا ہے۔ قارئین کرام کو، اگر دُہرے معیار کے اس ''امتیازی وصف'' کی مزید تفصیل درکار ہو، تو میری کتاب ''جناب غلام احمد پرویز، اپنے الفاظ کے آئینے میں'' کا مطالعہ فرمائیں۔

(۳۶) پرویز صاحب کا ''قرآنی مسلک''

دورانِ بحث، ایک مقام پر، ''مفکرِ قرآن'' صاحب فرماتے ہیں۔

> میں نہ سنی ہوں، نہ شیعہ۔ میرا تعلق کسی بھی فرقہ سے نہیں۔ میں قرآن کریم کا طالب علم ہوں، اور میرا عقیدہ (بلکہ ایمان) یہ ہے کہ خدا کی یہ کتاب عظیم، دین میں سند و حجت ہے، اور حق و باطل کے پرکھنے کا واحد معیار۔ کوئی عقیدہ، نظریہ، تصور، مسلک و مشرب، جو اس کے خلاف جاتا ہو، میرے نزدیک درست نہیں ہو سکتا، خواہ اس کی نسبت کسی کی طرف بھی کیوں نہ کی گئی ہو۔ ②

---

① معارف، مارچ ۱۹۳۵ء، ص ۱۸۲۔

② شاہکار رسالت، ص ۴۹۴۔

''مفکر قرآن'' کی یہ خوبی تھی کہ اپنے ساحرانہ اندازِ نگارش کے ذریعہ، الفاظ کا جادو جگایا کرتے تھے، اور حقائق کو اس طرح ذبح کیا کرتے تھے کہ کہیں خون کا دھبہ تک دکھائی نہ دے، اس عبارت میں، جو دامِ ہمرنگِ زمین بچھایا گیا ہے، اس کی کچھ حقیقت مندرجہ ذیل سطور میں ملاحظہ فرمائیے۔

ا۔۔۔ یہ درست ہے کہ پرویز صاحب (بقول خویش) معروف معنوں میں نہ سنی تھے، نہ شیعہ۔ کیونکہ وہ ان قدیم فرقوں سے وابستہ ہوکر، نہ تو لکیر کا فقیر بننا چاہتے تھے۔ اور نہ ہی ایک خاص ڈگر پر چلنے والے، ''اندھوں کی قطار'' میں شامل ہونا چاہتے تھے۔ اس لئے وہ مجبور تھے کہ ایک نیا فرقہ بنا کر، اس میں شامل (بلکہ اس کے سربراہ) ہوکر، اپنا نام پیدا کریں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ نیا فرقہ کس طرح بنتا ہے۔ وہ خود فرماتے ہیں۔

> اسے اچھی طرح سن رکھئے کہ جس دن آپ نے دین کے معاملہ میں، قرآن کریم کی بجائے، کسی انسان کو سند مان لیا، آپ نے فرقہ پرستی کی بنیاد رکھ دی، اور یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ فرقہ پرستی، قرآن کی رو سے شرک ہے۔ ❶

''فرقہ پرستی، قرآن کی رو سے شرک ہے۔'' یہ بات کسی کو معلوم ہو، یا نہ ہو، لیکن تمام منکرین حدیث کو یہ بات، خوب معلوم ہے کہ قرآنی حقائق میں، اُن کے نزدیک، سند و اتھارٹی کا مقام، رسول اللہ کو حاصل نہیں تھا، بلکہ صرف پرویز صاحب ہی کو حاصل ہے، اس بات کا اعلان، طلوع اسلام کے کنونشن میں، ببانگِ دُہل، ان الفاظ میں کیا گیا تھا۔

> اس نوجوان کا نام، جو اس وقت حکومت ہند کے ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھا، اور آج قرآن کریم کے حقائق کے سلسلہ میں اتھارٹی تسلیم کیا جاتا ہے، غلام احمد پرویز تھا۔ ❷

یاد رکھئے کہ عرف عام میں، معیار، سند، دلیل، اتھارٹی وغیرہ الفاظ، ہم معنی ہی ہیں، خود

---

❶ طلوع اسلام، مئی ۱۹۶۰ء، ص ۵۲۔

❷ طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۷۰ء، ص ۴۳۔

”مفکر قرآن“ نے ان الفاظ کو سند ہی کے معنی میں استعمال کیا ہے، جیسا کہ مندرجہ ذیل دو اقتباسات سے ظاہر ہے:

(۱)...... یہ اس لیے کہ آپ نے پہلے طے نہیں کیا تھا کہ کسی قانون کے اسلامی قرار دینے کے لیے، معیار (اتھارٹی) کیا ہے۔ ❶

(۲)...... سوال یہ ہے کہ جو کچھ یہ حضرات کہتے ہیں، اس کی ان کے پاس دلیل یا اتھارٹی کیا ہوتی ہے۔ ❷

اب اگر پرویز صاحب، واقعی کوئی انسان تھے، تو جن لوگوں نے بھی انہیں سند (اتھارٹی) تسلیم کیا ہے، انہوں نے یقیناً ایک فرقہ کی بنیاد رکھ دی ہے، اور غلام احمد پرویز ہی اس فرقہ کے پیشوا تھے۔

۲: رہا پرویز صاحب کا یہ عقیدہ کہ ”تنہا قرآن ہی دین میں سند و حجت ہے“ تو اس کے متعلق دو باتیں قابلِ غور ہیں۔

(الف) پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ عقیدۂ پرویز، خود اس قرآن کے بھی خلاف ہے، جسے وہ سند و حجت ماننے کے دعویٰ دار ہیں۔ اس لیے، کہ قرآن خود یہ کہتا ہے، کہ اللہ کی اطاعت کا واحد ذریعہ نبی ﷺ کی اطاعت ہے، جس نے رسول کی اطاعت کی، اس نے فی الواقع اللہ کی اطاعت کی۔ ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ (النساء: ۸۰) جس نے (اے نبی!) تیرے ہاتھ پر بیعت کی، اس نے درحقیقت، اللہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ﴾ (الفتح: ۱۰)

(ب) دوسری بات یہ ہے کہ ”تنہا قرآن ہی کا سند و حجت ہونا، مان بھی لیا جائے“ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ محض الفاظِ قرآن حجت ہیں، یا معانی الفاظ؟ کیونکہ عملی زندگی میں، جو چیز مطلوب ہے، وہ الفاظ نہیں، بلکہ ان کے معانی ہیں۔ اب ”مفکر قرآن“ کرتے یہ ہیں کہ

---

❶ طلوع اسلام، مارچ ۱۹۸۱ء، ص ۲۹۔

❷ تفسیر مطالب الفرقان، ج ۷، ص ۶۵۔

قرآن کے قطعی، یقینی، حتمی اور وحی ہونے کے بلند بانگ اعلانات کے ساتھ، اپنی طرف سے معانی گھڑ کر، انہیں قرآن کریم کے گلے مڑھ دیتے ہیں۔ پھر ان ہی من گھڑت معانی و مفاہیم کو، ”قرآنی مفاہیم“ اور ”خدائی احکام“ قرار دیتے ہیں۔ اور پھر اس ہر اس چیز کو، خواہ وہ فرمانِ رسول ہو، یا کوئی تاریخی حقیقت ہو، جو اُن کے اِن خود ساختہ مفاہیم پر پوری نہیں اترتی، دیوار پر دے پھینکتے ہیں۔ اور اپنے مخالفین کے خلاف، شوروغوغا کرتے ہوئے، یہ کہتے ہیں کہ ”وہ، قرآن کے مخالف“ ہیں۔ ”خدائی احکام“ کے منکر ہیں، اور اُن کی مخالفت، میری نہیں بلکہ کتاب اللہ کی مخالفت ہے، ان کا انکار، میری ذات کا نہیں، بلکہ ”خدائی احکام“ کا انکار ہے۔

> میں بلاشبہ اور بلاتمثیل عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ یہ لوگ میری مخالفت نہیں کرتے، کتاب اللہ کی مخالفت کرتے ہیں۔ ①

حالانکہ پرویز صاحب کی مخالفت کرنے والے لوگ، واقعتاً، قرآن کے مخالف نہیں، بلکہ صرف، اس مفہوم کے مخالف ہیں جسے پرویز صاحب نے منسوب الی القرآن کر رکھا ہے۔ وہ، اپنی تعبیراتِ قرآنیہ کو، ”قرآنی حقائق“ اور ”قرآنی دعاوی“ قرار دے کر پیش کرتے ہیں، اور نہ ماننے والوں پر، بزعمِ خویش، ”اتمام حجت“ کرتے ہیں۔

> ہمارا مقصد، صرف قرآنی حقائق پیش کرنا ہے، اس سے اگر کسی کے مروجہ عقیدہ یا کسی کے دعویٰ پر زد پڑتی ہے، تو اس کی ذمہ داری ہم پر عائد نہیں ہوتی، کیوں کہ اس باب میں مدعی قرآن ہے ہم نہیں۔ ہمارا فریضہ قرآن کے دعاوی کو پیش کرنا ہے اور بس۔ ②

امر واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم کے گلے مڑھے جانے والے تصور کی مخالفت، کسی صورت بھی، قران کی مخالفت قرار نہیں پاسکتی۔ خود پرویز صاحب ہی کا فرمان ہے کہ ان کی ”قرآنی بصیرت“ کی روشنی میں، کتاب اللہ سے ماخوذ تصور میں، سہو ونسیان کا امکان موجود ہے، کیونکہ

---

① طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۷۸ء، ص ۵۲۔

② طلوع اسلام، جنوری ۱۹۸۵ء، ص ۲۱۔

یہ بہرحال انسانی کوشش ہے۔

> قرآن تو وحی الٰہی ہے جس میں غلطی کا کوئی امکان نہیں، لیکن میں اپنی قرآنی بصیرت کو، کبھی وحی الٰہی قرار نہیں دیتا، اس لئے کہ اس میں سہو و خطا، دونوں کا امکان ہے۔ بنابریں، میں اس پر اصرار نہیں کرتا کہ جو کچھ میں نے سمجھا ہے، وہ حرفِ آخر ہے اور وحی الٰہی کی طرح منزہ عن الخطا۔ ❶

یہ ہاتھی کے صرف دکھانے کے دانت ہیں، کھانے کے نہیں۔ قولاً، تو وہ یہی کہتے ہیں کہ میری تعبیر، انسانی تعبیر ہے جس میں نسیان وسہو کے دونوں پہلو موجود ہیں، اور یہ تعبیر حرف آخر نہیں، لیکن عملاً وہ اپنی تعبیر کو، قرآنی حقیقت اور خدائی حکم کا درجہ دیتے ہیں، اور اسے نہ ماننے والوں پر، وہ، ''منکر قرآن'' ہونے کا فتویٰ رسید کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے ایسے ہی، قرآنی حقائق'' اور ''خدائی احکام'' کا انکار، مولانا مودودی رحمہ اللہ نے کیا، تو پرویز صاحب نے انہیں یکے از منکرینِ قرآن قرار دیا:

> طلوع اسلام نے اپنی سابقہ اشاعت میں قرآنی دلائل سے یہ ثابت کیا کہ یتیم پوتا، اپنے دادا کی میراث سے محروم نہیں ہوسکتا، اس کے جواب میں، منکرین قرآن کی طرف سے جو جواب شائع ہوا، وہ ملاحظہ فرمایئے۔ ❷

اب ظاہر ہے کہ یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ، قرآن میں صراحتِ نصوص کے ساتھ مذکور نہیں ہے۔ یہ دراصل، پرویز صاحب کی استنباطی موشگافیاں اور عقلی تیر تکے ہیں، جنہیں انہوں نے ''قرآنی دلائل'' کا نام دے کر، بطور ثبوت پیش کیا ہے۔ ان موشگافیوں کی مخالفت میں، جن ''منکرین قرآن'' کی طرف سے جواب شائع کرنے کا ذکر ہے، ان سے مراد، مولانا مودودی رحمہ اللہ ہیں، کیونکہ اقتباس بالا میں، جس جواب کی اشاعت کا ذکر ہے، وہ مولانا مودودی رحمہ اللہ ہی کا جواب (بصورت اقتباس) ہے۔

---

❶ نظام ربوبیت، ص ۲۳۔

❷ طلوعِ اسلام، اکتوبر ۱۹۵۲ء، ص ۵۸۔

۳۔۔۔۔ تنہا قرآن کریم ہی کو سند و حجت قرار دینے کے عقیدہ کا اظہار کرنے کے بعد، پرویز صاحب کا حدیث کی بابت، جو مسلک ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

حدیث کی بابت مسلکِ پرویز

حدیث کی بابت، اپنے مسلک کو، پرویز صاحب نے، شاہکار رسالت میں بھی، اور اپنی دیگر کتب میں بھی، اور طلوع اسلام کے بہت سے شماروں میں بھی بکثرت بیان کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> راقم الحروف کے نزدیک "معیار حدیث" یہ ہے کہ کوئی حدیث، جو قرآن کریم کے خلاف جاتی ہو، صحیح نہیں ہو سکتی۔ ❶

قدرے اور آگے چل کر پھر لکھتے ہیں:

> میرا "انکار حدیث" اتنا ہی ہے، جو میں کہتا ہوں کہ جو حدیث، قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے۔ رسول اللہ یا بزرگان دین کی طرف، اس کی نسبت غلط ہے۔ وہ کوئی ایسی بات نہیں کہہ سکتے تھے، جو قرآن کے خلاف ہو۔ ❷

اور اسی بات کو کبھی یوں بیان کیا جاتا ہے:

> جو حدیث، قرآن کے مطابق ہو، اسے سر آنکھوں پر جگہ دیتے ہیں۔ ❸

جائزہ مسلک پرویز

ہم پوچھتے ہیں کہ کسی حدیث، کسی قول، کسی بات یا کسی بھی معاملے کی صحت اور قبولیت کا واحد معیار، اگر اس کا "مطابق قرآن" ہونا ہی ہے، تو اس میں آخر حدیث رسول ہی کی کیا تخصیص ہے، زید کا خیال ہو، یا بکر کا، جان مائیکل کا قول ہو یا رام داس کا۔ نتھا سنگھ کی بات ہو یا چوہدری پرویز کی۔ الغرض، کسی کا بھی کوئی خیال، فکر یا قول ہو، اگر وہ "مطابق قرآن" ہے تو

---

❶ شاہکار رسالت، ص ۴۹۵۔ ❷ شاہکار رسالت، ص ۴۹۶۔
❸ طلوع اسلام، مئی ۲۰۰۵ء، ص ۲۹۔

صحیح، درست اور قابل قبول ہے۔ اس میں پھر فرمانِ نبی ﷺ ہی کی تخصیص کیوں؟ اور کس لیے؟ اگر ابوجہل اور ابولہب کی کوئی بات ''مطابق قرآن'' ہو، تو آپ کیا اسے یہ کہہ کر رد کر دیں گے کہ یہ کافروں کی بات ہے؟ ابوجہل اور ابولہب تو خیر انسان ہی تھے۔ اگر کوئی (بندر جیسا) جانور ☆ بھی، ایسی گفتگو کرے، جو ''مطابق قرآن'' ہو، تو کیا آپ صرف اس لیے رد کر دیں گے کہ یہ الفاظ، ایک جانور کے منہ سے نکلے ہیں؟ ظاہر ہے کہ جب آپ کے نزدیک، صحت کی کسوٹی اور قبولیت کا معیار، صرف اور صرف ''مطابق قرآن'' ہونا ہی ہے، تو پھر ہر وہ بات، جو اس معیار اور کسوٹی پر پوری اترتی ہے، وہ صحیح بھی ہوگی اور قابل قبول بھی۔ اور جو چیز، اس پیمانے پر پوری نہیں اترتی، وہ غلط بھی ہوگی اور مردود بھی، خواہ کسی پیغمبر نے پیش کی ہو یا غیر نبی نے، مسلمان نے پیش کی ہو یا کافر نے، فردِ بشر نے پیش کی ہو یا کسی بندر نما جانور نے۔ اس اعتبار سے خدا کا رسول، اور عام آدمی، فرد کافر اور بندۂ مومن، یہودی اور عیسائی، مجوسی اور ہندو، سکھ اور پارسی، سب کے سب ایک ہی سطح پر آ جاتے ہیں۔ اس بظاہر خوش آیند معیار کا لازمی اور منطقی نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ نبی اکرم ﷺ کو ان کے بلند مقام ومنصب سے گرا کر، عام فردِ بشر کی سطح تک ہی نہیں، بلکہ مقامِ انسانیت سے بھی نیچے پھینک دیا جائے۔

؏ چہ بے خبر زمقامِ محمد عربی ست

اگر میری صاف گوئی ناگوارِ خاطر نہ ہو، تو میں عرض کروں گا کہ ''قرآن اور صرف قرآن کے ساتھ مطابقت'' کا یہ بظاہر خوش آیند اصول، گھڑا ہی اس لیے گیا ہے کہ مغرب کی فکری غلامی میں مبتلا ہو کر، جو بات بھی من کو بھا جائے، اسے یہ کہہ کر قبول کر لیا جائے کہ یہ ''مطابق قرآن'' ہے۔ چنانچہ اس اصول (مطابقت قرآن) سے دُوہرا کام لیا گیا، اولاً یہ کہ احادیث رسول سے جان چھڑانے کے لیے، ''رد و ترک'' کی راہ یہ کہہ کر ہموار کی گئی کہ:

☆ جی ہاں! طلوع اسلام نے ایک امریکی پروفیسر کی یہ تحقیق پیش کی ہے کہ وہاں (امریکہ میں) بندر نما جانوروں کا ایک ایسا گروہ بھی پایا جاتا ہے جو بڑی فصیح عربی میں، قرآن وحدیث کے الفاظ پر مشتمل گفتگو کرتا ہے۔ (طلوع اسلام، مارچ ۱۹۸۹ء، ص ۵۸)

> ہمارے نزدیک، دین کا معیار فقط کتاب اللہ ہے۔ جو عقیدہ یا تصور اس کے مطابق ہے وہ صحیح ہے، اور جو اس کے مطابق نہیں، وہ بلا تامل وتذبذب، غلط اور باطل ہے، خواہ اس کی تائید میں ہزاروں حدیثیں بھی ایسی کیوں نہ پیش کردی جائیں جس کے راویوں میں جبرائیل ومیکائیل تک کا نام بھی شامل کردیا گیا ہو۔ ①

لیکن ”مطابقت قرآن“ کے اصول کی آڑ میں، یہاں تو صرف ”ردوترک“ کی راہ ہموار کی گئی ہے۔ نرے ردوترک سے، خواہ وہ اقوال وافعال رسول ﷺ ہی کا ردوترک کیوں نہ ہو، بہرحال، بات نہیں بن سکتی۔ اس کے لئے تو اخذ وقبول کی راہ اختیار کرنا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ اس کے لئے، یہ راہ یوں ہموار کی گئی:

> ہر معقول بات، خواہ وہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی ہو، یا کارل مارکس کی، اگر قرآن کی کسوٹی پر سچی ثابت ہوتی ہے، تو اسے قبول کرنے میں عار نہ ہونی چاہیے۔ ②

یہاں، ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا نام تو محض، وزن برائے بیت ہے۔ اصل میں تو کارل مارکس اور دیگر یہودی دانشوروں، عیسائی سکالروں ملحد فلاسفروں، اور بے دین علماء مغرب سے استفادہ کرنا مقصود ہے۔ اور یہ استفادہ یہ کہہ کر کیا بھی گیا کہ جو فکر، جو خیال، جو قدر، جو اطوار، ہم اپنا رہے ہیں، وہ ”مطابق قرآن“ ہے، اور مغرب کی جس چیز کو ”مطابق قرآن“ قرار دے کر، قبول کرنے کی گنجائش نہ نکل سکی، اسے یہ کہہ کر اپنا لیا کہ ”یہ خلاف قرآن نہیں ہے۔“

تہذیب مغرب اور تمدن جدید کی فکری اسیری اور ذہنی غلامی کی اس کیفیت کے ساتھ، جب یہ لوگ، قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں، تو یورپ کی عینک لگا کر۔ ان کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ یورپ کے فلسفہ وفکر کو، سائنسی انکشافات اور ایجادات کو، اور معاشرتی طور طریقوں کو قرآن کی آیات سے ”ثابت“ کیا جائے، اور اس طرح قرآن کا ایک ”نیا اعجاز“ دنیا کو دکھا دیا جائے کہ دیکھو! سائنس کے میدان میں آج یورپ جو کشفِ حقائق کر رہا ہے، اور اس کی بنیاد

---

① طلوع اسلام، نومبر ۱۹۵۳ء، ص ۳۷۔

② طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۶۳ء، ص ۷۵۔

پر، جو ایجادات وہ سامنے لا رہا ہے، آج سے چودہ سو سال قبل، قرآن مجید، ان کی طرف اشارے کر چکا ہے، اور فلاں آیت سے تو فلاں تحقیقِ جدید، صاف طور پر نکل رہی ہے، اور ان آیات سے تو، آج کے معاشی نظاموں میں سے فلاں معاشی نظام تو بالکل قرآن کے اقتصادی نظام سے متماثل ہے، اور ان آیات سے تو واضح طور پر، اُن بہت سی معاشرتی عادات و اطوار کی تائید ہو رہی ہے، جو آج کی ترقی یافتہ اقوام میں موجود ہیں، اور معمولی سے چند امور کی اگر قرآن تائید نہیں کرتا تو انہیں یہ کہہ کر قبول کر لیا جاتا ہے کہ یہ خلافِ قرآن نہیں ہیں۔

قرآن کے غلامِ فطرت اور نادان دوست

قرآن کے نام لیوا، یہ غلامِ فطرت حضرات، اگرچہ اپنے آقایانِ مغرب سے سیاسی آزادی پا چکے ہیں، لیکن ان کی فکری غلامی اور ذہنی اسیری سے چھٹکارا نہیں پا سکے۔ ؎

وطن تو آزاد ہو چکا ہے، دماغ و دل ہے غلام اب بھی
پڑے ہوئے ہیں شرابِ غفلت، یہاں کے خواص و عوام اب بھی

چنانچہ ہمارے ”مفکرِ قرآن“ نے ڈارون کا پورا نظریۂ ارتقاء، قرآن کے مختلف مقامات کی متفرق آیات کے ٹکڑوں کو جوڑ جاڑ کر، معنوی تحریف کے حربوں کے ساتھ، قرآن ہی سے برآمد کر لیا ہے۔ دورِ حاضر کے چلتے ہوئے، دو بڑے معاشی نظاموں میں سے، کارل مارکس اور لینن کی اشتراکیت کو قرآن کے جعلی پرمٹ پر درآمد کر لیا ہے۔ تہذیبِ مغرب کی فاسد معاشرت کے جملہ اطوار و اقدار کو بھی یہ کہہ کر اپنایا جا رہا ہے کہ یہ سب کچھ ”مطابقِ قرآن“ ہے۔ مخلوط سوسائٹی، مخلوط تعلیم، ترکِ حجاب و نقاب، مرد و زن کی مطلق مساوات (بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر، نظریۂ افضلیت اناث) درون خانہ فرائض کی بجائے انہیں بیرون خانہ مشاغل میں منہمک کرنا، تعدد ازواج کو معیوب قرار دینا، عورت کو خانگی مستقر سے اکھاڑ کر، اسے مردانہ کارگاہوں کی طرف دھکیل دینا، خانگی زندگی میں عورت کے فطری وظائف سے اسے منحرف کر کے، قاضی و جج بلکہ سربراہ مملکت تک کے مناصب پر براجمان کرنا وغیرہ وغیرہ، یہ سب کچھ قرآن میں سے نچوڑ ڈالنے کی دانشورانہ سرگرمیاں، مغرب کی اندھی تقلید کے منہ بولتے

کرشمے ہیں، اور یہ سب کچھ کرتے ہوئے، یہ لوگ مطمئن ہوجاتے ہیں کہ قرآن کریم دور حاضر کی ضروریات کا ساتھ دے رہا ہے، لہٰذا، اسے اب ''تاریک دور'' کی کتاب قرار نہیں دیا جاسکتا۔

لیکن قرآن مجید کے یہ نادان دوست، ہرگز یہ نہیں سمجھتے کہ ان کی یہ دماغ سوزی، نہ قرآن کے لئے مفید ہے اور نہ ہی اسلام کے لئے۔ یہ سب کچھ عوامی سطح کے مسلمانوں کے لئے دل خوش کن ہو، تو ہو، مگر قرآن اور اسلام کی تبلیغی روح کے لئے سخت مضر ہے۔ اہل نظر اور دانایانِ اسلام کے لئے، یہ روش سخت شرمندگی کا باعث ہے، اس لئے کہ ان لوگوں کی ان مقفّیٰ اور مسجّع لفاظیوں کو دیکھ کر، اہل یورپ یہ کہہ سکتے ہیں بلکہ شاید اپنے دلوں میں کہتے بھی ہوں (کیوں کہ ایسی باتوں کا برملا اظہار، ان کی سیاسی مصلحتوں کے منافی ہوتا ہے) کہ ''اب فلسفہ و سائنس کے یہ حقائق اور دور حاضر کا یہ معاشی نظام، نیز ترقی یافتہ اقوام کے یہ معاشرتی اطوار و اقدار یہ سب کچھ تمہاری مذہبی کتاب میں پہلے سے موجود ہے، اور بقول تمہارے، اس کتاب میں واضح اشارات موجود ہیں، اور تمہارے ہر طبقہ کے لوگ، اس کتاب کو پڑھتے پڑھاتے رہے ہیں۔ دن رات، اس کتاب کو سینوں میں محفوظ کرنے، اور اس کی تلاوت میں منہمک رہے ہیں، مگر یہ حقائق، تمہارے کسی عالم کو نظر نہ آئے، اور ہم لوگ، بغیر تمہاری اس کتاب کو پڑھے، ان حقائق کو پاگئے ہیں، اور ان میں مہارت میں اضافہ کے ساتھ ساتھ، ہم نے دن دگنی رات چوگنی ترقی کی ہے۔ اس لئے آپ لوگوں کو اس کتاب کی ضرورت ہو، تو ہو، ہمیں تو اس کی مطلق ضرورت نہیں، بلکہ آپ لوگوں کے لئے بھی یہ کتاب بے کار ہی ہے، اس لئے کہ آپ کو بھی، جو ہمارے سائنسی حقائق، فلسفیانہ نظریات، اشتراکی نظام معیشت اور معاشرتی اصول و اقدار، اب اگر اس کتاب میں دکھائی دینے لگے ہیں تو وہ بالفعل، ہمارے ان چیزوں کو اپنا لینے کے بعد ہی نظر آنے لگے ہیں۔''

یقیناً، ہمارے ''مفکر قرآن'' نے بڑی ہی زحمت کشی اور محنت شاقہ کے ساتھ، پچاس سالہ ''قرآنی خدمات'' کی گولڈن جوبلی پائی، مگر اس کا ماحصل، اس کے سوا کیا ہے کہ جو کچھ وہ قرآن سے نچوڑ کر پیش کرتے رہے ہیں، وہ بغیر کسی ''قرآن'' کے اہل مغرب کے ہاں، پہلے

ہی سے اپنایا جاچکا ہے۔ کبھی مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آیا کرتی تھی کہ ماضی میں کچھ لوگ اسلامی تعلیمات کی موجودگی میں کس طرح بیرونی افکار ونظریات کا شکار ہوئے تھے۔ منکرین حدیث اور خصوصاً پرویز صاحب کا لٹریچر پڑھ کر، اب یہ بات بخوبی سمجھ چکا ہوں کہ بیرونی فکر و فلسفہ سے مرعوبانہ حد تک مسخر دل و دماغ، کن حیلوں اور حربوں سے کام لے کر، اپنے من پسند اصول واقدار اور عادات واطوار کو ”مطابق قرآن“ قرار دے کر قبول کیا کرتے ہیں۔

الغرض، کسی چیز کے ”مطابق قرآن“ قرار پانے یا نہ پانے کا فیصلہ، ہمارے ”مفکر قرآن“ کی وہ عقل عیار کیا کرتی تھی، جسے وہ اپنی ”قرآنی بصیرت“ کہا کرتے تھے، اور جو سوچ و بچار کے ہر جھونکے کے ساتھ، مرغ بادنما کی طرح بدلتی رہتی تھی، اور یوں ہر بدلتے ہوئے، ”قرآنی مفہوم“ کے ساتھ، ”مطابق قرآن“ ہونے کا معیار بھی بدل جایا کرتا تھا جس کے نتیجہ میں، ایک وقت کے ”قرآنی افکار“، دوسرے وقت میں ”غیر قرآنی“ بلکہ ”مخالفِ قرآن“ قرار پا جاتے تھے، اور بعض اوقات تو یہ فرق، کفر و اسلام کا فرق بن جاتا ہے۔ یوں ”مطابقت قرآن“ کے لونِ گرگٹ کی طرح بدلتے ہوئے، معیار نے ”مفکر قرآن“ کے لٹریچر میں تضادات وتناقضات کا وسیع وعریض خارزار پیدا کر دیا ہے۔

(۳۷) سُنیوں کے مسلک پر عجمی اثرات (۱) تقلیلِ اہمیتِ قرآن

”مفکر قرآن“ نے اپنے ”عجمی سازش“ کے افسانہ میں تفصیل واطناب کا رنگ بھرنے کے لئے اکثر وبیشتر مسالہ اور مواد، کتب شیعہ سے لیا ہے۔ جیسا کہ اب تک کی بحث سے واضح ہے، اور پھر شیعی ائمہ، اور ان کے عقائد ونظریات کو قلمی چابکدستی کی بناء پر، پوری امت مسلمہ کے خلاف ”عجمی سازش“ کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ حالانکہ اس سازش کا اثر، (بشرطیکہ واقعی یہ کوئی سازش ہو بھی تو) صرف افراد شیعہ تک ہی محدود رہا ہے۔ اہل اسلام کا سواد اعظم (جس کی تعداد، نوے بانوے فیصد تک ہر دور میں رہی ہے)، نہ ایسے عقائد رکھتا ہے، اور نہ ہی اس ”سازش“ کے اثرات سے وہ متاثر ہوا ہے۔ ”مفکر قرآن“ کو اس بات کا احساس ہوا کہ جب

تک امت مسلمہ کے سواد اعظم پر، اس سازش کے اثرات، نہیں ''ڈالے جاتے'' اس وقت تک بات بنتی نظر نہیں آتی۔ چنانچہ ''بات بنانے'' کے لیے، جن گوشوں کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے، وہ درج ذیل ہیں۔

۱۔۔۔ قرآن کی اہمیت کو گھٹانا، ''مفکر قرآن'' کے نزدیک، وقوع نسخ آیات کو تسلیم کرنا اور خارج از قرآن، وحی کی اقسام کو ماننا، اسی مقصد کے پیش نظر ہے۔

۲۔۔۔ تصوف کے کوچہ سے، باطنی معانی کے ذریعہ دُور اَز کار خیز تاویلات بھی ''قرآنی دین'' سے لوگوں کو باز رکھنے کے لیے ہیں۔

۳۔۔۔ سرمایہ دارانہ نظام کا خلافت راشدہ کے بعد عود کر آنا بھی، اسی نقطۂ نظر سے ہے۔

یہ اگرچہ تین گوشے ہیں لیکن ان ہی کے اندر، کئی اور مباحث بھی سمٹ آئے ہیں، جن کی تفصیل آیندہ اوراق میں آ رہی ہے۔

اہمیت قرآن کو گھٹانا

''عجمی سازش'' کا پہلا اثر، جو امت مسلمہ کے سواد اعظم پر پڑا ہے، وہ (بقول پرویز صاحب) یہ ہے کہ قرآن کی اہمیت و عظمت، ان کے ہاں گھٹ گئی۔ اور اس تخفیفِ اہمیت کا پہلا مظہر، قرآن کے جمع و تدوین سے تعلق رکھتا ہے۔ چنانچہ قرآن کی جمع و تدوین اور ترتیب آیات و سور سے متعلق، ''عجمی اثرات'' میں سے اولین اثر کو بایں الفاظ پیش کیا گیا ہے:

> سُنیوں کے عقائد و تصورات پر، ایرانی سازش نے کیا اور کس طرح اثر کیا؟ اسے پھر دُہرا دیا جائے کہ عجمی سازش کا محوری نقطہ یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح، قرآن کریم کی اہمیت و عظمت کو ختم کر دیا جائے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ خیال عام کیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ نے قرآن، مرتب شکل میں امت کو نہیں دیا تھا۔ وہ اسے منتشر شکل میں چھوڑ گئے تھے۔ ①

''مفکر قرآن'' جناب چوہدری غلام احمد پرویز صاحب کا موقف یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ

---

① شاہکار رسالت، ص ۴۹۶۔

نے، قرآن کو ترتیب آیات وسور کے ساتھ، موجودہ کتابی شکل میں خود مرتب فرما دیا تھا، حالانکہ آپ ﷺ نے جو ترتیب قائم فرمائی تھی، وہ حفاظ کرام کے قلوب واذہان میں تھی۔ رہی قرآن کریم کی مرتب کتابی شکل، تو اس کا وجود، صرف اس صورت میں ممکن تھا، جب کہ یہ متفرق اور مختلف اشیاء پر مکتوب ہونے کی بجائے، کسی ایک ہی چیز یا اس کے قطعات پر لکھا گیا ہوتا، جسے یا جنہیں بعد میں، مجلد صورت میں، یکجا مرتب کرنا ممکن ہوتا، حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ قرآن مجید، جن متفرق اشیاء پر لکھا گیا تھا، ان میں کھجور کے پتوں، پتھر کے ٹکڑوں، لکڑی کے تختوں اور بڑے جانور کی چوڑی ہڈیوں جیسی چیزیں تھیں۔ اور ظاہر ہے کہ ان متفرق اجزاء وقطعات میں، ترتیب قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ یہ حقیقت کہ عہد نبوی میں قرآن، اشیاءِ متفرقہ پر لکھا گیا، اسے ’’مفکر قرآن‘‘ کے استاد، جناب اسلم جیراجپوری بھی تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> قرآن کریم، اگرچہ عہد رسالت میں ہی مکمل لکھوا دیا گیا تھا، لیکن وہ نوشتے، متفرق اور منتشر تھے۔ ❶

اب رہی یہ بات کہ قرآن مجید کی کتابت، کن چیزوں پر کی گئی تھی، تو اس کا جواب بھی، جناب اسلم جیراجپوری ہی کی قلم سے ملاحظہ فرمایئے:

> صحابہ رضی اللہ عنہم، آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں کھجور کے پتوں، لکڑی کی تختیوں وغیرہ پر اس کو لکھا کرتے تھے۔ ❷

ہاں، البتہ، مرتب صورت میں قرآن، اگر کہیں موجود تھا، تو وہ صرف لوگوں کے قلوب و اذہان تھے، موجودہ کتابی شکل میں مرتب قرآن، پہلی مرتبہ، عہد صدیقی میں سامنے آیا تھا، جیسا کہ جناب اسلم جیراجپوری نے لکھا ہے:

> حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو سب سے پہلے یہ خیال پیدا ہوا کہ ان کو ایک شیرازہ میں جمع کرا دیں، اور یہ خیال اس وقت پیدا ہوا جب جنگ یمامہ میں، جو آنحضرت ﷺ

---

❶ تاریخ القرآن، ص ۵۲۔

❷ تاریخ القرآن، ص ۵۴۔

> کے انتقال کے بعد ہی، مسیلمہ کذاب کی قوم، بنی حنیفہ سے ہوئی تھی، سات سو حفاظِ قرآن شہید ہوگئے تھے۔ انہوں نے سوچا کہ اگر حاملانِ قرآن کا اسی طرح خاتمہ ہوتا گیا، تو کہیں قرآن ضائع نہ ہوجائے............ ❶

ہم، قارئین کرام سے معذرت خواہ ہیں کہ، ہمیں اس مسلسل اقتباس کو درمیان میں کاٹنا پڑا ہے، لیکن ایک اہم نکتے کی طرف، توجہ دلانا بھی، یہاں بہت ضروری ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اضاعتِ قرآن کے خطرہ کو، شہادتِ حفاظ کی صورت سے وابستہ کیا، لیکن قرآن کی کتابت (کی اضاعت) سے وابستہ نہیں کیا۔ اگر قرآن، آیات وسور کی توقیفی ترتیب کے ساتھ، حضور کے ہاتھوں، واقعی کتابی شکل میں مجموع ومرتب ہو چکا ہوتا، تو خواہ کتنے ہی حفاظ شہید ہوجاتے، اضاعتِ قرآن کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ یہ سوال تو پیدا ہی اس لیے ہوا تھا کہ قرآن، مرتب شکل میں، اگر کہیں موجود تھا تو حفاظِ قرآن کے سینوں میں تھا، نہ کہ صحیفوں میں۔ اور حفاظ کی بکثرت شہادت ہی کی صورت میں، ضیاعِ قرآن کا خطرہ تھا۔ اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چاہا کہ اِسے کتابی صورت میں مرتب ومدون کیا جائے، اس سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ قرآن، باوجودیکہ لکھوایا گیا تھا، مگر اس کی حفاظت کا ذریعہ، کتابت کا عمل نہیں تھا، بلکہ حفظ فی الصدور تھا۔ اس جملہ معترضہ کے بعد، اب اقتباس کا بقیہ حصہ ملاحظہ فرمائیے۔

> اس لیے حضرت ابوبکر کے سامنے اس خیال کو پیش کیا۔ انہوں نے پہلے تو یہ عذر کیا کہ نبی ﷺ نے قرآن کو ایک شیرازہ میں جمع نہیں کرایا، امت کو لکھا دیا، یاد کرادیا، اور ان کے اوپر چھوڑ دیا۔ اب میں وہ کام کیوں کروں، جس کو آپ ﷺ نے نہیں کیا، مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اصرار سے وہ بھی اس ضرورت کو سمجھ گئے، اور اس کام کے لیے تیار ہوگئے۔ صحیح بخاری میں روایت ہے:
>
> حضرت زید بن ثابت نے کہا کہ جنگ یمامہ کے بعد، حضرت ابوبکر نے مجھ کو

---

❶ تاریخ القرآن، ص ۵۲۔

طلب فرمایا۔ جب میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ عمر بن الخطاب بھی ان کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے فرمایا کہ عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس لڑائی میں بہت سے حفاظ کرام مقتول ہو گئے ہیں۔ مجھے خوف ہے کہ قرآن کہیں ضائع نہ ہو جائے۔ اس لیے میری رائے یہ ہے کہ تم اس کو جمع کرادو۔ میں نے کہا وہ کام کیوں کروں جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اس کا جمع کرا دینا بہتر ہے، اور اسی پر وہ اصرار کرتے رہے، یہاں تک کہ میری سمجھ میں بھی یہ بات آ گئی اور میری رائے بھی ان کی رائے کے مطابق ہوگئی۔ ''تم جوان اور عقلمند ہو۔ ہم کو تمہارے اوپر اعتماد ہے۔ تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب وحی تھے۔ محنت کر کے قرآن کو جمع کرادو۔'' زید کہتے ہیں کہ اللہ گواہ ہے کہ اگر وہ مجھ کو پہاڑ اٹھانے کا حکم دیتے تو وہ میرے لیے آسان ہوتا، لیکن یہ بوجھ مجھے نہایت گراں معلوم ہوا۔

آخر میں آمادہ ہوا۔ کھجور کے پتوں، لکڑی کی تختیوں اور لوگوں کے سینوں سے اس کو جمع کیا۔ صرف سورہ توبہ کی دو آخری آیتیں سوائے ابوخزیمہ انصاری کے اور کسی کے پاس مجھ کو نہیں ملیں۔ ①

ترتیبِ قرآن اور طلوعِ اسلام

یہ امر واقعہ کہ اگرچہ قرآن، عہد نبوی میں لکھا ضرور گیا تھا، مگر وہ کتابی شکل میں مرتب نہ تھا، ایک ایسی حقیقت ہے جو طلوع اسلام کے اوراق میں بھی مذکور ہے، جناب اسلم جیراجپوری کے بعد، اب چند اقتباسات، طلوع اسلام کی فائل سے بھی نذر قارئین ہیں:

(۱)...... حضرت زید بن ثابت، کاتب دربار رسالت، نجباء انصار اور علماءِ قرآن میں سے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عمر کے آخری رمضان میں قرآن کا جو دور فرمایا تھا اس میں شریک تھے، جس کی وجہ سے عہد صدیقی میں جب قرآن،

---

① تاریخ القرآن، ص ۵۲ تا ۵۳۔

ایک کتاب کی شکل میں جمع کیا گیا، یہی اس کے جامع قرار پائے۔ ①

(۲)...... حضرت عثمان کا کام صرف یہ تھا کہ انہوں نے قراءۃ کے اختلافات کو مٹا کر، تمام امت کو ایک قراءت پر مجتمع کر دیا، اور بس۔ جو مصحف، رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد، حضرت ابوبکر کے عہد میں لکھا گیا، اسی کو بعینہٖ انہوں نے نقل کرا کے پانچ نسخے ولایات میں بھیجے، اور ایک نسخہ اپنے پاس رکھا جس کا نام امام تھا۔ ②

(۳)...... ابوبکر و عثمان کے جمع قرآن میں یہ فرق تھا کہ ابوبکر نے تو اس خوف سے جمع کیا تھا کہ کہیں قرآن ضائع نہ ہو جائے، کیونکہ اس وقت وہ منتشر اور متفرق صحیفوں میں لوگوں کے پاس تھا انہوں نے ان سب کو لے کر اسی ترتیب آیات و سور کے ساتھ، جو آنحضرت سے سنی تھیں، ایک شیرازہ میں کر دیا، اور حضرت عثمان نے جب لوگوں کو وجوہِ قراءت میں اختلاف کرتے دیکھا تو اسی مصحف کو اصل قریش کے لہجہ میں، اس صحیح قراءت کے موافق، جو عرضۂ اخیرہ کے مطابق تھی، اور جس کی صحت میں مطلق شبہ نہ تھا، نقل کرا دیا، تاکہ اختلافات رفع ہو جائیں۔ انہوں نے اس کی ترتیب میں نہ تقدیم کی نہ تاخیر، اور نہ کسی تاویل کو دخل دیا۔ ③

(۴)...... حضور ﷺ نے قرآن کریم کو متفرق اور منتشر نوشتوں میں لکھا ہوا چھوڑا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق کے عہد خلافت میں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشورہ سے، حضرت زید کی سرکردگی میں ایک کمیٹی بٹھائی گئی، جس نے ان متفرق نوشتوں کی شیرازہ بندی کر کے، قرآن کریم کو ایک جامع کتاب کی شکل میں مدون کیا۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم کو اختلاف قراءت سے محفوظ رکھنے کے لیے،

---

① طلوع اسلام، اپریل ۱۹۳۹ء، ص ۱۵ + دسمبر ۱۹۴۹ء، ص ۳۰۔

② طلوع اسلام، ستمبر ۱۹۳۹ء، ص ۲۱ تا ۲۲۔

③ طلوع اسلام، ستمبر ۱۹۳۹ء، ص ۲۲۔

> اس مصحفِ اول کی بہت سی نقول مختلف مراکز اسلامیہ میں بھجوائیں جن میں سے کئی ایک نسخے بجنسہٖ آج تک محفوظ چلے آتے ہیں۔ اس کے بعد، یہ صحیفۂ ربانی، آج تک حفاظ کے سینوں میں اور صفحاتِ قرطاس پر، اس انداز سے محفوظ چلا آ رہا ہے کہ اپنے تو اپنے، غیروں تک کو اعتراف ہے کہ مسلمانوں کے پاس جو قرآن کریم موجود ہے، وہ حرفاً حرفاً وہی ہے جو نبی اکرم ﷺ نے انہیں دیا تھا۔ ①

طلوع اسلام کی فائل میں سے ماخوذ (بالخصوص) آخری دو اقتباسات، اس امر کو واضح کر دیتے ہیں کہ حضور ﷺ، قرآن کو کتابی شکل میں مرتب کر کے اس دنیا سے رخصت نہیں ہوئے، بلکہ مختلف اشیاء پر مکتوب اجزائے قرآن منتشر اور متفرق حالت میں تھے۔

بہر حال، قرآن کریم کی جمع وترتیب کے متعلق یہ تھی، وہ بدیہی صورت حال، جو عہد نبوی میں پائی جاتی تھی، کہ قرآن، بے شک متفرق اشیاء پر لکھا ہوا موجود تھا، مگر اس کی توقیفی ترتیب صرف، اُس قرآن میں موجود تھی جو لوگوں کے سینوں میں محفوظ تھا۔ یہی وہ حقیقت ہے جو کتب احادیث اور تاریخی دستاویزات سے ثابت ہے، اور ’’مفکر قرآن‘‘ چونکہ ’’عجمی سازش‘‘ کے من گھڑت افسانہ میں، روایاتِ حدیث کو بھی، ایک کڑی بنانا چاہتے ہیں، اس لئے ان روایات کو نشانہ پر رکھنے کے لئے، یہ کہا جانے لگا کہ ان کی رو سے قرآن، عہد نبوی میں مرتب شکل میں موجود نہیں تھا، حالانکہ طلوع اسلام کے مذکورہ بالا اقتباسات سے بھی، اور روایاتِ حدیث سے بھی، یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ قرآن واقعی عہد رسالت میں، کتابی شکل میں مدوّن ومرتب نہیں تھا۔ لیکن ’’مفکر قرآن‘‘ چونکہ ذہناً احادیثِ رسول کے خلاف تھے، اس لئے انہوں نے قرآن کا نام لے کر، (احادیث کی مخالفت وضد میں) یہ نیا مؤقف اپنایا کہ قرآن تو عہد رسالت ہی میں مرتب ہو چکا تھا۔ (نہ کہ کسی بعد کے دور میں) چنانچہ وہ مذکورہ بالا اقتباس میں مذکور موقف کے برعکس، اپنے جدید اور متغیر موقف کو یوں بیان کرتے ہیں۔

> یہ خیال جو عام طور پر مروج ہے کہ موجود مصحف، حضرت عثمان کا مرتب فرمودہ ہے،

---

① طلوع اسلام، اپریل ۱۹۴۰ء، ص ۲۸ + اکتوبر ۱۹۴۹ء، ص ۲۴۔

> اور آپ ہی جامع القرآن ہیں، صحیح نہیں ہے۔ قرآن، اپنی کتابی شکل میں خود رسول اللہ کے زمانہ میں موجود تھا۔ ①

قرآن اور مفہومِ کتاب

دورِ حاضر میں جو کتابیں چھپ رہی ہیں، چونکہ وہ مرتب اور سلی ہوئی صورت میں، ہماری نظروں کے سامنے آتی ہیں۔ اس لیے ہمارے ذہنوں میں کتاب کا لفظ سنتے ہی، اس کا یہی تصور آتا ہے۔ عصرِ رواں کے اسی تصور کو سامنے رکھتے ہوئے، ”مفکرِ قرآن“ صاحب، مذکورہ بالا اقتباس کے متصل ساتھ ہی فرماتے ہیں:

> قرآن، اپنے آپ کو بار بار کتاب کہتا ہے حتیٰ کہ سورۃ البقرہ کی پہلی آیت میں ذَالِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ سے شروع ہوتی ہے اور عرب میں لکھی ہوئی چیز کو کتاب کہتے ہیں جو مدون شکل میں سلی ہوئی صورت میں موجود ہوتی تھی۔ ②

اس اقتباس میں ”مفکرِ قرآن“ کی پہلی غلطی یہ ہے کہ ذَالِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ کو سورۃ البقرہ کی پہلی آیت قرار دیا گیا ہے حالانکہ یہ دوسری آیت ہے، پہلی آیت تو حروفِ مقطعات الٓمّٓ پر مشتمل ہے۔

دوسری غلطی، ان کا یہ باطل قول ہے کہ...... ”عرب اُس لکھی ہوئی چیز کو کتاب کہتے تھے، جو مدون شکل میں سلی ہوئی صورت میں موجود ہوتی تھی“...... کتاب کا یہ تصور نہ عربوں میں موجود تھا، اور نہ عربوں سے قبل، یہودیوں میں پایا جاتا تھا۔ موجودہ دور سے کتاب کا یہ تصور لے کر، اسے عربوں کے گلے مڑھ دینا، یکے از اکاذیبِ پرویز ہے۔

قرآن مجید، خود اس لفظ کو، صرف ”لکھے ہوئے“ کے مفہوم تک محدود رکھتا ہے، ”مدون شکل میں، سلی ہوئی صورت“ میں ہونے کا تصور اس میں موجود نہیں ہے۔ مثال کے طور پر، ملکۂ سبا، اپنے درباریوں اور اکابرینِ سلطنت سے یہ کہتی ہے اِنِّیْٓ اُلْقِیَ اِلَیَّ کِتٰبٌ ”میری طرف ایک مکتوب پھینکا گیا ہے۔“ اس سے ذرا پہلے، حضرت سلیمان کا ہدہد سے یہ کہنا مذکور ہے کہ اِذْهَبْ

---

① طلوع اسلام، ستمبر ۱۹۵۰ء، ص ۳۴۔

② طلوع اسلام، ستمبر ۱۹۵۰ء، ص ۳۴۔

بِكِتَابِيْ هٰذَا ''میرا یہ مکتوب لے جا۔'' یہ دونوں آیات، اس امر کو واضح کرتی ہیں کہ ہدہد کو جس ''کتاب'' کے لے جانے کا حکم، حضرت سلیمان علیہ السلام نے دیا، اور جو ''کتاب'' ملکۂ سبا کو پہنچی، وہ ہرگز ہرگز ''مدون شکل میں سلی ہوئی صورت'' میں نہیں تھی۔

قرآن مجید کو، اللہ تعالیٰ نے، جو کتاب کہا ہے تو اس لیے نہیں کہ ''یہ مدون شکل میں، سلی ہوئی صورت میں'' کوئی شئے مکتوب تھی، بلکہ اس لیے کہ یہ کسی ناصحِ بے زور کا خالی خولی وعظ و نصیحت نہیں، بلکہ بادشاہِ ارض وسما کا حکم، فیصلہ، قانون اور واجب ومفروض چیز ہے۔ کیونکہ کتاب کے معانی میں، فیصلہ، حکم اور قانون کے معانی بھی موجود ہیں، خود پرویز صاحب لکھتے ہیں:

> کتاب کے معنٰی، فیصلہ اور حکم کے بھی آتے ہیں۔ قرآن کریم میں كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ (۲/۱۷۸) یا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (۲/۱۸۳) فرض اور ضروری قرار دینے کے معنوں میں آیا ہے، یعنی جو کام قانوناً لازم قرار دیا جائے۔ اسی لیے مجموعۂ قوانین کو کتاب کہا جاتا ہے، کیونکہ اس میں گوناگوں احکام واوامر جمع ہوتے ہیں۔ ابن فارس، نیز صاحب لطائف اللغہ نے بھی الکتاب کے معنی الفرض اور الحکم لکھے ہیں، لہٰذا جب قرآن کریم کو کتاب کہا گیا تو اس کے معنی ضابطۂ قوانین کے ہیں۔

''مفکر قرآن'' کا ''مدوّن شکل میں، سلی ہوئی صورت میں'' کسی شئے مکتوب کو، کتاب کہنا، اس لیے بھی غلط ہے کہ از روئے قرآن، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو کتاب دی گئی تھی وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ (۲/۸۷) وہ بھی ''مدوّن شکل میں سلی ہوئی'' نہیں تھی، بلکہ جدا جدا تختیوں کی صورت میں تھی۔ وَكَتَبْنَا لَهُ فِي الْأَلْوَاحِ (۷/۱۴۵) وَأَلْقَى الْأَلْوَاحَ (۷/۱۵۰) أَخَذَ الْأَلْوَاحَ (۷/۱۵۴) جیسی آیات، ''مفکر قرآن'' کے موقف کی تردید میں شاہد عدل ہیں۔

الغرض، کتاب کا یہ تصور کہ وہ سلی ہوئی شیرازہ بند ہو، دورِ حاضر کا تصور ہے (نہ کہ دورِ قرآن یا اس سے پہلے کے دور کا)۔ ''مفکر قرآن'' نے، صرف اور صرف اس لیے، کتاب کے موجودہ تصور کو، قرآن پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ یہ ڈھنڈورا پیٹا جاسکے کہ قرآن کی حفاظت کا ذریعہ، کتابت تھا (نہ کہ حفظ)۔ کیونکہ اگر حفظ کو حفاظتِ قرآن کا ذریعہ مانا جائے، تو

پھر اسی ذریعہ سے احادیث کو بھی محفوظ ماننا پڑتا ہے، جو انہیں گوارا نہیں۔ اس لیے ان کا تمام تر زور، اس بات پر صرف ہوتا ہے کہ قرآن، شروع ہی سے، عہدِ نبوی میں مرتب و مدوّن تھا، نہ کہ خلافت راشدہ میں۔ کیونکہ خلافت راشدہ میں قرآن کا مرتب ہونا (اور عہد رسالت میں ایسا نہ ہونے کی بجائے، متفرق اور منتشر اشیاء پر مکتوب ہونا) یہ واضح کرتا ہے کہ حفاظتِ قرآن کا اصل ذریعہ، کتابت نہیں بلکہ حفظ (فی الصدور) ہے، بالخصوص جب کہ اس کی جمع و تدوین اور ترتیب کی تحریک بھی، اس وقت پیدا ہوئی جب کہ جنگ یمامہ میں کثیر التعداد حفاظِ قرآن صحابہ کی شہادت کے باعث، ضیاعِ قرآن کا خطرہ پیدا ہوا تھا۔

حفاظت قرآن کا اصل ذریعہ حفظ ہی ہے

منکرینِ حدیث، بشمول پرویز صاحب، اس بات پر بہت زور دیتے ہیں کہ حضور ﷺ نے قرآن کو لکھوا دیا تھا اور احادیث کو لکھوایا نہیں تھا اس لیے قرآن محفوظ ہے، اور احادیث غیر محفوظ ہیں۔ حالانکہ قرآن کا محفوظ ہونا، اس بناء پر نہیں کہ اُسے (بغیر حفظ کیے) لکھا گیا تھا، بلکہ اس لیے تھا کہ عہدِ نبوی (میں بھی، اور ادوارِ مابعد) میں (بھی) اُسے سینوں میں محفوظ رکھا گیا تھا۔ خود قرآن میں بھی، اس کی کتابت کا نہیں بلکہ حفظ کا ذکر ہے بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ (۲۹/۴۹) ”بلکہ وہ (قرآن) تو ایسی واضح آیات ہیں جو اہل علم کے سینوں میں (محفوظ) ہیں۔“ اگر وہ حفظ نہ کیا گیا ہوتا، تو محض لکھا ہوا قرآن، اس بناء پر محفوظ نہیں رہ سکتا تھا کہ وہ لکھ لیا گیا تھا۔ یقیناً حضور ﷺ نے قرآن کو لکھوایا تھا، مگر آپ ﷺ کا مکتوبہ نسخۂ قرآن، آج کہاں ہے؟ وہ آج کہیں موجود ہی نہیں ہے۔ اگر کسی جگہ سے وہ دستیاب ہو بھی جائے، تو اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ وہ حضور ﷺ ہی کا کتابت شدہ نسخہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یقیناً، قرآن مجید کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے، مگر اُس کے رسول کے کتابت شدہ نسخۂ قرآن کا ذمہ تو نہیں لیا۔ اور قرآن، واقعی آج تک محفوظ ہے، مگر رسول اللہ ﷺ کا مکتوب مصحف تو قطعی لاپتہ فلہذا، غیر محفوظ ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ حفاظتِ قرآن کا، اصل ذریعہ حفظ ہی ہے (نہ کہ کتابت)

(۳۸) سُنیوں کے عقائد و مسلک پر عجمی اثرات (۲) عقیدہ ناسخ و منسوخ

اہل السنۃ والجماعۃ کے عقائد و مسلک پر، جس دوسرے ”عجمی اثر“ کو ”مفکر قرآن“ نے بیان کیا ہے، وہ ان کے اپنے الفاظ میں یہ ہے:

> اس (قرآن) کے متعلق، یہ عقیدہ پھیلایا گیا کہ اس میں بے شمار آیات منسوخ ہیں، یعنی وہ آیات، قرآن میں موجود ہیں، ان کی تلاوت بھی کی جاتی ہے، لیکن حکم ان کا منسوخ ہو چکا ہے، اس سلسلہ میں ایک عقیدہ یہ ہے کہ قرآن کی بعض آیات، قرآن ہی کی دوسری آیات سے منسوخ ہیں، اور دوسرا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن کی آیات، بعض احادیث کی رو سے منسوخ ہیں۔ اس دوسرے عقیدہ کے متعلق، ہم ذرا آگے چل کر لکھیں گے۔ جہاں تک اوّل الذکر عقیدہ کا تعلق ہے قرآن میں یہ کہیں درج نہیں کہ فلاں آیت نے فلاں آیت کو منسوخ کر دیا ہے، اسے ”علماء“ پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ جس آیت کے متعلق چاہیں کہہ دیں کہ اسے فلاں آیت نے منسوخ کر دیا ہے .... یہ عقیدہ، بہر حال، موجود ہے کہ قرآن کی بعض آیات، صرف پڑھی جاتی ہیں۔ ان کا حکم منسوخ ہو چکا ہے، اور منسوخ ہو چکا ہے (خدا کے فیصلے کی رو سے نہیں) بلکہ کسی نہ کسی عالم کے فیصلے کی رو سے۔ ❶

”مفکر قرآن“ نے یہاں جو کچھ فرمایا ہے، وہ بغیر سوچے سمجھے، محض اپنے ہی خیالات کی دنیا میں گھوم پھر کر فرما دیا ہے، اور ”عجمی سازش“ کی اختراع و اختلاق کے جوش میں، انہیں اتنا بھی ہوش نہیں رہا کہ جو اعتراض، وہ، (ناسخ و منسوخ کے حوالہ سے) علماء کرام پر کر رہے ہیں، وہ خود بھی، اس کی زد میں آ رہے ہیں۔

اگر ”مفکر قرآن“ الفاظ کے پیچوں میں الجھنے کی بجائے، مسئلہ نسخ میں فنی اصطلاحات کے پردوں کو اٹھا کر، عروسِ حقیقت کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کرتے، تو انہیں معلوم ہوتا کہ علماءِ امت ہوں یا وہ خود ہوں، قرآنی آیات میں موجود، بظاہر تعارض کے دونوں قائل ہیں۔ دونوں فریقوں کے

---

❶ شاہکار رسالت، ص ۴۹۸۔

نزدیک، قرآن کریم کی بعض آیات، متروک العمل ہیں۔ ایک فریق، ایسی آیات کو یہ کہہ کر متروک العمل قرار دیتا ہے کہ...... "یہ آیات منسوخ ہیں"...... اور دوسرا فریق، یہ کہہ کر، کہ...... "یہ احکام، عبوری دور سے تعلق رکھتے ہیں، جن میں سے معاشرہ گزر کر، اگلی منزل پر پہنچ چکا ہے۔"

مثال کے طور پر، انفرادی ملکیت کے مسئلہ پر، "مفکر قرآن" صاحب کے نقطۂ نظر سے، (نہ کہ علماء کرام کے نقطۂ نظر سے) قرآنی آیات میں بظاہر اختلاف و تعارض پایا جاتا ہے، "مفکر قرآن" صاحب، اگر ایک طرف، قرآن سے (آیت ۲/۲۱۹ کی روشنی میں) قل العفو کے الفاظ سے ذاتی اور نجی مال کی ملکیت کی نفی ثابت کرتے ہیں، تو دوسری طرف (آیت ۴/۳۲ کی رُو سے) مما اکتسبوا اور مما اکتسبن کے الفاظ سے مرد و زن، ہر دو کے حق میں، شخصی ملکیتِ مال کا جواز بھی پیش کرتے ہیں۔ اس صورت میں، قرآنی آیات کے باہم متعارض ہونے کی توجیہہ پیش کی جائے، تو علماء کرام کے نقطۂ نظر سے (بشرطیکہ دونوں آیات سے، ان کا استدلال بھی، استدلالِ پرویز کے موافق ہو، تو) ناسخ و منسوخ کے اصول پر ہوگی، اور پرویز صاحب کے نقطۂ نظر سے، "عبوری دور کے احکام" کے اصول پر ہوگی۔

اس صورتِ حال میں، کیا یہ بات، قابل تعجب اور موجب حیرت نہیں کہ ایک ہی حقیقت کو، اگر علماء کرام، ناسخ و منسوخ کے حوالہ سے بیان کریں، تو "مفکر قرآن" صاحب، اسے مضحکہ خیز قرار دیں، اور طنز و طعن کے تیر برسانا شروع کر دیں، لیکن اگر ٹھیک اسی حقیقت کو، وہ خود "عبوری دور کے احکام" کے حوالہ سے بیان کریں، تو وہ مفسر قرآن کہلائیں، حالانکہ ناسخ و منسوخ نہ سہی، اس مادہ سے چند مشتقات، قرآن میں موجود ہیں، لیکن "عبوری دور کے احکام" کا تو کسی درجہ میں بھی، قرآن میں کہیں ذکر نہیں ہے۔ پھر "مفکر قرآن" صاحب، خود تو، عمر بھر ناسخ و منسوخ کے مسئلہ پر، علماءِ امت پر، زبانِ طعن دراز کرتے رہے، لیکن ناسخ و منسوخ کی حقیقت کو "عبوری دور کے احکام" کے لیبل کے تحت، خود تسلیم کرتے رہے ہیں۔ آخر یہ واضح تو کیا جائے، کہ علماء کرام کے تصورِ ناسخ و منسوخ میں، اور خود "مفکر قرآن" کے "عبوری دور کے احکام" کے تصور میں کیا جوہری فرق ہے کہ اگر اس کو ایک نام سے موسوم کیا جائے تو ناقابلِ قبول

قرار پائے، اور دوسرے نام سے پیش کیا جائے تو قابلِ قبول؟ کیا یہ محض ایک لفظی نزاع نہیں ہے؟ جس کی آڑ میں، "مفکرِ قرآن" صاحب نے صرف اور صرف، علماء امت کی تحقیر و توہین اور تضلیل و تذلیل کے لیے، عقلی کشتی اور ذہنی دنگل کا اکھاڑہ عمر بھر جمائے رکھا ہے۔

جوابِ آں غزل

پھر "مفکرِ قرآن" نے اپنی دانشورانہ اور مفکرانہ ترنگ میں، جس میں قدرے طنز کی تلخی بھی موجود ہے، یہ فرمایا کہ...... "قرآن میں یہ کہیں درج نہیں، کہ فلاں آیت نے فلاں آیت کو منسوخ کر دیا ہے، اسے "علماء" پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ جس آیت کے متعلق چاہیں، کہہ دیں کہ اسے فلاں آیت نے منسوخ کیا ہے"...... اور پھر یہ بھی کہ...... "یہ عقیدہ، بہرحال موجود ہے کہ قرآن کی بعض آیات صرف پڑھی جاتی ہیں، ان کا حکم منسوخ ہو چکا ہے (خدا کے فیصلے کی رو سے نہیں) کسی نہ کسی عالم کے فیصلے کی رو سے"...... اب اگر کوئی شخص پلٹ کر، یہی سوال، "مفکرِ قرآن" کی زندگی میں، ان کے سامنے پیش کرتا، یا آج اس کی معنوی اولاد سے پوچھ بیٹھتا، تو معلوم نہیں، کہ کیا جواب ہوتا کہ...... حضرت گرامی قدر! اللہ تعالیٰ نے ان آیات کے متعلق کہیں نہیں بتایا کہ کون سی آیات، "عبوری دور کے احکام" سے متعلق ہیں، اور کون سی "نظامِ ربوبیت" کے "تکمیلی دور" سے وابستہ ہیں؟ نیز یہ بھی کہ...... قرآن میں ایسی آیات بھی موجود ہیں، جن کی تلاوت ہو رہی ہے، لیکن وہ متروک العمل ہیں (کیونکہ معاشرہ، ان کے وقتِ نزول کی سماجی حالت سے گزر کر، "تکمیلی دور" میں داخل ہو چکا ہے)، اور ان کا متروک العمل ہونا بھی، خدا کے فیصلے کی رو سے نہیں، بلکہ "مفکرِ قرآن" صاحب کے فیصلہ کی رو سے ہے...... معلوم نہیں کہ یہ حضرات اس سوال کا کیا جواب دیتے۔

کیا عبوری دور سے وابستہ بیچاری یہ آیات، ایسی ہی قسمت کی ماری ہوئی تھیں کہ چودہ صدیوں تک مسلسل گوشۂ خمول میں پڑی رہیں، کسی، عالمِ دین، مفسرِ قرآن، محدثِ ذی شان، اور فقیہِ اسلام کو، ان کا علم نہ ہو سکا، یہاں تک کہ بٹالہ کے ایک "خالص عرب علاقے" میں، ایک "خالص عربی مفکرِ قرآن" پیدا ہوا، جس نے "عجمی سازش" کے تحت، قرآن پر "ملاؤں کے ڈالے ہوئے پردے" چاک کیے، تو "عبوری دور کے احکام" سے متعلقہ آیات ابھر کر

سامنے آ گئیں، تو ’’مفکر قرآن‘‘ نے ’’انکشافِ حقیقت‘‘ کرتے ہوئے فرمایا۔

> وراثت، قرضہ، لین دین، صدقہ و خیرات وغیرہ سے متعلقہ احکام، اس عبوری دور سے متعلق ہیں، جس میں سے معاشرہ گزر کر، انتہائی منزل تک پہنچتا ہے۔ ①

سوال یہ ہے کہ جب معاشرہ (فرض کیجئے) تکمیلی دور کو پہنچ گیا، اور ’’عبوری دور کے احکام‘‘، متروک العمل ہو گئے، مگر ان کی تلاوت پھر بھی باقی رہی، ایسی آیات کو قرآن میں باقی کیوں رکھا گیا؟ اس کے جواب میں ’’مفکر قرآن‘‘ صاحب فرماتے ہیں۔

> وراثت، قرضہ لین دین، صدقہ و خیرات وغیرہ سے متعلق احکام، اس عبوری دور سے متعلق ہیں جن میں سے گزر کر معاشرہ انتہائی منزل تک پہنچتا ہے، اس کے ساتھ ہی، اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھا جائے کہ دنیا میں ایسے ممالک بھی ہوں گے جہاں مسلمان، اقلیت میں، غیر مسلم (غیر قرآنی) نظامِ حکومت کے تابع زندگی بسر کر رہے ہوں گے، وہاں ان کی انفرادی زندگی مسلمانوں کی سی ہوگی، اس لئے ان کے لئے انہی قرآنی احکام پر عمل پیرا ہونا ممکن ہوگا جنہیں ہم نے عبوری دور کے احکام کہہ کر پکارا ہے، ان کے لئے کشادگی کی راہ تو یہی ہوگی کہ وہ آخر الامر، اس مملکت کی طرف ہجرت کر جائیں جہاں قرآنی نظام نافذ ہو، لیکن جب تک یہ ممکن نہ ہو، انہیں، بہر حال، انفرادی احکام پر عمل پیرا رہنا ہی ہوگا۔ ②

اب اگر یہی سوال، علماء کرام کے سامنے رکھا جائے، کہ منسوخ آیات کو، ان کی تلاوت کے حکم کے باوجود، قرآن میں کیوں رکھا گیا، تو وہ بھی ایسی ہی وجہ بیان کرتے ہیں۔

> عام طور پر لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ جن آیات کا حکم منسوخ ہو چکا ہے، ان کی قرآن میں اب کیا ضرورت ہے، کیوں نہ ان کی تلاوت بھی منسوخ ہو گئی؟ اس کو رفع کرنے کے لئے، میں نے قرآن میں ان احکام کے باقی رہنے کی حکمت یہ بتائی ہے کہ اگر معاشرے میں کبھی ہم کو پھر ان حالات سے سابقہ پیش آئے، جن میں یہ احکام دیئے

---

① نظام ربوبیت، ص ۲۷۔

② نظام ربوبیت، ص ۲۷۔

> گئے تھے تو ہم ان پر عمل کر سکتے ہیں مثلاً کسی ملک میں مسلمان، اسی دور کے حالات سے دوچار ہوں جو مکی زندگی میں آپؐ کے اصحاب کو پیش آئے تھے تو مکی دور کی تعلیم، صبر و تحمل پر عمل کیا جائے گا، نہ کہ مدنی دور کی تعلیمِ جہاد و قتال پر۔ حالانکہ بیشتر علماء نے احکام قتال سے مکی دور کی ان آیات کو منسوخ قرار دیا ہے۔ اسی طرح، اُس حالت میں مسلمان، ان بہت سے احکام و قوانین کی پابندی سے آزاد رکھے جائیں گے جو مدنی دور میں نازل ہوئے اور جن پر عملدر آمد، اسلامی حکومت کی موجودگی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ ①

ان اقتباسات سے کیا واضح ہوا؟ یہی نا کہ علماء امت ہوں یا ''مفکر قرآن''، ہر ایک کے نزدیک، قرآن میں ایسی آیات موجود ہیں جن کا حکمِ تلاوت باقی ہے، لیکن ان پر عمل منسوخ یا متروک ہے۔ ان آیات کو، قرآن میں کیوں رکھا گیا؟ ان کی تلاوت کو بھی ان کے حکم کی طرح کیوں نہ ساقط کیا گیا؟ اس کا جواب بھی، دونوں گروہوں کے نزدیک متفق علیہ ہے، لیکن محض، اس بناء پر کہ، ''مفکر قرآن'' نے جس حقیقت کو ''عبوری دور کی آیات'' کے نام سے قبول کیا ہے، اُسی حقیقت کو، علماء نے، ''منسوخ آیات'' کے نام سے کیوں قبول کیا، اُن پر ہمیشہ زبان طعن دراز کرتے رہے، اور ان پر ایسے اعتراضات کی بوچھاڑ کرتے رہے، جن کی زد میں، وہ خود بھی آئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

پھر یہ بھی کیا عجیب منطق ہے کہ ناسخ و منسوخ کے حوالہ سے بات کی جائے، تو وہ ''عجمی سازش'' کا شاخسانہ قرار پائے، لیکن اگر ''عبوری دور کے احکام'' کے حوالہ سے بات ہو، پھر ''عجمی سازش'' سے اس کا دور کا بھی کوئی تعلق نہیں رہتا۔ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ.

جان لیجئے کہ یہ جو ہم نے کہا ہے کہ پرویز صاحب نے ناسخ و منسوخ کی حقیقت کو ''عبوری دور'' کے احکام کے نام سے قبول کر رکھا ہے تو یہ محض الزامی جواب کے طور پر ہے ورنہ اُن کا عبوری دور کا تصور، ہمارے نزدیک، قطعاً خلافِ حقیقت ہے۔

ہمارے نزدیک ''عبوری دور'' کی تعریف یہ ہے کہ قرآن کے ایک حکم یا اس کے

---

① رسائل و مسائل، ج ۳، ص ۸۵۔

دیئے ہوئے کسی قاعدے اور اصول پر عمل کرنے میں اگر کچھ موانع موجود ہیں تو ان کو دُور کرنے تک عارضی طور پر جو کچھ بھی ہم مجبوراً کریں گے، وہ عبوری دور کا انتظام ہوگا۔ اس کے برعکس منکرین حدیث کے نزدیک، ان کے اپنے تصنیف کردہ اصولوں پر عملدرآمد کرنے کے لیے، جب تک فضا سازگار نہ ہو، اُس وقت تک وہ قرآن کے دیئے ہوئے احکام اور اس کے مقرر کیے ہوئے اصولوں پر محض ایک عارضی انتظام کی حیثیت سے عمل کریں گے۔ ❶

(۳۹) سنیوں کے عقائد پر "عجمی اثرات"۔ (۳) وحی کی دو قسمیں

مسئلہ ناسخ و منسوخ کو "عجمی سازش" کے اثرات میں سے ایک اثر اور نتیجہ قرار دینے کے بعد، لیکن پینترا بدل کر، اسی حقیقت کو "عبوری دور کے احکام" کے حوالہ سے طے کر ڈالنے کے بعد، "مفکر قرآن" صاحب، فرماتے ہیں۔

> اس کے بعد، یہ سوال سامنے آتا ہے کہ جو قرآن منسوخ ہونے سے بچ گیا ہے، اسے سمجھا کس طرح جائے، یہ وہ مقام ہے جہاں ایرانیت، نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ محدث کے عقیدہ کی رو سے کہا یہ گیا کہ وحی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم کی وحی رسول اللہ پر نازل ہوئی، اور دوسری قسم کی وحی ائمہ پر۔ ان کے صرف طریق نزول میں فرق تھا۔ وحی ہونے کی جہت سے، ان میں کسی قسم کا فرق نہیں تھا۔ یہ عقیدہ شیعہ حضرات کا تھا۔ سنیوں کے ہاں یہ عقیدہ رائج کیا گیا کہ وحی کی دو قسمیں ضرور ہیں، لیکن یہ دونوں، رسول اللہ ﷺ پر ہی نازل ہوئی تھیں۔ ایک کو وحی جلی (یا وحی متلو) کہا جاتا ہے اور دوسری کو وحی خفی (وحی غیر متلو)۔ وحی جلی (یا متلو) قرآن کے اندر ہے، اور وحی خفی، احادیث کے اندر۔ ❷

قطع نظر اس کے کہ شیعہ علماء و ائمہ کی طرف، اس اقتباس میں جو کچھ منسوب کیا گیا ہے، اس میں کیا سخن سازی کی گئی ہے، اور اس میں کس قدر صداقت اور کس قدر لفظی ملمع سازی کی

---

❶ سنت کی آئینی حیثیت، ص ۲۰۰ تا ۲۰۱۔

❷ شاہکار رسالت، ص ۴۹۶۔

گئی ہے، ہم صرف یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ’’مفکر قرآن‘‘ کی تحریفی صلاحیتیں، کس قدر بلند پایہ ہیں، قولِ سدید کی بجائے، کس طرح کجئ لسان سے کام لیتے ہیں۔

(۱)...... سب سے پہلے، اس اقتباس میں، ’’مفکر قرآن‘‘ کی یہ ذہنی عیاری ملاحظہ فرمائیے کہ یہ کہنے کی بجائے کہ ...... ’’عبوری دور کے احکام‘‘ سے آیات کو وابستہ کر دینے کے بعد، باقی قرآن کو کیسے سمجھا جائے‘‘ ...... وہ یہ کہتے ہیں کہ ...... ’’جو قرآن، منسوخ ہونے سے بچ گیا، اسے کیسے سمجھا جائے‘‘ ...... کیونکہ علماء کو نشانۂ طنز بنانے کے لئے، مؤخر الذکر جملہ استعمال کرنا، اُن کے لئے مفید مطلب ہے۔

(۲)...... شاہ ولی اللہ، محدث دہلوی کے نزدیک، منسوخ آیات کی تعداد صرف پانچ ہے، لیکن ’’مفکر قرآن‘‘ نے جن آیات کو ’’عبوری دور کے احکام‘‘ قرار دیا ہے، اور جو مال و دولت کی انفرادی ملکیت پر دال ہیں، اور وہ سب کی سب (جن کی تعداد تقریباً ۱۷۲ ہے) ’’عبوری دور‘‘ کے فلسفۂ پرویز کی بھینٹ چڑھ کر ساقط العمل ہو گئی ہیں۔ اپنے نتائج و اثرات کے لحاظ سے، یہ فلسفہ، ناسخ و منسوخ کے مسئلہ سے کہیں زیادہ، بدتر ہے۔ لیکن ’’عبوری دور‘‘ کے فلسفہ کو، جو صدہا آیات پر خطِ تنسیخ کھینچ دیتا ہے، قبول کر لیا ہے، اور ناسخ و منسوخ کے تصور کو، جس سے (بقول شاہ ولی اللہ) صرف پانچ آیات متروک العمل ٹھہرتی ہیں، نشانۂ طنز و تعریض بنایا جاتا ہے۔

(۳)...... اب رہیں وحی کی قسمیں، تو ’’مفکر قرآن‘‘ کا مزاج یہ تھا کہ ان کی فضائے دماغی میں اٹھنے والی ہر لہر کے ساتھ، جب ان کے اپنے معتقدات و نظریات بدل جائیں تو اس کے ساتھ ہی، دنیا کی ہر چیز کو بدل جانا چاہئے، یہاں تک کہ زمین و آسمان کو بھی متغیر ہو جانا چاہئے۔ کسی شے کو بھی اپنی سابقہ حالت پر برقرار نہیں رہنا چاہئے۔ ہر ایک کو اپنا قبلہ تبدیل کر لینا چاہئے۔ حدیث، تاریخ، فقہ، لغت الغرض ہر چیز کو ’’مفکر قرآن‘‘ کے ہر آن بدلتے ہوئے، افکار و نظریات کے مطابق بدل جانا چاہئے۔ اور اسلامی علوم کے پورے ریکارڈ کو (خواہ، وہ تاریخ و سیر سے متعلق ہو، یا احکام و اوامر سے۔ حقوق و فرائض ہوں یا منہیات و ممنوعات۔ امورِ احادیث ہوں یا مسائل فقہ)، جناب چوہدری غلام احمد پرویز کی بارگاہ میں دست بستہ حاضر رہنا چاہئے تاکہ وہ ان کے اشارۂ ابرو کے ہر تغیر پر بدلتے چلے جائیں، اور انہیں دربارِ پرویز میں سراپا تسلیم و رضا رہنا چاہئے۔

دو نہیں بلکہ تین قسمی وحی

اب ''مفکرِ قرآن'' کو یہ بات کون سمجھائے کہ وہ تو دو وحیوں کی بات پر سیخ پا ہو رہے ہیں، جب کہ قرآن کریم میں، تین وحیوں کا ذکر ہے ملاحظہ فرمائیے، مندرجہ ذیل آیت۔

﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ۝﴾ (الشوریٰ: ۵۱)

''کسی بشر کے لیے یہ نہیں ہے کہ اللہ، اس سے گفتگو کرے مگر وحی کے طریقہ پر، یا پردے کے پیچھے سے، یا اس طرح کہ ایک پیغامبر بھیجے، اور وہ اللہ کے اذن سے وحی کرے جو کچھ کہ اللہ چاہتا ہے۔ وہ برتر اور حکیم ہے۔''

یہ آیت، دو قسمی نہیں، بلکہ تین قسمی وحی کا اثبات کر رہی ہے۔ ایک براہِ راست وحی (یعنی القاء و الہام)، دوسرے، پس پردہ کلام، تیسرے اللہ کے پیغام بر (فرشتہ) کے ذریعہ سے وحی۔ اور قرآن، صرف ایک قسم کی وحی پر مشتمل ہے، باقی دو قسموں کی وحی، اس کے علاوہ ہے۔ لیکن چونکہ ''مفکرِ قرآن'' صاحب کا ''ذوقِ قرآن'' یہ تھا کہ وہ، قرآن کریم کا مطیع و فرماں بردار بننے کی بجائے، الٹا قرآن کو اپنا مطیع و فرماں بردار بنایا کرتے تھے۔ اس لیے وہ اس آیت کی تاویل بلکہ تحریف پر اُتر آئے، اور الفاظ کی بے تحاشا فضول خرچی کے ساتھ، ''مفہوم آیت'' یہ بیان کیا:

> یہ قانون فطرت، جو کائنات میں، اس طرح کارفرما ہے، انسانی معاشرے کے لیے وحی کی رو سے ملتا ہے، جو انبیاءِ کرام کی وساطت سے بھیجی جاتی ہے۔ ہر فرد کی طرف، انفرادی طور پر نہیں بھیجی جاتی۔ خدا ہر انسان سے براہ راست ہم کلام نہیں ہوتا) اس کی ہم کلامی کے تین طریقے ہیں۔ دو طریقے انبیاء سے مخصوص ہیں، اور تیسرا طریق، عام انسانوں کے لیے۔ انبیاء سے خدا کی ہم کلامی کا طریق یہ ہے کہ کبھی خدا کی بات، نبی کے دل میں ڈال دی جاتی ہے، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پس پردہ خدا کی باتیں، ان کے کان تک پہنچ جاتی ہیں

> (جیسے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہوا۔ (۲/۲۵۳÷۴/۱۶۵) یہ دونوں طریقے، انبیاء کے ساتھ مخصوص ہیں۔ باقی رہے غیر از انبیاء (عام انسان) سو ان کی طرف رسول بھیجا جاتا ہے جو ان تک وہ وحی پہنچاتا ہے، جسے خدا اپنے قانون مشیت کے مطابق اس رسول کو دیتا ہے (کوئی غیر از نبی، خدا سے براہ راست ہم کلام نہیں ہوسکتا) ①

وحی کی ان تینوں صورتوں میں سے، ایک صورت کو، غیر از انبیاء (عام انسانوں) سے وابستہ کرنا، اور دو صورتوں کو انبیاء سے متعلق قرار دینا، اور پھر ان دو صورتوں میں سے بھی، ایک ہی صورت کو، حضور اکرم ﷺ سے، اور دوسری کو صرف موسیٰ علیہ السلام سے ملحق قرار دینا، نہ صرف بدترین تحریف آیت ہے، بلکہ یہ ان کے سابقہ مبنی بر حقیقت موقف کے ساتھ متصادم بھی ہے۔ بدترین تحریف، اس لیے کہ ان تینوں صورتوں کے ذکر کے بعد، اللہ تعالیٰ حضور اکرم ﷺ سے براہ راست یہ فرماتا ہے کہ

﴿كَذَالِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِنْ أَمْرِنَا﴾ (الشوریٰ: ۵۲)

"اسی طرح، ہم نے تیری طرف (اے نبی!) اپنے امر کی وحی کی۔"

كذالك کا اشارہ، ان تینوں طریقوں کی طرف مانا جائے یا صرف آخری طریقے کی طرف جو کہ كذالك کا قریب ترین مشارٌ الیہ ہے۔ ہر صورت میں، تیسرا طریقہ، انبیاء ہی کے ساتھ، ہم کلامی کا طریقہ قرار پاتا ہے۔ ان تینوں طریقوں میں سے قرآن، صرف ایک ہی طریقے کی وحی پر مشتمل ہے، اور بقیہ دو قسم کی وحیاں، قرآنی وحی کے علاوہ ہیں۔

اور اس بدترین تحریف کا، "مفکر قرآن" کے سابق موقف کے ساتھ تصادم و تضاد، اس لیے ہے کہ اس سے قبل، وہ اسی آیت کی سہ گونہ وحی کو، انبیاء کرام ہی سے وابستہ کیا کرتے تھے، ملاحظہ فرمائیے، ان کا یہ اقتباس:

> قرآن کریم نے، اللہ کے، اپنے بندوں سے ہم کلام ہونے کی تین صورتیں بتائی

---

① مفہوم القرآن، ج ۳، ص ۱۱۳۹۔

> ہیں۔ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ .... اِنَّهٗ عَلِیٌّ حَكِیْمٌ (الشوریٰ: ۵۱)۔ اور دیکھو! کسی انسان کی یہ حیثیت نہیں کہ خدا سے ہم کلام ہو، مگر (صرف تین صورتوں میں) بطور وحی کے، یا حجاب (پردے) کے پیچھے سے، یا یہ کہ کوئی قاصد (فرشتہ) بھیج دے، اور وہ خدا کے حکم سے، جو وہ چاہے، اس کے دل میں ڈال دے۔ بلاشبہ وہ بہت بلند مرتبہ اور صاحب حکمت ہے۔
>
> وحیٔ رسالت۔ پہلی قسم۔ فرشتہ یا آواز کے توسط کے بغیر کوئی بات دل میں ڈال دینا۔ دوسری قسم، پردہ کے پیچھے سے بذریعہ آواز کے، جیسے وَنَادَیْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَیْمَنِ وَ قَرَّبْنٰهُ نَجِیًّا (۵۲/۱۹) ہم نے اُسے کوہ طور کی داہنی جانب سے پکارا، اور وحی کی سرگوشیوں کے لیے، اپنے سے قریب کیا۔
>
> پس پردہ، اس لیے کہ کسی انسانی آنکھ کے لیے، ممکن نہیں کہ اس دنیا میں خدا کو بے حجاب دیکھ لے۔
>
> اور تیسری قسم۔ یہ کہ ملائکہ (پیغام رسانِ ملاءِ اعلیٰ) کی وساطت سے اس کا نزول ہو۔ ①

یہ پرویز صاحب کی اس زمانے کی تحریر ہے، جب وہ ''مفکر قرآن'' نہیں بنے تھے، پھر جب یار لوگوں نے انہیں ''مفکر قرآن'' بنا کر بانس پر چڑھا دیا تو پھر وحیٔ رسالت کی پہلی قسم، قرآنی وحی پر مشتمل قرار پائی، جب کہ ماضی میں (جیسا کہ معارف القرآن کے اقتباس سے ظاہر ہے) تیسری قسم کی وحی ہی مشتمل بر قرآن تھی۔ یہ فرق، اس فرق کے علاوہ ہے، جو اوپر بیان ہو چکا ہے (جس میں ہم کلامی کا ایک طریقہ، اب عام انسانوں کے لیے بھی طے کیا گیا ہے)۔

یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ جو لوگ، وحی، اور اس کی اقسام وطرق کے متعلق دونوں فریقوں کے دلائل کا موازنہ کر کے، کسی نتیجہ پر پہنچنا چاہتے ہیں، انہیں چاہیے کہ وہ مولانا

---

① معارف القرآن، ج ۲، ص ۲۸۴۔

مودودی رحمہ اللہ کی کتاب، ''سنت کی آئینی حیثیت''، کا ضرور مطالعہ فرمائیں۔

(۴۰) سُنّیوں کے عقائد و مسلک پر عجمی اثرات (۴) مثلہ معہ

وحی کی دو قسموں پر (حالانکہ قرآن میں تین قسموں کی وحی مذکور ہے) ''مفکر قرآن'' عبوس و تولی کا رویہ اختیار کرنے کے بعد، یہ لکھتے ہیں:

> وحی غیر متلو کے متعلق یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ یہ بھی مثلہ معہ ''قرآن کے ساتھ، اس کی مثل'' ہے۔ چنانچہ حضرت مقداد بن معدیکرب کی روایت یوں بیان کی جاتی ہے کہ...... رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یاد رکھو کہ مجھے الکتاب دی گئی ہے، اور اس کے ساتھ، اس کی مثل کچھ اور (انی اوتیت الکتاب و مثلہ معہ) یاد رکھو عنقریب ایک شخص، جس کا پیٹ بھرا ہوگا، اپنے تخت پر بیٹھا کہے گا کہ تم اس قرآن کو لازم پکڑو، جو کچھ اس میں حلال پاؤ، اسے حلال سمجھو، اور جو کچھ اس میں حرام پاؤ، اسے حرام سمجھو۔ (ابوبکر خطیب بغدادی۔ کتاب الکفایہ) ①

منکرین حدیث بشمول ''مفکر قرآن'' اس بات کا شدت سے انکار کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو، قرآن کے علاوہ بھی، کچھ اور چیز دی گئی تھی، ان کا دعویٰ یہ ہے کہ حضور ﷺ کو قرآن کے سوا، نہ کوئی معجزہ دیا گیا، اور نہ ہی کوئی اور وحی کی گئی۔ جو کچھ بھی ہے، بس وہ قرآن ہی ہے حالانکہ قرآن میں کتابی وحی کے علاوہ دو اور وحیوں کے ملنے کا بھی ذکر ہے۔

علاوہ ازیں، منکرین حدیث کے اس دعویٰ کی تردید، کہ حضور اکرم ﷺ کو، قرآن کے سوا، کچھ اور نہیں دیا گیا، قرآن کریم کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے جس میں نہ صرف آپ ﷺ کو، بلکہ جملہ انبیاء کو بھی، کتب الٰہیہ کے علاوہ، کچھ اور دیئے جانے کا ذکر ہے۔

﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ أَنَّى يُصْرَفُونَ ۝ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِالْكِتَابِ وَبِمَا أَرْسَلْنَا بِهِ رُسُلَنَا ۝﴾ (المومن: ٦٩ تا ٧٠)

---

① شاہکار رسالت، ص ۴۹۹۔

> "کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اللہ کی آیات میں جھگڑا کرتے ہیں،
> کہاں سے وہ پھرائے جاتے ہیں؟ یہ لوگ جو اس کتاب کو اور ان سب چیزوں کو،
> جن کے ساتھ ہم نے رسولوں کو بھیجا، جھٹلاتے ہیں۔"

یہاں کفار و منکرین کی طرف سے دو چیزوں کو جھٹلانے کا ذکر ہے، ایک کتب الٰہیہ، اور دوسری وہ چیز، جسے انبیاء و رسل کو دے کر، (ان کی اقوام کی طرف) بھیجا گیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ رسولوں کو کتابوں کے علاوہ بھی ایسی چیز دی گئی جس کی تصدیق کی بجائے، کفار نے تکذیب کی۔

مثلہ معہ

اب آیئے اس حدیث کی طرف جس میں مثلہ معہ کا ذکر آیا ہے، اور جسے منکرین حدیث نے کئی پہلوؤں سے نشانہ بنایا ہے، اور اس قدر استہزاء و تمسخر کیا ہے کہ الامان والحفیظ۔ حالانکہ اس میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے، وہ صرف اس قدر ہے کہ اتباع حق کے نقطۂ نظر سے جس طرح، قرآن کی پیروی ضروری ہے، اسی طرح، حدیث و سنت کی تابعداری بھی لازمی ہے۔ صاحب "الکفایہ فی علم الروایہ" نے اس حدیث کو جس عنوان کے تحت درج کیا ہے، وہی یہ بات ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے کہ اہل علم کے نزدیک، اس کا معنی و مفہوم کیا ہے۔ ابوبکر خطیب بغدادی کا دیا ہوا عنوان ملاحظہ فرمایئے۔

> "باب ما جاء فی التسویة بین حکم اللہ تعالیٰ وحکم سنة رسولؐ اللہ فی وجوب العمل ولزوم التکلیف"☆
>
> باب اس امر کے بیان میں کہ وجوب عمل اور تکلیف شرعی کے لازم ہونے میں کتاب اللہ اور سنت رسول دونوں کے حکم مساوی المرتبہ ہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ حدیث میں مذکور مثلیت سے مراد، حکمِ قرآن کی طرح، حکمِ سنت کی پیروی میں "مثلیت" ہے جس طرح اسلامی قانون کا ایک ماخذ قرآن ہے، اُسی طرح (مثلہ معہ) قانون و احکام کا ایک سرچشمہ، سنت بھی ہے۔ دینی حجت اور دینی سند ہونے میں، جس

☆الکفایة فی علم الروایة۔ ص ۸، ۷۔

طرح قرآن ہے، اسی طرح سنتِ رسول بھی ہے۔

اب اسی حدیث کے نفسِ مضمون کے متعلق، منکرین حدیث ہی کے ایک معتبر اور معتمد علیہ دانشور، تمنا عمادی صاحب یہ فرماتے ہیں:

> جہاں تک نفسِ مضمون کا تعلق ہے وہ تو بالکل صحیح ہے اس لیے کہ سنت رسول اللہ کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ کتاب اللہ کے احکام کی تعمیل جس طرح خود رسول نے کی، اور رسول کی تعلیم کے مطابق صحابہ رضی اللہ عنہم نے کی، تو سنت رسول ﷺ دراصل قرآن کے سوا کچھ بھی نہیں۔ قرآنی احکام کی عملی تفسیر کا نام سنت رسول ﷺ ہے، اس لیے سنت رسول کا اتباع، عین قرآن کا اتباع ہے۔ جس طرح قرآن میں ارشاد فرمایا گیا، مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (٤/٨٠) تو جس طرح، اللہ کی اطاعت، رسول ہی کی اطاعت کر کے ممکن ہے، اسی طرح قرآن کا اتباع، سنت صحیحہ رسول ﷺ کا اتباع کر کے ہی ممکن ہے۔ ①

لیکن اس کے بعد، خطیب بغدادی کے متعلق، تمنا عمادی صاحب، قطعی بے جا بدگمانی کرتے ہیں، جو ان کے شایانِ شان نہیں ہے، اور افسوس ہے کہ اس نگارش کی تنگ دامنی اس پر بحث کرنے میں مانع ہے۔

حدیث پر نشانہ بازی

الغرض، حکمِ قرآن ہی کی طرح، حکمِ رسول ﷺ (یا سنتِ رسول ﷺ) کا واجب و لازم ہونا ہی وہ چیز ہے جسے مثلہ معہ کے الفاظ میں تعبیر کیا گیا ہے، لیکن اسے نشانہ بنانے کے لیے، ٹھیک وہی ذہنیت اختیار کی گئی ہے جو عیسائی مشنری اور آریہ سماجیوں نے کبھی قرآن کو نشانہ بنانے کے لیے اختیار کی تھی۔

کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ حدیث و سنت، قرآن کی مثل کیسے ہو سکتی ہے جب کہ قرآن میں یہ اور یہ خوبیاں پائی جاتی ہیں اور حدیث و سنت میں یہ اور یہ عیوب و نقائص موجود ہیں، جب کہ

---

① طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۵۲ء، ص ۵۴۔

امرِ واقعہ یہ ہے کہ جن احادیث وسُنن کو سامنے رکھتے ہوئے، یہ سخن سازیاں کی جاتی ہیں، اُن میں سے کچھ تو وہ ہیں جنہیں خود محدثین نے جعلی اور وضعی قرار دے رکھا ہے، یہ لوگ ایسی احادیث کے عیوب کو، جملہ احادیث پر پھیلا کر سب کو ساقط الاعتبار بنا ڈالتے ہیں، اور کچھ وہ ہیں جن میں سے نفسیاتی طور پر، عجب و اپراہٹ کا پہلو نکال کر، عامۃ الناس کو بدگمان کیا جاتا ہے حالانکہ فی الواقع، نہ کوئی ان میں عقلی استبعاد پایا جاتا ہے، اور نہ ہی وہ تعلیمِ قرآن سے متصادم ہیں، اور نہ ہی فن حدیث کے اعتبار سے اُن میں کوئی سقم پایا جاتا ہے۔ لیکن تحریفی ترجمہ وتشریح کے کرتب دکھا کر، ان سے بے زاری پیدا کی جاتی ہے۔ اور پھر آنکھوں میں آنسو بھر کر یہ کہا جاتا ہے کہ...... "یہ ہیں وہ حدیثیں، جنہیں وحی غیر متلو اور مثلہ معہ (قرآن کے ہم پلہ) قرار دیا جاتا ہے"...... یہ بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی شخص، قرآن میں سے، حضور اکرم ﷺ کی بشریت کے بارے میں إِنَّمَآ أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ کے الفاظ کو بیان کرے اور پھر انسانوں میں سے چن چن کر، چوروں، ڈاکوؤں، شرابیوں، زانیوں، جیب کتروں، ٹھگوں، فریب کاروں، دھوکہ بازوں، ظالموں، بدمعاشوں اور بدکرداروں کو قطار میں کھڑا کر ڈالے اور پھر یہ کہے کہ یہ ہیں وہ لوگ، جن کی مانند رسول اللہ ﷺ کو (بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ) کہا جاتا ہے۔ ٹھیک یہی ٹیکنیک ہے جو مستشرقین کی اتباع میں، منکرین حدیث نے بالعموم اور "مفکرِ قرآن" نے بالخصوص، اختیار کیے رکھی ہے، اور ایسی روایات کو، جن میں سے نفسیاتی طور پر، عجب ونکارت یا حیرت واچنبھے کا کوئی پہلو نکالا جاسکتا ہے، انہیں سامنے رکھ کر، یہ ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے کہ۔۔۔ "یہ ہیں وہ روایات، جنہیں ملائیت اور مذہبی پیشوائیت، قرآن کی مثل، قرار دیتی ہے، اور وحیِ غیر متلو کہہ کر سینے سے لگائے ہوئے ہے"۔۔۔ کیا کوئی نیک نیت شخص، جسے آخرت میں، اپنی جوابدہی کا احساس ہو، ایسی حرکت کرسکتا ہے؟ کیا علمی تحقیق و استدلال، اسی رویے کا نام ہے؟ کیا یہ طرزِ عمل، صحتِ عقل اور سلامتیِ فکر کا غماز ہے؟

پھر منکرین حدیث، از خود، مثلہ معہ والی حدیث کا یہ مطلب لے کر، کہ حدیث و سنت، ہر لحاظ سے، ہر پہلو سے، ہر زاویہ سے قرآن ہی کے مثل ہے، ان دونوں کو زیرِ خوردبین

(Microscope) رکھ کر، اختلاف کے پہلوؤں کو تلاش کرتے ہیں، اور پھر یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ...... ''قرآن اور حدیث وسنت کے درمیان تو یہ اختلاف بھی ہے، اور یہ فرق بھی ہے، اور اس پہلو سے بھی، دونوں باہم متغائر ہیں، لہٰذا، حدیث وسنت، قرآن کے مثل کیسے ہو سکتے ہیں؟''...... یعنی فرمانِ رسول ﷺ، مثلیت کا پہلو پیش کر رہا ہے، اور یہ لوگ، (مثلیت کے پہلوؤں کو نظر انداز کر کے) عدمِ مثلیت اور اختلافات کے پہلو پیش کرتے ہیں، اور حدیث وسنت کو، قرآن سے متعارض اور متصادم قرار دے دیتے ہیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ کوئی شخص وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ (الانعام:۳۸) کے الفاظ میں مذکور، پرندوں اور بری جانوروں کے درمیان، اور بنی نوع انسان کے درمیان، جو مثلیت (یا مماثلت) قرآن بیان کرتا ہے، اُسے تو نظر انداز کر دیا جائے، اور بحث یہ شروع کر دی جائے کہ انسانوں اور دیگر جانداروں (مع پرندوں کے) درمیان یہ اور یہ فروق و امتیازات پائے جاتے ہیں، لہٰذا، یہ ایک دوسرے کی مثل کیسے ہو سکتے ہیں؟ حالانکہ انسانوں اور دیگر جانداروں میں مثلیت کا صرف اتنا پہلو ہی پایا جانا کافی ہے، کہ یہ سب، مخلوقِ خدا، مربوبِ رب اور عبدِ خالق ہیں۔

اور کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ حدیث وسنت، قرآن کی مثل (مثلہ معہ) کیسے ہو سکتی ہے، جب کہ قرآن، دین کے مکمل ہونے کا یہ کہہ کر، اعلان کر دیتا ہے کہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ۔ ''آج میں نے تمہارا دین، تمہارے لیے مکمل کر دیا۔'' اب کیا دین کو نامکمل مان لیا جائے؟ اور اس کی تکمیل کے لیے مثلہ معہ کو ساتھ ملا دیا جائے؟ اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس قسم کے شوشے اٹھانے والے، خود قرآن کو بھی، اور دین کو بھی نامکمل سمجھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک، دین اور قرآن کی اس وقت تک تکمیل نہیں ہو پاتی، جب تک ''مرکزِ ملت'' کی مرتب کردہ جزئیات ساتھ نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کے نزدیک، تنہا قرآن، ضروریاتِ دین کی تکمیل کے لیے کافی نہیں ہے۔

دین کی ضروریات، قرآن کے اتباع اور امام وقت کی اطاعت سے پوری

ہوتی ہیں۔ ①

اس سے ظاہر ہے کہ تنہا قرآن، ان معترضین کے نزدیک بھی، دین کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کافی نہیں، جب تک کہ اس کے ساتھ ''مرکز ملت'' کی طے کردہ جزئیات کو منتھی نہ کیا جائے۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہہ دے کہ قرآن وسنت ہی ضروریات دین کے لیے کافی ہیں، تو یہ بات، منکرین حدیث کے لیے سوہان روح بن جاتی ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ منکرین حدیث کو، ضد، چڑ، بیر، دشمنی، عداوت اور تعصب، جو کچھ بھی ہے، وہ سنت رسول کے حوالے سے ہے۔ اطاعت رسول کے حوالے سے ہے، امامِ وقت یا ''مرکز ملت'' کے حوالے سے نہیں ہے۔

(۴۱) سنیوں کے عقائد ومسلک پر عجمی اثرات (۵) حدیث کا مقام

مثلہ معہ کی بحث میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ مثلیت کا مفہوم صرف یہ ہے کہ عمل کے واجب ہونے میں اور شرعی تکلیف کے لازم ہونے میں، حکمِ قرآن اور حکمِ سنت، مساوی المرتبہ ہیں۔ لیکن منکرین حدیث کو، چونکہ یہ بات قابل قبول نہیں ہے، اس لیے وہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر، بعض علماء کی ایسی عبارات سے، عجب وحیرت کا پہلو پیدا کرتے ہیں جو بجائے خود صحیح اور درست ہیں، لیکن اپنے قلمکارانہ کرتب سے، ان عبارات کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ قارئین اس سے متوحش ہو کر بدک جائیں۔ چنانچہ مثلہ معہ پر بحث کے بعد، ''مفکر قرآن'' صاحب فرماتے ہیں:

> یہاں تک تو قرآن اور حدیث کو ہم پلہ قرار دیا جا رہا ہے، لیکن اب ذرا آگے بڑھیے۔ امام اوزاعی رحمہ اللہ کا قول ہے ''قرآن، اس سے زیادہ حدیثوں کا محتاج ہے، جس قدر حدیثیں قرآن کی محتاج ہیں''۔ اور ایک دوسرے امام یحییٰ بن کثیر فرماتے ہیں۔ ''حدیث، قرآن پر قاضی ہے، قرآن حدیث پر قاضی نہیں۔'' اتنا

---

① مقام حدیث، ص ۸۴۔

ہی نہیں، عقیدہ یہ بھی ہے کہ حدیث، قرآن کے حکم کو منسوخ کرسکتی ہے۔ علامہ حافظ محمد ایوب (مرحوم) اپنے کتابچہ "فتنہ انکارِ حدیث" میں لکھتے ہیں۔

> نبی ﷺ کے قول کے لئے ضروری نہیں کہ وہ قرآن کے مطابق ہو، تب حجت رہے، اور مطابق نہ ہو تو حجت نہ رہے.......... اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں ہے كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرَنِ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ (۲/۱۸۲) "تمہارے اوپر والدین کے لئے وصیت فرض ہے، اگر کسی نے مال چھوڑا ہے جب کہ اسے موت آئے۔" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ "وارث کے لئے وصیت نہیں ہے" اور تواتر سے ثابت ہے کہ عمل، اسی حدیث پر رہا ہے، یعنی وارث کے لئے وصیت ناجائز قرار دے دی گئی۔ حدیث نے قرآن کو منسوخ کردیا، اور قولِ رسول ﷺ، قرآن کی آیت کے خلاف، حجت اور موجب عمل رہا۔

یہ ہے، وہ مقام، جو قرآن کے مقابلہ میں احادیث کو عطا کیا گیا۔ ①

جی تو یہ چاہتا ہے کہ حافظ محمد ایوب مرحوم کی عبارت کے حوالے سے جو کچھ کہا گیا ہے، سب سے پہلے اسی پر گفتگو کی جائے۔ لیکن بعض مصالح کے پیشِ نظر، اقتباس میں قابلِ لحاظ نکات کی ترتیب کو ملحوظ رکھتے ہوئے، اس پر آخر میں ہی گفتگو کی جائے گی۔ اس بحث میں قدرے تفصیل و اطناب سے اس لئے کام لیا گیا ہے، کہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں حدیث و سنت کے متعلق جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، اس کا ازالہ کرنا بھی ہمارے پیشِ نظر ہے۔

(ا) حکمِ قرآن اور حکمِ سنت کی پیروی میں مساوات

یہ بات، اس سے قبل، واضح کی جاچکی ہے کہ حکمِ قرآن اور حکمِ سنت میں مساوات کا

---

① شاہکارِ رسالت، ص ۵۰۱۔

مفہوم، صرف اس قدر ہے کہ دونوں کے احکام کا اتباع لازمی اور ضروری ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس سنت کا اتباع، قرآن کے اتباع کی طرح ناگزیر ہے، وہ کون سی سنت ہے؟ وہ، دراصل، وہ سنت ہے جو مختلف زاویوں سے تحقیق و تفتیش اور تنقید و تنقیح کے مراحل میں سے گزر کر پایۂ ثبوت کو پہنچنے والے قولِ رسول، عملِ نبی اور تقریرِ پیغمبر پر مشتمل ہے۔ ایسی ثابت شدہ سنت یقیناً قرآن ہی کی طرح واجب العمل ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خود، قرآن میں، اگر ایک طرف یہ حکم دیتا ہے، کہ

﴿اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ﴾ (الاعراف : ۳)

”تمہارے رب کی طرف سے جو کچھ تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے، اس کی پیروی کرو، اور اس کے سوا دوسرے سرپرستوں کا اتباع مت کرو۔“

تو دوسری طرف، خود اللہ تعالیٰ ہی، اپنے نبی ﷺ کی اتباع و اطاعت پر بار بار زور دیتا ہے، مثلاً:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾

(آل عمران : ۳۱)

”(اے نبیؐ!) آپؐ کہہ دیجئے، اگر تمہیں (واقعی) اللہ سے محبت ہے، تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔“

﴿اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴾ (النور : ۵۶)

”رسول کی اطاعت کرو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔“

اب اللہ تعالیٰ، ایک طرف، اہل ایمان کو، سب کی پیروی سے دستکش ہو کر، صرف وحی کے اتباع کا حکم دیتا ہے، اور دوسری طرف، بتکرارِ بسیار، نبی ﷺ ہی کی پیروی کی تاکید کرتا ہے، تو اس کا، دو اور دو چار کی طرح، صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ نبی ﷺ کی اطاعت ہی مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کی اطاعت ہے، اور کتاب اللہ کا اتباع، اس کے بغیر ممکن نہیں کہ نبی ﷺ

کا اتباع کیا جائے۔ رسول ﷺ کی پیروی ہی وہ واحد طریقہ ہے جس کے ذریعہ، قرآن کی پیروی ممکن ہے، اگر رسول اللہ ﷺ کی حرکات و سکنات، اور آپ ﷺ کے اقوال و افعال، وحی کے سانچہ میں ڈھلے ہوئے نہ ہوتے، تو اللہ تعالیٰ، قطعاً آپ ﷺ کی اطاعت کا حکم نہ دیتا۔ چنانچہ آپ ﷺ کا اتباع ہی مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ کا اتباع ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے بار بار آپ ﷺ کی اتباع پر زور دیا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے، جس پر، پرویز صاحب کے، مندرجہ ذیل اقتباسات شاہد عدل ہیں۔

> (۱)...... حکم دیا گیا کہ رسول کی اطاعت کرو۔ مقصودِ آخری یا منتہیٰ اگرچہ اطاعتِ خدا ہی تھا، لیکن بجائے، اس کے کہ اس اطاعت کی شکل، ہر ایک کی اپنی مرضی یا زیادہ سے زیادہ فہم و ادراک پر چھوڑا جاتا، حکم دے دیا کہ اپنی رائے کو دخل نہ دو، بلکہ جس طرح سے یہ رسول کر کے دکھاتا ہے یا کرنے کا حکم دیتا ہے، اس کے مطابق کرتے جاؤ، یہی اطاعتِ خدا ہو جائے گی۔ ①

> (۲)...... اصل یہ ہے کہ رسول کا اتباع ہی قرآن کا اتباع ہے۔ ②

> (۳)...... لہٰذا (قرآن کے) ان احکام کی موجودگی میں، اب یہ کسی کی اپنی مرضی و منشا کے ماتحت نہ رہا، کہ جس طرح چاہے، قرآن کا اتباع کر لے، بلکہ قرآن کا اتباع ہو ہی اس شکل میں سکتا ہے جس شکل میں رسول نے کیا یا کرنے کا حکم دیا۔ ③

> (۴)...... جہاں، قرآن کریم میں اَطِیْعُوا اللّٰہَ آیا ہے، اس کے ساتھ ہی اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ بھی آیا ہے، کہیں ایک جگہ بھی اکیلا اَطِیْعُوا اللّٰہَ نہیں آیا، اور چونکہ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ میں اطاعت خداوندی خود بخود آ جاتی ہے، اس لئے خالی اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ قرآن میں بعض جگہ آیا ہے۔ مثلاً

---

① معارف، اپریل ١٩٣٥ء، ص ٢٨١۔

② معارف، اپریل ١٩٣٥ء، ص ٢٨٢۔

③ معارف، اپریل ١٩٣٥ء، ص ٢٨٢۔

﴿اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴾ (النور: ٥٦)

”رسول کی اطاعت کرو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔“

اور جہاں جہاں اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ آیا ہے، وہاں درحقیقت اَطِيْعُوا اللّٰهَ سے مراد، اطاعت رسول ہی ہے۔ ❶

یہ توضیحات، اس امر کو واضح کر دیتی ہیں کہ اطاعت رسول (اتباع سنت) ہی کے ذریعہ، قرآن اور خدائے واحد کا اتباع و انقیاد ممکن ہے۔

(الف) حدیث زیر تنقید یا بالائے تنقید؟

احادیثِ رسول ﷺ اور سننِ نبی ﷺ کے متعلق یہ شوشہ بھی چھوڑا جاتا ہے کہ اگر انہیں دینی حیثیت دی جائے، تو پھر ان کا تنقید سے بالا ٹھہرنا لازم ہے، جب کہ محدثین نے ان پر تنقیدیں کی ہیں، کسی حدیث کو صحیح اور کسی کو غلط قرار دیا ہے، لہٰذا ان کی حیثیت دینی نہیں بلکہ تاریخی ہے اور تاریخ دینی حیثیت کی حامل نہیں ہوتی۔ چنانچہ ”مفکر قرآن“ کے استاد اسلم جیراجپوری صاحب لکھتے ہیں۔

> حدیث، خبر ہے جس میں صدق و کذب دونوں کا احتمال ہوتا ہے، چنانچہ انہوں نے خود اس کی تنقید میں کوششیں کیں۔ اس سے بداہتہً ظاہر ہو جاتا ہے کہ حدیثیں علمی تحقیق کے تحت میں ہیں، اور ان کا درجہ دینی نہیں ہے، کیونکہ دینی امور یقینی اور تنقید سے بالاتر ہوتے ہیں۔ ❷

اب ”مفکر قرآن“ اور ان کے استاد، تو اپنے کثرتِ مطالعہ اور وفورِ علم کے پندار میں سطح زمین سے بطن ارض میں منتقل ہو چکے ہیں، لیکن ان کے اندھے مقلدین کو یہ بات کون سمجھائے کہ جو چیز علمی تنقید کے تحت ہے، وہ حدیث و سنت نہیں ہے، بلکہ وہ خبر، وہ اطلاع یا وہ روایت ہے، جس میں حدیث و سنت کو بیان کیا گیا ہے۔ جب وہ خبر، ہر پہلو سے تحقیق و تفتیش اور تنقید و

---

❶ معارف، اپریل ۱۹۳۵ء، ص ۲۸۳۔

❷ مقام حدیث، ص ۹۰۔

تنقیح کے مراحل میں سے گزر کر، پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے، اور اس کی صحت واضح ہو جاتی ہے، تب وہ تنقید سے بالاتر قرار پاتی ہے، اب اس پر عمل کرنا، لازم ہو جاتا ہے۔ وہ (روایت یا اطلاع) صرف اس وقت تک زیرِ تنقید رہتی ہے، جب تک اس کی صحت یا سقم کا پہلو واضح نہیں ہو جاتا۔ تحقیق و تفتیش کے دوران، آپ جس قدر چاہیں تنقید کریں، جرح کریں، چھان بین کریں، جانچ پڑتال کریں۔ صحتِ حدیث و سنت کی دریافت کا یہ معاملہ، اس پہلو سے پھر قرآن کے مساوی اور مماثل ہے۔ مثلاً ایک شخص، آپ کے سامنے آ کر، عربی زبان کا بہت خوبصورت اور فصیح و بلیغ جملہ بولتا ہے، اور یہ کہتا ہے کہ "یہ فرمان خداوندی ہے"۔ اُس کا یہ کہنا کہ "یہ فرمان خداوندی ہے" فقط ایک خبر یا محض ایک اطلاع ہے۔ اس اطلاع سے یہ لازم نہیں آتا کہ جس چیز کو وہ فرمودۂ خدا کے طور پر پیش کر رہا ہے، وہ واقعتاً "فرمانِ خداوندی" ہی ہو۔ آپ اپنے امکانی ذرائع سے کام لے کر، سب سے پہلے اس بات کی تحقیق اور تفتیش کریں گے کہ جسے وہ "اللہ کا فرمان" کہہ رہا ہے، وہ، فی الحقیقت، اللہ کا فرمان ہے یا نہیں۔ آپ اگر ان پڑھ اور ناخواندہ ہیں، تو کسی پڑھے لکھے آدمی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ پھر جب وہ یہ کہتا ہے کہ "ہاں، یہ واقعی، اللہ کا فرمان اور قرآن کی آیت ہے" تو پھر آپ پر لازم ہو جاتا ہے کہ آپ، اللہ کے فرمان کا صحیح مفہوم جان کر، اس پر عمل کریں۔ آپ خود بے علم اور ناخواندہ ہیں۔ کسی صاحب علم کا آپ کو یہ بتانا کہ جسے "فرمانِ خداوندی" کہا گیا ہے، وہ واقعی ایسا ہی ہے، پھر ایک خبر ہی ہے، جس سے یقینی نہیں بلکہ ظنی علم ہی حاصل ہوا ہے، اور جب اس تعلیم یافتہ شخص کی تصدیق کے بعد، آپ نے اس پر عمل کیا ہے، تو ظنی علم ہی پر عمل کیا ہے۔

پس جس طرح، آپ نے اپنے ذرائع سے کام لے کر، کسی کی اس خبر کو کہ "یہ خدا کا ارشاد ہے" صحیح سمجھا، اور پھر اس پر عمل کیا، اسی طرح، اس خبر (اطلاع یا روایت) کی تحقیق کرنا بھی لازم ہے جس میں حضور کی کسی قولی، فعلی یا تقریری سنت کو پیش کیا گیا ہے، اس کی صحت ظاہر ہونے کے بعد، اس پر عمل کرنا، اسی طرح ضروری ہے جس طرح منسوب الی اللہ فرمان کے "ارشادِ خداوندی" ثابت ہو جانے کے بعد، اس پر عمل کرنا لازم ہے۔

(ب) احادیث وسنن، محض تاریخ؟

منکرین حدیث، بعض اوقات، محض لفظی اشتراک سے ناروا فائدہ اٹھاتے ہوئے، اپنے باطل موقف کے اثبات پر تل جاتے ہیں۔ مولانا مودودی رحمہ اللہ نے ایک مقام پر یہ فرمایا تھا کہ

> آج ہمارے پاس رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرام کے عہد کی پوری تاریخ اپنے جزئیات کے ساتھ موجود ہے۔ ❶

اسی طرح سید مناظر احسن گیلانی کی کتاب "تدوین حدیث" میں سے دو ایک جملے ایسے ڈھونڈ نکالے گئے، جن میں احادیث کو تاریخ کہا گیا ہے، اور پھر منکرین حدیث کے اربابِ معارف اچھل پڑے، اور بڑے فاتحانہ انداز میں اس شور وغوغا سے آسمان سر پر اٹھا لیا کہ

> اس میں وضاحت سے درج ہے کہ خود امام بخاری، مولانا گیلانی اور مولانا مودودی رحمہ اللہ کے نزدیک، صحیح بخاری جیسی کتاب، رسول اللہ کے عہد مبارک کی تاریخ ہی ہے۔ ❷

حالانکہ مولانا مودودی رحمہ اللہ نے، یہ بھی لکھا تھا کہ

> کیا ان حضرات نے رسول ﷺ کی تاریخ کو سکندر اور نپولین کی تاریخ سمجھا ہے کہ اس کے صحیح ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہ پڑتا ہو؟ کیا وہ اتنا نہیں سمجھتے کہ یہ اس انسان کی تاریخ ہے جس کا اتباع فرض ہے، جس کی اطاعت پر نجات کا مدار ہے، جس کی سیرت، مسلمانوں کے لئے اسوۂ حسنہ ہے؟ اس ذاتِ پاک کی تاریخ دو حال سے خالی نہیں ہوسکتی، یا صحیح ہوگی یا غلط۔ اگر غلط ہے تو اس کو لینا کیا معنی، نذرِ آتش کر دیجئے۔ رسول پر بہتان اور آپ اس کو تاریخ کی حیثیت سے قبول کریں؟ اور اگر وہ صحیح ہے تو اس کا اتباع فرض ہے۔ مسلمان ہوتے ہوئے اس کی پیروی سے آپ بچ کہاں سکتے ہیں؟ ❸

---

❶ تفہیمات، ج۱، ص۳۳۷۔

❷ مقام حدیث، ص۱۵۷۔

❸ تفہیمات، ج۱، ص۳۳۹۔

دین اور تاریخ۔ جمع بین النقیضین؟

پھر منکرین حدیث، تاریخ اور دین کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ گویا دین تاریخ نہیں ہوسکتا اور تاریخ دین نہیں ہوسکتی، اور ایک ہی چیز میں تاریخی اور دینی حیثیتوں کا اجتماع، گویا اجتماع بین النقیضین ہے۔ حالانکہ یہ ضروری نہیں کہ ہر جگہ ان کا اجتماع، نقیضین ہی کا اجتماع ہو، اور نہ ہی یہ ضروری ہے کہ کسی بات کا تاریخ ہونا، اس کو مستلزم ہے کہ وہ دین نہ ہو۔ منکرین حدیث، اس الجھاؤ میں اس لئے پڑ گئے ہیں کہ وہ ہر تاریخ کو ظنی قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ قاعدہ کلیہ ہی غلط ہے، کہ وہ ظن پر ہی استوار ہوتی ہے، اور کبھی یقین پر قائم ہی نہیں ہوسکتی۔

آج ہمارے ہاتھوں میں جو قرآن ہے، اس کا من و عن، وہی قرآن ہونا، جو حضور اکرم ﷺ پر اُترا تھا، آخر تاریخ ہی تو ہے۔ قرآن میں انبیاء کرام کے جو احوال و قصص مذکور ہیں، آخر وہ تاریخ ہی تو ہیں، مزید برآں، وہ اعمال، جو تواتر سے ہم تک پہنچے ہیں، وہ بھی آخر تاریخ ہی تو ہیں۔ اب کیا یہ تاریخ ظن پر قائم ہوئی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ جس طرح ظن پر قائم ہوتی ہے، اسی طرح وہ یقین پر بھی استوار ہوتی ہے، لہٰذا، کسی چیز کا فی نفسہٖ تاریخ ہونا، کوئی ایسا جرم و گناہ نہیں ہے، جس کی پاداش میں اسے دین کی چار دیواری سے نکال باہر کیا جائے۔ الغرض، نہ تو کسی چیز کا تاریخ ہونا، اس کے دین ہونے کے منافی ہے، اور نہ ہی حدیث و سنت کا تاریخ ہونا، اس کی دینی حیثیت کی نفی کرتا ہے۔ منکرین حدیث، حدیث و سنت پر، ''تاریخ'' ہونے کا عیب صرف اس لئے لگاتے ہیں کہ اسے دینی حیثیت سے محروم کرتے ہوئے، اسوۂ رسول ﷺ کو، دین کی عملداری سے جلاوطن کرنا، ان کے پیش نظر ہے۔ تاکہ جب اس طرح صرف قرآن باقی رہ جائے، تو نرے قرآن کے اتباع کا ڈھنڈورا پیٹ کر، دراصل، اُس سے اپنا اتباع کرایا جائے۔

(ج) راویوں پر ایمان کا شوشہ

تشکیک و ترییب کی مہم چلانے میں، منکرین حدیث کا دنیا میں کوئی مدمقابل نہیں ہوسکتا۔ یہ لوگ ایسے ایسے شوشے چھوڑتے ہیں کہ الاماں والحفیظ۔ ان کے اٹھاتے ہوئے، خلاف

احادیث شوشوں میں سے ایک شوشہ، یہ بھی ہے کہ راویٔ حدیث کی روایت کو ماننا، اس پر ایمان لانے کے مترادف ہے، چنانچہ ''مفکر قرآن'' صاحب اپنے اِسی باطل تصور کو بنیاد بنا کر، یہ تحریر فرماتے ہیں۔

> خدا نے تو آپ کو (مسلمان ہونے کے لئے) رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر ایمان لانے کے لئے کہا تھا، لیکن اب صورت یہ ہے کہ جب تک آپ ان انسانوں (راویوں) پر ایمان نہیں لائیں گے، آپ مسلمان نہیں کہلا سکیں گے۔ ①

اور پھر اسی بات کو، حلقۂ طلوع اسلام سے وابستہ، ایک مولوی صاحب نے (جو فاضل درس نظامی بھی اپنے نام کے ساتھ لکھتے ہیں) بایں الفاظ دُہرایا ہے۔

> قرآن کریم پر ہمارا ایمان ہے، اور اس پر ایمان لانے کا ہم کو حکم دیا گیا ہے...... لیکن اس کے برعکس، نہ حدیث پر ہمارا ایمان ہے، نہ اس پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے، نہ حدیث کے رواۃ پر ہمارا ایمان ہے، نہ ان پر ایمان لانے کا ہم کو حکم دیا گیا ہے، نہ حدیث کی سند میں جو رجال ہیں، ان پر ہمارا ایمان ہے، نہ ان پر ایمان لانے کا ہم کو حکم دیا گیا ہے۔ ②

سبحان اللہ! کیا مرتبہ ہے اِن لوگوں کا، اور کیا اونچی شان ہے اِن حضرات کی۔ گویا قرآن، براہ راست، اللہ میاں کے ہاتھوں سے اِن کو ملا ہے، ورنہ اگر سینکڑوں، ہزاروں اور کروڑوں افراد کے تواتر سے، اِن حضرات تک قرآن پہنچا ہے، تو اِن کروڑوں راویوں کے توسط سے، اِن تک قرآن پہنچنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کروڑوں راویوں پر ان کا ایمان ہو جائے، اور ان سب پر ایمان لانے کا اِنہیں حکم دیا گیا ہو۔ اور جب ایسا نہیں ہے، تو یقیناً اللہ تعالیٰ نے بلاواسطہ، ان کی آغوشِ مبارک میں قرآن ٹپکا دیا ہے، اور پھر آج سے آپ ہرگز کسی خبر دینے والے کی خبر، اور کسی شاہد کی شہادت کی طرف کان بھی نہ دھریئے گا، ورنہ اس کا مطلب

---

① مقام حدیث، ص ۲۶۔

② طلوع اسلام، مئی ۲۰۰۵ء، ص ۲۵ تا ص ۲۶۔

یہ ہوگا کہ آپ اُس خبر رساں اور اُس شاہد پر ایمان لا رہے ہیں، جس کا اللہ نے آپ کو حکم نہیں دیا ہے، اور یہ جو ہمیشہ سے دنیا بھر کی عدالتوں میں شاہدوں کے بیانات اور ان کی شہادتیں سنی اور قبول کی جاتی رہی ہیں، منکرین حدیث جیسے نکتہ سنج حضرات کے نزدیک، سارے قضاۃ کرام، اور جج صاحبان، ان شاہدوں پر ایمان ہی لایا کرتے ہیں، حالانکہ ایسی ''غیر یقینی اور غیر ایمانی چیزوں'' پر ایمان لانے کا انہیں حکم ہی نہیں دیا گیا۔ مزید آگے بڑھیے اور دیکھیے کہ حضور اکرم ﷺ اور خلفاءِ راشدین نے کسی مخبر کی خبر پر، اگر اعتبار و اعتماد کیا تھا، یا کسی گواہ کی گواہی کو قبول کیا تھا، تو پرویزی حضرات کی اس عجیب منطق کی رو سے رسول اللہ بھی اور خلفائے راشدین بھی مخبر و شاہد پر ایمان لانے والے ٹھہرتے ہیں، جب کہ اللہ نے ان پر قطعاً ایمان لانے کا حکم نہیں دیا۔ اور یہ جو ۲۹ دسمبر ۱۹۵۵ء کو کسی نے ٹیلیفون پر ''مفکر قرآن'' کو یہ اطلاع دی کہ اسلم جیراجپوری فوت ہو گئے ہیں، اور پرویز صاحب نے اس اطلاع کو قبول کیا، اور بعد میں طلوع اسلام کا ایک پورا شمارہ ''اسلم جیراجپوری نمبر'' کے طور پر شائع کیا، تو اس خبر کو قبول کرنا، اطلاع دہندہ پر ایمان لانا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ منکرین حدیث نے، ساری دنیا کو جاہل اور احمق سمجھ لیا ہے، یا یہ ان کے مبلغِ علم کا کرشمہ ہے، جو ایسے مضحکہ خیز ''نوادرات'' ان کے قلم سے صادر ہو رہے ہیں۔

ایسی بات، جیسی منکرینِ حدیث پیش کر رہے ہیں، اگر کسی کے لیے کہنا سزاوار ہوتا تو یقیناً وہ صحابہ کرام ہی ہو سکتے تھے، کیونکہ وہی قرآن کے اولین مخاطب تھے، لیکن انہوں نے یہ بات صرف اور صرف اس لیے نہیں کہی کہ آپ ﷺ کو نبی ﷺ اور رسول ﷺ تسلیم کر لینے کے بعد، وہ زبانِ رسول سے برآمد ہونے والے ہر لفظ کو کلمۂ حق سمجھتے تھے اور یہ اعتقاد کہ آپ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلنے والی ہر بات، امر حق اور مرضاتِ الٰہی کے مطابق ہے، قرآن کریم اور فرمانِ رسول ہی کا پیدا کردہ ہے۔ رہا آپ ﷺ کا فرمان، تو آپ ﷺ نے خود اپنے ایک صحابی، حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کو (جو کچھ لوگوں کی طرف سے غلط فہمی کی بناء پر، فرمودات رسول ﷺ کو لکھنا چھوڑ بیٹھے تھے) یہ فرمایا تھا کہ اُكْتُبْ فَوَالَّذِي

نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَا يَخْرُجُ مِنْهُ إِلَّا حَقٌّ "تم لکھتے رہو، اس ذات کی قسم! جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اس (منہ) سے حق کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ رہا قرآن، تو وہ یہ اعلان کرتا ہے کہ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى. "یہ رسول، اپنی نفسانی خواہشات کے تابع ہو کر نہیں بولتا، بلکہ وہ تو سراسر وحی ہے جو اس پر کی جاتی ہے۔" اس آیت کی تفسیر میں سید ابو الاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ نے جو کچھ قلمبند فرمایا ہے، وہ فی الواقع بیمار کی شفایابی اور پیاسے کی سیرابی کا نہایت مؤثر ذریعہ ہے، اور منکرین حدیث کے شکوک وشبہات کا بہترین ازالہ ہے۔

(د) قرآن یقینی، مگر روایات ظنی کا پراپیگنڈا

حدیث وسنت کے خلاف اثارۂ شکوک وشبہات کی مہم چلاتے ہوئے، منکرین حدیث، اس امر پر بھی بڑا زور دیا کرتے ہیں کہ قرآن، سارے کا سارا یقینی ہے، اس کی جملہ آیات بھی یقینی وحتمی ہیں، جب کہ روایاتِ حدیث بالکل ظنی اور غیر یقینی ہیں لہٰذا وہ دینی حیثیت کی حامل نہیں ہو سکتیں۔

قرآنی آیات کے یقینی اور حدیث وسنت کی روایات کے غیر یقینی ہونے کے معاملہ میں، اصل اور بنیادی چیز، جو غور طلب (بلکہ منکرین حدیث سے دریافت طلب) ہے، وہ یہ ہے کہ..........صرف الفاظِ قرآن ہی یقینی اور حتمی ہیں؟ یا ان الفاظ کا معنی ومفہوم بھی؟..........

اگر منکرین حدیث، الفاظ قرآن ہی کے حتمی اور یقینی ہونے کے قائل ہیں، تو یہ امر تمام مسلمانوں میں (بلکہ غیر مسلموں میں بھی) متفق علیہ ہے، اس میں کسی کو بھی اختلاف نہیں ہے، لیکن اگر وہ، الفاظِ قرآن کے معنی ومفہوم کو بھی یقینی اور حتمی سمجھتے ہیں، تو ان کا یہ نظریہ، وہم و گمان سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ کوئی بڑے سے بڑا منکر حدیث، حتیٰ کہ خود پرویز صاحب بھی، اس کے مدعی نہیں ہو سکتے۔ اگر متن قرآن کا مفہوم ومدلول بھی حتمی اور یقینی ہوتا تو تفسیر قرآن میں قطعاً کبھی اختلاف نہ ہوتا۔ منکرینِ حدیث کے جملہ گروہوں میں، خواہ وہ ماضی کے احزاب ہوں یا دورِ حاضر کے ٹولے ہوں، یہ اختلافات موجود رہے ہیں، اس کے باوجود کہ ہر ٹولہ، تمسک بالقرآن ہی کو رافع اختلاف قرار دیتا رہا ہے، حتیٰ کہ عبادات وعقائد

تک میں ---- اور فروعی نہیں بلکہ اصولی امور تک میں ---- یہ افتراقات و تنازعات، اب تک برقرار ہیں۔ اور ان ہی کی بنیاد پر، خود پرویز صاحب، منکرین حدیث کے دوسرے گروہوں کو، گمراہ، دشمنِ دین اور مخزی القرآن قرار دیتے رہے ہیں۔ پھر یہ تفسیری اختلافات، مسلکِ انکارِ حدیث کے علمبردار، مختلف دھڑوں ہی میں نہیں پائے جاتے، بلکہ ان کے کسی ایک ہی گروہ میں بھی وقتاً فوقتاً موجود رہے ہیں، اور ''مفکرِ قرآن'' کا تو خیر سے پورا لٹریچر ہی ماشاء اللہ، ان ہی اختلافات کی بنیاد پر، تضادات و تناقضات سے اٹا پڑا ہے جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ ہی حتمی اور یقینی ہیں، مگر ان کا معنی و مفہوم ہرگز ہرگز حتمی اور یقینی نہیں ہے۔ پرویز صاحب خود ایک مقام پر یہ لکھتے ہیں۔

> قرآن تو وحیٔ الٰہی ہے جس میں غلطی کا کوئی امکان نہیں، لیکن میں اپنی قرآنی بصیرت کو کبھی وحیٔ الٰہی قرار نہیں دیتا اس لیے کہ اس میں سہو اور خطا دونوں کا امکان ہوتا ہے۔ بنابریں، میں اس پر اصرار نہیں کرتا کہ جو کچھ میں نے سمجھا ہے وہ اس باب میں حرفِ آخر ہے اور وحیٔ الٰہی کی طرح منزہ عن الخطا۔ ①

اب جب کہ پرویز صاحب کے نزدیک بھی، انسانی تعبیرِ قرآن، سہو و خطا کا امکان رکھتی ہے، اور وہ تفسیر و تعبیر، وحیٔ الٰہی کی طرح منزہ عن الخطا نہیں ہے، تو پھر اس کے ظنی اور غیر یقینی ہونے میں کیا شک رہ جاتا ہے؟

الغرض، قرآن کے الفاظ تو بلاشبہ قطعی، حتمی اور یقینی ہیں، لیکن ان کا مفہوم و مراد، ہرگز ایسا نہیں ہے، بلکہ وہ ظنی اور غیر یقینی ہے، اور عملی حیثیت سے اگر دیکھا جائے، تو اتباعِ قرآن اور پیرویٔ کتاب اللہ کے لیے، ہم الفاظِ قرآن سے کہیں زیادہ، مفہومِ قرآن ہی کے محتاج ہیں جو بہر حال ظنی ہی ہے۔ لہٰذا، یہاں عملاً دین میں حجت اور سند (قرآنی آیات کے مفہوم کی صورت میں) وہ چیز بن رہی ہے جو غیر یقینی اور ظنی ہی ہے۔ جب عمل کی دنیا میں، واقعی صورتِ حال یہ ہے تو پھر حدیث و سنت نے کیا قصور کیا ہے کہ وہ (بقول منکرین حدیث کے)

---

① نظام ربوبیت، ص ۲۳۔

ظنی اور غیر یقینی ہونے کی بناء پر، حجت اور سند ہونے سے محروم ہو جائے؟ کیا منکرینِ حدیث یہ کہنا چاہتے ہیں کہ روایاتِ رسول ﷺ اور احادیثِ نبی ﷺ، تو ظنی ہونے کی بناء پر، مردود و مسترد ہیں، لیکن پرویز صاحب کی قرآنی تعبیرات، ظنی ہونے کے باوجود، مقبول و محمود ہیں؟

(ر) اختلافِ سنت کا پراپیگنڈہ

منکرین حدیث، سنت کو ساقط الاعتبار قرار دینے کے لیے یہ شور وغل، اور غوغا آرائی بھی کیا کرتے ہیں کہ

> ان حضرات (علماء) کے نزدیک، قدرِ مشترک صرف لفظ ''سنت'' ہے، اس کا مفہوم ہر ایک کے نزدیک الگ الگ ہے۔ ❶

اسے خوب نمک مرچ لگا کر، پراپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ ---''سنت کی تعریف و تعبیر میں، علماء کرام کے درمیان شدید اختلافات ہیں، ہر فرقہ کی سنت الگ الگ ہے، اور پھر اس کی تعبیر بھی جدا جدا ہے۔ ایک فرقہ سنت کی جو تعبیر پیش کرتا ہے، دوسرا اسے تسلیم نہیں کرتا۔ لیکن اس کے برعکس، قرآن کے متن میں کوئی اختلاف نہیں ہے، ہر مخالف و موافق کے نزدیک، وہی متن قرآن متفق علیہ ہے جو مابین الدفتین موجود ہے، وغیرہ وغیرہ---''

لیکن اگر قرآن، کوئی جنتر منتر کی چیز نہیں ہے، اور وہ کوئی ایسی کتاب بھی نہیں جس کا متفق علیہ مفہوم، تعویذ بنا کر پلائی جانے والی چیز ہو، بلکہ عمل کرنے کے لیے ایک دستور العمل ہے تو پھر منکرین حدیث کے اس مکروہ پراپیگنڈا میں کیا وزن رہ جاتا ہے جب کہ متنِ قرآن کے متفق علیہ ہونے کے باوجود، اس کے مفہوم میں اختلافات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ پھر جب عمل کی طرف آمادہ ہوں گے تو یہ عمل، اُسی معنی و مفہوم اور مراد و مدلول پر قائم ہوگا جو قرآنی متن سے کسی نے اخذ کیا ہوگا۔ غلام احمد پرویز کا عمل، اس معنی و مفہوم پر ایستادہ ہوگا، جو اُن کی اُس عقل عیار نے قرآن سے نچوڑا ہوگا، جسے وہ اپنی ''قرآنی بصیرت'' کہا کرتے تھے۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے عمل کی بنیاد، اس مدلول و مراد پر ہوگی جو اس نے متنِ قرآن سے کشید کیا

---

❶ طلوع اسلام، جولائی ۱۹۶۳ء، ص ۶۰۔

ہوگا۔ ان دونوں میں سے ہر ایک کے لیے حجت وسند، وہی معنی و مفہوم ہوگا جو اس کے نزدیک ماخوذ من القرآن ہوگا۔ ہر کوئی ایک دوسرے کی حجت وسند کا منکر ہوگا۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ ہر ایک کا قرآن سے اخذ کردہ مفہوم، اور اس پر تعمیر ہونے والی دلیل و حجت، خود اسی کے لیے سند ہوگی، اور ہر کوئی دوسرے کے مراد و مفہوم، اور اس کی دلیل و برہان کا منکر ہوگا۔ مزید برآں، ہر ایک کا قرآن سے نچوڑا ہوا مفہوم و مدلول، ظنی اور غیر یقینی ہی ہوگا، اور جو سند و حجت ہوگی وہ بھی ظنی ہی ہوگی، تو پھر سنت کے خلاف یہ واویلا اور یہ غوغا آرائی کیسی؟ لہٰذا، اب اگر سنت کے معاملہ میں مبینہ اختلاف فی نفسہٖ، حدیث و سنت کو قابل رد بنا دینے پر، محکم دلیل بن سکتا ہے اور سرے سے سنت ہی کا کوئی مقام باقی نہیں رہنے دیتا، تو پھر عملی دنیا میں ''قرآنی بصائر و معارف'' کے درمیان متضاد اختلافات کا وجود بھی، قرآن کو ناقابل سند و حجت بنا دینے کے لیے ایک محکم دلیل بن سکتا ہے، اور عمل کے باب میں، ''قرآنی معارف و حقائق'' کا آپس میں تصادم، قرآن کے لیے بھی دینی مقام باقی نہیں رہنے دے گا۔

یہاں منکرین حدیث کی ذہنیت کا یہ پہلو بھی لائق دید اور قابل داد ہے کہ وہ سنت کی بابت، اختلافاتِ علماء کا تو خوب ڈھنڈورا پیٹتے ہیں، لیکن خود ان کی صفوں میں (مختلف گروہوں کے درمیان) قرآن کی تعبیر و تفسیر میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں، ان کا نہ صرف یہ کہ ذکر نہیں کرتے، بلکہ اس عدمِ ذکر کے ساتھ ساتھ، الٹا یہ اعلان بھی کرتے ہیں کہ قرآن ہی رافعِ اختلاف اور مزیل تنازعات ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا واقعی قرآن، ان سب کے درمیان اختلافات ختم کر چکا ہے؟ اور یہ مختلف گروہ، کسی ایک تعبیرِ قرآن پر متحد و متفق ہو چکے ہیں؟ باقی جگہوں کو تو چھوڑیئے، کیا لاہور ہی میں، واقعی، طلوع اسلام اور بلاغ القرآن والے ٹولے، براساسِ قرآن، شیر و شکر ہو چکے ہیں؟

(س) منکرین حدیث کا ایک شبہ اور اس کا ازالہ

''مفکر قرآن'' خود بھی اس غلط فہمی کا شکار تھے، اور دوسروں کو بھی اس غلط فہمی میں مبتلا کیا کرتے تھے، کہ عربی کے کسی بھی جملہ سے پہلے دو چار راویوں کا نام لے کر، اگر قال قال

رسول اللہ کہہ دیا جائے تو وہ "حدیث رسول ﷺ" بن جاتی ہے۔ چنانچہ وہ اپنی اسی غلط فہمی (جو یا تو بربنائے جہالت تھی یا بوجہ شرارت تھی) کی بناء پر لکھتے ہیں:

> جس کے جی میں آیا، ایک عربی کا فقرہ گھڑا، اس سے پہلے حدثنا زید عن عمر عن بکر قال قال رسول اللہ کے الفاظ بڑھائے۔ لیجئے! یہ عربی کا فقرہ مذہب کی سند (یعنی حدیث رسول اللہ) بن گیا۔ ❶

ایک اور مقام پر، اسی غلط فہمی کا شکار ہوکر، وہ فرماتے ہیں کہ یہ عین ممکن ہے کہ کسی عیار، چالاک اور جعل ساز نے، حدیث گھڑتے وقت، بڑی احتیاط سے، قابل اعتماد راویوں کی سند، اپنے فقرے کے ساتھ جڑ کر، حدیث بنا ڈالی ہو۔ چنانچہ وہ، اس امکان کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ایسی حدیثیں بھی تو ہو سکتی ہیں، جن میں راویوں کا نام لکھنے میں احتیاط سے کام لیا گیا ہو، اور وہ تنقید رجال کی میزان میں بالکل ثقہ ثابت ہو سکتے ہوں۔ لہٰذا اس قسم کی حدیثیں فن رجال کے مطابق قوی قرار پائیں گی۔ لیکن اس کے باوجود، ان کی بنیادوں پر قائم کردہ کوئی ایسا عقیدہ صحیح قرار نہیں پا سکے گا جو غیر قرآنی ہو، لہٰذا، اصل بحث مڑ پھر کر وہیں آ جاتی ہے کہ دین کا معیار کیا ہے؟ ہمارے نزدیک دین کا معیار، فقط کتاب اللہ ہے۔ ❷

قبل اس کے کہ "مفکر قرآن" اور دیگر منکرین حدیث کی مذکورہ بالا غلط فہمی کا بھرپور جائزہ لیا جائے، منکرین حدیث میں سے اگر کوئی "رجلِ رشید" ہے، تو ہم اس سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں، کہ آخر کسی جعل ساز کو اپنے خود ساختہ فقرے کے ساتھ، قابل اعتماد رواۃ کی سند لگانے کی ضرورت ہی کیوں پیش آئی؟ وہ ایک جعلی حدیث بنانے پر مجبور ہی کیوں ہوا؟ جھوٹی حدیثیں، آخر گھڑی ہی کیوں گئیں؟ منکرین حدیث نے نہ کبھی اس سوال پر غور کیا، اور نہ کبھی

---

❶ طلوع اسلام، فروری ۱۹۵۲ء، ص ۳۰۔

❷ طلوع اسلام، نومبر ۱۹۵۳ء، ص ۳۷۔

اس کا سامنا کیا، حالانکہ بات بالکل صاف اور واضح ہے کہ

> ان (احادیث) کے گھڑے جانے کی وجہ یہی تو تھی کہ حضور ﷺ کا قول وفعل، حجت تھا، اور آپ ﷺ کی طرف ایک غلط بات منسوب کر کے جھوٹے لوگ کوئی نہ کوئی فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ اگر وہ حجت نہ ہوتا، اور کسی شخص کے لئے اپنے دعوے کے حق میں، حدیث لانا اور نہ لانا یکساں بے فائدہ ہوتا تو کسی کو کیا پڑی تھی کہ ایک غلط بات تصنیف کرنے کی تکلیف اٹھاتا۔ دنیا میں ایک جعل ساز، وہی نوٹ تو بناتا ہے جو بازار میں قدر و قیمت رکھتا ہے۔ جس کی کوئی قیمت نہ ہو، اسے آخر کون احمق جعلی بنائے گا؟ ❶

الغرض، وضعِ حدیث، خود اس بات کی زبردست دلیل ہے کہ وہ حجت اور سند کا مقام رکھتی ہے، اور اسے تاریخی ہی نہیں بلکہ دینی حیثیت بھی حاصل ہے۔

ازالۂ اشکال

اب رہی وہ غلط فہمی، جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے، تو فی الواقع، وہ، علومِ حدیث سے قطعی بے خبری اور نری ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ یہ شبہ اور یہ اعتراض پیش کرنے والے، اپنی جہالت کی بناء پر، یہ گمان کئے بیٹھے ہیں کہ حدیث کی جانچ پڑتال کا بس یہی ایک طریقہ ہے کہ راویوں کی ثقاہت کا پتہ لگا لیا جائے، حالانکہ یہ ان متعدد طریقوں میں سے، جن سے ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ بالکل ناآشنا ہے، صرف ایک طریقہ ہے، اور اسی وجہ سے انہیں ایسے شبہات لاحق ہوتے ہیں۔ مولانا مسعود احمد، بی ایس سی (کراچی) اس سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں:

> عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حدیث کو پرکھنے کا بس ایک ہی طریقہ ہے، یعنی فن اسماء الرجال کے ذریعہ، حدیث کی سند میں جو راوی آئے ہیں، ان کی جانچ پڑتال۔ پس اگر راوی جانچ پڑتال سے ثقہ ثابت ہو جائیں تو حدیث صحیح ہو جائے گی۔ حالانکہ یہ ان کی لاعلمی ہے۔ حدیث کو پرکھنے کے فنون کی تعداد تقریباً سو

---

❶ سنت کی آئینی حیثیت، ص ۳۴۷ تا ص ۳۴۸۔

ہے، اور ہر فن کی ایک مستقل حیثیت ہے، اور ہر فن پر مستقل تحریری مواد ہمارے پاس موجود ہے۔ جب ان تمام معیاروں سے کوئی حدیث بے داغ ثابت ہو جائے، تو اس کو صحیح کہا جاتا ہے۔ جن لوگوں کو یہ مغالطہ ہوا کہ بس سند ہی ایک ذریعہ ہے۔ وہ اس دھوکہ میں پڑ گئے کہ کسی شخص نے کوئی حدیث گھڑ دی، اور دو چار ثقہ آدمیوں کے نام، بطور سند کے اس گھڑے ہوئے متن کے ساتھ لگا دیئے لہٰذا حدیث صحیح ہو گئی۔ ان کو یہ معلوم نہیں کہ اس طرح سند لگا دینے سے حدیث صحیح نہیں ہو گی۔ قطع نظر دوسرے فنون کے، وہ فن اسماء الرجال کے معیار پر ہی پوری نہیں اترے گی۔ مثلاً ایک شخص سلمی، کوئی حدیث گھڑ لیتا ہے اور سند یہ لگا دیتا ہے کہ مجھ سے امام مالک رحمہ اللہ نے بیان کیا، اُن سے امام نافع نے، اُن سے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا...... یہ سند اگرچہ اصح الاسانید ہے، اور سلسلۃ الذہب (سونے کی زنجیر) ہے، لیکن حدیث کی صحت کے لئے کافی نہیں۔ اس لئے جب سلمی، اس حدیث کو، اس سند سے بیان کرے گا تو سُننے والا اپنی سند میں سلمی کا نام ضرور لے گا، اور سلمی کی وجہ سے، اس حدیث کی تصحیح میں تامل ہو گا۔ سلمی سے اوپر کی سند بے شک بہت اعلیٰ اور معتبر ہے، لیکن پوری سند میں یہ بات نہیں، لہٰذا، حدیث پایۂ اعتبار سے گر جائے گی، اور محض اوپر کی سند، اس کی صحت کے لئے کافی نہ ہو گی۔ اب حدیث کی صحت کے لئے سلمی کا حال معلوم کرنا ہو گا۔ اگر حالات نہ مل سکے تو وہ مجہول ہو گا اور اس کی روایت کا اعتبار نہیں ہو گا۔ اور اگر حالات مل گئے، تو یا تو وہ صادق ہو گا یا کاذب۔ اگر کاذب ہوا تو اس کی حدیث کا انکار کر دیا جائے گا، اور وہ حدیث جھوٹی ہو گی، اور تمام محدثین نے اگر دھوکہ کھا کر اس کو صادق کہہ دیا (اگرچہ یہ ناممکن ہے، اور ایسا کبھی ہوا بھی نہیں کہ کسی واضعِ حدیث کو تمام محدثین نے صادق کہا ہو، لیکن پھر بھی اگر بالفرض محال ایسا ہو جائے) تو پھر دوسرے عیوب کی تلاش ہو گی مثلاً حافظہ کی خرابی، وہم،

مبالغہ آمیزی، متن اور تشریحی الفاظ کا خلط ملط کرنا، تدلیس وغیرہ وغیرہ۔ اگر ان میں سے ایک بھی عیب پایا گیا تو حدیث کا اعتبار نہیں ہوگا۔ اب اگر ان تمام حربوں سے وہ بچ گیا، اور تمام محدثین نے غلطی سے بالاتفاق، اس کو ہر لحاظ سے ثقہ کہہ دیا (اگرچہ یہ ناممکن ہے، اور نہ کبھی ایسا ہوا ہے کہ کسی وہمی، بدحافظہ کو، محدثین نے ثقہ کہا ہو) تو پھر یہ دیکھا جائے گا کہ جو کچھ وہ کہتا ہے کیا امام مالک کے دوسرے شاگرد بھی اسے بیان کرتے ہیں یا نہیں۔ اگر بیان کرتے ہیں تب تو خیر وہ حدیث دوسری سند سے ثابت ہوجائے گی، اور اگر دوسرے شاگرد بیان نہیں کرتے بلکہ سلمی کے خلاف روایت کرتے ہیں تو سلمی کی روایت کردہ حدیث شاذ ہوگی اور صحت کے درجہ سے گر جائے گی، اور اگر سلمی کی بیان کردہ حدیث کا مضمون بالکل نیا ہوگا تو پھر وہ ہر حالت میں غریب ہوگی، اور یہ بھی ایک قسم کا نقص ہی ہے۔ بہرحال، سلمی کی بیان کردہ حدیث ہرگز صحت کے درجہ تک نہ پہنچے گی، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ابتدائی منازل ہی میں وہ ضعیف ثابت ہوجائے گی۔ مزید برآں، سلمی جیسے جھوٹے آدمی کے لئے یہ کتنا مشکل ہوگا کہ وہ اپنی پوری زندگی، تقویٰ وطہارت اور خلوص کے ساتھ گزارے، اور اگر یہ مشکل کام اس نے انجام دے بھی لیا، تو بھی محدثین کی گرفت سے بچنا، اس کے لئے بہت مشکل ہوگا، اس لئے کہ محدثین کی گرفت سے وہ لوگ بھی نہ بچ سکے جو صالح تھے لیکن نیک نیتی سے حدیث میں تحریف کردیا کرتے تھے۔ یہ لوگ، باوجود اپنے زہد و اتقاء کے، محدثین کو دھوکہ نہ دے سکے، غرض یہ کہ محدثین نے جس حدیث کو صحیح کہا وہ حقیقت میں ایسی ہی ہے، اس لئے کہ شبہ اور شکوک کے تمام منازل کو اس نے عبور کرکے ہی مقام صحت کو پایا ہے۔ جو لوگ اب بھی صحیح حدیث کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں وہ فن حدیث سے ناآشنا ہیں، اور ان تفاصیل کا انہیں علم نہیں ہے، اگر ان فنون کو عام کردیا جائے تو ان شاء اللہ تمام شکوک دور ہوجائیں گے، اور محدثین

> کے کارناموں کی یہ لوگ بھی اسی طرح داد دیں گے جس طرح بعض غیر مسلم یورپین محققین نے دی ہے۔ ❶

مولانا مسعود احمد صاحب نے بڑے اختصار سے کام لے کر، منکرین حدیث کی زیر بحث غلط فہمی کا ازالہ فرمایا ہے، میں خود اس پر تفصیلی بحث، اپنی کسی مستقل تصنیف میں کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں، تاہم میں محسوس کرتا ہوں کہ سلیم الفطرت شخص کے ازالۂ شبہ کے لیے یہ مختصر بحث بھی اطمینان بخش ہے۔ اس کے علاوہ، قارئین کرام سے درخواست ہے کہ منکرین حدیث کے پیدا کردہ شکوک وشبہات کے ازالہ کے لیے، یوں تو وہ تمام مضامین ہی لائق مطالعہ ہیں جو مولانا مودودی رحمہ اللہ نے تفہیمات، جلد اول میں درج کیے، لیکن ''حدیث اور قرآن'' کے زیر عنوان مضمون کا مطالعہ ضرور فرمائیں۔ اس مقالہ کا آخری پیراگراف، نذر قارئین ہے۔

> ہم نے کبھی اس خیال کی تائید نہیں کی کہ ہر شخص کو ائمۂ حدیث کی اندھی تقلید کرنی چاہئے یا ان کو غلطی سے مبرا سمجھنا چاہیے۔ نہ کبھی ہم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ہر کتاب میں جو روایت قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہ سے شروع ہو، اس کو آنکھیں بند کرکے رسول اللہ ﷺ کی حدیث مان لیا جائے۔ برعکس اس کے ہمارے نزدیک کسی حدیث کو حدیث رسول قرار دینے کی ذمہ داری، ایک گراں بار ذمہ داری ہے جس کو اٹھانے کی جرأت کافی تحقیق کے بغیر ہرگز نہ کرنی چاہیے۔ اور تحقیق واجتہاد کے متعلق بھی ہمارا مذہب یہ ہے کہ اس کا دروازہ ہر زمانہ میں کھلا ہوا ہے، اور کسی خاص عہد کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ جن لوگوں نے فن حدیث کی تحقیق اور اس کے باقاعدہ مطالعہ اور تحقیقات میں پورا ایک مہینہ بھی صرف نہیں کیا ہے، وہ اُن بزرگوں کے کارناموں پر تنقید کریں جنھوں نے پوری پوری عمریں، اس فن کی خدمت میں بسر کی ہیں۔ صرف ایک فن حدیث ہی پر موقوف نہیں ہے، دنیا کا کوئی علم وفن بھی آپ کو ایسا نہیں ملے گا جس

---

❶ تفہیم اسلام، ص ۳۰۸ تا ۳۱۰۔

> میں مبتدیوں اور اناڑیوں کو ریسرچ اور ماہرانہ اظہار رائے اور مجتہدانہ کلام کا حق دیا جاتا ہو۔ یہ حق انسان کو صرف اس وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ فن اور اس کے مبادی پر پوری طرح حاوی ہو چکا ہو، اور جتنا ذخیرۂ معلومات، اس فن کے متعلق موجود ہے وہ سب اس کی نظر میں ہو۔ باقی رہا وہ شخص، جو ابھی اس مرتبہ پر نہیں پہنچا ہے تو اس کے لیے سلامتی اسی میں ہے کہ وہ ائمۂ فن کی تحقیقات اور ان کی آراء کا اتباع کرے۔ تمام دنیوی علوم کی طرح، مذہبی علوم میں بھی یہی طریقہ بہتر اور صحیح تر ہے۔ اس کو چھوڑ کر جو لوگ، اجتہاد بلا علم کا علم بلند کرتے ہیں، وہ دنیا اور دین دونوں میں رسوائی کا سامان کرتے ہیں۔ ①

امر واقعہ یہ ہے کہ عام منکرین حدیث تو رہے ایک طرف، خود پرویز صاحب کا حال یہ تھا کہ وہ علم حدیث کی ابتدائی اصطلاحات کے مفاہیم تک سے ناآشنا تھے، اور اس پر مستزاد یہ کہ وہ دروغ گو، بددیانت اور دھوکہ باز بھی تھے، اور محض اپنے اکاذیب و اباطیل کی حمایت و پاسداری کے لیے، وہ اپنے مخالفین کی عبارات کو سیاق وسباق سے الگ کر کے پیش کرنے کے عادی تھے، لیکن تنقید کے پردہ میں تنقیص ہی نہیں، بلکہ دریدہ دہنی اپنایا کرتے تھے، ان پاکباز، متدین اور بلند پایہ کردار کے حامل محدثین کے خلاف، جن کا اہل ایمان پر اتنا بڑا احسان ہے کہ وہ قیامت تک اس بار سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ رَحِمَهُمُ اللّٰهُ وَنَوَّرَ اللّٰهُ قُبُوْرَهُمْ۔

مولانا الطاف حسین حالی رحمہ اللہ نے خدمات محدثین کو سراہتے ہوئے یوں خراج عقیدت پیش فرمایا ہے:

گروہ اک جو یا تھا علم نبیؐ کا — لگایا پتا جس نے ہر مفتری کا
نہ چھوڑا کوئی رخنہ کذبِ خفی کا — کیا قافیہ تنگ ہر مدعی کا!
کیے جرح و تعدیل کے وضع قانوں
نہ چلنے دیا کوئی باطل کا افسوں

---

① تفہیمات، جلد اول، ص ۳۴۸ تا ۳۴۹۔

اسی دُھن میں آساں کیا ہر سفر کو   اسی شوق میں طے کیا بحر و بر کو
سنا خازنِ علمِ دیں جس بشر کو   لیا اس سے جا کر خبر اور اثر کو
پھر آپ اس کو پرکھا کسوٹی پر رکھ کر
دیا اور کو، خود مزا اس کا چکھ کر
کیا فاش راوی میں جو عیب پایا   مناقب کو چھانا، مثالب کو تایا
مشائخ میں جو قبح نکلا، جتایا!   ائمہ میں جو داغ دیکھا بتایا
طلسم ورع ہر مقدس کا توڑا
نہ ملا کو چھوڑا، نہ صوفی کو چھوڑا! ❶

(۲)......اب رہے وہ اقوالِ علماء، جنہیں امام اوزاعی اور یحیٰی بن کثیر کے حوالہ سے پیش کیا گیا ہے، تو وہ بجائے خود، درست، صحیح اور مطابق قرآن ہیں، کیوں کہ خود اللہ تعالیٰ نے، یہ کہہ کر، قرآن کو نبی ﷺ کی وضاحت کا محتاج بنا دیا ہے کہ

﴿اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ﴾

"(اے نبیؐ!) ہم نے تیری طرف یہ ذکر اس لیے نازل کیا کہ آپؐ اس کی وضاحت کر دیں۔"

اس آیت کے متعلق پرویز صاحب نے کبھی یہ بھی لکھا تھا:

> اس آیت میں ایک فردِ واحد (اِلَیْكَ) کی طرف، تنزیلِ قرآن کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ (لِ۔ تاکہ) کہ جو پیغام، اللہ نے لوگوں کی طرف بھیجا ہے، اس کی تبیین کر دے۔ ❷

تبیینِ رسول کی مثالیں

نبی اکرم ﷺ کی تبیین، کوئی اس طرح کی توضیح و تشریح نہیں تھی، جس طرح بیضاوی

---

❶ مسدس حالی۔ ص ۲۸ تا ص ۲۹۔

❷ معارف، اپریل ۱۹۳۵ء، ص ۲۷۷۔

زمخشری اور رازی وغیرہ نے تفسیریں لکھ کر کی، بلکہ یہ قرآن کے مدعا و مقصود کو افراد و اجتماع کی زندگی میں جاری و ساری کرنے کے لیے، وہ ہدایات و احکام ہیں، جن کا فہم و ادراک، غیر نبی کو ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کی صرف چند مثالیں حاضر ہیں، تفصیل کے طالب حضرات سے درخواست ہے کہ وہ مولانا مودودی رحمہ اللہ کی کتاب ''سنت کی آئینی حیثیت'' کا مطالعہ فرمائیں۔

(الف)...... قرآن میں اقامتِ صلوٰۃ کا حکم بار بار دیا گیا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے بڑی تفصیل سے بیان فرمایا کہ اس کا مفہوم کیا ہے؟ نہ صرف بیان فرمایا بلکہ اپنے عمل کے قالب میں ڈھال کر پیش بھی فرمایا۔ اس کے آداب و شروط کیا ہیں۔ اسے انفرادی طور پر ادا کرنا ہے یا اجتماعی طور پر۔ اسے گھر میں ادا کرنا ہے، یا کسی خاص مقام پر۔ روزانہ کرنا ہے یا کبھی کبھی خاص ایام میں۔ روزانہ کرنا اگر مقصود ہے، تو کتنی بار کرنا ہے۔ اس کے ارکان کیا ہیں۔ اس کی رکعات کتنی ہیں۔ ہر رکعت میں کیا پڑھنا ہے۔ اس عمل کے دوران کیا کچھ کرنا، جائز اور کیا کچھ کرنا جائز نہیں ہے۔ اس کا آغاز اور اختتام کیسے کرنا ہے۔

(ب)...... نماز کے بعد، جس دوسرے عمل پر بہت زور دیا گیا ہے وہ ایتاءِ زکوٰۃ ہے، جس کی قرآن میں زبردست تاکید کی گئی ہے۔ حضور ﷺ نے بڑی شرح و بسط سے نہ صرف قولاً یہ فرمایا کہ اس کا مفہوم کیا ہے، بلکہ معاشرہ میں عملاً اسے جاری و ساری فرما کر بھی اس کی وضاحت کی۔ آپ ﷺ نے اس کا طریقہ کار وضع فرمایا، اس کا نصاب پیش کیا، ہر نوع کے مال میں، اس کی شرح بیان فرمائی۔ اس امر کو واضح کیا کہ نماز کی طرح کا یہ کوئی روزمرہ کا عمل ہے، یا کسی خاص مدت میں انجام پانے والا عمل ہے۔

اسی طرح، آپ ﷺ نے پورے قرآن کی تبیین فرمائی۔ لیکن ہمارے ''مفکر قرآن'' صاحب، چاہتے یہ تھے کہ تبیین قرآن کا جو کام، حضور اکرم ﷺ نے، مامور من اللہ ہونے کی حیثیت میں کیا تھا (اور جس کی پیروی، اہل اسلام پر لازم کی گئی ہے)، وہی کام، وہ خود، کریں، بغیر اس کے کہ اللہ نے انہیں مامور کیا ہو۔ وہ یہ تمنا رکھتے تھے کہ لوگوں کو، محمد رسول اللہ کی پیروی سے ہٹا کر، اپنی پیروی پر قائم کیا جائے۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے یہی کام، نبوتِ زائفہ کی آڑ

میں کیا، اور غلام احمد پرویز نے اسی کام کو قرآن کی آڑ میں انجام دیا۔ لوگوں کو حضور اکرم ﷺ کی اطاعت و پیروی سے منحرف کر کے، اپنی فرماں برداری پر لانے کے لئے، جان توڑ کوشش کی کہ احادیث رسول ﷺ اور سننِ پیغمبر ﷺ کو بھی، اور علماءِ سلف و خلف کی تشریحات کو بھی، ناقابل اعتبار قرار دیا جائے، کہ یہ چیزیں (بقول اُن کے) فہمِ قرآن میں حائل ہوتی ہیں، اور ان کی جگہ، مغربی معاشرت اور اشتراکی معیشت کے زیر اثر، جو قرآنی توضیحات، وہ خود پیش کیا کرتے تھے، انہیں وہ فہم قرآن کا واحد ذریعہ قرار دیا کرتے تھے۔ چنانچہ وہ اعلان فرمایا کرتے تھے کہ

> قرآن سمجھ میں نہیں آ سکتا......
>
> ......ترجموں سے، کیونکہ قرآنی الفاظِ کے مرادفات، دنیا کی کسی زبان میں نہیں مل سکتے۔
>
> ......تفسیروں سے، کیونکہ تفاسیر میں عام طور پر، مفسروں کے اپنے خیالات اور معتقدات، قرآنی مطالب پر غالب آ جاتے ہیں۔ ①

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر آخر ”قرآن، کس سے سمجھا جائے؟ جواب واضح ہے کہ صرف پرویز صاحب سے، کیونکہ وہی اس امر کے مدعی ہیں کہ انہوں نے ”اپنے خیالات و معتقدات کو قرآنی مطالب پر غالب نہیں ہونے دیا“۔ اور وہی، بھری دنیا میں قابل اعتماد ہیں۔ وہی قرآن میں اتھارٹی ہیں۔ انہوں نے ہی (مغربی معاشرت کے عادات و اطوار کے ساتھ، اشتراکیت کی پیوندکاری کرتے ہوئے) قرآن اور اسلام کی ”صحیح تصویر“ پیش کی ہے۔ اُن ہی کا یہ دعویٰ ہے کہ ”خالص قرآن“ کی تعلیم، سوائے طلوع اسلام کے اور کہیں سے نہیں مل سکتی، اور جسے بھی ”نور ہدایت“ ملا ہے، یہیں سے ملا ہے۔

> (ا)...... میں نے قرآنی تعلیم کو اپنے کسی خیال یا رجحان کے تابع رکھنے کی جسارت کبھی نہیں کی۔ ②

---

① طلوع اسلام، جنوری ۱۹۷۱ء، اندرونِ آخری ٹائٹیل۔

② طلوع اسلام، اگست ۱۹۶۱ء، ص ۴۷۔

(۲)...... اس نوجوان کا نام، جو اُس وقت حکومت ہند کے ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھا، اور آج قرآن کریم کے حقائق کے سلسلہ میں، اتھارٹی تسلیم کیا جاتا ہے، غلام احمد پرویز تھا۔ ①

(۳)...... مجھے اس احساس اور یقین سے بڑا سکون اور اطمینان نصیب ہوگیا کہ اس بے اعتماد دنیا میں، کم از کم، ایک انسان تو ایسا ہے جس پر میں پورا پورا اعتماد کرسکتی ہوں۔ یہ قابل اعتماد انسان ہے پرویز۔ ②

(۴)...... محترم پرویز صاحب کو، اللہ تعالیٰ نے جو قرآنی بصیرت عطا فرمائی ہے، ان کی اس بصیرت نے قرآن کریم اور اسلام کی صحیح تصویر ہمارے سامنے پیش کردی ہے۔ ③

(۵)...... آج پاکستان ہی نہیں بلکہ تمام دنیا میں، صرف یہی ایک گوشہ ہے جہاں سے شمع قرآنی کی کرنیں، بغیر کسی قسم کی رنگ آمیزی کے، اصلی اور حقیقی شکل میں فضا میں پھیل رہی ہیں۔ ④

یہ ہے غلام احمد پرویز، کا غلام احمد قادیانی کے ساتھ، تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ کے رشتہ میں منسلک ہوکر، ہم نوائی ہم آہنگی کا پہلو کہ ؎

آؤ لوگو! یہیں نورِ خدا پاؤ گے

پھر ایک ''نورِ خدا'' پانے والے نے لکھا کہ

''میں مذہب سے دور ہوچکا تھا، لیکن اب مجھے اطمینان ہے۔ مجھے یقین ہے۔ مجھے تسکین ہے کہ وہ خدا، جو ذہنوں کے پردے میں تھا، آپ کی کتابوں کے مطالعہ سے اب ظاہر ہوچکا ہے۔ اب میں اِس خدا کو دل میں محسوس کرتا ہوں۔ ⑤

یہ ہے پرویز صاحب کا دامِ ہمرنگِ زمین، جس میں وہ لوگ جو عربی زبان سے، اور دینی

---

① طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۷۰ء، ص۷۳۔

② طلوع اسلام، ستمبر ۱۹۶۵ء، ص۵۲۔

③ طلوع اسلام، ستمبر ۱۹۶۵ء، ص۳۹۔

④ طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۵۶ء، ص۵۱۔

⑤ طلوع اسلام، مارچ ۱۹۶۵ء، ص۱۹۔

تعلیمات سے بے خبر ہیں، آن پھنستے ہیں، اور اپنے آپ کو یہ "سکون اور اطمینان" دے دیتے ہیں کہ وہ اسلام کو چھوڑ کر بھی مسلمان بنے ہوئے ہیں، اور "قرآن کی سند" بھی ان کے ہاتھ ہی میں رہی ہے۔

امام اوزاعی اور یحییٰ بن کثیر

اب رہیں وہ عبارتیں، جو امام اوزاعی اور یحییٰ بن کثیر کے حوالہ سے پہلے مذکور ہو چکی ہیں، تو ان کے صحیح ہونے میں کیا شک رہ جاتا ہے، جب کہ قرآنی احکام، اس تفصیلی تشریح کے محتاج ہیں جو حضور اکرم نے فرمائی، جیسا کہ "اقامتِ صلوٰۃ" اور "ایتاءِ زکوٰۃ" کی مذکورہ بالا دو مثالوں سے واضح ہے۔

"مفکرِ قرآن" نے، امام اوزاعی اور یحییٰ بن کثیر کی صحیح اور مطابق قرآن عبارات کو "عجمی سازش" کے خود ساختہ پس منظر میں رکھ کر، اس سے غلط تاثر پیدا کرنے کی یہ کوشش صرف اس لئے کی ہے کہ قرآن پر سنت رسول تو قاضی نہ رہے، لیکن پرویز صاحب کے صحرائے دماغ میں اٹھنے والے ہر عقیدہ ونظریہ کی لہر، قرآن پر چھائی رہے، اور ان کی اپنی تعبیرات، قرآن پر قاضی بن کر رہیں۔

قرآن تعبیراتِ پرویز کا محتاج

پرویز صاحب کے نزدیک، یہ ایک نہایت معیوب امر، بلکہ گھناؤنا جرم تھا (اور ہے) کہ علماء کرام کا عقیدہ اور طرز عمل یہ رہا ہے کہ وہ:

> حدیثوں کے ذریعہ، قرآن کے عام کو خاص اور خاص کو عام، مقید کو مطلق اور مطلق کو مقید، بلکہ اس پر اضافے کرنے لگے.......... اور اس طرح قرآن کے استقلال کو مٹا کر، اس کو حدیثوں کے ماتحت کر دیا۔ ①

"مفکرِ قرآن" کو علماء کرام سے یہ اختلاف نہیں تھا کہ انہوں نے قرآن کو "ماتحت کر دیا"۔ وہ اس بناء پر اُن سے خفا تھے کہ انہوں نے، قرآن کو "حدیثوں کے ماتحت کر دیا" جب کہ

---

① مقام حدیث، حصہ اول، ص ۱۷۳ بحوالہ فتنۂ انکار حدیث کا منظر و پس منظر، ج ۳، ص ۱۰۷۔

”مفکر قرآن“ یہ چاہتے تھے کہ قرآن، حدیثوں کی بجائے، اُن کی تعبیرات ہی کے ماتحت رہے۔ چنانچہ، تعمیم الخاص اور تخصیص العام یا اطلاق المقید اور تقیید المطلق کا جو اختیار، وہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نہیں دینا چاہتے تھے، اسے وہ، اپنی ذات کے لئے نہ صرف یہ کہ مخصوص رکھتے تھے، بلکہ اس اختیار کو بروئے عمل بھی لایا کرتے تھے۔ چند ایک مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔

(۱)...... قرآن کریم نے چور کے لئے، ایک ہی سزا (The Only Punishment) قطع ید، مقرر کی ہے، لیکن ”مفکر قرآن“ اپنے ”صوابدیدی اختیارات“ کو استعمال کرتے ہوئے، حنیف رامے سے گفتگو کے دوران یہ فرماتے ہیں کہ یہ انتہائی سزا (The Maximum Punishment) ہے، اور نہ صرف جرمِ سرقہ کی سزا، بلکہ تمام جرائم کی مذکور فی القرآن، عقوبات، انتہائی سزائیں ہیں۔

> آپ نے صحیح سمجھا ہے کہ قرآن کریم نے جرائم کی جو سزائیں مقرر کی ہیں وہ انتہائی ہیں۔ ①

(۲)...... پھر اسی سزا کے بارے میں وہ دوسری بات یہ کہتے ہیں کہ یہ، عام چور کی نہیں۔ بلکہ عادی مجرم کی سزا ہے۔

> قطع ید کی سزا، عادی مجرموں کے لئے ہے۔ ②

یہ تو قرآن کریم کے عام (یا مطلق) حکم کو خاص (یا مقید) کرنے کی دو مثالیں تھیں۔ اب ایک مثال، خاص (یا مقید) حکم کو، عام (یا مطلق) کر ڈالنے کی بھی ملاحظہ فرمایئے۔ قرآن میں یہ حکم ہے کہ مطلقہ خواتین، اپنے بچوں کی مدتِ رضاعت کی تکمیل کے لئے دو سال دودھ پلائیں، لیکن ”مفکر قرآن“ صاحب، اس حکم کو، طلاق شدہ خواتین تک محدود رکھنے کی بجائے، بیوہ عورتوں تک وسیع کر ڈالتے ہیں۔ اور لکھتے ہیں کہ

> رضاعت کی استثناء وہاں ہے جہاں کہا گیا ہے کہ مطلقہ (یا بیوہ) عورت، اپنی آغوش

---

① طلوع اسلام، جنوری ۱۹۶۶ء، ص ۲۴۔

② طلوع اسلام، مارچ ۱۹۷۹ء، ص ۶۔

کے شیر خوار بچے کو، دودھ پلائے۔ ❶

اس سے یہ واضح ہے کہ ''مفکر قرآن'' کو اصل تکلیف، یہ نہیں تھی کہ ''قرآن کو ماتحت'' بنا دیا گیا ہے۔ بلکہ یہ تھی کہ اُسے ''حدیثوں کے ماتحت'' بنا دیا گیا ہے، چنانچہ وہ یہ چاہتے تھے، کہ قرآن، ''حدیثوں کی بجائے'' خود ان کی اپنی نت نئی بدلتی ہوئی تعبیروں کے تابع رہے، اور قرآن، احادیث کا محتاج ہونے کی بجائے، اُن کی اپنی تشریحی آراء کا محتاج بنا رہے، نیز یہ کہ قرآن پر، سنن رسول ﷺ، قاضی نہ ہوں، بلکہ گرگٹ کی طرح، رنگ بدلنے والی، ان کی اپنی توضیحات ہی قاضی بنی رہیں۔

پھر ان نبوی توضیحات کی حیثیت بھی یہ نہیں تھی کہ وہ قرآن کریم کے کسی حکم کو رد کر کے، کوئی نیا حکم یا عمل لازم کرتی تھیں، بلکہ وہ قرآن کے عمل کی تفصیل پیش کرتی تھیں۔ اس صورتِ حال کو ''مفکر قرآن'' کا اپنی سوءِ تعبیر کے ذریعے، اپنی من گھڑت ''عجمی سازش'' کے سلسلہ کی ایک کڑی قرار دینا، قطعی غلط اور بے جا بات ہے۔

حافظ محمد ایوب کا اقتباس

اب رہا حافظ محمد ایوب صاحب کا وہ اقتباس، جسے اگر تحریف کے ساتھ پیش نہیں کیا گیا ہے اور جس سے نسخ القرآن بالحدیث کا تصور، اخذ کیا گیا ہے، تو یہ خود ان کی طرف سے حقیقت کی غلط تعبیر ہے۔ ان کی پیش کردہ دلیل سے نسخ قرآن کا ثبوت نہیں ملتا، بلکہ تخصیص القرآن بالحدیث کا ثبوت ملتا ہے۔ ایسی ہی غلط تعبیرات، معترضین کو، اعتراض کا موقع فراہم کرتی ہیں۔ اب صرف یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حدیث و سنت، قرآن کے کسی مطلق حکم کو مقید یا اس کے برعکس، اور قرآن کے کسی عام حکم کو مخصوص یا اس کے برعکس کر سکتی ہے، ''مفکر قرآن'' صاحب، چونکہ پرلے درجے کے تضاد گو تھے، اس لیے کبھی وہ اس سوال کا جواب نفی میں دیا کرتے تھے، اور جو علماء، حدیث و سنت کے ذریعے، قرآنی حکم کی تعمیم و تخصیص یا اطلاق و تقیید کے قائل تھے، ان کے عمل کو وہ معیوب قرار دیا کرتے تھے، جیسا کہ پہلے گزر

---

❶ طلوع اسلام، جون ۱۹۸۴ء، ص ۶۳۔

چکا ہے، اور کبھی وہ، اس سوال کا جواب، اثبات میں دیا کرتے تھے، جیسا کہ مندرجہ ذیل اقتباس سے ظاہر ہے:

> دین میں حدیث کی بڑی قیمت ہے، اور اس کا مرتبہ قرآن کے بعد ہے۔ قرآن کی بہت سی آیتیں مجمل، مطلق یا عام ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد یا آپ کا عمل، اس کی توضیح کرتا، مطلق کو مقید کرتا، یا عام کو مخصوص کر دیتا ہے، مثلاً قرآن کریم نے نماز کی تفاصیل بیان نہیں کیں۔ نماز کا مجملاً حکم دیا گیا ہے۔ نبی ﷺ کے فعل نے اس کے اوقات اور کیفیات کو واضح کر دیا ہے۔ قرآن نے خمر (شراب) کو حرام قرار دیا ہے۔ (آیت مع ترجمہ مرقوم ہے...... قاسمی)۔ لیکن خمر سے کیا مراد ہے؟ اور اس کی کتنی مقدار حرام ہے؟ وغیرہ، یہ تمام باتیں، حدیث نے بیان کی ہیں۔ ①

اس سے واضح ہے کہ حدیث وسنت، قرآن کے کسی عام، مطلق یا مجمل حکم کی تخصیص، تقیید یا تفصیل پیش کر سکتی ہے، اور یہ اختیار، مامور من اللہ، کی حیثیت سے، خود خدائے قدوس نے، وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم، (اور اس جیسی دوسری آیات) کے الفاظ میں دیا ہے۔

یہاں یہ بات بھی ملحوظِ ذہن رہنی چاہیے کہ بعض فقہاء کے ہاں، دورِ ماضی میں، نسخ الکتاب بالسنۃ سے مراد، تخصیص الکتاب بالسنۃ تھا۔ بعد میں، پھر مؤخر الذکر اصطلاح استعمال ہونے لگ گئی، اور یہ ظاہر ہے کہ اس مفہوم کے لیے یہی اصطلاح درست اور موزوں ہے۔ حافظ محمد ایوب صاحب نے ممکن ہے کہ علمائے سلف کے اتباع ہی میں، نسخ القرآن بالحدیث، کی اصطلاح استعمال کی ہو۔

دورِ حاضر کے ایک عالم کی وضاحت

ڈاکٹر عبدالودود (یکے از منکرین حدیث) نے مولانا مودودی رحمہ اللہ کے ساتھ، قلمی مباحثے

---

① طلوع اسلام، فروری ۱۹۵۹ء، ص ۵۰۔

کے دوران، جب یہ کہا کہ...... ''سنت، قرآن کے کسی حکم کو منسوخ نہیں کر سکتی''...... تو مولانا مودودی رحمہ اللہ نے جواباً یہ تحریر فرمایا تھا کہ

> یہ بات، آپ نے ایک غلط فہمی کے تحت لکھی ہے جسے صاف کرنا ضروری ہے۔ فقہاءِ حنفیہ جس چیز کو ''نسخ الکتاب بالسنۃ'' کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں، اس سے مراد، دراصل، قرآن کے کسی حکم کو مخصوص (Qualify) کرنا، اور اس کے ایسے مدعا کو بیان (Explain) کرنا ہے، جو اس کے الفاظ سے ظاہر نہ ہوتا ہو۔ مثلاً سورۃ البقرہ میں والدین اور اقربین کے لئے وصیت کا حکم دیا گیا ہے۔ (آیت: ۱۸۰) پھر سورہ نساء میں تقسیم میراث کے احکام نازل ہوئے، اور فرمایا کہ یہ حصے متوفیٰ کی وصیت پوری کرنے کے بعد نکالے جائیں (آیت ۱۱، ۱۲)۔ نبی ﷺ نے اس کی وضاحت یہ فرمادی کہ لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ یعنی اب وصیت کے ذریعہ سے کسی وارث کے حصہ میں کمی بیشی نہیں کی جا سکتی، کیونکہ قرآن میں، اللہ تعالیٰ نے وارثوں کے حصے، خود مقرر فرما دیئے ہیں۔ ان حصوں میں اگر کوئی شخص وصیت کے ذریعہ کمی بیشی کرے گا تو قرآن کی خلاف ورزی کرے گا۔ اس طرح، اس سنت نے وصیت کی عام اجازت کو، جو بظاہر، قرآن کی ان آیتوں سے مترشح ہوتی تھی، غیر وارث مستحقین کے لئے خاص کر دیا، اور یہ بتا دیا کہ شرعاً جو حصے، وارثوں کے لئے مقرر کر دیئے گئے ہیں، ان میں کمی بیشی کرنے کے لئے، وصیت کی اس عام اجازت سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ ①

اس بحث سے، یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ''نسخ الکتاب بالسنۃ'' کی اصطلاح، جس مفہوم کے لئے علماءِ سلف نے استعمال کی تھی، وہ، دراصل، سنت کے ذریعہ کسی عام حکمِ کتاب کو مخصوص کرنا تھا۔ یا اس کے کسی ایسے مدعا کو بیان کرنا تھا جو اس کے الفاظ سے ظاہر نہ ہوتا ہو، اس مقصد کے پیشِ نظر، مناسب اصطلاح، تخصیص القرآن بالسنۃ ہی ہے۔ اور سنت کے ذریعہ

---

① سنت کی آئینی حیثیت، ص ۵۶۔

ایسا کرنا، بالاتفاق درست اور جائز ہے جیسا کہ طلوع اسلام، فروری ۱۹۵۹ء، ص ۵۰ کی عبارت سے واضح ہے۔ لیکن محسوس یہ ہوتا ہے کہ بعد میں، وابستگان طلوع اسلام نے، اپنے اس موقف کو بدل ڈالا، چنانچہ خود پرویز صاحب نے امام اوزاعی اور یحییٰ بن کثیر کی صحیح عبارات کو، اور خود ڈاکٹر عبدالودود نے، مودودی رحمہ اللہ سے قلمی بحث کے دوران، اس معاملہ کو جس انداز میں پیش کیا ہے، اس سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ (یا ان کی سنت) کا یہ اختیار نہیں مانتے، کیونکہ بعد میں ''مفکر قرآن'' صاحب، اس طرح کی باتیں بھی کرنے لگ گئے کہ

> کسی مقید قانون کو مطلق قرار دینے سے قانون کی حیثیت ہی کچھ نہیں رہتی۔ ①

لیکن اطلاق وتقیید، تعمیم وتخصیص، اور اجمال وتفصیلِ قرآن کا جو اختیار، اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو (یا اس کی سنت کو) دیا ہے، اُسے ہمارے ''مفکر قرآن'' صاحب، اُمتی ہوتے ہوئے، اور غیر مامور من اللہ ہوتے ہوئے، خود استعمال کرتے رہے ہیں۔ اگرچہ اس کی دو تین مثالیں اوپر گزر چکی ہیں، لیکن پھر مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ چند اور مثالیں، قارئین کرام کی خدمت میں پیش کی جائیں۔

(۱)...... اللہ تعالیٰ نے سورۃ المائدہ میں یہ فرمایا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ﴾

(المائدہ: ۱۰۱)

> ''اے ایمان والو! ایسی چیزوں کے بارے میں سوال نہ کیا کرو، جنہیں اگر تم پر ظاہر کر دیا جائے، تو تمہیں ناگوار خاطر گزریں۔''

اس آیت میں اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ کے علاوہ، اور کوئی شرط یا قید عائد نہیں کی گئی ہے، اور اس کے علاوہ عام سوال کرنے کی اجازت دی گئی ہے، لیکن ''مفکر قرآن'' صاحب، اپنی طرف سے یہ شرط اور قید بڑھا دیتے ہیں کہ ''جزئیات کے متعلق سوالات نہ پوچھے

---

① طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۸۳ء، ص ۳۱ + مارچ ۱۹۸۴ء، ص ۵۹۔

جائیں۔" چنانچہ وہ مفہومِ آیت کو، اپنے ایک خودساختہ پس منظر، (یا من گھڑت شانِ نزول) میں رکھ کر، بایں الفاظ واضح کرتے ہیں۔

> جس وقت قرآن نازل ہو رہا تھا۔ بعض لوگوں نے چاہا کہ قرآنی اصولوں کی جزئی تفاصیل بھی قرآن میں بیان کر دی جائیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسے سوالات سے سختی سے روک دیا، اور کہا یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا...... ❶

قرآنی حکم کو، اپنی خودساختہ قید سے مقید کرنے کی یہ واضح مثال ہے۔ اور اس سے قبل یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ جرم سرقہ کی عقوبت میں "مفکر قرآن" نے، از خود، دو قیود کا اضافہ کیا ہے۔

(۲)...... قرآن کے مطلق حکم کو، اپنی خودساختہ قید سے مقید کرنے کی اس مثال کے بعد، ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیے، جس میں "مفکر قرآن" نے، قرآن کے ایک محدود و مقید حکم کو وسیع اور مطلق حکم بنا ڈالا ہے۔

قرآن کریم نے، مسجد حرام (خانہ کعبہ) کو، جس کی تعمیر، اولاً، حضرت آدم علیہ السلام، اور ثانیاً، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں ہوئی تھی، جائے امن قرار دیا ہے، اور اس کا مامن ہونا، اُس دعاءِ ابراہیم علیہ السلام کا نتیجہ ہے جو قرآن میں دو مقامات پر مذکور ہے۔ لیکن ہمارے "مفکر قرآن" صاحب، مسجد حرام کی اس فضیلت کو، ہر مسجد تک وسیع اور متعدی کر دیتے ہیں، حالانکہ قرآن کریم نے صرف یہ کہا ہے۔

﴿اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝ فِیْهِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِیْمَ ۚ وَ مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا...... ۝﴾

(آل عمران: ۹۶، ۹۷)

"بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ، جو انسانوں کے لیے تعمیر ہوئی، وہ وہی ہے جو مکہ میں واقع ہے۔ اس کو خیر و برکت دی گئی تھی، اور تمام جہان والوں کے لئے مرکز ہدایت بنایا گیا تھا۔ اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں۔ ابراہیم کا مقامِ عبادت ہے، اور اس کا حال یہ ہے کہ جو اس میں داخل ہوا، مامون ہو گیا---"

---

❶ طلوع اسلام، مئی جون، ۱۹۶۰ء، ص ۷۲۔

ظاہر ہے کہ دَخَلَہٗ میں ہٗ کی ضمیر اس گھر کی طرف راجع ہے جو (۱) مکہ میں ہے (۲) بابرکت ہے (۳) تمام جہانوں کے لئے مرکز ہدایت ہے، (۴) جس میں مقام ابراہیم ہے (۵) دیگر شعائر و نشانات الٰہیہ ہیں (٦) جس کا حج کرنا، لوگوں پر فرض کیا گیا ہے۔ لیکن ہمارے ''مفکر قرآن'' صاحب، اپنے خودساختہ تشریعی اختیارات کی بنیاد پر، اسے ہر مسجد کے لئے وسیع کر ڈالتے ہیں، اور لکھتے ہیں

> اب ذرا اس مقام کی طرف آیئے، جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا (۳/۹٦) جو اس میں داخل ہوگیا، اسے امن مل گیا۔'' ❶

اس پر حاشیہ میں یہ لکھا گیا ہے:

> اگرچہ قرآن میں یہ آیت، مسجد حرام کے ضمن میں آئی ہے، لیکن اس کا اطلاق ہر مسجد پر ہوسکتا ہے۔ ❶

لیکن اس کی دلیل؟...... کیا خدا نے ایسا فرمایا ہے؟...... کیا یہ حکمِ رسول ﷺ ہے؟ نہیں، بلکہ یہ حکمِ پرویز ہے، فلہٰذا!

؎ مستند ہے ان کا فرمایا ہوا

''مفکر قرآن'' کا اس قوم پر کس قدر احسان ہے کہ اپنا گھر بار اور کاروبار چھوڑ کر، عزیز و اقارب اور احباء و اصحاب کی جدائی برداشت کرکے، اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی کو خرچ کرتے ہوئے، راہ سفر کی صعوبتوں اور دقتوں کو برداشت کرنے کی، جو پابندیاں، فریضۂ حج و اعتمار کے سلسلہ میں، قرآن نے عائد کی تھیں، ان سب ''اغلال و اصر'' سے ''مفکر قرآن'' نے نجات دلا دی، اب حج و عمرہ، اور طواف بیت اللہ کے جو اعمال، وہاں انجام دیئے جاتے ہیں، انہیں یہاں کی کسی بھی مسجد میں انجام دیا جاسکتا ہے۔ جس اسلام کو، مُلّا نے بہت مشکل اور کٹھن بنا دیا تھا، اسے ''مفکر قرآن'' نے آسان بنا کر، دین اسلام میں کس قدر نرمی پیدا کر ڈالی ہے۔ فطوبی

---

❶ طلوع اسلام، ستمبر ۱۹٦۲ء، ص ۴۔

لکم وللمعتمرین والحجاج۔

الغرض، ''مفکرِ قرآن'' صاحب، نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے، تو، اجمال وتفصیل، اطلاق وتقیید اور تعمیم وتخصیص کے اختیارات کو تسلیم نہیں کرتے، حالانکہ آپ ﷺ، مامور من اللہ اور مہبط قرآن تھے، لیکن وہ خود، اپنے لئے ایسے اختیارات، نہ صرف مانتے ہیں، بلکہ انہیں استعمال بھی کرتے ہیں، تاکہ لوگوں کو محمد رسول اللہ کی اطاعت سے پھیر کر، قرآن کا نام لیتے ہوئے، اپنی نت نئی بدلتی ہوئی تعبیرات کا تابع بنایا جائے، اور لوگوں کا آنحضرت ﷺ سے جو اتباع و اطاعت کا تعلق ہے، اسے کاٹ پھینکا جائے، اور وہ بھی قرآن کا نام لیتے ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مسلک کے علمبرداروں نے، زبانِ قال سے تو نہیں، لیکن زبانِ حال سے کلمہ طیبہ کا مفہوم کیا معنی، بلکہ اس کے الفاظ تک کو بدل ڈالا ہے۔ اب ان کے کلمہ کا دوسرا جز، محمد رسول اللہ نہیں، بلکہ والقرآن کتاب اللہ ہے۔ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ.

(۴۲) زمانۂ تدوین احادیث

گزشتہ مبحث میں، پرویز صاحب کے جس اقتباس کا جائزہ لیا گیا ہے، اس کا آخری جملہ یہ تھا...... ''یہ ہے وہ مقام، جو قرآن کے مقابلہ میں، احادیث کو دیا گیا ہے''...... اگر وہ ''قرآن کے مقابلہ میں'' کی بجائے ''قرآن کے ساتھ'' کے الفاظ استعمال کرتے، تو یہ الفاظ، موقفِ علماء کی بہتر نمایندگی کرتے، لیکن ''مفکرِ قرآن'' کو، خود احادیث سے، پھر علماء محدثین سے جو عناد ہے، وہ انہیں مناسب الفاظ، استعمال نہیں کرنے دیتا۔ بہرحال، اس کے بعد، اور متصل بعد، وہ لکھتے ہیں۔

> سوال یہ ہے کہ یہ عقائد کب وضع ہوئے اور احادیث کب وجود میں آئیں۔ ہم باب چہارم (حسبنا کتاب اللہ) میں یہ تفصیل بتا چکے ہیں کہ احادیث کا کوئی مجموعہ نہ رسول اللہ نے مرتب فرما کر امت کو دیا، نہ ہی خلفاءِ راشدین کے زمانے میں مرتب ہوا۔ انہوں نے بلکہ اس کی شدت سے مخالفت کی۔ ان کے بعد صحابہ

> اور بنو امیہ کے زمانے میں بھی، ان کے مجموعے مرتب نہ ہوئے۔ یہ مجموعے، عباسیوں کے عہد میں مرتب ہوئے۔ ①

"مفکر قرآن" کو، دروغ گوئی، مسخ حقائق، تحریفِ واقعات میں رتی برابر بھی کبھی تامل نہیں ہوا، وہ بڑے دھڑلے سے جھوٹ بولا کرتے تھے، جیسا کہ میری کتاب "جناب غلام احمد پرویز، اپنے الفاظ کے آئینے میں" میں دلائل و براہین سے واضح کیا گیا ہے۔

اس اقتباس میں، انہوں نے کذب بافی، اور قطع و برید سے خوب کام لیا ہے، چند باتیں، اس ضمن میں، اختصار کے ساتھ، نذرِ قارئین ہیں۔

خودساختہ فلسفہ

(۱) پہلی بات یہ ہے کہ انکارِ حدیث کے لیے، پرویز صاحب نے ایک فلسفہ خود گھڑا ہے۔ پھر (۲) اس خودساختہ فلسفہ کو، خدا کی مرضی اور اس کا منشاء و مقصد قرار دیا ہے۔ پھر (۳) اس من گھڑت فلسفے کی کسوٹی پر، جو چیز پوری نہیں اترتی، اسے وہ ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیتے ہیں۔ تسویلِ نفس کے بل پر، "مفکر قرآن" کے گھڑے ہوئے فلسفہ کے مندرجہ ذیل اجزاء ہیں:

الف......: قرآن، صرف اصول و کلیات کی کتاب ہے۔

ب......: احادیث و سنن، عہدِ نبوی کی فروعات و جزئیات ہیں۔

ج......: اصول و کلیات، ناقابلِ تغیر و تبدل ہیں جبکہ فروعات و جزئیات زمانے کے تقاضوں کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔

د......: فروعات و جزئیات مبنی بروحی نہیں ہوتیں، انہیں، ہر دور کا "مرکزِ ملت" باہمی مشاورت سے متعین کرتا ہے۔ جب کہ اصول و کلیات پر مشتمل کتاب (قرآن) مبنی بروحی ہوتی ہے۔

ر......: چونکہ ان فروعات و جزئیات کا تعین، مبنی بروحی نہیں ہوتا۔ اس لیے انہیں لکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ نے کوئی مجموعۂ حدیث مرتب نہیں

---

① شاہکارِ رسالت، ص ۵۰۱۔

کروایا تھا۔ تاہم اگر انہیں قید کتابت میں لا کر محفوظ کر لیا جائے، تو اس سے تاریخی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، دینی نہیں۔

یہ ہے وہ فلسفہ، جو میڈان طلوع اسلام آفس (Made in Tolo-e-Islam Office) ہے، جس پر، انکارِ حدیث کا کریملین تعمیر کیا گیا ہے۔ اس فلسفہ کے اجزاء، پرویز صاحب کی مختلف تصانیف میں بکھرے پڑے ہیں۔ تاہم ایک اقتباس ایسا ہے، جس میں اس ''فلسفہ'' کا جوہر موجود ہے:

> بات صرف اتنی تھی کہ خدا نے جن احکام کی تفصیل، خود متعین نہیں کی تھی، وہ دانستہ متعین نہیں کی تھی، اور اس لیے متعین نہیں کی کہ وہ ان جزئیات کو جامد نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ان اصولوں کے تحت، زمانہ کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق، نئی نئی جزئیات متعین ہوتی رہیں۔ ورنہ اگر خدا کا منشا یہ ہوتا کہ یہ جزئیات بھی غیر متبدل رہیں، تو اُس نے جس طرح بعض دوسرے احکام کی جزئیات کو خود متعین کر دیا تھا، ان احکام کی جزئیات کا متعین کرنا، اس کے لیے کچھ دشوار نہ تھا۔ ①

......''خدا نے جن احکام کی تفصیل، خود متعین نہیں کی تھی، وہ دانستہ متعین نہیں کی تھی''......

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا کی اس دانست کا ''مفکرِ قرآن'' کو علم کیسے ہوا؟ کیا اللہ نے خود قرآن میں اپنی اس دانست کا ذکر کیا ہے؟ کیا اس کے رسول ﷺ نے ایسا کہا ہے؟ کیا چوہدری غلام احمد پرویز صاحب بھی، اپنے ہم نام، مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح وحی پانے کے مدعی ہیں کہ خدا نے براہ راست، وحی کے ذریعے، اُن پر اپنی دانست کا اظہار فرما دیا؟ کیا ''مفکرِ قرآن'' صاحب، خود ''مزاج شناسِ خدا'' تھے کہ انہوں نے اللہ کی دانست، مرضی اور منشا کو مزاج شناسی کی بنا پر پالیا؟ کیا قرآن، صرف اصول و کلیات ہی کی کتاب ہے؟ اس میں جزئیات و فروعات بالکل نہیں ہیں؟ پھر، اس کا اصول و کلیات ہی پر مشتمل ہونے کا علم، کیا خود

---

① مقام حدیث، ص ۲۱۹۔

خدا نے دیا ہے؟ یا اس کے رسول نے یہ اطلاع دی ہے؟ اگر قرآن، محض اصول وکلیات ہی کی کتاب ہے، اس میں جزئیات نہیں ہیں؟ تو پھر ''مفکر قرآن'' کے اس فرمان کا کیا معنی، جس میں خود انہوں نے قرآن میں جزئیات کا ہونا تسلیم کیا ہے۔

> جن امور میں قرآن کریم نے جزئیات کی تصریح خود کردی ہے، ان میں ساری امت کو مل کر بھی اس کا حق نہیں پہنچتا کہ ذرا سا ردوبدل کر سکے۔ ❶

اور کیا احادیث وسنن، محض فروعات وجزئیات ہی ہیں؟ ان میں اصولی تعلیم بالکل نہیں ہے؟ کیا یہ بات، اللہ نے قرآن میں بیان کی ہے؟ یا رسول ﷺ نے اسے بیان فرمایا ہے؟ کیا اللہ نے يحل لهم الطيبات ويحرم عليهم الخبائث اور ولا يحرمون ما حرم الله ورسوله کہہ کر، حضور اکرم ﷺ کو، تشریعی اختیارات سے نہیں نوازا؟ کیا قرآن کریم، ان آیات میں تحلیل وتحریم کے فعل کو، فعلِ رسول قرار نہیں دے رہا ہے؟ اور حضور ﷺ نے (جو بقول منکرین حدیث کے ''مرکز ملت'' تھے) اقيموا الصلوة کے قرآنی حکم پر، عمل پیرا ہونے کے لیے، ارکانِ نماز، رکعات نماز، ترتیب وترکیب نماز، مقامِ ادائیگی نماز، وغیرہ کی جزئیات، کیا باہمی مشاورت سے متعین فرمائی تھیں؟ اور اسی طرح، کیا روزہ، زکوۃ، حج کے لیے بھی، جزئیات کے تعین کے لیے، کوئی مجلس مشاورت قائم ہوئی تھی؟

خوئے بدرا بہانہ ہائے بسیار است

''مفکر قرآن'' صاحب کے خود ساختہ فلسفہ کی کوکھ سے، جس عقیدے نے جنم لیا ہے، اور پھر جسے، انہوں نے اپنے فکری ہمنواؤں کے قلوب واذہان میں راسخ کیا ہے، وہ، خود اُن ہی کے الفاظ میں، مندرجہ ذیل عقیدہ ہے:

> دین، قرآن میں مکمل ہوگیا ہے، جو اس میں نہیں، وہ دین نہیں۔ ❷

اب یہ ظاہر ہے کہ احادیث رسول، بہرحال، کلام اللہ یا قرآن نہیں ہیں، لہٰذا، اس عقیدہ

---

❶ طلوع اسلام، نومبر ۱۹۵۳ء، ص ۱۴۱۔

❷ طلوع اسلام، اپریل ۱۹۸۳ء، ص ۴۔

کی رو سے، وہ "دین" نہیں ہیں۔ اب اس عقیدہ کو اپنا کر، "مفکر قرآن" صاحب، اگر یہ کہتے ہیں کہ ...... "نہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں، کوئی مجموعۂ احادیث مرتب ہوا، اور نہ ہی خلافت راشدہ میں" ...... یا یہ کہتے ہیں کہ ...... کتب احادیث میں اس بات کی صراحت نہیں ہے کہ کون سی بات، حضور ﷺ نے بطور ایک بشر کے کی، اور کون سی بات، بحیثیتِ رسول ﷺ فرمائی، کیوں کہ ہم صرف اس حدیث وسنت پر عمل کرنے کے مکلف ٹھہرائے گئے ہیں، جو آپ ﷺ نے بحیثیت رسول فرمایا یا کیا، اس لیے جب تک، آپ ﷺ کی حیثیت رسالت میں بیان کردہ امور کو الگ نہ کر دیا جائے، اس وقت تک عمل بالحدیث ممکن نہیں" ...... یا یہ سخن سازی کرتے ہیں کہ ...... "کتب احادیث میں، صحیح اور غلط، ہر قسم کی روایات موجود ہیں، جب تک صحیح روایات کو نکھار کر، غلط روایات سے الگ نہ کر دیا جائے، عمل بالسنۃ غیر ممکن ہے۔" تو یہ سب "عذرات" دراصل نہ ماننے کے لیے "بہانے" ہیں۔ آپ خواہ، کتنے ہی دلائل دیں، اگر جبریل بھی آسمان سے آ کر، انہیں یہ کہہ دیں کہ "مجلس نبوی میں بعض اصحابؓ رسولؐ، آپ ﷺ کے فرمودات واعمال کو لکھ لیا کرتے تھے،" تو یہ لوگ تب بھی نہیں مانیں گے، کیونکہ ان کا یہ عقیدہ کہ "جو کچھ قرآن میں نہیں ہے، وہ دین نہیں ہے"، اسے قبول کرنے میں حائل ہے۔ پھر یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ کسی نیک نیت متبع رسول ﷺ کے لیے، یہ معلوم کرنا کچھ بھی مشکل نہیں ہے کہ کون سی بات، حضور ﷺ نے بحیثیتِ رسول ﷺ ارشاد فرمائی ہے، تاکہ اس پر عمل کیا جا سکے۔ آخر پرویز صاحب، قرآن کے بارے میں بھی، تو، یہ فرق معلوم کر ہی لیتے ہیں کہ حضور کی فلاں بات بحیثیت رسول ﷺ نہیں تھی، بلکہ وہ محض، آپ ﷺ کی شخصی رائے اور ذاتی مشورہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ مثال کے طور پر، حضور اکرم ﷺ نے، حضرت زید رضی اللہ عنہ کو أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللَّهَ کہہ کر، طلاق دینے سے منع کیا تھا۔ پرویز صاحب، حضور ﷺ کے اس فرمان کو، حکمِ رسول قرار دینے کی بجائے، آپ ﷺ کا ذاتی مشورہ اور نجی رائے، قرار دیتے ہیں۔ اور صاف لکھتے ہیں کہ

> حضور ﷺ کا یہ حکم، نہ بحیثیتِ رسول ﷺ تھا، اور نہ بمنصب سربراہِ مملکت۔

یہ ایک ذاتی مشورہ تھا۔ ❶

اگر قرآن میں مذکور احکامِ رسول میں یہ فرق کیا جا سکتا ہے تو احادیث میں مذکور احکام میں بھی ایسا کرنا ممکن ہے، بشرطیکہ آدمی، نیک نیتی سے اتباعِ رسول کا خواہش مند ہو۔ اسی طرح یہ کہنا بھی دراصل، حدیث و سنت کو نہ ماننے کا ایک بہانہ ہے کہ صحیح روایاتِ حدیث کو غلط روایات سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اور اس قسم کے دیگر عذرات، دراصل، نہ ماننے کے بہانے ہیں، کیونکہ ان کا مذکورہ بالا عقیدہ، احادیث رسول ﷺ اور سنن نبی ﷺ کو، دینی حیثیت دینے میں مزاحم ہے، پھر اُن کے نزدیک، ''جو کچھ قرآن میں ہے'' سے مراد، مغربی معاشرت کے وہ فاسد اطوار و عادات اور اس کے ساتھ اشتراکیت کا وہ اقتصادی نظام ہے، جسے وہ قرآن کریم سے نچوڑ کر، اپنی ''پچاس سالہ قرآنی خدمات'' کے طور پر پیش کرتے رہے ہیں۔ حالانکہ مغرب کی سیکولر اور فساد زدہ معاشرت میں، اور اشتراکیت میں، وہ سب کچھ بغیر کسی قرآن کے پہلے سے ہی موجود ہے، پھر آخر اس سب کچھ کو قرآن سے کشید کرنے کا کیا فائدہ؟ ماسوا، اس کے کہ مغرب کے مقابلہ میں اپنی فکری اسیری اور ذہنی غلامی کا ثبوت دیا جائے۔

چلو ان کو ہی تسلیم کر لو

اگر عہد نبوی ہی کی کتابت شدہ احادیث کو، سند و حجت ماننے میں، ''مفکر قرآن'' مخلص اور نیک نیت ہوتے، تو کم از کم، ان احادیث کو، وہ ضرور تسلیم کر لیتے، جن کا عہد نبوی میں، خود رسول اللہ ﷺ کی طرف سے لکھا جانا، وہ خود تسلیم کرتے ہیں۔ مثلاً

> روایات سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ قرآن کریم کے علاوہ کچھ اور متفرق چیزیں بھی، حضور ﷺ کے ارشاد کے مطابق، قلم بند ہوئی تھیں، مثلاً وہ تحریری معاہدات، احکام اور فرامین وغیرہ، جو آنحضرت ﷺ نے قبائل یا اپنے عمال کے نام بھیجے۔ لیکن اس باب میں جو کچھ آج تک معلوم ہو سکا ہے وہ فقط اتنا ہے کہ قرآن کریم کے علاوہ، حضور ﷺ کی وفات کے وقت صرف حسب ذیل

---

❶ طلوع اسلام، مارچ ۱۹۷۹ء، ص ۳۷۔

تحریری سرمایہ موجود تھا۔

(۱)...... پندرہ سو صحابہ کے نام ایک رجسٹر میں۔

(۲)...... مکتوباتِ گرامی، جو حضور ﷺ نے سلاطین و امراء کو لکھے۔

(۳)...... چند تحریری احکام، فرامین اور معاہدات وغیرہ۔

(۴)...... کچھ حدیثیں، جو حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عمرو رضی اللہ عنہ یا حضرت علی و حضرت انس نے اپنے طور پر قلم بند کیں۔ ❶

اب جب کہ یہ حضرات خود اس بات کے معترف ہیں کہ کم از کم یہ چیزیں تو حضور ﷺ نے خود لکھوائیں، عہد نبوی میں صحابہ رضی اللہ عنہم نے لکھیں، تو انہیں ہی دینی سند اور حجت تسلیم کر لیا جاتا۔ لیکن ان کو رد کر دیا جاتا ہے، کیوں؟ صرف اس لئے کہ انہیں مان لینے کی صورت میں، انکارِ حدیث کے لئے جو فلسفہ گھڑا گیا ہے، اس کی فلک بوس عمارت دھڑام سے زمین پر گر جاتی ہے۔ اس لئے یہ کہنا کہ عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں احادیث و سنن کا مکتوب نہ ہونا، ان کے دینی سند نہ ہونے کی دلیل ہے، محض حیلہ سازی اور بہانہ بازی ہے۔

اب رہا یہ معاملہ کہ احادیث و سنن کا کتنا ذخیرہ عہدِ نبوی، خلافت راشدہ اور بعد کے ادوار میں قلمبند ہوا، تو اس کی تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمایئے، میری کتاب، ”تفسیر مطالب الفرقان کا علمی اور تحقیقی جائزہ۔“

(۲) ”کچھ حدیثیں“

مقام حدیث کے صفحہ ۵، اور ۶ پر سے جو اقتباس، اس سے قبل درج ہو چکا ہے، اس کا آخری فقرہ ملاحظہ فرمایئے۔ ”کچھ حدیثیں، جو حضرت عبداللہ بن عمرو، یا حضرت علی رضی اللہ عنہ و حضرت انس رضی اللہ عنہ نے اپنے طور پر قلمبند کیں۔“ اس جملہ میں، جن احادیث کو، ”کچھ حدیثیں“، کہا گیا ہے، وہ نہ تو ”کچھ حدیثیں“ ہی تھیں، اور نہ ہی وہ غیر مصدقہ تھیں۔ ”مفکر قرآن“ کی عادت یہ تھی، کہ اپنے قلبی معتقدات و نظریات کی حمایت و پاسداری کے لئے، کسی

---

❶ مقام حدیث، ص ۵ تا ۶۔

عبارت سے وہ چیز لے لیا کرتے تھے، جو مفید مطلب ہوا کرتی تھی اور اس چیز کو نظر انداز کر دیا کرتے تھے، جو خلافِ مقصود ہوا کرتی تھی۔ ان کی اس ذہنی خیانت کا پردہ، مولانا افتخار احمد بلخی رحمہ اللہ نے بایں الفاظ چاک کیا ہے۔

> حالانکہ وہ نہ صرف ’’کچھ حدیثیں‘‘ تھیں، اور نہ ہی حضور ﷺ کی بے تصدیق شدہ تھیں، بلکہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کے مجموعہ میں جس کا نام انہوں نے ’’الصادقہ‘‘ رکھا تھا، کتنی حدیثیں تھیں؟ اس کا اندازہ، اس سے کیا جا سکتا ہے، کہ اس میں صرف ان امثال کی تعداد، ایک ہزار تھی جو انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنے تھے۔ پھر جہاں سے ان اصحاب کی کتابت حدیث سے متعلق، معلومات حاصل کی گئی ہیں، ان ہی ماخذ سے اس کی شہادت بھی ملتی ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ، احادیث کو قلمبند کرنے کے ساتھ ساتھ، تصحیح و اصلاح کی خاطر، انہیں حضور ﷺ کی خدمت میں پیش بھی کرتے رہتے تھے۔ ❶

اور مقامِ حدیث کے مندرجہ بالا اقتباس میں، اصحاب ثلاثہ کے متعلق، یہ جو کہا گیا ہے کہ...... انہوں نے ’’اپنے طور پر‘‘ کچھ حدیثیں قلمبند کیں‘‘...... تو یہ بھی ایک قلبی اور قلمی خیانت کا کرشمہ ہے، تا کہ یہ تاثر اچھالا جا سکے کہ احادیث کی جمع و تدوین، اور اس کی حفظ و کتابت، کسی دینی اور اسلامی محرک کے تحت، ہدایت پانے اور پھر راہِ راست پر برقرار رہنے کے پیش نظر نہ تھی، بلکہ محض اپنی ’’ذاتی معلومات‘‘ اور صرف ’’تفنن طبع‘‘ کے لیے، انہوں نے، ’’اپنے طور پر‘‘ یہ کام کیا تھا۔

(۴۳) ابن شہاب زہری اور ان کا مجموعۂ حدیث

مقامِ حدیث ہی میں، قدرے آگے چل کر، پھر ان ’’کچھ احادیث‘‘ کے تذکرہ کے بعد، مزید ’’کچھ احادیث‘‘ کا ذکر، بایں الفاظ کیا گیا ہے:

---

❶ فتنۂ انکارِ حدیث کا منظر و پس منظر، ج ۳، ص ۱۹۸، تا ص ۱۹۹۔

> اس کے بعد، امام ابن شہاب زہری نے، خلفاءِ بنی امیہ کے حکم سے، ایک مختصر سا مجموعۂ احادیث تیار کیا تھا۔ ❶

اس اقتباس میں “مفکرِ قرآن” نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں، وہ ان کی ذہنی خیانت کو، ایک بار پھر بے نقاب کر ڈالتے ہیں۔ اور یہ ذہنی خیانت بھی ایسی ہے کہ سرسری نظر سے دیکھنے والے قاری کو، اس میں قطعاً کوئی کھٹک اور خلش محسوس نہیں ہوتی۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ

اولاً...... خلفاءِ بنی امیہ، سب کے سب (باستثناءِ واحد) قرآن و سنت کی پٹڑی سے اکھڑے ہوئے تھے۔ ان سب نے حکومت و ریاست کو نسلی جاگیر اور خاندانی میراث بنا کر رکھ دیا تھا۔ دینی مقاصد پر، ان کی سیاسی مصلحتیں حاوی ہو چکی تھیں۔ لیکن اپنے اخلاق و کردار، اور طرزِ حکومت کے اعتبار سے، صرف اور صرف حضرت عمر بن عبدالعزیز کا دورِ حکومت ہی اس قابل تھا کہ مورخین نے ان کے عہد کو خلافت علی منہاج نبوت کے مماثل، اور خود ان کو یکے از خلفاءِ راشدین قرار دیا ہے، اور یہی وہ خلیفۂ راشد، عمر بن عبدالعزیز تھے، جن کے حکم سے، امام ابن شہاب زہری نے مجموعۂ احادیث مرتب کیا تھا۔ “مفکرِ قرآن” نے حضرت عمر بن عبد العزیز کا نام حذف کرتے ہوئے، خلفاءِ بنی امیہ کی طرف، جمع احادیث کے حکم کو، صرف اس لئے، منسوب کیا ہے کہ اگر جمعِ حدیث کا یہ کارنامہ، متدین، متشرع، متقی، انصاف پرور، اور پاکباز و پاک دل، خلیفہ راشد، عمر بن عبدالعزیز کی طرف منسوب کیا جاتا، تو لوگ، ان کے سیرت و کردار کو دیکھتے ہوئے، اسے شاندار کارنامہ قرار دیتے، لیکن ہمارے “مفکرِ قرآن” صاحب، “شاندار کارنامہ” کی بجائے، چونکہ، اسے “گھناؤنی حرکت” قرار دے کر، اپنی مزعومہ “عجمی سازش” کا حصہ بنانا چاہتے تھے، اس لئے انہوں نے اسے بنی امیہ کے ظالم پیشہ، ستم شعار، چیرہ دست، اور ہوسِ اقتدار کے مارے ہوئے، حکمرانوں کی طرف منسوب کر ڈالا۔

ع “ایسا بلند سب کا ذوقِ نظر کہاں”

---

❶ مقام حدیث، ص ۱۰ تا ص ۱۱۔

ثانیاً...... امام ابن شہاب زہری نے جو مجموعۂ احادیث، مرتب فرمایا تھا، وہ ایک ضخیم ذخیرۂ احادیث تھا۔ لیکن ''مفکر قرآن'' صاحب، اس کے حقیر و صغیر اور قلیل و خفیف ہونے کا تاثر دینے کے لئے، اسے ''مختصر سا مجموعہ، احادیث'' قرار دیتے ہیں، حالانکہ ولید بن یزید کے قتل کے بعد، جب اس ''مختصر سے مجموعۂ احادیث'' کو منتقل کرنا پڑا، تو بہت سے جانوروں پر لاد کر، اسے منتقل کیا گیا تھا۔ یہ الفاظ کا وہ ہیر پھیر ہے، جس سے مسخ حقائق اور تحریفِ واقعات کا کام لینا ''مفکر قرآن'' کا شیوہ تھا۔

(۴۴) تدوین حدیث کی بابت! ''مفکر قرآن'' کی ایک عیّارانہ چال

یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ امام ابن شہاب زہری کا مرتب کردہ مجموعۂ احادیث، بے حیثیت بھی تھا، اور اس کا وجود بھی کہیں نہیں پایا جاتا تھا، ''مفکر قرآن'' لکھتے ہیں۔

> لیکن نہ تو حضرت عمر بن عبدالعزیز کی جمع کردہ احادیث، کسی مدون صحیفہ کی شکل میں موجود ہیں، اور نہ امام زہری کا مذکورہ صدر مجموعہ ہی کہیں موجود ہے، البتہ بعد کی کتب میں، ان کی روایات ملتی ہیں۔ ①

گویا مجموعہ ہائے احادیث کا الگ الگ ابتدائی مجموعوں میں نہ ملنا، اور ان کا بعد کی کتب میں مل جانا، یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ احادیث ضائع ہو گئیں، فضاء میں تحلیل ہو گئیں، آبی بخارات بن کر اڑ گئیں، کیونکہ ان کے ابتدائی مجموعے موجود نہیں ہیں۔ طلوع اسلام نے مولانا اسلم جیراجپوری کے (متفرق اوقات میں لکھے گئے) جن مقالات و مضامین کو ''نوادرات'' نامی کتاب میں جمع کر دیا ہے، اُن کو ضائع شدہ سمجھنا چاہئے، کیونکہ ان میں سے کوئی مضمون اور کوئی مقالہ بھی، آج اپنے ابتدائی کتابچہ کی صورت میں دستیاب نہیں ہے۔ یہ ہے انکارِ حدیث کے لئے، ''مفکر قرآن'' کے ''علمی استدلال'' کا ''قرآنی معیار'' جس کا دم بھرتے ہوئے یہ ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے کہ:

---

① مقام حدیث، ص ۱۱۔

(۱):..... ملا کے پاس، نہ علم ہوتا ہے، نہ بصیرت، نہ دلائل ہوتے ہیں، نہ براہین۔ ❶

(۲)..... ہمارا ملا، طلوعِ اسلام میں پیش کردہ دعوت کا جواب، دلائل و براہین سے تو دے نہیں سکتا۔ (اس لئے کہ وہ دعوت، قرآن کی دعوت ہے، اور ملا بیچارہ، قرآنی نور سے محروم ہوتا ہے۔) ❷

مسخِ حقائق، تقلیبِ امور، اور تحریفِ واقعات، کے لئے، جو حربے، ہتھکنڈے، حیلے اور چالیں، ”مفکرِ قرآن“ عمر بھر اختیار کرتے رہے ہیں، وہ اگر ان کے ”قرآنی نور“ ہی کا فیض ہے، (جس سے ملا بیچارہ محروم ہے) تو اس ”قرآنی نور“ کو دور ہی سے سلام، بِئْسَمَا يَأْمُرُكُمْ بِهٖٓ إِيمَانُكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلک انکارِ حدیث کو، حرزِ جان بنا لینے کے بعد، خیال و گمان کی جو لہر بھی، ”مفکرِ قرآن“ کے دل و دماغ میں اٹھتی تھی، اُسے وہ ”دلائل و براہین“ قرار دے دیا کرتے تھے، اور بعض اوقات تو ایسا بھی ہوتا تھا کہ مستشرقین نے احادیث پر، جو اعتراضات کئے ہیں، اُن ہی کی چھوڑی ہوئی ہڈیوں کو، جب وہ، اپنے منہ سے اگل دیتے تھے، تو انہیں ”دلائل“ کا نام دے دیا کرتے تھے۔

(۴۵) امام زہری، اور خلفاءِ بنی امیہ

امام ابن شہاب زہری کے متعلق، ”مفکرِ قرآن“ صاحب لکھتے ہیں کہ وہ:

خلفاءِ بنی امیہ کے درباروں میں بہت معزز تھے، اور ان ہی کے حکم سے انہوں نے حدیثیں لکھیں، وہ خود کہتے ہیں کہ ہم کو حدیثوں کا لکھنا گوارا نہ تھا، لیکن ان خلفاء نے مجبور کر کے لکھوایا۔ ❸

---

❶ طلوعِ اسلام، ۵ فروری ۱۹۵۵ء، ص ۴۔

❷ طلوعِ اسلام، مئی ۱۹۵۳ء، ص ۴۷۔

❸ مقامِ حدیث، ص ۶۲۔

اس اقتباس میں، دو ایسی باتیں بیان ہوئی ہیں، جو بظاہر امر حق مگر بباطن خلاف حق ہیں۔ اور کلمۃ حق ارید بھا الباطل کا مصداق ہیں۔

اولاً...... یہ کہ ''امام زہری، خلفاءِ بنی امیہ کے درباروں میں معزز تھے'' یقیناً یہ بات درست ہے، مگر ان کا معزز ہونا، صاحب علم وعمل، متقی و پاکباز ہونے کے باعث تھا۔ وہ وقت کے عظیم محدث اور جید خادم دین تھے۔ لیکن اگر منکرین حدیث کی دیگر تحریروں کی روشنی میں، اس جملے کو دیکھا جائے، تو اس کا مفہوم، ان کے نزدیک یہ ہے کہ امام زہری، حکمرانوں کے آلۂ کار تھے۔ ان کی ہاں میں ہاں ملانے والے تھے، وہ اگر عالم تھے بھی، تو ضمیر فروش اور دین فروش تھے، اسی وجہ سے، انہوں نے ''حکمرانوں کو'' قرآن سے دور کرنے کے لیے، احادیث کا ''مختصر سا مجموعہ'' تیار کیا، تاکہ حکمران، قرآن کو پس پشت ڈال کر، احادیث سے مطلب برآری کریں، اور انہیں اپنی غیر دینی حرکات، اور اپنی سیاسی اغراض کے لیے، سندِ جواز مل جائے۔

لیکن ''مفکر قرآن'' سے یہ مت پوچھیے کہ اگر دین میں احادیث کی کوئی قدر و قیمت تھی ہی نہیں، اور امت میں صرف قرآن ہی حجت و سند کے طور پر مقبول تھا، حدیث، دینی لحاظ سے نہ حجت تھی، اور نہ سند۔ نہ وہ بطور دلیل کوئی اہمیت رکھتی تھی، اور نہ بطور برہان اس کا کوئی مقام تھا، لیکن پھر بھی حکمرانوں کی خوشنودی کے لیے، اگر جعل ساز احادیث گھڑا کرتے تھے، تو اس صورت میں (علماء کو بالعموم اور عمر بن عبدالعزیز کو بالخصوص) جمع احادیث کی، اور کسی جعل ساز کو حدیث گھڑنے کی آخر ضرورت ہی کیا تھی، کیا کوئی جعل ساز ایسے سکے اور ایسے کرنسی نوٹ، جعلی بنانے کی کوشش کیا کرتا ہے جو بازار میں چلتے ہی نہ ہوں۔ اور کیا کوئی حاجت مند بازار میں چلنے والی کرنسی کی بجائے، کوئی ایسی کرنسی جمع کیا کرتا ہے، جس کا بازار میں لین دین نہ ہو، یا وہ جعلی اور من گھڑت ہو۔

ثانیاً...... یہ کہ امام زہری کا یہ کہنا بھی کہ...... ''ہم کو حدیثوں کا لکھنا گوارا نہ تھا، لیکن ان خلفاء نے مجبور کر کے لکھوایا''...... بجائے خود ایک صحیح بات ہے، لیکن اگر منکرین حدیث کے لٹریچر کی روشنی میں اسے دیکھا جائے تو مفہوم یہ بنتا ہے کہ احادیث کی کوئی اہمیت اور قدر و

قیمت تو تھی ہی نہیں، اس لئے علماء اسے ضبط تحریر میں لانا نہیں چاہتے تھے، دورِ ملوکیت کے حکمرانوں نے ''مذہبی پیشوائیت'' کو مجبور کیا، تو اس شاہی عتاب کا نشانہ بننے کی بجائے، انہوں نے مناسب سمجھا کہ اسے احاطہ تحریر میں لایا جائے۔ اور انہیں بادل نخواستہ یہ کام کرنا پڑا۔ حالانکہ اس کا اصل مفہوم یہ ہے کہ علماء کرام، دینی سرمایہ کو، جو قرآن و سنت پر مشتمل ہے، صحیفوں میں محفوظ کرنے کی بجائے، سینوں میں محفوظ کرنے کو افضل و اعلیٰ جانتے تھے، ان کے ہاں قدر و منزلت کا مستحق، وہ عالم نہیں تھا جو علم کو کتابوں میں مقید رکھا کرتا تھا، بلکہ وہ تھا جو اپنے علم کو حافظہ میں راسخ کیے ہوئے تھا۔ اُس وقت کی علمی فضا ایسی تھی کہ علماءِ حدیث، کتابتِ حدیث میں کدورت و کراہت اور حفظِ حدیث میں مسرت و راحت محسوس کیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ بعض اہل علم، احادیث کو ضبط تحریر میں لانے کو ناجائز سمجھا کرتے تھے۔ حفظ و کتابت کے نقطہ نظر سے، ان کے ہاں بابرکت، افضل اور اعلیٰ دور، وہ بعد کا دور نہیں تھا جس میں احادیث کی کتابت عام طور پر عمل میں آئی، بلکہ وہ پہلا دور تھا جب احادیث کو ازبر کیا جاتا تھا۔ خود طلوع اسلام نے بھی ایک مقام پر، اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔

> عہد صحابہ کے بعد، ائمہ تابعین بھی، مثلاً علقمہ، مسروق، قاسم، شعبی، منصور، مغیرہ، اور اعمش وغیرہ کتابتِ حدیث کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔
>
> امام اوزاعی کہا کرتے تھے کہ ''حدیثوں کا علم، جب تک زبانی تھا، شریف علم تھا، مگر جب سے لکھا جانے لگا، اس کا نور جاتا رہا، اور نا اہلوں کے ہاتھوں میں پڑ گیا۔''❶

لیکن منکرین حدیث کی گنگا الٹی بہتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر علم حدیث، دینی حیثیت رکھتا، تو اسے شروع ہی سے لکھا جانا چاہیئے تھا۔ مگر جو عبارت پیش کی جا رہی ہے، وہ یہ ظاہر کرتی ہے کہ علم حدیث کا افضل و عالی مرتبت ہونا، دور حفظ ہی سے وابستہ تھا۔ یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ دورِ حفظ میں بھی، جن لوگوں نے احادیث کو قلمبند کیا تھا، ان کا مقصد

---

❶ طلوع اسلام، نومبر ۱۹۵۲ء، ص ۵۱ + مقام حدیث، ص ۶۲۔

بھی صرف یہ تھا کہ وہ لکھ کر حفظ کرنا چاہتے تھے، جیسا کہ رجاء بن حیوہ کے بیان سے ظاہر ہے:

> ((عن رجاء ابن حیوہ قال: کتب ھشام بن عبدالملك الی عامله ان یسئلنی عن حدیث. قال رجاء: فکنت قد نسیته لو لا انه کان عندی مکتوبًا.)) ❶

> ”رجاء بن حیوہ، حدیث بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہشام ابن عبدالملک نے، اپنے ایک عالم کو لکھا کہ وہ مجھ سے ایک حدیث کے بارے میں پوچھے۔ رجاء نے کہا کہ میں تو وہ حدیث بھول ہی چکا تھا، اگر میرے ہاں وہ لکھی ہوئی نہ ہوتی۔“

یہ واقعہ، اس امر کو واضح کر دیتا ہے کہ کتابت حدیث کے عمل کو، حفظ حدیث کا ذریعہ بنایا گیا تھا۔ حفظ حدیث، بطورِ مقصد کے، اور کتابت حدیث، بطورِ ذریعہ کے ساتھ ساتھ چلتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کے ہاں، زبانی روایت کے ساتھ ساتھ، کتابت کا عمل بھی برقرار رہا۔ اور صحابہ رضی اللہ عنہم، مسجد نبوی میں، احادیث کو، سینوں اور صحیفوں میں محفوظ کر کے، اگلی نسل کو پہنچاتے رہے ہیں۔

الغرض، امام زہری نے جو کچھ کہا ہے، وہ تو درست ہے، لیکن منکرین حدیث، اس کا جو مطلب مراد لیتے ہیں، وہ غلط ہے۔ صحیح مطلب وہی ہے، جسے ہم نے طلوعِ اسلام، مقام حدیث اور سنن دارمی کے حوالہ سے بیان کیا ہے۔

(۴۶) کیا شیعہ رواۃ کی روایات سنیوں کے ہاں قابل قبول نہیں ہیں؟

”مفکر قرآن“ علم حدیث کی ابجد تک سے ناواقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ فن حدیث کی ابتدائی اور بنیادی اصطلاحات کا بھی علم نہیں رکھتے تھے، اپنی اس جہالت کے باعث، اُنھوں

---

❶ سنن دارمی، باب من رخص فی کتابۃ العلم۔

نے ایسی فاش غلطیاں کی ہیں، جن پر علم روتا ہے، عقل ماتم کرتی ہے، جہالت ہنستی ہے، اور حقیقت سر پیٹتی ہے، اس کی ایک مثال تو وہ ہے جس میں ''ضعیف حدیث'' کو ''غلط حدیث'' کے مفہوم میں لے کر، ایک طرف، اپنی علمی بے بضاعتی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں، اور دوسری طرف، اپنی جہالت پر پردہ ڈالتے ہوئے، چوری اور پھر سینہ زوری کا مظاہرہ کرتے ہوئے، اُس عالم دین کو کوستے ہیں، جو نہ صرف فن حدیث کی رو سے، بلکہ عقل و دانش کی رو سے بھی درست مؤقف پر قائم تھے۔ علم حدیث سے ان کی بے خبری و جہالت کی دوسری مثال، شیعہ راویوں کی روایت کے قابل قبول ہونے یا نہ ہونے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس مثال سے نہ صرف یہ کہ ان کا عیب جہالت کھل کر سامنے آ جاتا ہے، بلکہ علماءِ کرام پر، ان کی خوئے اتہام تراشی بھی نمایاں ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر لکھتے ہیں:

> ''سنیوں کا یہ مسلک ہے کہ جس حدیث کا کوئی ایک راوی بھی شیعہ ہو، وہ حدیث قابل تسلیم نہیں۔'' ❶

سنیوں کا یہ مسلک کہاں اور کس کتاب میں درج ہے؟ اسے کس سنی عالم نے بیان کیا ہے؟ یہ مسلک کس عصر و مصر میں اختیار کیا گیا؟ حرام ہے جو ''مفکر قرآن'' نے اس کا کہیں حوالہ دیا ہو۔ بس اپنے جی سے ایک بات گھڑی، اور اسے علماء کی طرف منسوب کر ڈالا، محض اس لیے کہ اندھے مقلدین تو اپنے اس اعتقاد کے باعث کہ ''مستند ہے آپ کا فرمایا ہوا'' اس پر یقین کر ہی لیں گے۔ رہے سادہ لوح عوام الناس، تو ان کے متعلق، ''مفکر قرآن'' کا شاید یہ گمان ہے کہ وہ ان کی ملمع سازیوں اور عبارت آرائیوں اور مقفّٰی و مسجع نگارشوں کے دام میں آ ہی جائیں گے۔

وہ لوگ، جنھوں نے فن حدیث اور رواۃِ حدیث کا تحقیقی مطالعہ کیا ہے، یہ جانتے ہیں کہ جن راویوں کی روایات کو، محدثین کرام نے قبول کیا ہے، محض اس لیے قبول کیا ہے کہ وہ لوگ، اپنے غلط رجحانات اور باطل میلانات کے باوجود، صادق الحدیث تھے۔ ان کے عام طرزِ عمل

---

❶ شاہکار رسالت، ص ۵۰۰۔

میں دین داری، پرہیزگاری، صداقت، امانت، دیانت اور ثقاہت موجود تھی۔ محدثین کرام نے جتنی محنت و مشقت، جزرسی و دیدہ ریزی کے ساتھ، راویوں کے حالات کی چھان بین کی ہے، صفحۂ ہستی پر، کسی ایک انسانی گروہ نے، کسی دوسرے گروہ کے حالات کو اس تحقیق و تفتیش اور تدقیق و تفحص کے ساتھ نہیں جانچا۔ ماہرین حدیث کے اس کارنامے پر، بعض انصاف پسند مستشرقین نے بھی زبردست خراجِ تحسین پیش کیا ہے، خود "مفکر قرآن" نے بھی، اس پہلو سے، ان کی یہ کہہ کر تحسین فرمائی ہے:

> "اس میں ذرا کلام نہیں کہ ان احادیث کا تفحص و تجسس، تحقیق و تدقیق اور نقد و تبصرہ میں حضرات ائمہ حدیث (علیہم الرحمۃ اجمعین) نے جس دقتِ نظر اور کاوشِ دقیقہ سنجی سے کام لیا ہے، اس کی مثال دنیا کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔ ڈاکٹر اسپرنگر تو عربوں کا اسماء الرجال دیکھ کر ہی ششدر رہ گیا تھا۔ اگر وہ کہیں تاریخ تدوین حدیث پر غور کرتا، تو پتہ نہیں، کس قدر غرقِ حیرت ہو جاتا۔ لیکن بایں ہمہ کدوکاوش یہ تمام مساعی، پھر بھی انسانوں ہی کے ہاتھوں سے انجام پائی، جس میں کہیں نہ کہیں سہو و خطا کا امکان ضرور ہے۔ لاریب، ہمارا علم حدیث، تمام دنیا کے علوم سے زیادہ یقینی اور قابل اعتماد ہے۔" ①

علم حدیث اور فن اسماء الرجال پر خراجِ تحسین پیش کرتے وقت، "مفکر قرآن" صاحب جب یہ کہتے ہیں کہ ...... "لیکن بایں ہمہ کدوکاوش، یہ تمام مساعی، پھر بھی انسانوں ہی کے ہاتھوں سے انجام پائی، جس میں کہیں نہ کہیں سہو و خطا کا امکان ضرور ہے" ...... تو وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ قرآن کی محفوظیت بھی، انسانی ہاتھوں ہی کی مرہونِ منت ہے۔ اللہ تعالیٰ، عرشِ عظیم سے اُتر کر، زمین پر نہیں آیا کہ اس نے خود اپنے ہاتھوں کتاب اللہ کو محفوظ و مصئون کر رکھا ہو، اور انسانی سعی و کاوش کا اس میں رتی بھر کوئی دخل نہ ہو، بلکہ جس طرح انسانی کاوش، قرآن کی حفاظت کی ضامن قرار پائی، بالکل اسی طرح، حدیث و سنت کی صیانت کی بھی

---

① ماہنامہ معارف، اپریل ۱۹۳۵ء، جلد: ۳۵، شمارہ نمبر: ۴، صفحہ: ۲۸۸۔

ضامن ٹھہری۔ انسانی ہاتھوں سے انجام پانے والی، جس کدو کاوش میں، علم حدیث کے حوالہ سے، ”کہیں نہ کہیں سہو وخطا کا امکان ضرور پایا“ اور تلاش کیا جاتا ہے، اُسی کدو کاوش میں، قرآن کے حوالہ سے بھی، ”کہیں نہ کہیں سہو وخطا کا امکان ضرور“ ان لوگوں کو دکھائی دے رہا ہے، جنھیں ہم مستشرقین کہتے ہیں۔ اگر چہ اس پر بہت کچھ لکھنے کو جی چاہتا ہے، لیکن اختصار کے پیش نظر، اسی اشارہ پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

پھر یہ اعتراف واعلان کر ڈالنے کے بعد، کہ...... ”لاریب، ہمارا علم حدیث، تمام دنیا سے زیادہ یقینی اور قابل اعتماد ہے“۔ ”مفکر قرآن کا ذہن جو پلٹا اور دماغ معکوس ہوا، اور عقل منکوس ہوئی، تو فن اسماء الرجال کا یہی شاندار کارنامہ، محدثین کی سیاہ عملی قرار پایا۔ اور جو چیز، پہلے قابل تعریف وستائش تھی، وہی قابل تعریض و آلائش بن گئی، اور جس فن اسماء الرجال کی ایجاد، مسلمانوں کا طرۂ امتیاز تھی، اُسی فن کے متعلق اب یہ کہا جانے لگا کہ

> ”یہ کوئی مفید اور قابل فخر، تاریخی علم نہیں ہے، بلکہ ملت کے لیے ایک قسم کی دماغی تعزیر ہے، جو روایت پرستی کے سبب سے ملی ہے۔“ ①

آمدم برسر مطلب

الغرض بات یہ ہو رہی تھی کہ اہل سنت کے نزدیک، شیعہ راویوں کی روایت، نا قابل تسلیم ہے، یہ ”مفکر قرآن“ کی قطعی بے اصل بات ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ہر وہ شخص، جس کی زندگی میں بر وتقویٰ غالب ہے، وہ اگر صادق الحدیث پایا گیا، تو اس کی روایت مقبول ٹھہری، خواہ اس کے قلبی رجحانات اور ذہنی میلانات میں تشیّع، خارجیت، ارجاء وغیرہ کے انحرافات ہی کیوں نہ موجود ہوں۔ اس قسم کے کج رو فرقوں میں سے، ہر فرقے کے افراد سے اخذ روایات کیا گیا ہے۔ اہل ہوا میں سے خوارج کی روایات کو سب سے زیادہ پذیرائی اس لیے ملی کہ وہ لوگ، جھوٹ بولنے کو گناہِ کبیرہ، اور مرتکب گناہِ کبیرہ کو کافر سمجھتے تھے، اور مباح الدم بھی۔ اب ظاہر ہے کہ جن کا عقیدہ یہ ہو، ان سے زیادہ کس کی بیان کردہ روایت صحیح اور

---

① مقامِ حدیث، صفحہ: ۷۵۔

مقبول ہوگی۔ اس ضمن میں امام ابوداؤد کا قول، اہل علم میں بڑا معروف ہے۔

((لیس فی اھل الھواء اصح حدیثا من الخوارج .)) ❶

"اہل بدعت وہویٰ میں، خارجیوں سے بڑھ کر، کوئی اور گروہ، صحیح الحدیث نہیں ہے۔"

اس باب میں، امام شافعی رحمہ اللہ کا یہ قول بھی منقول ہے:

((تقبل شھادۃ اھل الھواء الاّ الخطابیۃ من الرافضۃ لانھم یرون الشھادۃ بالزور لموافقیھم .)) ❷

"ماسوا خطابیہ کے، جو روافض کی شاخ ہیں، جملہ اہل ہواء کی شہادت قبول کی جائے گی، کیونکہ یہ خطابیہ، اپنے ہمنواؤں کے حق میں جھوٹی گواہی دینے کے قائل ہیں۔"

الکفایہ فی علم الروایہ کے مصنف، امام ابوبکر احمد بن علی بن ثابت (المعروف، خطیب بغدادی) نے اپنی اسی کتاب میں، بایں الفاظ، ایک باب باندھا ہے: ((باب ما جاء فی الاخذ عن اھل البدع والاھواء والاحتجاج بروایاتھم .)) ...... یعنی "اہل بدعت وہویٰ کی مرویات اور ان سے دلیل پکڑنے کے بارے میں باب۔" اس باب میں وہ بسط واطناب کے ساتھ بحث فرماتے ہیں، اور آخر میں محاکمہ کرتے ہوئے، قابل اعتماد مسلک کی ترجمانی، ان الفاظ میں کرتے ہیں:

((والذی یعتمد علیه فی تجویز الاحتجاج باخبارھم اشتھر من قبول الصحابة اخبار الخوارج وشھادتھم ومن جریٰ مجرٰھم من الفساق بالتاویل ثم استمرار عمل التابعین والخالفین بعدھم علیٰ ذلك لما رأ وامن تحریھم الصدق

---

❶ الکفایۃ فی علم الروایۃ، ص ۱۳۰۔

❷ الکفایۃ فی علم الروایۃ، صفحہ: ۲۱۰۔

وتعظيمهم الكذب وحفظهم انفسهم من المحذورات من الافعال وانكارهم على اهل الريب والطرائق المذمومة ورواياتهم الحديث التى تخالف آراء هم ويتعلق بها مخالفوهم فى الاحتجاج عليهم فاحتجوا بروايات عمران ابن حطان وهو من الخوارج ، وعمر بن دينار وكان ممن يذهب الى القدر والتشيع ، وكان عكرمة اباضيا وابن ابى نجيح وكان معتزليًا ، وعبدالوارث بن سعيد وشبل بن عباد ، وسيف بن سليمان و هشام الدستوائى وسعيد بن ابى عروبة وسلّام بن مسكين وكانوا قدرية ، وعلقمة بن مرثد وعمر بن مرّة ومسعد بن كدام وكانوا مرجئة وعبيداللّٰه بن موسىٰ وخالد بن مخلد وعبدالرزاق بن همام وكانوا يذهبون الى التشيّع فى خلق كثير يتسع ذكرهم ، دوّن اهل العلم قديمًا وحديثًا رواياتهم واحتجوا بأخبارهم فصار ذالك كالاجماع منهم وهو اكبر الحجج فى هذا الباب وبه يقوى الظن فى مقاربة الصواب .)) ❶

”اہل بدعت وہوا کی مرویات کے قابل حجت ہونے کے معاملے میں قابل اعتماد مسلک یہی ہے کہ خود صحابہ کرام نے خوارج کی روایات وشہادات کو قبول کیا ہے، اور ان جیسے لوگوں کی احادیث کو بھی لیا ہے، جنھوں نے کسی تاویل کی بناء پر ارتکاب فسق کیا ہے۔ اس کے بعد تابعین اور تبع تابعین کا استمراری عمل بھی یہی رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صحابہ کرام اور تابعین نے دیکھا کہ یہ خوارج اور اہل فسق، روایت حدیث میں اتباع صدق کرتے ہیں۔ کذب بیانی کو بڑا گناہ سمجھتے ہیں۔ ممنوعات سے بچتے ہیں۔ عادات ذمیمہ اور اہل الریب کو بُرا سمجھتے ہیں، اور

---

❶ الکفایة فی علم الروایة، ص ۱۲۵۔

> ایسی احادیث بھی بیان کر دیتے ہیں جو ان کی آراء کے خلاف پڑتی تھیں، اور جن کی بناء پر، ان کے مخالفین، ان پر حجت قائم کر سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ محدثین نے عمران بن حطان کی روایت لی ہے، جب کہ وہ خارجی تھا۔ اسی طرح عکرمہ، اباضیہ (خوارج کا معتدل گروہ) میں سے تھا۔ اور ابن ابی نجیح معتزلی تھا۔ عبدالوارث بن سعید، شبل بن عباد، سیف بن سلیمان، ہشام دستوائی، سعید بن ابی عروبہ، سلام بن مسکین، سب قدریہ میں سے تھے۔ اور ان کی احادیث قبول کی گئی ہیں۔ علقمہ بن مرثد، عمرو بن مرہ اور مسعر بن کدام مرجئہ تھے۔ عبیداللہ بن موسیٰ، خالد بن مخلد، عبدالرزاق بن ہمام، اہل تشیع میں سے تھے۔ اسی طرح کے اور بہت سے لوگ تھے، جن کا ذکر باعث طوالت ہے۔ اہل علم نے ہر زمانے میں ان کی روایات کو مدون کیا ہے اور ان سے احتجاج و استدلال کیا ہے، اور اس پر ایک طرح کا اجماع ہو گیا ہے، جو اس مسئلہ میں سب سے بڑی دلیل ہے، اور اس مسلک کے اقرب الی الصواب ہونے کو تقویت پہنچاتی ہے۔“

اگر چہ بعض لوگوں نے، اہل ہوا و بدعت کی مرویات کی قبولیت کے لیے یہ شرط عائد کی ہے کہ ایسا راوی، اپنے گمراہانہ نظریات کا داعی نہ ہو، بلکہ خاموش طبع اور روادار ہو۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ کسی کا داعی ہونا یا نہ ہونا، ایک اضافی شئے ہے، اور یہ بات ناقابل تصور ہے کہ کوئی شخص اپنے افکار و نظریات کا کسی درجہ میں بھی داعی نہ ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو ان راویوں کے بارے میں سرے سے یہ پتہ ہی نہ لگ سکتا تھا کہ یہ لوگ ان گمراہانہ اور مبتدعانہ نظریات کے حامل تھے، اس لیے ائمہ محققین نے اس پابندی کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ اس کی بہترین مثال عمران بن حطان کی شخصیت میں موجود ہے، جس کا ذکر اقتباس بالا میں بھی موجود ہے۔ یہ شخص نہ صرف یہ کہ پختہ ذہن کا خارجی تھا بلکہ اپنے نظریات کا مبلغ اور داعی بھی تھا۔ جس خارجی (عبدالرحمٰن بن ملجم) نے حضرت علی ؓ کو اپنی ضربِ سیف کا نشانہ بنایا تھا، اس کے اس فعل

(ضربِ سیف) پر، عمران بن حطان، اسے خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے، جو قصیدہ کہتا ہے، اس کے دو اشعار ملاحظہ فرمایئے:

یا ضربة من تقي ما اراد بها　　الا لیبلغ من ذی العرش رضوانا

"صاحب تقویٰ (ابن ملجم) کی اس قاتلانہ ضرب کے کیا کہنے؟ اس ضرب کا مقصود، صرف مالک عرش کی رضا پانا تھا۔"

انی لا ذکرہ یومًا فاحسبهٗ　　او فی البریة عنداللّٰه میزانا ❶

"میں، جس دن بھی اس (ابن ملجم) کو یاد کرتا ہوں، تو میں اسے عنداللہ ساری دنیا سے بھرپور میزان (اجر) کا حقدار سمجھتا ہوں۔"

اس پکے اور پختہ خارجی کی روایات کو، امام بخاری، امام ابوداؤد اور امام نسائی جیسے ائمۂ حدیث نے قبول فرمایا ہے، اور خود یہ شخص، حضرت عائشہ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری سے اخذ روایات کرتا ہے۔

بہرحال، الکفایہ کا وہ اقتباس جو اس سے قبل پیش کیا جا چکا ہے، وہ "مفکر قرآن" کے اس جھوٹ کا پول کھول دیتا ہے کہ "سنیوں کا یہ مسلک ہے کہ جس حدیث کا کوئی ایک راوی بھی شیعہ ہو، وہ حدیث قابل تسلیم نہیں۔" کیونکہ اس اقتباس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ ائمۂ حدیث نے ہر اس مبتدع اور متبع ہویٰ، راوی کی روایت کو قبول کیا ہے، جس کی زندگی پر حسنات و معروفات کا غلبہ تھا، اور اسے صادق الحدیث پایا گیا، خواہ وہ کیسی ہی تاویل کا شکار ہو کر، فسق و بدعت میں مبتلا ہو چکا تھا۔ الکفایہ فی علم الروایہ کے مذکورہ بالا اقتباس میں، ان رواۃ سے اخذ روایات کا بھی ذکر ہے جو خوارج، اباضیہ، مرجئہ، قدریہ اور شیعہ میں سے تھے۔ اور ویسے بھی اس دور میں، اہل تشیع، صرف ایک سیاسی گروہ کی حیثیت رکھتے تھے، مذہب کا وہ گہرا رنگ جو آج ہمیں ان میں دکھائی دیتا ہے، اس دور میں مفقود تھا۔ اس لیے اُن کی روایات، علماءِ تاریخ نے بھی، اور ائمۂ حدیث نے بھی قبول کی تھیں، جیسا کہ درج ذیل اقتباس سے

---

❶ مروج الذہب، جلد: ۲، صفحہ: ۴۱۵۔

ظاہر ہے:

> "بنی اُمیہ کے متعلق، غلط روایات کے اندراج کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس زمانہ میں شیعہ و سنی اختلافات نے یہ شکل اختیار نہ کی تھی۔ اس کی حیثیت زیادہ تر پولیٹیکل تھی۔ اس پر مذہب کا رنگ اتنا گہرا نہ چڑھا تھا۔ اس لیے مؤرخین تو مؤرخین، محدثین تک ان کی روایات قبول کرتے تھے، چنانچہ کتب صحاح میں بھی ان کی روایتیں موجود ہیں، اس لیے بنی اُمیہ کے متعلق بھی اُن کے بیانات کتابوں میں داخل ہوگئے۔ گو شیعہ ہونا بے اعتباری کی دلیل نہیں ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ بنی اُمیہ کے بارے میں، ان کے بیانات کا کیا درجہ ہوگا۔" ①

اس پوری بحث سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہمارے دور کے علماءِ کرام کو، جس "مفکر قرآن" سے پالا پڑا ہے، وہ کس قدر دروغ گو، مقلب حقائق، منکر واقعات اور فریب کار و خیانت کار تھا۔ امت پرویز کا کوئی شخص بھی، علماء سلف کا کوئی ایسا اقتباس پیش نہیں کرسکتا جو ان کے مؤقف کی حمایت میں ہو۔

کیا جامعین صحاحِ ستہ، سب کے سب ایرانی تھے؟

مؤلفین صحاح ستہ کے متعلق، "مفکر قرآن" صاحب ...... جامعین حدیث سب ایرانی تھے ...... کے زیرِ عنوان لکھتے ہیں:

> "آپ یہ دیکھ کر حیران ہوں گے کہ (شیعہ جامعین روایات کی طرح) سنی جامعین روایات بھی سب کے سب ایرانی تھے۔

نمبر شمار	نام جامع حدیث	سن وفات	وطن	کتنی احادیث جمع کیں	ان میں سے کتنی اپنے مجموعہ میں درج کیں
1	امام محمد اسماعیل بخاری	۲۵۶ یا ۲۶۰ھ	بخارا	چھ لاکھ	۲۷۶۲ (مکررات کرنے کے بعد)

---

① تاریخ اسلام (از شاہ معین الدین ندوی)، جلد دوم، صفحہ: ۴۶، ۴۷۔

2	امام مسلم بن حجاج	۲۶۱ھ	نیشاپور	تین لاکھ	۳۸۴۸
3	امام ابو عیسیٰ محمد ترمذی	۲۷۹ھ	ترمذ	تین لاکھ	۳۱۱۵
4	امام ابوداؤد	۲۷۵ھ	سیستان	پانچ لاکھ	۴۸۰۰
5	ابوعبداللہ ابن ماجہ	۲۳۷ھ	قزوین	چار لاکھ	۴۰۰۰
6	امام عبدالرحمٰن نسائی	۳۰۳ھ	خراسان کا گاؤں نسا	دو لاکھ	۴۳۲۱

آپ غور فرمائیے کہ رسول اللہ ﷺ کی احادیث جمع کی جاتی ہیں، اور ان جامعین میں سے کوئی بھی عرب نہیں۔ سب کے سب ایرانی ہیں۔ ان جامعین کے پاس، احادیث کا کوئی تحریری مواد نہیں تھا۔ تمام احادیث، زبانی روایات کی بناء پر جمع کی گئیں۔ ❶

اِس اقتباس میں، عنوان کے علاوہ، متن میں دو دفعہ یہ کہا گیا ہے کہ جامعین صحاحِ ستہ، سب کے سب ایرانی تھے۔ ”مفکرِ قرآن“ کو جھوٹ بولتے ہوئے، نہ کبھی خوفِ خدا لاحق ہوا، اور نہ مخلوق ہی سے شرم و حیا۔ وہ جھوٹ بولتے تھے اور بار بار بتکرار بسیار بولتے تھے۔ کذب گوئی ان کی فطرت ثانیہ تھی۔ دروغ و زُور، ان کی رگ رگ میں رچ بس چکا تھا۔ یہ کوئی مبالغہ آرائی نہیں بلکہ ایک ایسی ٹھوس حقیقت ہے، جس کے شواہد سے میری تصنیف: ”جناب غلام احمد پرویز، اپنے الفاظ کے آئینے میں“ بھری پڑی ہے، اور جس میں مذکور حقائق کا کوئی جواب، منکرین حدیث میں سے، کوئی ماں کا لعل، نہ دے سکا ہے اور نہ ہی دے سکتا ہے۔ ﴿وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا ۝﴾

آیئے اب ہم ”مفکرِ قرآن“ کے اِس جھوٹ کا جائزہ لیں کہ: ”صحاح ستہ کے جامعین سب کے سب ایرانی تھے۔“

---

❶ شاہکارِ رسالت، صفحہ: ۵۰۲۔

(۱) امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ

ان کا اصل نام، محمد بن اسماعیل ہے، نہ کہ محمد اسماعیل، جیسا کہ "مفکر قرآن" نے لکھ مارا ہے۔ یہ ۲۰۲ھ یا ۲۰۴ھ یا ۲۰۶ھ میں ماوراء النہر کے مشہور شہر، بخارا میں پیدا ہوئے۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ امام بخاری کا یہ وطن، صحابی رسول، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد حکومت میں، اسلامی سلطنت کا حصہ بنا۔ ممکن ہے بعد میں یہاں سے کچھ بغاوتوں نے بھی سر اُٹھایا ہو، جس کے نتیجہ میں نمایاں فوج کشی، ولید بن عبدالملک کے عہد میں، قتیبہ بن مسلم کی زیر کمان ہوئی۔ یہ علاقہ نہ تو خلافت راشدہ ہی میں، اور نہ ہی دورِ حاضر میں ایرانی سلطنت کا حصہ رہا ہے۔ لہٰذا، امام بخاری کو ایرانی کہنا، ہمارے "قرآنی گوبلز" کا ایسا انوکھا اکذوبہ ہے، جس کے سامنے نازیوں کے گوبلز کے جملہ اکاذیب بھی ماند پڑ جاتے ہیں۔

(۲) امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ

۲۰۲ یا ۲۰۴ یا ۲۰۶ ہجری میں، خراسان کے شہر نیشاپور میں پیدا ہوئے، یقیناً اُس دور میں خراسان ایرانی سلطنت کا ایک حصہ تھا، لیکن خود امام مسلم، حسب نسب کے اعتبار سے ہرگز ہرگز ایرانی نہیں تھے۔ بلکہ فصحائے عرب میں داخل تھے، ماں اور باپ دونوں کی طرف سے عربی النسل اور نجیب الطرفین تھے۔ طلوعِ اسلام سے قبل، چودہ صدیوں پر محیط، مشاہیر کی تاریخ میں، کبھی کسی مفسر، محدث، فقیہہ، یا عالم مغازی وسیر نے، انھیں "عجمی سازش" سے متہم نہیں کیا۔

(۳) امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ

۲۰۹ھ میں، بلخ کے شہر ترمذ میں پیدا ہوئے، جو ایرانی سلطنت کی حدود سے خارج تھا۔ ولید بن عبدالملک کے عہد میں، قتیبہ بن مسلم کے زیر کمان، فتح ہو کر، یہ اسلامی قلمرو میں شامل ہوا۔ یہ شہر آج بھی دریائے آمو کے کنارے، تاجکستان میں واقع ہے۔ یہی دریا، افغانستان اور تاجکستان میں حد فاصل کا کام دیتا ہے، امام ترمذی کو ایرانی قرار دینا بھی، "مفکر قرآن" کے اکاذیب میں سے ایک اکذوبہ ہے۔

(۴۔۵) امام نسائی اور امام ابن ماجہ رحمہما اللہ

صرف یہی دو ائمہ حدیث، ایرانی تھے۔ امام نسائی کا مولد، خراسان کا شہر نسا تھا، ان کا سالِ ولادت ۲۰۴ ہجری تھا، جب کہ امام ابن ماجہ عراق عجم کے مشہور شہر، قزوین میں پیدا ہوئے، جو ایران کے صوبہ آذربائیجان میں واقع تھا۔

(۶) امام ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ

یہ ۲۰۲ ہجری میں، سجستان میں پیدا ہوئے تھے۔ اگرچہ یہ علاقہ، ایرانی سلطنت کا حصہ تھا، لیکن خود امام صاحب، نسلاً ایرانی نہیں تھے، بلکہ خالص عرب تھے۔ جب ایرانی سلطنت اور ایرانی تہذیب کا، مسلم فاتحین کے ہاتھوں خاتمہ ہوا، تو اس وقت امام ابو داؤد پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ لہٰذا، نہ انھیں ایرانی تہذیب وسلطنت کے مٹ جانے کا کوئی صدمہ پہنچا، اور نہ ہی، نتیجتاً، انھیں وہ انتقام لاحق ہوا، جسے ''مفکر قرآن'' کی قلمی چالبازیوں نے ''عجمی سازش'' کا محرک قرار دے رکھا ہے۔ پھر انھیں، ایرانی تہذیب وسلطنت سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی کہ اس کے خاتمہ پر، انھیں کوئی دکھ، درد یا انتقام لاحق ہو، جب کہ وہ خود، عربی قبیلہ ازد کے چشم وچراغ تھے۔

ان حقائق کی روشنی میں، ''مفکر قرآن'' کے اس جھوٹ کا پول کھل جاتا ہے کہ جس میں انھوں نے بتکرار بسیار یہ لکھا ہے کہ ''سب کے سب جامعین صحاح، ایرانی تھے۔'' جناب خادم حسین الٰہی بخش، اس ضمن میں فرماتے ہیں:

> ((اما ما زعمه الخصيم عن اصحاب الكتب الستة من انهم ايرانيون ، فهذا فيه تفصيل: ان اراد بذلك انهم من الفرس ولادةً ونسلًا فهذا باطل ، اذان مسلما وابا داؤدد والترمذي عرب فصحاء ، يجرى في عروقهم دم العروبة۔ وان اراد انهم ولدوا على ارض فارس فهذا مسلم به لا نزاع فيه ، لكن ما اتهم به من المؤامرة على الاسلام فهو اتهام باطل ، لا يعتمد

على دليل ولا يقبله الفكر السليم، لان الولادة والسكنى فى قطر من الاقطار لا تكوّن ضغينة من الضغائن كما ان الفتح للبلدان لا تحمل شعوبها على الكراهية للفاتح مالم يكن ظالمًا، كيف وقد جاء الاسلام وفتوحاته لازالة الظالم وتحرير الناس من عبادة العباد الى عبادة رب العباد، بل هذا من اسهام الشعوب فى التراث الاسلامى بكفاءات متنوعة.)) ❶

''رہا صحاح ستہ کے اصحاب کے ایرانی ہونے کا زعم، جسے ہمارے مخالف نے پیش کیا ہے، تو یہ محتاجِ تفصیل ہے۔ اگر اس سے اُن کی مراد یہ ہے کہ جامعین حدیث، اپنی ولادت اور نسل کے اعتبار سے ایرانی ہیں، تو یہ قطعی باطل ہے، کیونکہ امام مسلم، امام ابوداؤد اور امام ترمذی، ایسے فصیح اللسان عرب ہیں جن کی رگوں میں عربی خون گردش کرتا ہے۔ لیکن اگر مراد یہ ہے کہ مؤلفین صحاح، سرزمین ایران میں پیدا ہوئے تو یہ بات، بلانزاع، امرِ مسلّم ہے۔ لیکن ان میں سے کسی پر، اسلام کے خلاف، سازش کی تہمت لگانا، نری بہتان تراشی ہے جس پر نہ کوئی قابل اعتماد دلیل ہے، اور نہ ہی اسے عقل سلیم تسلیم کرتی ہے، کیونکہ محض کسی جگہ جنم لینا اور رہائش پذیر ہونا، کوئی کینہ پیدا نہیں کرتا، بالکل اسی طرح، جس طرح ممالک کو فتح کرنا، مفتوح جماعتوں میں ناگواری پیدا نہیں کرتا، جب تک کہ فاتحین ظلم پر نہ اُتر آئیں۔ پھر ایرانیوں میں یہ حسد و انتقام، پیدا بھی کیسے ہوسکتا ہے، جب کہ اسلام، اپنی فتوحات کے جلو میں، آیا ہی اس لیے ہے کہ ظلم وستم کا ازالہ کرے، اور لوگوں کو، لوگوں کی بندگی سے آزاد کر کے، انھیں، اُن کے رب کی عبادت میں سونپ دے، بلکہ

---

❶ والقرآنیون، صفحہ: ۲۲۱ تا ۲۲۲۔

ان مفتوحین نے مختلف انداز سے اسلامی ورثہ کی (خدمت و صیانت) میں بڑا مؤثر حصہ ڈالا ہے۔‘‘

پھر یہ بات بھی لائقِ غور اور قابلِ توجہ ہے کہ چودہ صدیوں میں، اُمت مسلمہ کے مشاہیر علم میں بڑے بڑے ذہین افراد گزرے ہیں۔ عظیم دانشور، عقیل وفہیم علماء، دقیقہ رس اور نکتہ جو فقہاء، مخفی سے مخفی علل و اسقام کو بے نقاب کرنے والے ماہرین حدیث، عظیم وکبیر صاحب فراست اور اصحاب تدبر، منصۂ شہود پر آئے، جن کی ذہانت وفراست اور تدبر و فطانت کو، اُن کے تقویٰ و تدین، امانت و دیانت اور پاکیزگی و پارسائی نے چار چاند لگادیئے، مگر اُن میں سے کسی کو بھی، اس ’’عجمی سازش‘‘ کا پتہ نہ چلا۔ اگر اس کا سراغ ملا، تو چودہ صدیوں بعد، ایک ایسے کلرک کو، جو باطل نظام کی مشینری کا کل پرزہ بنا ہوا تھا، اور جس کے معارف قرآنیہ میں، طاغوتی نظام کی چاکری کے ذریعہ، روٹی کا غلام بن کر، ’’رزق حلال‘‘ کمانا ’’معراجِ انسانیت‘‘ ہے۔ علمی مباحث میں، اپنے فکری حریفوں کی عبارتوں کو مسخ وتحریف کا نشانہ بنا کر پیش کرنا، ’’خدمت قرآن‘‘ ہے۔ بہتان تراشی، کذب بافی اور خیانت کاری جیسے ہتھکنڈے، جس کے ’’جہاد قرآنی کی شمشیریں‘‘ ہیں، وہ اس ’’عجمی سازش‘‘ کو بے نقاب کرتا ہے، جس کا عالم واقعہ میں کوئی وجود ہی نہیں، اور ایک دلیل، یہ پیش کرتا ہے کہ جامعین حدیث، سب کے سب ایرانی تھے، ان میں سے ایک بھی عرب نہیں تھا۔ اور لطف بالائے لطف یہ بات ہے کہ جس سازش کو چودہ صدیوں میں، کوئی عرب بھی نہ سمجھ سکا، اسے اب اگر کسی نے ’’سمجھا‘‘ اور ’’بے نقاب‘‘ کیا ہے، تو وہ، خود بھی عرب نہیں ہے، بلکہ خالص عجمی ہے، اپنے نام کے اعتبار سے بھی، تخلص کے لحاظ سے بھی، آداب بود و باش میں بھی، وطن ونسل، اور زبان کے پہلو سے بھی۔ نہ ان کے باپ کی طرف سے، نہ ہی ان کی ماں کی طرف سے، ان کی رگوں میں عربی خون تھا، ہاں البتہ کسی بلڈ بینک کی طرف سے ہو، تو ہم کچھ کہہ نہیں سکتے۔

پھر یہاں ’’مفکر قرآن‘‘ کے ’’دوغلہ پن‘‘ اور دُہرے معیار کی علمبرداری کو بھی ملاحظہ فرمایئے کہ وہ جملہ جامعین صحاح ستہ کو، تو، اپنے دروغ بے فروغ کے ذریعہ ’’ایرانی‘‘ قرار

دیتے ہیں۔ اور ''ایرانیت'' کو ان کے دامن کردار پر ایک ''سازشی داغ'' قرار دیتے ہیں، لیکن اپنے ممدوح معتزلہ کو، جن سے آج کے منکرین حدیث کا قارورہ ملتا ہے، کہیں بھی ''ایرانی'' مذکور نہیں کرتے، حالانکہ اگر وہ سب کے سب نہیں، تو ان کی بھاری اکثریت یقیناً ایرانی ہی تھی۔ پھر جس طرح (دورِ قدیم کے منکرین حدیث) معتزلہ، یونانی فلسفہ کے پھانہ کو اسلامی عقائد میں ٹھونکتے رہے ہیں۔ اُسی طرح اور ان ہی کی روش پر چلتے ہوئے (دورِ جدید کے معتزلہ) منکرین حدیث، اشتراکیت کو اور مغرب کی فاسد معاشرت کے اجزاء کو قرآنی تعلیمات میں گھسیڑنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اب رہا یہ امر کہ قدیم معتزلہ ''ایرانی'' تھے، تو اس پر مندرجہ ذیل اقتباس، شاہد عدل ہے:

> ''معتزلہ، یونانی منطق و فلسفہ اور ہندی فلسفہ و فارسی ادب کی شیفتہ و فریفتہ قوم تھی۔ یہ سب کے سب یا ان میں سے اکثر فارسی الاصل تھے۔ قرآن کو یونانی ادب کے قالب میں ڈھالنے کے لیے یہ اس کی تاویل کرتے تھے، جو احادیث نبویہ، یونان کے مشرکانہ فلسفہ سے ہم آہنگ نہ ہوتیں۔ وہ ان کی تکذیب کرتے تھے، وہ فلاسفہ یونان کو معصوم عن الخطاء اور عقل کے انبیاء تسلیم کرتے تھے۔'' ①

کثرتِ تعدادِ احادیث کی وحشت

''مفکر قرآن'' نے اپنی جہالت مطلقہ کی بناء پر، یا دیدہ دانستہ، محدثین کی جمع کردہ روایات کو، اور پھر ان میں سے انتخاب کردہ روایات کو، اس طرح بیان کیا ہے کہ وہ علمِ حدیث سے نابلد، سادہ لوح قارئین کے لیے، موجب وحشت اور باعث وسوسہ بن جائیں۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی یہ دیکھتا ہے کہ (مثلاً) امام بخاری نے چھ لاکھ میں سے صرف چند ہزار احادیث کو اپنی تالیف ''صحیح بخاری'' میں جمع کیا ہے، اور بقیہ کو درج نہیں کیا، تو اتنی بڑی تعداد میں روایات کا نظر انداز کیا جانا، وحشت و وسوسہ کا موجب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن ''مفکر قرآن'' کا یہ طرز تحریر، فن حدیث سے سراسر بے خبری اور ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔

---

① حدیث رسول کی تشریعی مقام از مصطفیٰ سباعی، ترجمہ از غلام احمد حریری، صفحہ: ۳۸۔

محدثین کے ہاں، تعدادِ احادیث کا لحاظ، متن حدیث کے اعتبار سے نہیں بلکہ طرق (سندوں) کی تعداد کے اعتبار سے ہوتا ہے، مثلاً اگر حضور کی فرمائی ہوئی ایک بات، بیس طریقوں (یا سندوں) سے مروی ہوئی ہے، تو اگرچہ متن کے لحاظ سے ایک ہی حدیث ہے، لیکن طرق کے لحاظ سے، اس کی تعداد بیس ہوگی، جیسا کہ مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

> ''صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایت کرنے والے حتی الوسع اس کی کوشش کرتے تھے کہ ایک ہی روایت، جن جن صحابیوں سے سننا ممکن ہو، اس میں کمی نہ کی جائے۔ اصطلاحِ حدیث میں روایت کے اس طریق عمل کا نام متابعت تھا، اور جو روایتیں اس طریقہ سے حاصل کی جاتی تھیں، یعنی ایک ہی واقعہ کو تصدیق و توثیق کے لیے، شاگرد اپنے استاد کے رفیقوں اور ہم عصروں سے بھی جو روایت کرتا ہے، ان کا نام اصطلاحاً متابعات و شواہد ہے، جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا محدثین میں توابع و شواہد جمع کرنے کا شوق زیادہ شدت پذیر ہوتا گیا۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ صرف ایک مشہور حدیث ((اِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ .)) سات سو طریقوں سے مروی ہے، یعنی حدیث ایک ہے لیکن اس کی سندیں سات سو ہیں، اور یہ عدد بھی، ایک خاص نقطۂ نظر سے ہے ورنہ اس حدیث کے طرق، دراصل اس سے بھی زیادہ ہیں۔ روایتوں میں قوت پیدا کرنے کا یہ بہترین طریقہ تھا، محدثین نے اس پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔'' ❶

''مفکر قرآن'' نے محدثین کرام کی منتخب کردہ چند ہزار احادیث کے مقابلہ میں، جن لکھوکھا احادیث کے جمع کرنے کا ذکر کیا ہے، اور پھر ان کی کثرتِ تعداد کو، ہوا بنا کر، اپنے قارئین کے قلوب و اذہان میں وسوسہ و وحشت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، اس کے بارے میں چند صفحات، آگے چل کر، مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ، پھر فرماتے ہیں:

---

❶ تدوین حدیث، صفحہ: ۲۰۶۔

"امام ابوزرعہ، جو حفاظ حدیث میں خاص امتیاز رکھتے تھے، ان کی حدیثوں کی تعداد بھی سات لاکھ بتائی جاتی ہے۔ امام بخاری کے متعلق عام طور سے لکھتے ہیں کہ انھیں دو لاکھ کے قریب تو غیر صحیح ☆ اور ایک لاکھ صحیح ☆ حدیثیں زبانی یاد تھیں۔ امام مسلم سے لوگوں نے ان کا یہ دعویٰ نقل کیا ہے کہ اپنی کتاب صحیح کے متعلق خود فرمایا کرتے تھے کہ اپنے کان سے سنی ہوئی تین لاکھ حدیثوں سے میں نے یہ مجموعہ منتخب کیا ہے۔ اس طرح مختلف لوگوں کی طرف بڑے بڑے اعداد منسوب ہیں، لیکن ان بیانوں سے عوام جو سمجھتے ہیں، کیا اُس کا مقصود بھی یہی ہے؟ بات یہ ہے کہ لوگ محدثین کی ایک اصطلاح سے چونکہ ناواقف ہیں، اس لیے انھیں حیرت ہوتی ہے، بلکہ یہ بھی وسوسہ ہوتا ہے کہ مثلاً امام بخاری کو اگر اتنی صحیح حدیثیں زبانی یاد تھیں تو پھر انھوں نے اپنی کتاب میں سب کو درج کیوں نہیں کیا؟ واقعہ یہ ہے کہ حدیث کی حفاظت و بیان کا جو روایتی طریقہ ہے، پہلے بھی میں بتا چکا ہوں کہ اس طریقہ کو مضبوط و مستحکم بنانے کے لیے، ابتداء سے متابعات و شواہد کی کثرت کا طریقہ مروّج ہو گیا تھا، یعنی ایک ایک حدیث کو، جن جن سندوں اور طریقوں سے روایت کرنا ممکن تھا، محدثین ان تمام طریقوں کو جمع کرنے کی کوشش کرتے تھے اور ان کی یہ اصطلاح تھی کہ ایک ہی حدیث کو، ان کے مختلف طریقوں کے اعتبار سے، بجائے ایک کے، طریقوں کے حساب سے شمار کرتے تھے، مثلاً: ((إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ .)) کی حدیث، جیسا کہ بیان کر آیا ہوں، واقعہ کے لحاظ سے ایک حدیث ہے، لیکن محدثین چونکہ سات سو

☆ علم حدیث کی اصطلاح میں "صحیح" سے مراد وہ حدیث ہے، جس کی سند میں صحت کی مخصوص شرائط پائی جاتی ہوں، اس سے کمتر درجے کی سندوں کے لیے وہ دوسری اصطلاحات استعمال کرتے ہیں، مگر "مفکر قرآن" جیسے علم حدیث سے ناواقف لوگ "صحیح" کے لفظ کو سچی حدیث کے معنی میں لے لیتے ہیں اور پھر یہ گمان کر لیتے ہیں کہ اس کے ماسوا جتنی حدیثیں ہیں، سب جھوٹی ہیں۔

① تدوین حدیث، صفحہ: ۵۳ تا ۵۴۔

طریقوں سے اسے روایت کرتے ہیں، اس لیے، بجائے ایک کے، صرف اسی ایک حدیث کی تعداد سات سو ہو جاتی ہے، اور یہ کسی ایک حدیث کا نہیں، بلکہ حدیث کے بیشتر حصہ کا یہی حال ہے۔ حدیثوں کے ان عجیب وغریب اعداد کی بنیاد ایک تو یہ ہے، دوسرے، پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ گو ابتداء میں حدیث، جس کے لفظی ولغوی معنی بات کے ہیں۔ اس کا اطلاق محض آنحضرت ﷺ کے ملفوظاتِ طیبہ پر کیا جاتا تھا، مگر پھر اس میں وسعت پیدا ہوئی اور آپ ﷺ کے افعال وتقریرات کو بھی اس کے نیچے درج کیا گیا۔ اسی طرح رفتہ رفتہ اطلاق میں اور کشادگی پیدا ہوئی اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے اقوال وفتاویٰ اور فیصلوں، بلکہ تابعین و تبع تابعین تک کی چیزوں کو بھی لوگوں نے حدیث کے نیچے داخل کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اس وجہ سے قدرتاً حدیثوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے، لیکن عامی خیال کرتے ہیں کہ یہ براہِ راست رسول اللہ ﷺ کی حدیثوں کی تعداد ہے۔ صاحب توجیہ النظر لکھتے ہیں:

ان کثیرا من المتقدمین کانوا یطلقون اسم الحدیث علیٰ ما یشتمل اثار الصحابة والتابعین وتابعیهم وفتاوٰهم ویعدون الحدیث المرویّ باسنادین، حدیثین۔ [ص:۹۳]	متقدمین کی بڑی جماعت، عموماً حدیث کے لفظ کا اطلاق ایسے عام مفہوم پر کرتی تھی، جس میں صحابہ، تابعین، تبع تابعین کے آثار وفتاویٰ سب ہی داخل ہیں۔ نیز ایک ہی حدیث، جو دو سندوں سے مروی ہوتی، اُسے وہ دو حدیث قرار دیتے تھے۔ ❶

الغرض، احادیث کی تعداد، ان کے متون کے لحاظ سے نہیں، بلکہ طرق (سندوں) کی تعداد کے لحاظ سے متعین ہوا کرتی تھی، اس حقیقت کو، مولانا گیلانی مرحوم، ابن جوزی کے حوالے سے، اقتباس بالا کے متصل ساتھ ہی یوں بیان فرماتے ہیں:

اور یہی مراد ہے ابن جوزی کے اس فقرے سے جو حدیثوں کے ان اعداد کو درج

---

❶ تدوین حدیث، صفحہ: ۵۳ تا ۵۴۔

کرنے کے بعد، لکھتے ہیں کہ:((ان المراد بھذا العدد الطرق لا المتون .)) [تلقیح، ص: ۱۸۷] ...... "یعنی ان اعداد سے مقصد، حدیثوں کے متن کی تعداد نہیں ہے، بلکہ ان کے طریقے اور اسناد مراد ہیں۔" ❶

یہ ہے حقیقت، ان لاکھوں احادیث کی، جن کی تعداد کو ہوا بنا کر پیش کیا جاتا ہے، اور پھر تاثر دیا جاتا ہے کہ اتنی بڑی تعداد کا نظر انداز کیا جانا، یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ سب غلط احادیث تھیں، اور جن کو محدثین نے اپنی کتب میں درج کیا ہے، صرف وہی ان کے نزدیک صحیح تھیں۔

جملہ معترضہ، بابت صحیفہ ہمام ابن منبہ

صحیفہ ہمام ابن منبہ کا ذکر، اگرچہ شاہکارِ رسالت کے اُس (آخری) باب میں نہیں ہے، جسے "مفکر قرآن" نے اپنی مزعومہ "عجمی سازش" کے لیے، وقف کر رکھا ہے، لیکن حدیث کے حوالہ سے منکرین حدیث کی بالعموم، اور "مفکر قرآن" کی بالخصوص، علمی بے بضاعتی نے، اور پھر اس پر مستزاد، ان کی ضد، ہٹ دھرمی اور سینہ زوری نے، جو کچھ ان کے قلم سے اگلوایا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ اس کا جائزہ بھی، یہیں ہی لے لیا جائے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ عہد نبوی، (جو فی الواقع عہد صحابہؓ کے آغاز اور کمال کا بھی دور ہے) ہی میں، مقولاتِ پیغمبرؐ، معمولاتِ رسولؐ اور تقریرات نبیؐ کو، صحیفوں اور سینوں میں محفوظ رکھنے کا اہتمام ہو چکا تھا۔ اور وفاتِ رسولؐ کے ساتھ ہی، عہد تابعین آغاز پذیر ہو چکا تھا۔ یہ دور، جوں جوں، اپنے شباب اور کمال کو پہنچتا چلا گیا، توں توں، تعدادِ صحابہ قلیل و کم تر ہوتی چلی گئی۔ اُن سے سارے کا سارا علم اخذ کر لینے کا جذبہ شوق، تابعین میں اُسی نسبت سے فزوں تر ہوتا چلا گیا، جس نسبت سے صحابہ کرام، دار الفناء سے دار البقاء کی طرف منتقل ہو رہے تھے، عامۃ الناس کا یہ سمجھنا، یا چند ہشیار و چالاک لوگوں کا اُنھیں ایسا باور کروانا، کہ آخری صحابی کی وفات کے بعد ہی، تابعین کا دور شروع ہوتا ہے، ایک غلط فہمی ہے جسے صرف اس لیے اچھالا جاتا ہے کہ تدوین حدیث کی کوششوں میں، کم از کم ایک صدی کا فترت ظاہر کیا جائے، حالانکہ حقیقت یہ

---

❶ تدوین حدیث، صفحہ: ۵۵۔

ہے کہ صحابہ کا علم حدیث، خواہ ان کے صحیفوں میں تھا، یا سینوں میں، وفاتِ نبیؐ کے ساتھ ہی، تابعین کی طرف منتقل ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اور پھر اسی طرح، بغیر کسی انقطاع کے، صحابہ سے نچوڑا ہوا تابعین کا پورا علمی سرمایہ، تبع تابعین تک پہنچ گیا، تاآنکہ وہ مستقل طور پر، کتب احادیث میں مجموع و مدوّن ہو گیا، اور عہد نبوی سے لے کر تدوین حدیث کے آخری مراحل تک، ایک لمحہ کا بھی انقطاع نہیں ہوا، جس میں احادیث، حفظ و کتابت کے ذریعے محفوظ نہ رہی ہوں، جیسا کہ مولانا مناظر احسن گیلانی فرماتے ہیں:

> "عملی تواتر اور روایت، ان دو ذریعوں کے سوا، حدیث کی کوئی معمولی مقدار نہیں، بلکہ اس وقت ہمارے پاس، اس تاریخ کا جو ذخیرہ موجود ہے، اس کا غالب ترین حصہ، (کم از کم نمبر اوّل کی صحیح حدیثوں کی جو تعداد ہے) خود اس کے عینی شاہدوں کے زمانہ میں زیادہ تر ان ہی کے ہاتھوں سے قید تحریر میں آ چکا تھا اور اس کے بعد، اس دعوے پر یہ اور اضافہ کرتا ہوں کہ ان واقعات کا ایک بڑا جز، جس طرح تواتر کے ساتھ، مسلمانوں میں منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے، اور روایت کے متابعاتی اور شواہدی طریقوں سے جس طرح یہ موجودہ شکل میں آیا ہے، ٹھیک اسی طرح اپنے چشم دید گواہوں کے زمانہ سے قید تحریر میں آ کر مسلسل اسی طرح کتابی شکل میں باقی رہا اور اب تک باقی ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ کسی کو یہ شبہ نہ ہو، کہ ممکن ہے ابتداء میں بعض لوگوں نے حدیث کے بعض ذخیروں کو لکھ لیا ہو، لیکن بعد کو یہ کتابی ذخیرے ضائع ہو گئے ہوں، اور درمیان میں پھر زبانی روایت پر اس کا دارومدار رہ گیا ہو، اور آخر میں لوگوں نے اسے پھر قلمبند کیا۔ ایسا سمجھنا بھی قطعاً واقعات کے خلاف ہے، بلکہ جس طرح گلستاں جب سے سعدی نے لکھی، اور اب تک درمیان میں غائب ہوئے بغیر، اسی کتابی شکل میں منتقل ہوتی چلی آ رہی ہے، یعنی اس کتاب پر ایسا کوئی زمانہ نہیں گزرا کہ دنیا سے بالکلیہ ناپید ہو گئی ہو اور پھر لوگوں نے اپنے حافظوں کے ذریعہ سے اسے دوبارہ قید تحریر میں لایا ہو،

جیسا کہ تورات وغیرہ کے متعلق، ایک دفعہ نہیں، بار بار یہ واقعہ پیش آتا رہا ہے کہ تین تین سو، چار چار سو سال کے لیے اس کا تحریری سرمایہ ناپید ہوگیا، اور پھر سینوں سے اس کو سفینوں میں لانے کی کوشش کی گئی، حدیث کے اس کتابی ذخیرہ پر، الحمد للہ، یہ حادثہ کبھی نہیں گزرا۔" ①

اس پر "مفکر قرآن" کا یہ کہنا کہ حدیثیں، وفاتِ رسولؐ کے صدیوں بعد وضع کی گئی تھیں، ایک ایسا جھوٹ ہے، جسے انھوں نے گوبلز کے اس مقولے پر عمل کرتے ہوئے، بار بار دہرایا ہے کہ:

> "جھوٹ کو اگر سو دفعہ دہرایا جائے، تو وہ سچ بن جاتا ہے۔" ②

اس جھوٹ کا پول، صحیفہ ہمام ابن منبہ کی دریافت نے کھول دیا ہے۔ یہ دورِ صحابہ میں، ایک تابعی کا لکھا ہوا وہ مجموعۂ حدیث ہے جسے ہمام ابن منبہ نے اپنے استاد (اور صحابی رسول) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی زندگی ہی میں لکھ لیا تھا۔ اس کا نام، خود ان کے ہاں الصحیفہ الصحیحہ تھا، اگرچہ وہ مشہور و معروف، صحیفۂ ہمام ابن منبہ ہی کے نام سے ہے۔ چونکہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی وفات ۵۸ ہجری میں ہوئی تھی، اس لیے یہ صحیفہ اس سے پہلے کا تحریر شدہ ہے۔ اس کے دو قلمی نسخے، ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم نے برلن اور دمشق سے ڈھونڈ نکالے، اور اس صحیفہ کو زیورِ طباعت سے آراستہ کرکے، چار دانگ عالم میں پھیلا دیا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے، مولانا عبدالماجد دریابادی نے "صدقِ جدید" لکھنؤ میں، یہ فرمایا:

> "حجیت حدیث کے منکرین کی طرف سے شد و مد سے کہا جاتا ہے کہ حدیثوں کا اعتبار ہی کیا۔ وفات رسول ﷺ کے اڑھائی تین سو سال بعد تو کہیں ان کی کتابت شروع ہوئی ہے............ کتاب کا اصل نام "الصحیفہ الصحیحہ" تھا، (جس طرح حضرت عبداللہ بن عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہ کے

---

① تدوین حدیث، صفحہ: ۵۲ تا ۵۳۔

② طلوع اسلام، ستمبر ۱۹۶۰ء، صفحہ: ۶۹۔

جامعہ بیت العتیق (رجسٹرڈ)
کتاب نمبر

> مجموعہ کا نام " الصحیفة الصادقة " تھا) احادیث کی تعداد کل ۱۳۸ ہے۔ عموماً مختصر ہی ہیں اور جیسا کہ مرتب نے مقدمہ میں لکھ دیا ہے کہ سب کی سب ایسی ہیں جو مسند احمد بن حنبل اور صحیح بخاری وغیرہ میں آ چکی ہیں۔ (صدق جدید لکھنو، ۱۸ ستمبر ۱۹۵۳ء) ❶

اس پر "مفکر قرآن" صاحب سٹپٹا اُٹھے، اس کشف حقیقت سے مزاج میں انقباض پیدا ہوا، پاؤں تلے سے زمین سرکتی ہوئی محسوس ہوئی، تو اُنھوں نے اپنے باطل مؤقف کے ہاتھی کو، انکارِ حدیث کی منزل تک پہنچانے کے لیے، دریائے حقیقت پر تنکوں کا پل یوں تعمیر کیا:

> آپ نے غور فرمایا کہ ان مولوی صاحب کو کون سا ایٹم بم مل گیا ہے جس کے زور پر انھوں نے سمجھ لیا ہے کہ منکرین حدیث کے تمام قلعے مسمار ہو گئے ہیں۔ انھیں حدیث کی ایک کتاب مل گئی ہے جو پہلی صدی ہجری کی تدوین ہے اور جس میں ایک دو نہیں، اکٹھی ایک سو اڑتیس احادیث ہیں۔ ❷

حالانکہ فی الواقع، یہ ایٹم بم ہے جس نے انکارِ حدیث کی پوری عمارت کو بھک سے اُڑا کر پیوند خاک کر ڈالا ہے۔ اور منکرین حدیث کے تمام دعاوی کو خاک میں ملا دیا ہے۔ اس لیے کہ ان لوگوں کا سرمایۂ دعاوی ہی یہ ہے کہ کوئی کتاب بھی دورِ صحابہ میں مدون نہیں ہوئی، صحابہ اور تابعین کے ہاں، سرے سے کوئی تحریری ذخیرۂ حدیث تھا ہی نہیں، یہ سب کچھ تو زبانی روایات کے ذریعہ اڑھائی تین سو سال بعد، عباسی دور میں مجموع و مدون ہوا۔ اس لیے کہ (بقول ان کے) حضور ﷺ نے کتابت حدیث سے منع کر رکھا تھا، اور صحابہ رضی اللہ عنہم ایسے نہ تھے کہ حضور ﷺ کا یہ حکم نہ مانتے۔ پھر خلفاءِ راشدین تو (بقول ان کے) ہاتھوں میں کوڑے لیے، کاتبین احادیث کا تعاقب کیا کرتے تھے۔ اور صحابہ رضی اللہ عنہم، احادیث کو مٹاتے اور جلاتے رہے۔ اور پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تو (بقول ان کے) تمام قلمرو سے نوشتہ ہائے احادیث اکٹھے کیے اور پھر ان کے انبار کو نذرِ آتش کر دیا۔ ان تمام دعاوی کو، صحیفہ ہمام ابن

---

❶ طلوع اسلام، نومبر ۱۹۵۳ء، صفحہ: ۴۶ تا ۴۷۔

❷ طلوع اسلام، نومبر ۱۹۵۳ء، صفحہ ۴۷۔

منبہ نے پانی کا بلبلہ ثابت کر ڈالا، تاریکی کی دلدادہ چمگادڑیں، اس نورِ حقیقت کی تاب نہ لا سکیں۔ اور اس ٹھوس حقیقت کا سامنا، مشرکین مکہ کی روش پر چلتے ہوئے، استہزاء و تمسخر کے ساتھ کیا، اور بایں الفاظ مذاق اُڑاتے ہوئے، اور ملاحیاں سناتے ہوئے کہا کہ؛

> معلوم نہیں، اسے ابلہ فریبی کہا جائے یا خود فریبی۔ جو لوگ اس قسم کی بچوں کی سی باتیں کرتے رہتے ہیں، اور اتنا بھی نہیں سوچ سکتے کہ جو بات اس شد و مد سے پیش کی جا رہی ہے، وہ خود اپنے ہی خلاف تو نہیں جاتی۔ ❶

''مفکرِ قرآن'' کی یہ مستقل عادت تھی کہ وہ اپنی غلط حرکات پر پردہ ڈالے رکھنے کے لیے، ان حرکات کا مرتکب اپنے مخالفین کو قرار دے کر، ان کے خلاف بھرپور پراپیگنڈہ کیا کرتے تھے۔ وہ ''کرو خود، مگر الزام دوسروں پر لگاؤ'' کی پالیسی اپنائے ہوئے تھے۔ وہ جھوٹ خود بولا کرتے تھے مگر الزام دوسروں پر لگایا کرتے تھے، وہ قرآن کے نام پر خود باطل پرست تھے مگر الزامِ باطل پرستی اپنے حریفوں پر دھرا کرتے تھے۔ وہ خود بہتان تراش تھے مگر اس قبیح عادت کو منسوب، دوسروں کی طرف کیا کرتے تھے۔ وہ خود تضاد گو تھے، مگر اپنی اصلاح کرنے کی بجائے، وہ دوسروں کو ایسا کہا کرتے تھے۔ وہ خود خیانت کار تھے، مگر اس کا الزام، اپنے مخالفین پر عائد کیا کرتے تھے۔ وہ خود ابلہ فریبی اور خود فریبی، دونوں میں مبتلا تھے، مگر دوسروں کو اس کا شکار بتایا کرتے تھے، ''ٹھوس حقیقت'' سے آنکھیں چرا کر، اور وہم و گمان پر مبنی نظریات کو، ''ثابت شدہ سائنسی حقائق'' مان کر، ''بچوں کی سی حرکات'' خود کیا کرتے تھے، مگر ان حرکات کو، وہ، اپنے مخالفین کے کھاتے میں ڈال دیا کرتے تھے۔ چنانچہ ''مفکرِ قرآن'' کی اس ابلہ فریبی اور خود فریبی کو بھی ملاحظہ فرمائیے، جس میں، بچوں کی سی حرکت کا مظاہرہ، چند اوہام و وساوس کی بنیاد پر کیا ہے، اور بایں الفاظ کیا ہے

> ذرا غور کیجیے کہ ایک شخص پہلی صدی ہجری میں، بلکہ ۵۸ ہجری سے پہلے، مدینہ میں بیٹھ کر، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی شاگردی میں، احادیث کا مجموعہ مرتب کرتا

---

❶ طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۵۳ء، صفحہ: ۴۷۔

> ہے، اور اسے کل ۱۳۸ احادیث ملتی ہیں (یاد رہے کہ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کو ابھی قریب چالیس برس ہوئے ہیں، اور مدینہ میں بیشتر صحابی موجود ہیں۔ ان میں سے احادیث کے بہت بڑے راوی حضرت ابو ہریرہؓ کے زیر تلمذ، مجموعۂ حدیث مرتب ہوتا ہے، اور اِس میں کل ۱۳۸ احادیث درج ہوتی ہیں) اس کے دو سو سال بعد، ایک صاحب، بخارا سے آتے ہیں، اور انھیں چھ لاکھ حدیثیں مل جاتی ہیں۔

اب ذرا اس برہانِ رفیع اور استدلال بدیع پر غور فرمایئے، جس کی بنیاد، صرف اور صرف اوہام و وساوس اور بے بنیاد مفروضوں پر رکھی گئی ہے، جن میں سے چند ایک بالکل واضح اور نمایاں ہیں۔ مثلاً ...... ☆۱ یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم کے ہاتھوں، ہمام ابن منبہ کا جو صحیفہ دریافت ہوا ہے، اس (ایک) کے علاوہ، ان کا کوئی اور نوشتہ موجود ہی نہیں ہے۔ اور یہ بات بھی، گویا دریافت شدہ صحیفہ میں، ہمام ابن منبہ نے لکھ ڈالی ہے کہ میرا، اوّل و آخر، بس یہی ایک صحیفہ ہے جو صرف ۱۳۸ احادیث ہی پر مشتمل ہے۔ ☆۲ یہ بھی فرض کرلیا گیا ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس، بس یہی ۱۳۸ احادیث تھیں، جو ہمام ابن منبہ نے ان سے لے کر قلمبند کرڈالیں، ان کے علاوہ ان کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ ☆۳ اور یہ بھی بطورِ "اصول موضوعہ" فرض، کیا معنی، بلکہ یقین کرلیا گیا ہے کہ ہمامؒ ابن منبہ کے سوا، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا کوئی اور شاگرد تھا ہی نہیں، جو کچھ لکھ پاتا۔ بس یہی ان کے اکلوتے شاگرد تھے، جو اپنے استاد کے علمِ کل کے وارث اور محافظ تھے۔ ☆۴ اور ان سب سے آگے بڑھ کر، یہ موہومہ اور یہ مفروضہ، کہ گویا، نہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے سوا، کوئی اور صحابی تھا، جو سُننِ رسول ﷺ کا محافظ اور ناقل ہوتا، اور نہ ہی، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے اس شاگرد (ہمامؒ بن منبہ) کے علاوہ، (کسی اور صحابی رضی اللہ عنہم کا) کوئی شاگرد تھا، جو ان سے سرمایۂ علمِ حدیث حاصل کرتا، اور پھر اسے اگلی نسل تک منتقل کرتا۔

یہ ہے، مفروضوں کی بنیاد پر، دریافت شدہ ٹھوس حقائق کا مقابلہ کرنے کا اندازِ پرویز......

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں ...... ایک طرف، یہ ابلہ فریبی اور خود فریبی ہے، جس میں بچوں کی سی حرکت کرتے ہوئے، صحیفہ ہمام ابن منبہ کے ردّ کی کوششیں ہیں، اور دوسری طرف، اسی ابلہ فریبی اور خود فریبی ہی کا یہ شاہکار ہے کہ مغرب سے ایک ملحد، اور خدا کا دشمن و باغی اُٹھتا ہے، اور وہ "اڑھائی تین سو سال" کی نہیں، بلکہ ہزار ہا سال کی پرانی، بوسیدہ، خاک خوردہ، قدیم اور کرم خوردہ ہڈیاں تلاش کرتا ہے، اور خالص وہم وگمان کی بنیاد پر، بوسیدہ ہڈیوں کے ساتھ، اپنے لفاظی کا مرکب پیش کرتا ہے، اور اسے "ارتقاء کا نظریہ" قرار دیتا ہے۔ ...... (نظریہ، نہ کہ ثابت شدہ حقیقت) ...... اور ہمارے "مفکر قرآن" صاحب، اسے وحی کی طرح قبول کر لیتے ہیں، حالانکہ یہ محض ایک ایسا نظریہ ہے جو نہ تو کوئی ثابت شدہ حقیقت ہے اور نہ ہی اسے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ (Neither A Proven fact Nor A Provable Thing)۔ لیکن عقل و دانش کے علمبردار، سات سات سو اسنادی طریقوں سے مروی حدیث کو تو ظنی اور ناقابل اعتبار و اعتماد قرار دیتے ہیں، لیکن نظریۂ ارتقاء کو، جو نظریہ کی حد سے آگے نہیں بڑھ سکا، وحی آسمانی سمجھتے ہیں۔ اور پھر "مفکر قرآن" صاحب، اس کوشش میں جت جاتے ہیں کہ قرآنِ کریم کے مختلف مقامات کی عبارتوں میں سے، کہیں کی اینٹ اور کہیں کا روڑہ لے کر، بھان متی کا وہ کنبہ جوڑ دیں، جس سے ارتقاء کا نظریہ، ایک "قرآنی حقیقت" بن جائے۔ سچی بات ہے کہ:

دل نہ چاہے، تو رسالت کا بھی ارشاد غلط   من کو بھا جائے تو بھانڈوں کی خرافات بجا

امام بخاری کی چھ لاکھ احادیث

اب رہی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی چھ لاکھ احادیث والی بات! تو سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لیجیے کہ صحیفۂ ہمام ابن منبہ کی کتابت سے لے کر، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ تک، مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ، سلسلہ رواۃ کی کڑیوں میں اضافہ ناگزیر تھا، اور پھر احادیث کا شمار بھی، اُن کے ایک ایک متن کے لحاظ سے نہیں، بلکہ اس کے متعدد طریقوں (سندوں) کے لحاظ سے کیا جاتا تھا۔ اس لیے طرقِ احادیث کے بڑھنے کے ساتھ، تعدادِ احادیث کا بڑھ جانا بھی،

فطری امر تھا، بالکل اُسی طرح، جس طرح پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اگر چہ ((إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ .)) کے الفاظ پر مشتمل حدیث، واقعہ کے اعتبار سے ایک ہی حدیث ہے، لیکن چونکہ یہ واحد حدیث، سات سو طرق (اسناد) سے مروی ہے، اس لیے اس کی تعداد، سات سو تسلیم کی جاتی ہے، مزید برآں، حدیث کے اطلاق میں وسعت اور کشادگی کے باعث بھی، تعداد میں اضافہ، بدیہی امر تھا۔ اس لیے ان دونوں وجوہات کے باعث، مکررات اور متابعات وشواہد سمیت، امام بخاری کی مجموعی تعدادِ احادیث، چھ لاکھ مذکور ہے۔

”مفکرِ قرآن“ کی ”حسن نیت“ اور خارزارِ تضادات

اب اس کے بعد، ”مفکرِ قرآن“ کی ”حسن نیت“ بھی ملاحظہ فرمایئے، کہ یہاں چونکہ کثرتِ حدیث کا ہوا دکھلانا، ان کے پیش نظر تھا۔ اس لیے فرمایا کہ:

> ایک صاحب، بخارا سے آتے ہیں، اور انھیں چھ لاکھ حدیثیں مل جاتی ہیں، جن میں سے وہ قریب سات ہزار کو اپنے مجموعہ میں داخل کر لیتے ہیں۔ ❶

اور انہی امام بخاری کی، اپنے مجموعہ احادیث میں درج شدہ حدیثوں کی تعداد، ایک دوسرے مقام پر، اس سے مختلف بتاتے ہیں:

> امام بخاری (المتوفی ۲۵۶ ہجری) نے قریب چھ لاکھ احادیث اکٹھی کیں، اور ان میں سے کانٹ چھانٹ کر، جو مجموعہ تیار کیا، اس میں مکررات حذف کر دینے کے بعد، دو ہزار چھ سو تیس احادیث ہیں۔ ❷

اور پھر تیسرے مقام پر (شاہکارِ رسالت، صفحہ: ۵۰۲ پر)، یہ تعداد، بارِ دِگر بدل کر، (۲۶۳۰ کی بجائے) ۲۷۶۲ ہو جاتی ہے۔

اب غور فرمایئے کہ امام بخاری کے مجموعہ میں داخل احادیث کی تعداد، کبھی تقریباً سات ہزار، کبھی ۲۶۳۰، اور کبھی ۲۷۶۲ (بعد از حذفِ مکررات) بیان کی جاتی ہے۔ اور یہ ہر مقام پر

---

❶ طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۵۳ء، صفحہ: ۲۷۔

❷ مقامِ حدیث، صفحہ: ۱۱۔

بدلتی ہوتی تعداد، اس حقیقت کو واضح کر دیتی ہے کہ "مفکر قرآن" صاحب، خواہ کتنے ہی چوکنے ہو کر، بیدار مغزی کے ساتھ، جھوٹ بولیں، وہ بہر حال، دوام کے ساتھ، اپنے دروغ کو نباہ نہیں سکتے۔ کہیں نہ کہیں، کوئی ایسی بات، ان کے قلم سے نکل ہی جاتی ہے جو ان کے کذب و زُور کا پول کھول دیتی ہے، اور اس کے ساتھ ہی، ان کے تضادات و تناقضات کو بھی مبرہن کر ڈالتی ہے۔ تصنع کے ساتھ، آخر کاٹھ کی یہ ہنڈیا، کب تک جلتے چولہے پر رہ سکتی ہے؟ تصنع اور حقیقت کا فرق، بالآخر، واضح ہو ہی جاتا ہے، خود "مفکر قرآن" صاحب لکھتے ہیں:

> مگر حقیقت اور تصنع میں ایک فرق ضرور ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت کے بیان میں کبھی تعارض و تناقض نہیں ہوتا۔ کسی واقعہ کی جزئیات، آپ جس قدر زیادہ سے زیادہ بیان کرتے چلے جائیں گے، کڑیوں سے کڑیاں ملتی چلی جائیں گی، لیکن جو بات واقعہ کے خلاف گھڑی جائے گی، اس کی جزئیات بیان کرتے وقت، کہیں نہ کہیں سچی بات بھی منہ سے نکل ہی جاتی ہے، اس لیے کہ انسان کا حافظہ اتنا قوی نہیں ہوتا کہ وہ قدم قدم پر زندگی بھر، اپنے تصنع کا خیال رکھ سکے۔ لہٰذا، اس کی جزئیات میں آپ کو تعارض و تناقض کے بہت ہی بھونڈے نمونے نظر آئیں گے۔ ❶

صرف اسی مقام پر، مجموعۂ بخاری میں درج احادیث کی تعداد کے حوالے ہی سے نہیں، بلکہ "مفکر قرآن" کے پورے لٹریچر میں، ان کے "تعارض و تناقض کے بہت ہی بھونڈے نمونے نظر" آتے ہیں۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے میری کتاب "جناب غلام احمد پرویز، اپنے الفاظ کے آئینے میں")

بہر حال، بات ہو رہی تھی، صحیفہ ہمام بن منبہ کی دریافت پر، "مفکر قرآن" کے پیچ و تاب کی، کہ یہ کون سا ایٹم بم ہے کہ جس سے منکرین حدیث کے قلعے (بقول ان کے) مسمار ہو جائیں۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ اس کی دریافت نے، منکرین حدیث کے تمام دعاوی کو

---

❶ طلوع اسلام، جون ۱۹۵۳ء، صفحہ: ۳۹۔

خاک میں ملادیا ہے۔ اس صحیفہ کی ۱۳۸ نہیں، بلکہ صرف ۳۸ ہی احادیث ہوتیں، تب بھی یہ ایک ایٹم بم ہی تھا، جو ان کے اس دعویٰ کو بھسم کر ڈالتا کہ...... ''وفاتِ رسول ﷺ کے قریب اڑھائی سو سال بعد، بغیر کسی سابقہ تحریری ریکارڈ کے، لوگوں کی زبانی سن کر روایات جمع کی گئیں'' ...... لیکن چونکہ ''مفکرِ قرآن'' پہلے سے یہ ''عقیدہ'' اپنا چکے ہیں کہ جو چیز، قرآن میں نہیں، وہ سرے سے اسلام ہے ہی نہیں۔

> " What is not there, is not Islam." ❶

اس لیے، ۵۸ ھ کی بجائے، اگر اس سے بھی پہلے کا صحیفہ مل جاتا، اور وہ کسی تابعی کا نہیں، بلکہ صحابی کا بھی لکھا ہوا ہوتا، تب بھی ''مفکرِ قرآن'' کے لیے، وہ قابلِ قبول نہ ہوتا۔

> ۵۸ ھ چھوڑ، سنہ ۱۸ ھ کا بھی کوئی مجموعۂ حدیث، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے شاگرد نہیں، بلکہ خود حضرت ابوہریرہ کا بھی مل جائے، تو بھی وہ دین نہیں بن سکتا۔ ❷

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، تو پھر بھی صحابی ہیں، اگر جبریل و میکائیل بھی، آسمان سے اتر کر، کوئی قولِ رسولؐ، عملِ پیغمبرؐ یا تقریرِ نبیؐ، پیش کریں، تو چونکہ وہ بھی، خارج از قرآن ہی ہوں گے، اس لیے وہ بھی، ناقابلِ قبول ہوں گے:

> ہمارے نزدیک، دین کا معیار فقط کتاب اللہ ہے، جو عقیدہ یا تصور، اس کے مطابق ہے، وہ صحیح ہے اور جو اس کے مطابق نہیں، وہ بلاتامل و تذبذب، غلط اور باطل ہے، خواہ اس کی تائید میں ہزاروں حدیثیں بھی ایسی کیوں نہ پیش کر دی جائیں، جس کے راویوں میں جبرائیل و میکائیل تک کا نام بھی شامل کر دیا گیا ہو۔ ❸

اب رہا وہ رسولؐ، جس کے ذریعہ سے یہ کتاب بھیجی گئی، تو اس کی تو (معاذ اللہ) کوئی دینی حیثیت ہی نہیں، وہ محض ایک ڈاکیہ تھا، جس نے اللہ میاں سے، قرآن کی ڈاک لے کر،

---

❶ طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۸۲ء، صفحہ: ۳۹۔

❷ طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۵۳ء، صفحہ: ۴۸۔

❸ طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۵۳ء، صفحہ: ۳۷۔

بندوں تک پہنچا دی۔ نہ اس کی (استغفر اللہ) کوئی دینی حیثیت تھی، نہ وہ شارح کتاب تھا، نہ وہ اہل ایمان کے لیے اسوہ حسنہ تھا کہ اس کی پیروی کی جاتی۔ اللہ میاں نے، قادر مطلق ہونے کے باوجود، خواہ مخواہ یہ فعل عبث کیا کہ کتاب (جو تنہا ہی دینی حیثیت کی حامل ہے) براہ راست لوگوں تک پہنچانے کی بجائے، نبی ﷺ کے واسطہ سے پہنچائی، اور پھر خواہ مخواہ (العیاذ باللہ) اُس نبی کی پیروی کے ساتھ، حصولِ ہدایت کو مشروط کیا۔ نعوذ بالله من هذه الخرافات۔

(۴۸) عباسیوں کی محبت

”مفکر قرآن“ صاحب، مؤلفین صحاح ستہ کو ”عجمی سازش“ کی ایک کڑی قرار دے ڈالنے کے بعد، یہ لکھتے ہیں کہ کتب صحاح میں، ایسی احادیث بھی شامل ہیں، جو نسلی امتیاز کی تعلیم دیتی ہیں، چنانچہ ”عباسیوں کی محبت“ کا ایک عنوان قائم کرتے ہیں، اور تمہیداً لکھتے ہیں کہ کتب احادیث میں جس قسم کی روایات درج ہیں، اس کی مثالیں پیش کرنے کا تو یہ مقام نہیں، البتہ:-

> یہاں اتنا لکھ دینا کافی ہوگا کہ یہ احادیث، عباسیوں کے عہد میں جمع ہوئیں، اس لیے ان میں اس قسم کی روایات موجود ہیں کہ...... ”حضور ﷺ نے فرمایا کہ کسی شخص کے دل میں، اس وقت تک ایمان داخل نہیں ہوسکتا، جب تک وہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد سے محبت نہ رکھے“...... ①

اس حدیث کا حوالہ، متنِ اقتباس میں، توجیہ النظر صفحہ ۱۷، اور جامع البیان دیا گیا ہے، اور نیچے حاشیہ میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ

> تفسیر ابن کثیر میں بھی اس روایت کو نقل کیا گیا ہے۔
>
> (پچیسواں پارہ، تفسیر سورہ شوریٰ، ص ۱۳) ②

جہاں تک تفسیر ابن کثیر کا تعلق ہے، تو اس میں ایسے الفاظ کے ساتھ، کوئی روایت ہرگز ہرگز موجود نہیں ہے، جن کا ترجمہ، وہ کچھ ہو، جو ”مفکر قرآن“ نے مندرجہ بالا عبارت میں پیش

---

① شاہکار رسالت، ص ۵۰۳۔ ② شاہکار رسالت (حاشیہ)، ص ۵۰۳۔

کیا ہے۔ خود جامع ترمذی میں بھی، جہاں سے یہ روایت لی گئی ہے، اس مفہوم کی کوئی حدیث موجود نہیں ہے۔ اب رہی جامع البیان، تو نہ تو اس کتاب کا پورا نام درج کیا گیا ہے، اور نہ ہی اس کا باب، یا صفحہ نمبر دیا گیا ہے۔ پھر یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ ”مفکر قرآن“ نے جامع البیان کے نام سے، جس کتاب کا حوالہ دیا ہے، اُس سے مراد، ابن عبدالبر کی جامع بیان العلم وفضلہ ہے یا کوئی اور کتاب۔ ابن عبدالبر کی کتاب مذکور میں مجھے اس مفہوم کی حدیث کہیں نظر نہیں آئی۔ اس کے بعد، اب آیئے، توجیہ النظر کی طرف، جس کا صفحہ ۱۷ کا حوالہ دیا گیا ہے، تو اس میں بھی کوئی ایسی حدیث قطعاً موجود نہیں ہے جس میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور ان کی محبت کو، شرطِ ایمان قرار دیا گیا ہو۔ یہ سب کچھ ”مفکر قرآن“ نے، حسبِ عادت، بر بنائے خیانت، فرما دیا ہے۔ جامع ترمذی کی جس روایت پر، کذب و خیانت کے ساتھ، یہ قصر دروغ تعمیر کیا گیا ہے، اس کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے:

”عن عبد الملك ابن ميسرة قال سمعت طاؤسًا قال سئل ابن عباس عن هذه الآية قل لا اسئلكم عليه اجر الا المودة فى القربٰى فقال سعيد بن جبير قربٰى اٰل محمد فقال ابن عباس اعلمت ان رسول الله ﷺ لم يكن بطن من قريش الا كان له فيهم قرابة فقال الا ان تصلوا ما بيني وبينكم من القرابة.“①

”عبدالملک ابن میسرہ سے روایت ہے کہ انہوں نے طاؤس کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے، قل لا اسئلكم عليه اجرا الّا المودة فى القربٰى کے بارے میں پوچھا گیا، تو سعید بن جبیر نے کہا قربیٰ سے مراد آل محمد ہے۔ جب کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ”کیا تجھے علم نہیں کہ قریش کے جملہ بطون میں سے ہر ایک میں حضور ﷺ کی رشتہ داری پائی جاتی ہے، پس آیت میں واقع استثناء کا یہ مطلب ہے کہ ”میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا سوائے

---

① جامع ترمذی، ابواب تفسیر القرآن، سورۃ الشوریٰ۔

اس کے کہ تم میرے اور اپنے درمیان رشتہ داری کو قائم و برقرار رکھو۔"

اس روایت میں ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہما اور ان کی اولاد سے محبت کو، کہیں بھی شرطِ ایمان قرار نہیں دیا گیا۔

پھر "مفکر قرآن" کا یہ کہنا کہ "یہ احادیث، عباسیوں کے عہد میں جمع ہوئی تھیں۔" اگر صحیح بھی ہو، تو ایک غلط پس منظر اور پیش منظر میں اسے رکھ کر، غلط تاثر پیش کیا گیا ہے تا کہ "عجمی سازش" کے من گھڑت تخیل کو تقویت دی جائے، کسی خاص دور میں کتابی شکل میں مدون ہونا کوئی اہمیت نہیں رکھتا، اہمیت تو صرف اس بات کی ہے کہ کوئی حدیث، زمانہ تدوین سے قبل بھی، امت مسلمہ میں مشہور و متداول تھی یا نہیں؟ اور ظاہر ہے کہ سورہ شوریٰ کی زیرِ حوالہ آیت کی طرح، ایسی احادیث بھی، اپنے صحیح مفہوم کے ساتھ، (نہ کہ پرویز صاحب کے بیان کردہ باطل مفہوم کے ساتھ) امت میں شہرت و رواج پکڑ چکی تھیں۔

آیتِ قرآن اور "ایسی احادیث"

کتبِ احادیث میں کس قسم کی احادیث پائی جاتی ہیں؟ اس کی ایک اور مثال پیش کرنے کے لیے، "مفکر قرآن" صاحب نے، "عباسیوں کی محبت" ہی کے زیرِ عنوان، یہ حدیث پیش کی ہے۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ "اس قسم کی احادیث" کے عین مطابق، قرآن پاک کی ایک آیت بھی پیش کی گئی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے یہ اقتباس، جس میں پہلی حدیث کو پیش کرنے کا متحرک جذبہ بھی ظاہر کیا گیا ہے۔

> اس کا محرک جذبہ تو (ظاہر ہے) سیاسی ہے۔ عقیدہ کے طور پر اس قسم کی متعدد روایات، ان کتابوں میں مذکور ہیں جن میں یہ کہا گیا ہے کہ ...... "حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ، خدا کی نعمتوں کو مدنظر رکھ کر، خدا سے محبت کرو، اور اللہ سے محبت کی وجہ سے مجھ سے محبت کرو، اور میری محبت کی وجہ سے، میرے اہل بیت سے محبت رکھو۔" (ترمذی، بحوالہ تفسیر ابن کثیر، سورہ شوریٰ)
>
> یا مثلاً قرآن میں ہے قل لا اسئلکم علیه اجرا الا المودۃ فی القربیٰ

> (۲۳/٤۲) ”اے رسول ﷺ! ان سے کہہ دو کہ میں (تبلیغ قرآن) کے لیے، تم سے کوئی اجر طلب نہیں کرتا۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے رشتہ داری کا برتاؤ رکھو۔“ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ ...... ”آنحضرت ﷺ کی قرابت، جملہ بطونِ قریش میں تھی، اللہ نے آپ کی زبان سے اعلان کرایا کہ کہہ دو کہ میں تبلیغ قرآن اور تعلیم دین پر، تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، صرف رشتہ داری کا برتاؤ میرے ساتھ رکھو۔“ ❶

اب غور فرمائیے کہ ”اس قسم کی احادیث“ میں، اول، تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد کی محبت کو، شرط ایمان، قرار نہیں دیا گیا، اور ثانیاً، یہ کہ ”اس قسم کی احادیث“ کی جو مثالیں، سورہ شوریٰ کی آیت کے ساتھ پیش کی گئی ہیں، وہ معناً اور مفہوماً مطابق قرآن ہیں۔ پھر آخر، اس میں اعتراض کیا ہے؟ یوں احادیث کی اندھی مخالفت کے جوش میں، ”مفکر قرآن“، خود قرآن کی بھی مخالفت کر ڈالا کرتے تھے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ رسولِ خدا یا حدیث رسول ﷺ کی مخالفت کرنے والا، خود خدا یا کتاب اللہ کی مخالفت کیے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ یہاں، قرآنی آیت کا جو مفہوم، خود ”مفکر قرآن“ نے پیش کیا ہے، بالکل وہی مفہوم، اقتباس میں موجود، ”اس قسم کی احادیث“ کا بھی ہے۔ اگر آیت کا معنی اور مفہوم درست ہے، تو یقیناً ”اس قسم کی احادیث“ بھی، صحیح المفہوم ہیں۔ لیکن اگر ”اس قسم کی احادیث“ پر، ”عباسیوں کی محبت“ کا عنوان، چسپاں کیا جا سکتا ہے، تو آیت قرآن پر بھی، یہی عنوان جمایا جا سکتا ہے، لیکن ”مفکر قرآن“ اپنی مزعومہ ”عجمی سازش“ کی رو میں تنکے کی طرح، یوں بہتے چلے گئے ہیں کہ انہیں، ان باتوں کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت ہی نہیں ملی۔

لفظ ”آل“ اور پرویز کی حیلہ

اس کے بعد، ”مفکر قرآن“ صاحب، ”اس قسم کی احادیث“ کی ایک اور مثال پیش فرماتے ہیں، لیکن اس میں واقع، ایک ذو معنی لفظ کا ایسا مفہوم، بیان کرتے ہیں، جس سے وہ

---

❶ شاہکار رسالت، ص ۵۰۳۔

حدیث، ''عباسیوں کی محبت'' کے زیرِ عنوان، مرقوم ہو کر، ''عجمی سازش'' کی کڑی قرار پا سکے۔ چنانچہ وہ، مندرجہ بالا اقتباس کے متصل (ساتھ) ہی یہ لکھتے ہیں کہ

> امام ترمذی نے، اسے درج کرنے کے باوجود، سعید بن جبیر سے نقل کیا ہے، کہ ......''اس آیت میں، قربیٰ کے معنی ''آل محمد ﷺ'' کے ہیں، یعنی میری تبلیغ کا اجر کچھ نہیں سوائے اس کے کہ میری اولاد کے ساتھ محبت رکھو۔'' ❶

اور پھر ''مفکرِ قرآن'' نے، اولاد (آل) کی وضاحت، اسی صفحہ پر، حاشیہ میں، یہ کہہ کر کی ہے کہ...... ''اس میں ہر سید شامل ہوگا''......

اب ذرا ''مفکرِ قرآن'' کی ذہنی خیانت اور قلمی چابکدستی ملاحظہ فرمائیے، کہ حضرت سعید بن جبیر نے، قرآنی آیت میں واقع لفظ قربیٰ کا مفہوم، آل (یعنی آلِ محمد ﷺ) بیان کیا، اور عربی میں آل کے دو معنی ہوتے ہیں (۱) اولاد بھی، اور (۲) متبعین بھی۔ یعنی نسبی ذریت بھی اور پیروکار بھی۔ خود ''مفکرِ قرآن'' نے ان دونوں معانی کا اعتراف، اپنی لغات القرآن میں کیا ہے۔

> آل، آدمی کے اہل و عیال، رفقاء۔ متبعین۔ آل کا استعمال شرفاء ہی میں ہوتا ہے، اراذل میں نہیں ہوتا۔ قرآن میں آلِ یعقوب (۱۲/۶ میں) اولاد کے معنوں میں آیا ہے۔ اور رفقاء اور متبعین کے معنوں میں آلِ فرعون (۲/۴۹) میں)۔ ❷

آل کا معنی، رفقاء و متبعین لیا جائے، تو آلِ محمد میں، آپ ﷺ کے قیامت تک کے پیروکار شامل ہو جاتے ہیں۔ اس معنی کی بنیاد پر، پوری امت سے محبت کرنا، اجرِ تبلیغ قرار پاتا ہے۔ چونکہ یہ معنی، ''عجمی سازش'' کے ساتھ میل نہیں کھاتا، اس لیے، اس کی بجائے، آل کا معنی، اولاد، مفید مطلب ٹھہرا، تو ''مفکرِ قرآن'' نے، اس معنی کو سعید بن جبیر کے گلے مڑھ کر، ''اولادِ رسول ﷺ'' اور پھر اس معنی پر، ازخود پیش قدمی کرتے ہوئے، ''ہر سیّد'' کو، مرکزِ محبت اور مرجعِ مودّت قرار دے کر، اجرِ تبلیغ بنا ڈالا ہے۔ سچ ہے، تحریفِ قرآن کے پہلو سے:

---

❶ شاہکارِ رسالت، ص ۵۰۳۔ ❷ لغات القرآن، ج ۱، ص ۲۸۸۔

؏ ایسا بلند سب کا ذوقِ نظر کہاں!

(۴۹) ''اصحاب رسول ﷺ (معاذ اللہ) مرتد ہو گئے''

''مفکرِ قرآن'' کی طرف سے، ''عباسیوں کی محبت'' کے زیرِ عنوان، بیان کردہ ''ایک قسم کی احادیث'' کے بعد، اب دوسری قسم کی احادیث میں سے، ایک حدیث، عنوانِ بالا کے تحت، یوں بیان کی گئی ہے۔

دوسری طرف، ان کتابوں میں، اس قسم کی احادیث بھی ملتی ہیں:

> حضرت ابن عباس راوی ہیں کہ رسولِ خدا نے یہ خطبہ پڑھا کہ ''اے لوگو! تم اللہ کی طرف، ننگے پیر، ننگے بدن، اور بے ختنہ اٹھائے جاؤ گے...... پھر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ آگاہ رہو کہ کچھ لوگ، میری امت کے لائے جائیں گے، اور فرشتے انہیں دوزخ کی طرف لے جائیں گے۔ اُس وقت میں کہوں گا ''اے میرے رب! یہ میرے صحابی ہیں۔ اللہ کی طرف سے ندا آئے گی کہ تو نہیں جانتا کہ انہوں نے تیرے بعد کیا کیا؟'' اس وقت میں بھی، عیسیٰ علیہ السلام کی طرح سے کہوں گا (و کنت علیھم شھیدا۔ الآیۃ) پھر اللہ کی جانب سے ندا آئے گی کہ
>
> ''اے محمد ﷺ! یہ لوگ، تیرے جدا ہونے کے بعد ہی مرتد ہو گئے تھے۔ ①

قطع نظر اس کے کہ حدیث کا مفہوم بیان کرنے میں کیا کرتب دکھائے گئے ہیں، اور قطع نظر اس کے کہ حدیث کا متن پیش کرنے سے گریز کس مصلحت کی بناء پر کیا گیا ہے۔ جو کچھ الفاظِ اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم، اسلام سے پھر گئے تھے، اور یہ چیز، ''مفکرِ قرآن'' کے نزدیک، چونکہ ناقابلِ تسلیم ہے، اس لئے وہ کتبِ احادیث میں، اس کی موجودگی کو، محدثین کرام کے جرائم کی فہرست میں ایک جرم کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں، اور پھر اسے مبالغہ آرائی کے ساتھ، مزید قبیح و شنیع بنانے کے لئے، یہ لکھتے ہیں کہ:

---

① شاہکارِ رسالت، ص ۵۰۴۔

> صحابہ کبار کے متعلق، یہ روایت (کہ وہ معاذ اللہ، حضور ﷺ کی وفات کے بعد، مرتد ہو گئے تھے) بھی اِن ہی کتابوں میں (ہے)۔ پھر سن لیجئے کہ یہ کتابیں، شیعوں کی نہیں، سنیوں کی ہیں، اور ایسی مستند اور معتبر کہ (ان حضرات کے عقیدہ کی رو سے) ان میں درج شدہ کسی ایک روایت کا انکار، مسلمان کو دائرۂ اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ ❶

چھوڑیئے اس بات کو، کہ روایت میں مطلق صحابہ رضی اللہ عنہم کا ذکر ہے، یا صحابہ کبار کا۔ اور اسے بھی نظر انداز کر دیجئے کہ متن حدیث میں، وہ کون سے الفاظ ہیں، جن کا ترجمہ ”فرشتے، انہیں دوزخ کی طرف لے جائیں گے“ کے الفاظ میں کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے، حدیث کے متن کا وہ حصہ، ملاحظہ فرمایئے، جس کا ترجمہ، ”مفکر قرآن“ نے اپنے اقتباس میں دیا ہے۔

> ”عن ابن عباس خطب رسول اللہ ﷺ فقال: یا ایها الناس! انکم محشورون الی اللہ حفاةً عراةً غرلًا .... ثم قال.......... الا وانه یجاء برجال من امتی . فیوخذ بهم ذات الشمال ، فاقول یا ربّ! أصیحابی فیقالُ انك لا تدری ما احدثوا بعدك . فاقول کما قال العبد الصالح (وکنت علیهم شهیدا.....) فیقال ، ان هٰؤلآءِ لم یزالوا مرتدین علی اعقابهم منذ فارقتهم . “ ❷

> ”ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خطبہ دیا، تو فرمایا ”لوگو! تم اللہ کی طرف ننگے پاؤں، ننگے بدن اور بے ختنہ سمیٹے جاؤ گے...... پھر فرمایا...... کچھ لوگ میرے پاس لائے جائیں گے، انہیں بائیں جانب سے پکڑا جائے گا، اور میں عرض کروں گا ”میرے پروردگار! یہ تو میرے ساتھی ہیں، تو جواباً کہا جائے

---

❶ شاہکار رسالت، ص ٥٠٤۔

❷ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب کنت علیهم شهیدا۔

گا کہ آپ نہیں جانتے کہ آپ کے بعد، انہوں نے کیا نئی بدعات نکالی تھیں۔

تب میں اللہ کے نیک بندے (عیسیٰ علیہ السلام) کی طرح عرض کروں کہ "میں تو ان پر نگران تھا، جب تک میں ان میں تھا" پھر کہا جائے گا، یہ لوگ آئے دن، اپنی ایڑیوں کے بل، پھر کر، اس وقت سے مرتد ہوتے رہے، جس وقت سے آپ نے ان سے جدائی اختیار کی۔"

یہ ہے روایتِ بخاری کا صحیح ترجمہ، جس کی روشنی میں "مفکر قرآن" کی کرشمہ ہائے قلمکاری کا بخوبی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

دورخا پن اور متضاد رویہ

یہاں "مفکر قرآن" کا یہ دورُخا پن بھی ملاحظہ فرمائیے کہ کبھی وہ، ارتداد کو عیب و جرم سمجھتے ہیں، اور کبھی ایسا نہیں سمجھتے، مثلاً جب وہ "مرتد کی سزا" پر بحث کرتے ہیں، تو بڑے زور وشور کے ساتھ، یہ فرماتے ہیں کہ مرتد ہونا، تو کوئی عیب ہے ہی نہیں۔ نہ یہ کوئی گناہ ہے، اور نہ کوئی جرم، پھر بھلا اس پر سزا کیسی؟

> قرآن نے ارتداد کو جرم ہی قرار نہیں دیا۔ ❶

اور ایک مقام پر، ایک آیت سے (اس کے دورِ نزول سے صرفِ نظر کرتے ہوئے) اپنے غلط استدلال کا نتیجہ، بایں الفاظ پیش کرتے ہیں۔

> آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کی رو سے، اسلام اور کفر کے دروازے، کس طرح آمدورفت کے لیے کھلے رہتے ہیں۔ ❷

اب جب کہ، (بقول "مفکر قرآن") اسلام اور کفر کے دروازے، قرآن کی رُو سے، آمدورفت کے لیے، ہر وقت کھلے رہتے ہیں، اور ارتداد، نہ کوئی گناہ ہے، اور نہ کوئی جرم۔ اور نہ ہی اس کی کوئی تعزیر ہے اور نہ حد، تو پھر صحابہ "کبار" اگر مرتد ہو بھی گئے، تو پھر اس پر تعجب اور

---

❶ دو مسائل (۱)......(۲)......ص ۲۵۔

❷ دو مسائل (۱)......(۲)......ص ۳۲۔

اچنبھا کیسا؟ اور اسے سنگین وشدید حرکت بنا کر، پیش کرنے کا مطلب کیا؟ اور پھر ''معاذ اللہ'' کے الفاظ کے ساتھ، صحابہ ''کبار'' کے مرتد ہونے کا ذکر کس لیے؟۔ کیا یہ دوُرخا پن، ''مفکر قرآن'' کے تضاد گو ہونے کا ثبوت ہے؟ یا اس امر کی دلیل ہے کہ ان کے تحت الشعور میں، ارتداد کے معیوب اور جرم ہونے کا تصور راسخ ہے، اور اسے وہ صحابہ کے مرتبہ کے منافی سمجھتے ہوئے، ان کی طرف، جرمِ ارتداد کی نسبت کو درست نہیں سمجھتے، اور جن محدثین کرام نے ایسی احادیث کو اپنی کتب میں، جمع کیا ہے، اُنہیں وہ اس پہلو سے خطا کار گردانتے ہیں کہ ان کی جمع شدہ اور قبول کردہ روایات سے، ''معاذ اللہ'' صحابہ ''کبار'' کے مرتد ہونے کا تاثر ملتا ہے، اس ثنویت اور دوُرخے پن سے، ایک متناقض الکلام اور تضاد گو شخص کی نفسیاتی حالت اور ذہنی کیفیت واضح ہوجاتی ہے۔ ایسے ہی وہ مواقع ہوا کرتے ہیں، جہاں کسی عیار و مکار فنکار کا انتہائی خفیف سا سچ بھی، اپنے سے کئی گنا بڑے جھوٹ کا پول کھول دیتا ہے۔ ''مفکر قرآن'' کی طرف سے، روایات حدیث میں، مذکور فعل ارتداد کو، صحابہ ''کبار'' کی طرف، ''معاذ اللہ'' کے الفاظ کے ساتھ منسوب کرنا، خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ فعل، اُن کے نزدیک، امر مباح نہیں، بلکہ ایک سنگین عیب ہے، جس سے ان کے اس جھوٹ کی قلعی کھل جاتی ہے کہ فعل ارتداد، کوئی عیب و جرم نہیں ہے۔

مزید برآں، زیر بحث حدیث میں مذکور لفظ اُصَیْحَابِی سے ایک اور حقیقت بھی واشگاف ہوجاتی ہے۔ یہ اسم تصغیر کا وزن ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس سے مراد، معدودے چند افراد ہیں، جو ہوسکتا ہے کہ قدر و منزلت کے اعتبار سے بھی کم تر درجہ کے افراد ہوں، نہ کہ صحابہ ''کبار''، جیسا کہ ''مفکر قرآن'' نے گمان کر رکھا ہے۔

امکانِ ارتداد در آیاتِ قرآن

اب آخر میں یہ بات بھی جان لیجئے کہ ارتدادِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے جس فعل کو، ''مفکر قرآن'' معیوب قرار دے کر، کتب احادیث پر لے دے کرتے ہوئے، یہ فرماتے ہیں کہ...... ''سن لیجئے، یہ کتابیں شیعوں کی نہیں، بلکہ سنیوں کی کتابیں ہیں'' ...... اُسی فعل کے وقوع کا امکان،

قرآن مجید کے متعدد مقامات پر موجود ہے، لیکن میں، مثال کے طور پر صرف ایک مقام کی نشاندہی پر اکتفاء کروں گا۔ ملاحظہ فرمایئے اور آنکھیں کھول کر ملاحظہ فرمایئے، مندرجہ ذیل آیت کریمہ۔ اور سن لیجئے کہ یہ آیت، کسی سنی یا شیعہ کی کتاب حدیث میں نہیں، بلکہ خود خدائے قدوس کی کتاب میں موجود ہے۔

﴿اَفَاۡئِنۡ مَّاتَ اَوۡ قُتِلَ انۡقَلَبۡتُمۡ عَلٰۤى اَعۡقَابِكُمۡ‌ؕ وَمَنۡ يَّنۡقَلِبۡ عَلٰى عَقِبَيۡهِ فَلَنۡ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيۡـــًٔا‌﴾ (آل عمران: ١٤٤)

’’پھر اگر وہ (رسول خدا) فوت ہو جائیں یا شہید کر دیئے جائیں، تو کیا تم ایڑیوں کے بل کفر کی طرف پلٹ جاؤ گے، اور جو کوئی یوں پلٹے گا، وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔‘‘

یہ آیت، صراحتاً اس امکان کو واضح کر رہی ہے کہ رسول خدا کی وفات یا شہادت کے بعد، کچھ لوگ، کفر کی طرف پلٹ جائیں گے، جیسا کہ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ نے، اس آیت کی وضاحت میں فرمایا ہے:

> اس آیت سے اشارت نکلتی ہے کہ حضرت ﷺ کی وفات پر بعضے لوگ پھر جاویں گے، اور جو قائم رہیں گے، ان کو بڑا ثواب ہے۔ اسی طرح ہوا کہ بہت لوگ، حضرت ﷺ کے بعد مرتد ہوئے، اور حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کو پھر مسلمان کیا، اور بعضوں کو مارا۔ ①

اب کیا عہد صدیقی میں مرتد ہو جانے والوں میں، ایک بھی نبی ﷺ دیدہ شخص نہ تھا؟ جب قرآن خود ایک بات کا ذکر کرتا ہے، اور کتب احادیث اور مستند تاریخی مواد، اس امر کی شہادت بہم پہنچاتے ہیں کہ بعد از وفاتِ رسول، کچھ لوگ مرتد ہوئے، اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اُن کے جرم ارتداد کی بناء پر، ان کے خلاف لشکر کشی کی، جن میں سے بعض اپنے ارتداد پر قائم رہے اور وہ سیف صدیقی کا نشانہ بن کر کیفر کردار کو پہنچے، اور بعض نے

---

① موضح القرآن، در آیت آل عمران، ۱۴۴۔

دوبارہ رجوع الی الاسلام کرلیا، اور بعض اس فتنہ میں پڑے بغیر، اپنے اسلام پر برقرار رہے، تو اسے ہوا بنا کر پیش کرنے کا کیا مطلب؟

عہد نبوی میں وقوعِ ارتداد کا اعتراف اور طلوعِ اسلام

لیکن یہ تو وفاتِ رسول ﷺ کے بعد کا واقعۂ ارتداد ہے۔ اب میں ایک ایسے واقعہ کا ذکر کر رہا ہوں جو حضور اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں پیش آیا، اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس کا اعتراف، ''مرتد کی سزا'' کے ضمن میں، خود طلوعِ اسلام نے بھی کیا ہے۔ اور شخصِ مذکور کا یہ ارتداد، آپ ﷺ کے لیے اس قدر موجبِ افسوس اور باعثِ اذیت تھا کہ فتح مکہ کے وقت، جن لوگوں کو قتل کرنے کا حکم، آپ ﷺ نے اس قدر پُرزور تاکید کے ساتھ دیا تھا کہ اگر وہ غلافِ کعبہ میں بھی لپٹے ہوئے پائے جائیں تو بھی وہ ناقابل معافی ہیں، انہیں بہرحال، قتل کرنا ضروری ہے۔ ملاحظہ فرمایئے، طلوعِ اسلام کا یہ اقتباس،

> عبداللہ بن سرح رسول اللہ کا سیکرٹری تھا، اور وہ گمراہ ہو کر دشمنانِ اسلام سے جاملا تھا۔ کفار مکہ اس وقت رسول اللہ سے برسرِ پیکار تھے۔ اس کا اندازہ اس مثال سے ہوسکتا ہے کہ کسی بادشاہ کا سیکرٹری، اُس سے برسرِ جنگ دشمن سے جا ملے۔ ظاہر ہے کہ دشمن سے مل کر وہ کیا کچھ نہ کرے گا۔ اسی حیثیت سے تو وہ بدرجہ اولیٰ، حارب اللہ ورسولہ کا مرتکب ہوا تھا۔ ❶

طلوعِ اسلام کے اس اقتباس کے آغاز ہی میں، حضرت عبداللہ ابن سعد ابن ابی سرح کے ارتداد کا یہ کہہ کر اعتراف کیا گیا ہے کہ...... ''وہ گمراہ ہو کر دشمنانِ اسلام سے جاملا تھا۔'' لیکن چونکہ ارتداد کی سزائے قتل کا وہ منکر ہے، اس لیے اقتباس کے آخر میں، اُسے مجرمِ حرابہ (بغاوت) قرار دیا گیا ہے، تاکہ سزائے قتل کو، ارتداد کی بجائے، بغاوت کی پاداش قرار دیا جاسکے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تقلیبِ امور اور مسخِ حقائق کے لیے، چکمہ بازی، مغالطہ آفرینی اور فریب دہی، منکرین حدیث کی عام عادت ہے۔ یہ لوگ، اپنے ذہنی معتقدات

---

❶ طلوعِ اسلام، مارچ ۱۹۶۳ء، ص ۶۷۔

اور قلبی نظریات کی حمایت و پاسداری کی خاطر، جن جرائم کو (یا ان کی سزاؤں کو) نہیں ماننا چاہتے، اُن کے بارے میں، یا تو معنوی تحریف کی روش اپناتے ہیں، اور بات کو اصل ٹھکانے پر نہیں رہنے دیتے، یا پھر ان جرائم کے ساتھ، کسی اور جرم کو نتھی کر ڈالتے ہیں، اور سزا کی علت و وجہ، اپنے اس (الحاق شدہ) جرم کو قرار دیتے ہیں۔ قتل مرتد کی عقوبت کا ذکر ہو، تو یہ لوگ، اس کے ساتھ ''بغاوت'' کا جرم نتھی کر دیتے ہیں، اور پھر یہ دعویٰ کر ڈالتے ہیں کہ عہد نبوی یا خلافت راشدہ میں، جو سزا دی گئی ہے، وہ جرم ارتداد کی نہیں، بلکہ جرم بغاوت کی سزا ہے۔ اور اگر سورہ مریم میں، لفظ بغیا میں زنا کاری اور بدکاری کا ذکر ہو، تو اس کے ساتھ، ''سرکشی'' کو نتھی کر کے، یہ سوال اٹھا دیتے ہیں کہ...... ''کیا بدکار عورت، معاشرہ میں سرکشی کی مرتکب نہیں ہوتی؟''......

اب جب کہ قرآن بھی، آپ ﷺ کے انتقال کے بعد، لوگوں کے مرتد ہو جانے کا امکان واضح کرتا ہے، اور عملاً یہ امکان واقع بھی ہوا، اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مرتدین کے خلاف فوج کشی بھی کی۔ اور خود حضور اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں بھی، عبداللہ بن سعد بن ابی سرح جیسے صحابی رسول ﷺ (جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا رضاعی بھائی بھی تھا) کے ارتداد کا خود طلوع اسلام کو بھی اعتراف ہے، تو پھر اگر کتب احادیث میں بھی ایسے ارتداد کا ذکر ہو، تو اس پر اعتراض کیا؟ اور ''اصحاب (معاذ اللہ) مرتد ہو گئے'' جیسی سنسنی خیز سرخیاں جمانے کا مقصد کیا؟ اور اس پر یہ بے جا اور غلط زور دینے کا فائدہ کیا کہ ''یہ باتیں، شیعوں کی کتب احادیث میں نہیں بلکہ سنیوں کی کتب احادیث میں مذکور ہیں'' جب کہ خود قرآن میں بھی اس امر کے امکان کے شواہد موجود ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ''مفکر قرآن'' کو حدیث رسول ﷺ اور سنت نبی ﷺ سے اس قدر ضد، چڑ، کینہ اور بغض تھا کہ وہ کتب احادیث کو، اپنے استشراقی اساتذہ کی پیروی میں، کھنگالا ہی اس لئے کرتے تھے کہ ان میں سے عیوب و نقائص تلاش کئے جائیں، اور اگر ان میں کوئی خامی اور کمزوری نظر نہ آئے، تو ''مفکر قرآن'' پر یہ بھی لازم تھا کہ وہ خود زحمت اٹھا کر، ایسی چیزیں بنا لائیں، اور پھر آنکھوں میں آنسو بھر کر، یہ وعظ

فرمائیں کہ ''یہ ہیں وہ روایات، جو امت مسلمہ کی نکبت و ادبار اور زوال و انحطاط کی ذمہ دار ہیں۔ اگر ملت اسلامیہ کا عروج و ارتقاء، پھر مطلوب ہے، تو اس دفتر بے معنی کو دریا برد کرنا ضروری ہے۔'' یہ ہے وہ دھن، جس میں سرشار ہوکر، ''مفکر قرآن'' کتب احادیث کی عیب جوئی میں، اسی طرح کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں چھوڑتے، جس طرح آریہ سماجیوں اور دوسرے دشمنانِ اسلام نے، قرآن مجید کو نشانہ بنائے رکھا ہے۔

(۵۰) امام طبری، سنی تھے یا شیعہ؟

جامعین صحاحِ ستہ کو، اولاً، ایرانی قرار دینے کے بعد، اور ثانیاً قرآن کے مقابلہ میں، ''حدیثی اسلام'' پیش کرنے کی ''عجمی سازش'' کا جملہ محدثین کو علمبردار اور مجرم قرار دینے کے بعد، اور ثالثاً، کتب تفاسیر و تاریخ کو ''غیر قرآنی افکار و اعمال'' کا حامل قرار دے ڈالنے کے بعد، اب ''مفکر قرآن'' صاحب، امام ابن جریر طبری کو نشانہ بناتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''ابن جریر، طبرستان کے قصبہ امل کے رہنے والے تھے، یہیں پیدا ہوئے، یہیں پرورش پائی، اور یہیں سے تحصیل علم کے لیے باہر نکلے، ۴۴ برس تک تحصیل علم میں سرگرداں رہے، (شیعہ تھے لیکن) ازروئے تقیہ سُنّی بنے رہے۔ ان کے دادا کا اصل نام رستم تھا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد یزید نام رکھا گیا۔ ابن جریر خالص شیعوں کے لیے جو کتاب لکھتے تھے، اس میں اپنا نام محمد بن جریر بن رستم لکھتے تھے، اور سارے مسلمانوں کے لیے جو کتاب لکھتے تھے، اس میں اپنا نام محمد بن جریر بن یزید لکھتے تھے۔ (بحوالہ طلوع اسلام، اگست ۱۹۶۸ء، صفحہ: ۶۱) ❶

اس اقتباس میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ سراپا جھوٹ اور پلندۂ کذب ہے۔ میں اس جھوٹ کی قلعی کھولنے کے لیے، اختصار سے کام لینے پر مجبور ہوں اگرچہ اس کے لیے مبسوط مقالہ درکار ہے، جسے بتوفیق ایزدی، کبھی آیندہ قلمبند کروں گا۔

محمد بن جریر بن یزید اور محمد بن جریر بن رستم، الگ الگ دو شخصیتیں تھیں۔ یہ دونوں نام

---

❶ شاہکارِ رسالت، صفحہ: ۵۰۴۔

کسی ایک ہی شخصیت کے نہیں تھے، جیسا کہ شاہکارِ رسالت کے اقتباس میں کہا گیا ہے۔ اسماء الرجال اور تاریخ کی کتابیں، انھیں دو جداگانہ ہستیاں قرار دیتی ہیں۔ طلوعِ اسلام اور "مفکر قرآن" کا اوڑھنا بچھونا، چونکہ، کذب و دروغ، افتراء پردازی اور بہتان تراشی، خیانت و بددیانتی، دھوکہ بازی اور فریب دہی ہے، اس لیے یہی اخلاقی رذائل، اُن کے "جہادِ قرآنی" کی شمشیریں ہیں۔ منکرین حدیث کو بالعموم اور غلام احمد پرویز کو بالخصوص، نہ کبھی خوفِ خدا لاحق ہوا، اور نہ ہی مخلوقِ خدا سے کبھی شرم و حیا محسوس ہوئی۔ وہ آخرت میں، خدا کے حضور جواب دہی سے بالکل بے پروا اور قطعی بے خوف تھے۔ اس لیے، وہ، جب، جہاں، جیسا جھوٹ چاہتے تھے، لکھ ڈالتے تھے۔ یقیناً صداقت وحقیقت پر مبنی میرے یہ جملے منکرین حدیث کو ناگوار گزریں گے۔ بہت سے چہرے خشمگیں ہوں گے۔ بہت سی نگاہیں، غضب سے آتش بار ہوں گی۔ بہت سی جبینیں شکن آلود ہو کر عَبَسَ وَتَوَلّٰی کا مصداق ہوں گی، لیکن میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، اس کے ایک ایک حرف پر، میری کتاب...... "جناب غلام احمد پرویز، اپنے الفاظ کے آئینے میں"...... شاہد ہے، اور آج تک منکرین حدیث میں سے کوئی ماں کا لعل، اس کا جواب نہیں دے سکا، اور نہ ہی آیندہ دے سکے گا۔ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا.

کتب رجال اور امام طبری

اب رہی یہ حقیقت کہ ابن جریر بن یزید اور ابن جریر بن رستم، فی الواقع، دو الگ الگ شخصیتیں تھیں، تو اس پر مندرجہ ذیل اقتباس شاہد ہیں:

امام ذہبی (ابوعبداللہ، محمد بن احمد بن عثمان) ان دونوں کو، دو جداگانہ افراد قرار دیتے ہوئے، ایک کا ذکر ۷۳۰۶، اور دوسرے کا ذکر ۷۳۰۷ نمبر کے تحت کرتے ہیں۔ اگر یہ دونوں نام، ایک ہی شخصیت کے ہوتے تو دونوں کا ذکر، الگ الگ نمبروں کے تحت نہ کیا جاتا۔ اور دونوں کا حال، ایک ہی نمبر کے تحت مذکور ہوتا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

((٧٣٠٦ــ محمد بن جرير بن يزيد، الطبری، الامام الجليل المفسر، ابو جعفر صاحب التصانيف الكثيرة، مات

سنة عشر وثلثمأة، ثقة صادق، فيه تشيّع يسير وموالاة لا تضر۔ اقذع احمد بن علی السلیمانی الحافظ، فقال: کان یضع للروافض، کذا قال السلیمانی: وھٰذا رجم بالظن الکاذب، بل ابن جریر من کبار ائمة الاسلام المعتمدین، وما ندعی عصمتهٗ من الخطاء ولا یحل لنا ان نؤذیَهٗ بالباطل والھویٰ، فان کلام العلماء بعضهم فی بعض ینبغی ان یتاٰنّی فیه، ولا سیما فی مثل امام کبیر، فلعل السلیمانی اراد الاٰتی۔

۷۳۰۷ــ محمد بن جریر بن رستم، ابو جعفر، الطبری، رافضی له توالیف منها کتاب الرواة عن اهل البیت، رماه بالرفض عبدالعزیز الکتّانی۔)) ❶

”۷۳۰۶ــ محمد بن جریر الطبری، جلیل القدر امام اور مفسر ہیں، ان کی کنیت ابو جعفر ہے، اور وہ بلند پایہ تصانیف کے مالک ہیں۔ ۳۱۰ھ میں ان کا انتقال ہوا، وہ بااعتماد اور راست گفتار تھے، جن میں معمولی درجہ کا تشیع اور موالاۃ پایا جاتا تھا جو ضرررساں نہ تھا۔ حافظ احمد بن علی سلیمانی نے، انھیں برا بھلا کہتے ہوئے کہا کہ وہ روافض کے لیے روایات گھڑا کرتے تھے، حالانکہ یہ بے تکی بات، محض بدگمانی پر مبنی ہے۔ جب کہ واقعہ یہ ہے کہ ابن جریر بن یزید ائمہ اسلام کی عظیم اور قابل اعتماد ہستیوں میں سے تھے۔ ہمارا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ وہ معصوم عن الخطا تھے، لیکن یہ بات بھی ہمارے لیے جائز نہیں ہے کہ باطل اور ہوا پرستی کے الزام کے ذریعہ، ہم ان (کی روح) کو اذیت دیں۔ علماء کرام کو، ایک دوسرے کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے سوچ بچار سے کام لینا چاہیے، بالخصوص، جب معاملہ اتنے

---

❶ میزان الاعتدال فی نقد الرجال، جلد: ۳، صفحہ: ۴۹۸ تا ۴۹۹۔

بڑے پیشوائے اسلام کا ہو۔ ہوسکتا ہے کہ سلیمانی نے یہ الفاظ آگے آنے والے (ابن جریر بن رستم) کے بارے میں کہے ہوں۔

۷۳۰۷ ـــــ محمد بن جریر بن رستم، ابوجعفر طبری، رافضی تھا، اور بہت سی تالیفات کا مؤلف تھا، جن میں سے ایک کتاب ''کتاب الروایۃ عن اھل البیت'' (اہل بیت سے روایت کرنے والے راویوں پر مشتمل کتاب) ہے۔ عبدالعزیز الکتانی نے، انھیں رفض کے ساتھ متہم کیا ہے۔''

تقریباً، انہی الفاظ میں، حافظ ابن حجر نے، ان کو دو الگ الگ شخصیات قرار دیا ہے، چنانچہ ۷۱۹۰ [۷۳۱۲] نمبر کے تحت، وہ، محمد بن جریر بن یزید الطبری کے متعلق لکھتے ہیں:

((الامام الجلیل المفسر، ابو جعفر، صاحب تصانیف الباھرۃ مات سنۃ عشر وثلثمأۃ، ثقہ صادق، فیہ تشیع یسیر وموالاۃ لا تضر۔ اقذع احمد بن علی السلیمانی الحافظ، فقال: کان یضع للروافض، کذا قال السلیمانی الحافظ ھٰذا رجم بالظن الکاذب، بل ابن جریر من کبار ائمۃ الاسلام المعتمدین وما ندعی عصمتہٗ من الخطاء ولا یحل لنا ان نوذیہ بالباطل والھویٰ، فان کلام العلماء بعضھم فی بعض ینبغی ان یتأنّٰی فیہ، ولا سیما فی مثل امام کبیر، فلعل السلیمانی اراد الاتی، انتھیٰ، ولو حلفت ان السلیمانی ما اراد الا الاتی لبررت والسلیمانی حافظ متقن کان یدری ما یخرج من رأسہ، فلا اعتقد انہ یطعن فی مثل ھٰذا الامام بھذا الباطل۔)) ❶

چونکہ یہ اقتباس، تقریباً انہی الفاظ پر مشتمل ہے جو اس سے قبل (میزان الاعتدال میں

---

❶ لسان المیزان لابن حجر، جلد: ۵، صفحہ: ۱۰۸۔

سے) پیش کیا جاچکا ہے، اس لیے میں خود اس کا ترجمہ کرنے کی بجائے، پروفیسر غلام احمد حریری صاحب کا وہ ترجمہ پیش کر رہا ہوں جو انھوں نے اپنی ترجمہ شدہ کتاب ''تاریخ تفسیر و مفسرین'' میں درج کیا ہے:

> ''ابن جریر، راستباز اور ثقہ تھے۔ مگر آپ میں کسی حد تک تشیع پایا جاتا تھا جو چنداں ضرر رساں نہیں۔ احمد بن علی سلیمانی نے ابن جریر کی شان میں یہ گستاخی کی ہے کہ آپ شیعہ کے لیے حدیثیں وضع کیا کرتے تھے۔ یہ بدگمانی، سفید جھوٹ اور بے بنیاد ہے، بخلاف ازیں، ابن جریر، کبار ائمۂ اسلام میں سے تھے، اگرچہ ہم آپ کو معصوم قرار نہیں دیتے، تاہم ان پر غلط الزام عائد کرنا بھی روا نہیں۔ ایک عالم کو دوسرے عالم پر تنقید کرتے وقت، نرمی سے کام لینا چاہیے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سلیمانی نے جس طبری کے بارے میں یہ الفاظ کہے ہیں، وہ محمد بن جریر بن رستم طبری رافضی ہو، بلکہ میں اس پر حلف اُٹھانے کے لیے تیار ہوں، کہ سلیمانی کا مقصد یہی ہے۔ سلیمانی حافظ حدیث ہے۔ اور وہ جانتے تھے، کہ ان کے منہ سے کیا بات نکل رہی ہے، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ ایسے عظیم امام پر، اس طرح طعن کرتے۔'' ❶

اب آخر میں، یہ جان لیجئے کہ نہ صرف سُنیوں ہی کے نزدیک بلکہ شیعہ مکتبۂ فکر کی کتبِ اسماء الرجال میں بھی، ان دونوں کو الگ الگ شخصیات قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ شیعہ حضرات کی کتاب ''تنقیح المقال فی علم الرجال'' میں مذکور ہے۔

اپنے اعمالِ بد دوسروں کے کھاتہ میں

(ب) شاہکارِ رسالت کے زیرِ تبصرہ اقتباس میں یہ کہنا کہ---- ''محمد بن جریر بن یزید اور محمد بن جریر بن رستم ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں، اور جب کبھی اس نے سنیوں کے

---

❶ تاریخ تفسیر و مفسرین، صفحہ: ۱۹۱ تا ۱۹۲۔

لیے کتاب لکھی تو اس پر اوّل الذکر اور شیعوں کے لیے لکھی جانے والی کتاب پر مؤخر الذکر نام ثبت کیا'' ---- تو اس جیسی حرکت، دراصل، کبھی خود ''مفکر قرآن'' کی عادت رہی ہے۔ چنانچہ اپنی ایسی خصلت پر پردہ ڈالنے کے لیے، وہ اسے دوسروں کی طرف منسوب کر دیا کرتے تھے، حالانکہ ایسی دوغلی پالیسی اختیار کیے رکھنا، اُن کا اپنا وطیرہ اور شیوہ رہا ہے۔

ایک زمانہ تھا جب جناب غلام احمد پرویز صاحب، منکرین حدیث کے خلاف، حدیث کی حمایت و مدافعت میں، مضامین و مقالات لکھ کر، اہل سنت کی ہمنوائی کا دم بھرا کرتے تھے، اور دوسری طرف، ٹھیک اُسی زمانے میں، منکرین حدیث ہی کی روش اپنا رہے تھے، اور حدیث کو نظر انداز کرتے ہوئے، تنہا قرآن ہی کی بنیاد پر، ایک ایسا انسائیکلوپیڈیا تصنیف کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے، جس کی ابتداء، معارف القرآن، جلد اوّل سے کی گئی تھی۔ اس کتاب کی بابت، طلوع اسلام لکھتا ہے:

> ''جناب پرویز صاحب نے سلسلہ معارف القرآن کی ابتداء، ۱۹۲۸ء میں کی۔ پہلی جلد کا عنوان تھا: ''اللہ''، جو بعد میں ''من ویزداں'' کے نام سے شائع ہوئی۔'' ❶

یاد رہے کہ ماہنامہ نگار کے ایڈیٹر، جناب نیاز فتح پوری، اپنے مجلّہ میں فتنہ انکارِ حدیث کی حمایت میں، اُن دنوں، بکثرت مضامین شائع کر رہے تھے۔ معارف القرآن جلد اوّل کا بعد میں نام بدل کر ''من ویزداں'' رکھا گیا، حالانکہ نیاز فتح پوری کی ایک کتاب کا بھی یہی نام تھا۔ اور یہ کارروائی تشابهت قلوبهم کے رشتۂ باہمی کی غماز ہے۔

بہر حال، معارف القرآن جلد اوّل کو قرآن و حدیث یا کتاب و سنت کی بجائے، فقط قرآن ہی کی بنیاد پر تصنیف کیا جا رہا تھا۔ خود پرویز صاحب لکھتے ہیں:

> ''معارف القرآن میں وہی کچھ لکھا گیا ہے جو میں نے خالص قرآنِ کریم سے سمجھا ہے کہ یہی اس کتاب کا نقطۂ ماسکہ ہے۔'' ❷

---

❶ طلوع اسلام، اپریل ۱۹۸۵ء، صفحہ: ۴۔

❷ معارف القرآن، ج ۱، ص ۵۳۔

یہ کتاب (معارف القرآن، جلد اوّل) پایۂ تکمیل کو پہنچ کر، کب زیور طباعت سے آراستہ ہو کر، منظرِ عام پر آئی؟ طلوعِ اسلام ہی سے اس سوال کا جواب، بایں الفاظ، حاضر ہے:

> ”اُن (پرویز صاحب) کے اس تدبر کی مستقل صورت، وہ عظیم القدر کتاب ہے جو ”معارف القرآن“ کے نام سے وجہِ فروغِ ابصار ہوئی۔ اس کتاب کی پہلی جلد کی اشاعت کا فخر، طلوعِ اسلام کو حاصل تھا جو ۱۹۴۱ء کو مشہود ہوئی۔“ ❶

اب ذرا ”مفکرِ قرآن“ کی اس دو رُخی پالیسی کو ملاحظہ فرمائیے کہ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۴۱ء تک، معارف القرآن کی تصنیف تو ”خالص قرآن“ کی بنیاد پر ہوتی رہی، کہ یہی ”اس کتاب کا نقطۂ ماسکہ“ تھا، لیکن ٹھیک اسی دوران، وہ عام اہل سنت کے لیے، جو مضامین و مقالات، مختلف مجلّات میں شائع کرواتے رہے ہیں، انھیں، وہ ”خالص قرآن“ کے ”نقطۂ ماسکہ“ سے ہٹ کر، قرآن و حدیث اور کتاب و سنت کی اساس پر لکھتے رہے ہیں، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر، وہ منکرین حدیث کی تغلیط و تردید کرتے ہوئے، خود کو، حامی حدیث اور مدافع سنت کے طور پر پیش کرتے رہے ہیں۔ مثلاً ماہنامہ نگار میں (جو نیاز فتح پوری کا رسالہ تھا) روزوں کی بابت، ایک منکر حدیث نے ”حق گو“ کے قلمی نام سے ایک مقالہ لکھا۔ پرویز صاحب نے قرآن و حدیث کی بنیاد پر ”ایامِ صیام“ کے عنوان سے، ایک تردیدی اور جوابی مقالہ لکھا، جو ماہنامہ معارف کے دسمبر ۱۹۳۱ء کے شمارہ میں چھپا۔ اسی طرح، ”حدیث کی دینی حیثیت“ پر ایک زور دار مقالہ، اُس دور کے منکرین حدیث کے خلاف لکھ کر، خود کو مدافع سنت اور محافظ حدیث کے طور پر پیش کیا۔ یہ مقالہ، معارف میں، مارچ ۱۹۳۵ء اور اپریل ۱۹۳۵ء کے شماروں میں اشاعت پذیر ہوا۔ اسی طرح ان کے مقالات، دیگر مجلّات میں بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔ یعنی ایک ہی دور میں، وہ اپنے مقالات و مضامین میں، جو مختلف مجلّات کی زینت بنا کرتے تھے، خود کو معتقد سنت اور حامیٔ حدیث ظاہر کیا کرتے تھے، اور منکرین حدیث کے خلاف، دفاعِ سنت کے سرگرم مجاہد کا روپ اپنایا کرتے تھے، جب کہ اُسی زمانے میں، اپنے

---

❶ طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۷۱ء، ص ۶۱۔

گھر میں بیٹھ کر، وہ اپنے سلسلۂ معارف القرآن کی پہلی کڑی کو اپنے باطنی مسلک اور مکتوم مذہب (انکارِ حدیث) کی روشنی میں، "خالص قرآن" کی بنیاد پر تصنیف کر رہے تھے۔ دو غلے اور دوُرخے پن کی اپنی اس خصلت کو "مفکرِ قرآن" اپنی کتاب "شاہکارِ رسالت" میں، امام محمد بن جریر بن یزید جیسے ثقہ و صادق عالم دین کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ "مفکرِ قرآن" صاحب، اپنی ہر خصلت بد کو، اپنے مخالفین کے کھاتے میں ڈالنے کے عادی تھے۔ وہ خود دروغ گو، خائن، فریب کار اور بہتان تراش تھے، لیکن اپنی ان حرکات کو، وہ، وہ اپنے مخالفین کے سر تھوپا کرتے تھے۔ اس معاملہ میں ان کی روش یہ تھی کہ

ہم اپنے دل کے حال کو معیار جان کر
اوروں کے دل کا حال یونہی جانتے رہے

(۵۱) امام طبری کی تفسیر

"مفکرِ قرآن" نے کذب و زور کا سہارا لے کر، امام طبری کو حقائق کے علی الرغم، شیعہ قرار دینے کے بعد، اُن کی تفسیر پر جو کرم فرمائی کی ہے، ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے:

> "امام طبری نے ایک تو یہ کیا کہ (تیں جلدوں میں) قرآنِ کریم کی تفسیر لکھی۔ اس تفسیر میں انھوں نے انداز یہ اختیار کیا کہ ہر آیت کی تفسیر میں احادیث درج کر دیں، جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ تفسیر امام طبری کی نہیں بلکہ خود رسول اللہ کی ہے۔ آپ سوچیے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ یہ کہ اب قرآنِ کریم کا وہی مطلب صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے جسے امام طبری نے اپنی تفسیر میں لکھ دیا ہے۔ بات بالکل واضح ہے۔ جب کسی سے یہ کہا جائے کہ فلاں آیت کی یہ تفسیر، خود رسول اللہ نے بیان فرمائی ہے تو کون سا مسلمان یہ کہنے کی جرأت کر سکے گا کہ یہ تفسیر ٹھیک نہیں یا یہ کہ اس آیت کا جو مفہوم، میں نے سمجھا ہے وہ اس سے بہتر ہے۔ نہ کوئی مسلمان ایسا

کہنے کی جرأت کر سکے گا، نہ کوئی مسلمان، ایسی بات سننا گوارا۔'' ❶

واقعی یہ بات درست ہے کہ کوئی مسلمان، مسلمان ہوتے ہوئے، یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بیان کردہ تفسیر درست نہیں، اور نہ ہی یہ کہ، اُس کی اپنی تفسیر، جو ایک اُمتی کی حیثیت سے اُس نے پیش کی ہے، وہ، اللہ کے رسول اور نمایندہ ہونے کی حیثیت میں، آپ ﷺ کی پیش کردہ تفسیر سے بہتر ہے۔ ایک مسلمان، جب تک مسلمان ہے، نہ ایسی بات، خود سوچ اور کہہ سکتا ہے، اور نہ کسی سے سُن سکتا ہے۔ ''مفکرِ قرآن'' صاحب نے جو جرأت کی ہے، وہ یقیناً مسلمان کی حیثیت سے نہیں کی ہے، کیونکہ ایک پختہ مزاج مسلمان کے نزدیک، قرآن خود محتاجِ تفسیرِ رسول ﷺ ہے۔ ﴿وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ﴾ پھر قرآن نے کہیں بھی یہ نہیں کہا کہ...... ''جس نے قرآن کی پیروی کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی'' لیکن اس کے برعکس، قرآن، یہ صراحت کرتا ہے کہ: ﴿مَن يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ﴾ اس لیے کہ اطاعتِ رسول میں، خود اللہ کی بھی اور کتاب اللہ کی بھی اطاعت شامل ہے، جیسا کہ خود پرویز صاحب کی مندرجہ ذیل عبارات سے واضح ہے:

۱: اصل یہ ہے کہ رسول کا اتباع ہی قرآن کا اتباع ہے۔ ❷

۲: قرآن کا اتباع ہو ہی اس شکل میں سکتا ہے، جس میں رسول (ﷺ) نے کیا یا کرنے کا حکم دیا۔ ❸

۳: جہاں، قرآنِ کریم میں أَطِيعُوا اللَّهَ آیا ہے، اس کے ساتھ ہی أَطِيعُوا الرَّسُولَ بھی آیا ہے، کسی ایک جگہ بھی اکیلا أَطِيعُوا اللَّهَ نہیں آیا۔ اور چونکہ أَطِيعُوا الرَّسُولَ میں، اطاعت خداوندی خود بخود آ جاتی ہے، اس لیے خالی أَطِيعُوا الرَّسُولَ قرآن میں بعض جگہ آیا ہے، مثلاً:

---

❶ شاہکارِ رسالت، صفحہ: ۵۰۵۔

❷ معارف، اپریل ۱۹۳۵ء، صفحہ: ۲۸۲۔

❸ معارف، اپریل ۱۹۳۵ء، صفحہ: ۲۸۳۔

﴿ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ۝﴾ [النور: ٥٦]

”رسول کی اطاعت کرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔“

اور جہاں جہاں أَطِيعُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ آیا ہے، وہاں درحقیقت، اطیعوا اللہ سے مراد، اطاعتِ رسول ہی ہے۔ ❶

پھر ایک راسخ العقیدہ مومن، یہ بھی جانتا ہے کہ کتابِ خداوندی، خواہ کتنی ہی بلند پایہ ہو، وہ ہے تو بہر حال، مشتمل برالفاظ ہی۔ اور جب تک یہ الفاظ، ایک جیتے جاگتے پیکر میں مشہود نہ ہوں، وہ عملی نمونہ نہیں بن سکتے۔ اسی ضرورت کے تحت، اللہ تعالیٰ نے تنہا کتاب نہیں بھیجی، بلکہ رسول بھی بھیجا تا کہ اس کی پاکیزہ زندگی، قابل اطاعت اسوۂ حسنہ بن سکے، ورنہ اگر ہر شخص، اپنی اپنی عقل کے مطابق، احکامِ قرآن کی پیروی پر اُتر آتا، تو لوگوں کے عقلی و ذہنی مدارج کے تفاوت کا نتیجہ، انتشارِ فکر، تشتت عمل اور پراگندگیٔ تہذیب کی صورت میں ظاہر ہوتا، اور ایک ہم رنگ اور ہم آہنگ تمدن کبھی تعمیر ہی نہ ہو پاتا۔ اس لیے اسوۂ رسول ﷺ کی پیروی لازم قرار دی گئی، مگر صرف اور صرف اُس شخص کے لیے، جو آخرت کا اُمیدوار ہو، اور ہر لمحہ اللہ کے حضور، اپنی جواب دہی کا احساس رکھتا ہو، اور اپنی زندگی کے جملہ معاملات کو یادِ خدا کے ساتھ طے کرنا چاہتا ہو، جیسا کہ خود پرویز صاحب نے کبھی یہ لکھا تھا کہ:

> ”اگر غور وفکر اور ہدایت ونجات کے لیے، کتاب اللہ کی آیات ہی کافی ہوتیں، تو کتاب کسی پہاڑ کی چوٹی پر رکھ دی جاتی، عوام کے دلوں میں القاء کر دی جاتی (جیسا کہ وہ اکثر اعتراض بھی کرتے تھے کہ ہم پر وحی کیوں نہیں بھیجی جاتی) لیکن اس علیم وحکیم کو خوب معلوم تھا کہ تعلیم بلا عمل، اور کتاب بلا رسولؐ، ناقص رہ جاتی ہے۔ یہی ضرورت تھی جس کو پورا کرنے کے لیے فرمایا کہ:
>
> ﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ط﴾
>
> ”تمہارے لیے رسولِ خدا کی زندگی میں عمدہ نمونہ ہے۔“

---

❶ معارف، اپریل ۱۹۳۵ء، ص ۲۸۲ تا ۲۸۳۔

اور اس نمونہ کی ضرورت یوں بیان فرمائی:

﴿ لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ ط وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ۝﴾

’’یہ نمونہ اُس شخص کے لیے ہے جو خدا کی ملاقات اور یومِ آخرت کی اُمید رکھتا ہے اور خدا سے بہت ڈرتا ہو۔‘‘ ①

لیکن آج ’’شاہکارِ رسالت‘‘ کے مندرجہ بالا اقتباس کی روشنی میں ’’مفکر قرآن‘‘ کے نزدیک، ’’قرآنی مومن‘‘ وہ ہے جو رسول ﷺ کی تفسیر کو غلط قرار دے، اور اپنی تفسیر کو، رسول اللہ ﷺ کی تفسیر سے بہتر سمجھے بھی، اور ایسا کہے بھی، اور دوسروں سے ایسا سنے بھی۔

غور و فکر کا سدباب؟

اس کے بعد، ’’مفکر قرآن‘‘ صاحب، اپنے اقتباس بالا کے تسلسل میں یہ فرماتے ہیں:

’’نتیجہ یہ کہ قرآنِ کریم کا مفہوم، تفسیر طبری میں مقید ہو کر رہ گیا، اور اس پر غور و تدبر اور تنقید و تنقیح کے سب دروازے بند ہو کر رہ گئے۔‘‘ ②

حالانکہ نہ یہ نتیجہ نکلا، نہ کسی نے یہ نتیجہ نکالا، اور نہ ہی غور و فکر کے دروازے بند ہوئے، اور نہ ہی تنقید و تنقیح کا سدباب ہوا۔ یہ سب کچھ ’’مفکر قرآن‘‘ نے محض اپنی مزعومہ ’’عجمی سازش‘‘ کی راہ صاف کرنے کے لیے، اپنے ہی خیالات کی دنیا میں گھوم پھر کر لکھ ڈالا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کو، مبین، مفصّل اور تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ جو قرار دیا ہے، تو کیا اس کے بعد قرآن پر غور و تدبر کے دروازے بند ہو گئے ہیں؟ پھر اللہ تعالیٰ نے، اس کے باوجود کہ اس کی کتاب، مبین، مفصّل اور تبیانا لکل شیء ہے، اسے نبی علیہ السلام کی وضاحت کا محتاج بنایا ہے، ﴿ وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ ﴾، اور پھر اسی آیت میں، وضاحت نبوی کے بعد بھی، غور و فکر کی گنجائش یہ کہہ کر رکھی ہے: ﴿ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴾۔ حقیقت یہ ہے کہ حدیث رسول کے ذریعہ، قرآن کی تشریح و توضیح کے بارے میں، غور و تدبر کے دروازوں کی بندش کا جو اعتراض، آج خود ’’مفکر قرآن‘‘ صاحب پیش

---

① معارف، اپریل ۱۹۳۵ء، صفحہ: ۲۷۹۔

② شاہکارِ رسالت، صفحہ: ۵۰۵۔

فرمارہے ہیں، کبھی اسی اعتراض کا جواب، مدافعِ سنت اور حامی حدیث کا روپ دھار کر، خود اُنھوں نے بایں الفاظ پیش کیا تھا:

> ”اس پر اعتراض وارد کیا جاتا ہے کہ اگر رسولؐ نے اس پیغام کی تبیین کردی، تو لوگوں کو جو حکم دیا گیا ہے کہ وہ خود غور وفکر کریں، اُن کے لیے غور وفکر کی کون سی چیز باقی رہ جائے گی؟ گذارش ہے کہ قرآن نے اپنے آپ کو بار بار مفصل، مبین اور تبیان لکل شیء کہا ہے۔ اپنی آیات کو بینات قرار دیا ہے۔ لیکن بایں ہمہ تفصیل وتبیین، بار بار یہ حکم دیا گیا ہے کہ: لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ○ لَعَلَّهُمْ يَتَدَبَّرُوْنَ ○ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○ [یونس: ٢٤]۔ اگر قرآن باوجود بین اور مفصل ہونے کے بھی، اس قابل رہتا ہے کہ اس میں تدبر وتفکر کی گنجائش باقی رہ جائے، تو یقیناً رسول کی تبیین کے بعد، انسانی عقل وفکر پر مہریں نہیں لگ جاتیں۔ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ کے لیے، تبیین رسول، مانع نہیں ہوسکتی بلکہ بصیرت وشعور کی سینکڑوں اور راہیں کھل جاتی ہیں۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا ①

تبیین رسول ﷺ کے بعد بھی، غور وتدبر کی صورتیں کیا ہوسکتی ہیں؟ اس کی وضاحت، نیچے حاشیہ میں بایں الفاظ کی گئی ہیں:

> ”اسلامی تدبر واجتہاد سے مقصد یہ ہے کہ جن رموز ومعارف کا قرآن نے اشارۃً اور اجمالاً ذکر کیا ہے، دنیوی علوم وفنون اور ذاتی تحقیق وتدقیق سے ان کی کنہ وحقیقت دریافت کی جائے، مثلاً سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ، قرآن کا اشارہ ہے اور محکمہ آثار قدیمہ، اس تدبر کا نتیجہ۔ اسی طرح احکامِ قرآنی میں تدبر کے معنی یہ ہیں کہ اس بات پر غور کیا جائے کہ وہ کن مصالح پر مبنی ہیں اور اسی طرح انھیں دنیا

---

① معارف، اپریل ۱۹۳۵ء، صفحہ: ۲۷۷۔

> کی بہترین تعلیم ثابت کیا جائے، مثلاً الصلوٰۃ کی غرض وغایت کا قرآن میں اجمالاً ذکر ہے۔ تدبر فی القرآن سے ثابت کیا جائے کہ تخلیق انسانی کے مقاصد کے حصول کے لیے اس سے بہتر کوئی اور ذریعہ نہیں ہوسکتا۔ اسی الصلوٰۃ کی تشکیل، رسول اللہ ﷺ نے فرمادی۔ اس بارے میں تدبر سے مراد یہ ہوگی کہ ثابت کردیا جائے کہ ان مقاصد کے حصول کے لیے اس سے بہتر عملی شکل کوئی پیدا نہیں ہوسکتی۔ ” ❶

ما ابعد الیوم من الامس

”مفکر قرآن“ کے آج اور کل میں کس قدر بُعد بعید واقع ہوچکا ہے۔ کل منکرین حدیث کے جس اعتراض کی وہ خود تردید کیا کرتے تھے، آج وہ خود فتنۂ انکارِ حدیث کے امام و پیشوا بن کر، اُسی اعتراض کو پیش کررہے ہیں۔ کل الصلوٰۃ کے غوروفکر اور تدبر و تعقل کے نتیجہ میں وہ یہ ثابت کررہے تھے کہ الصلوٰۃ کی جو شکل، خود رسول اللہ ﷺ نے تشکیل فرمائی تھی، اس سے بہتر کوئی اور عملی صورت پیدا نہیں ہوسکتی، لیکن آج کے غور و تدبر کا نتیجہ، ہمیں یہ بتاتا ہے کہ الصلوٰۃ سے مراد، رسول اللہ ﷺ کی متعین فرمودہ بہترین صورتِ نماز، ہرگز نہیں ہے، بلکہ اس سے مفہوم ایک خاص قسم کا ”نظام“ قائم کرنا ہے۔ گویا ماضی میں، جو عمل ”وضو“ کہلاتا تھا، آج وہ ”وضع“ کے عمل میں تبدیل ہوگیا ہے۔ یوں ”مفکر قرآن“ اپنے گذشتہ دور کے مؤقف کی، بعد میں، تردید وتغلیط پر اُتر آئے، تاکہ اپنے خارزار تضادات میں کچھ اور اضافہ کرڈالیں۔

اس کے بعد، اپنے اقتباس کے تسلسل میں، ”مفکر قرآن“ صاحب، تفسیر طبری پر یوں گرجتے اور برستے ہیں:

> ”چنانچہ طبری کے بعد، جس قدر تفاسیر لکھی گئیں، وہ اُن ہی کے تتبع میں لکھی گئیں، اور جس نے اس سے اختلاف کی جرأت کی، وہ منکر حدیث، منکر رسالت

---

❶ معارف، اپریل ١٩٣٥ء، صفحہ: ٢٧٧۔

> فلہٰذا ملحد و بے دین قرار پا گیا۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس ایک اقدام سے قرآنِ مجید کو کس طرح ان عقائد و تصورات کا پابند بنا دیا گیا جو ان کتب روایات میں مذکور تھے، جنھیں ایرانی جامعین نے جمع اور مرتب کیا تھا۔'' ❶

اس اقتباس میں، ''مفکر قرآن'' نے پھر جھوٹ کا سہارا لیا ہے اور دروغ گوئی کی روش اپنائی ہے، حالانکہ امام طبری کی تفسیر ''جامع البیان فی تفسیر القرآن'' کے بعد، سینکڑوں تفاسیر لکھی گئی ہیں، جن میں تفسیر طبری سے اختلاف کیا گیا ہے، لیکن اس اختلاف کی بدولت، نہ کسی کو منکر حدیث کہا گیا، اور نہ منکر رسالت۔ نہ کسی کو ملحد قرار دیا گیا، اور نہ ہی بے دین۔ منکر حدیث یا منکر رسالت، البتہ اس شخص کو ضرور کہا گیا، جو کسی حدیث و سُنّت کی بابت یہ کہے کہ ''اگر یہ حدیث رسول یا سنت نبی ہو بھی، تب بھی میرے نزدیک یہ سند و حجت نہیں ہے۔'' ایسا شخص، یقیناً خارج از اسلام ہے، کیونکہ وہ رسول کی شارعانہ، حاکمانہ اور مطاعانہ حیثیت کو چیلنج کرتا ہے، جس کی رتی بھر بھی کوئی گنجائش اسلام میں نہیں ہے۔ ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۝﴾۔ آیت میں اطاعت کے بالمقابل تولّی کا لفظ لایا گیا ہے، جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ جو پیروی و اطاعت کی بجائے تولّی و اعراض کا رویہ اختیار کرتا ہے، اس کا حضورِ اکرم ﷺ اور دین اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

تفسیر طبری پر یہ غیظ و غضب کیوں؟

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تفسیر طبری ہو، یا اس کے تتبع میں لکھی جانے والی بعد کی تفاسیر ہوں، ''مفکر قرآن'' ان پر کیوں اس قدر گرجتے اور برستے رہتے ہیں؟ اس سوال کا جواب، اس وقت تک قابل فہم نہیں ہے، جب تک یہ نہ جان لیا جائے کہ جس ''اسلام'' کو وہ قرآن کے نام پر پیش کرتے ہیں، وہ کن امور پر مشتمل ہے۔ ہر وہ شخص، جس نے ان کے لٹریچر کا تفصیلی مطالعہ کیا ہے وہ یہ جانتا ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد کا ''اسلام''، اُن کے اُس

---

❶ شاہکارِ رسالت، صفحہ: ۵۰۵۔

اسلام سے قطعی مختلف بلکہ متضاد تھا، جسے وہ متحدہ ہندوستان میں پیش کیا کرتے تھے۔

۱۹۴۷ء سے قبل، ان کا اسلام، اصولی طور پر بھی اور فروعی طور پر بھی، علماءِ سلف و خلف کے پیش کردہ (مبنی بر قرآن و سنت) اسلام کے مطابق تھا۔ اُن دنوں، وہ، قرآن کے ساتھ حدیث کا، اور کتاب اللہ کے ساتھ سنت کا بھی ذکر کیا کرتے تھے، اور حدیث و سنت کو بھی، قرآن ہی کی طرح، اسلامی قانون کا ماخذ قرار دیا کرتے تھے۔ ضبطِ تولید کا عمل بھی، اُس وقت، اُن کے نزدیک، ایک خلافِ اسلام عمل تھا۔ گیت سنگیت اور موسیقی بھی خلافِ اسلام امور میں شامل تھے۔ مخلوط سوسائٹی اور مخلوط تعلیم کا وجود بھی، غیر اسلامی چیزیں تھیں، حجاب و نقاب بھی اسلامی تعلیمات کا لازمہ تھا، اور خواتین کے حصولِ تعلیم میں، پردہ کسی طرح بھی حائل قرار نہ پاتا تھا۔ اشتراکیت، اپنے اصول و فروع میں بھی، اور فلسفۂ حیات میں بھی، اسلام سے کلی منافات رکھتی تھی۔ تعدد ازواج کی مخالفت بھی، اُس دور میں، اُن سے صادر نہیں ہوئی تھی۔ .... ان اُمور و مسائل پر مشتمل، اُن کا اسلام، اُس زمانے میں، تفسیر طبری (یا اس کے تتبع میں لکھی جانے والی کسی تفسیر) کے بھی خلاف نہیں تھا۔ .... لیکن پھر پاکستان بننے کے بعد، اُس کے افق پر، جب "طلوعِ اسلام" ہوا، تو انھوں نے زَقند معکوس لگائی، اور جس نئے اور "انقلابی اسلام" کو قطرہ قطرہ قرآن سے کشید کیا، اُس کے اہم اجزاء، اب یہ قرار پائے:

(۱) حجاب و نقاب کی مخالفت کرنا، اور کشفِ وجوہ کو "قرآنی پردہ" قرار دینا۔

(۲) تعدد ازواج کو معیوب قرار دینا۔

(۳) خواتین کے ...... وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ ...... پر عمل کرنے کو حبس بے جا قرار دینا۔

(۴) خواتین خانہ کو، چراغِ خانہ کی بجائے، شمعِ محفل بنانا۔

(۵) خانگی زندگی کے فطری فرائض سے منحرف کر کے، مستورات کو مردانہ مناصب پر براجمان کرنا۔

(۶) مخلوط تعلیم اور مخلوط سوسائٹی کو قرآنی معاشرت قرار دینا۔

(۷) مرد و زن میں معیارِ مغرب کی مساوات قائم کرنا، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر، افضلیتِ اناث کے نظریہ کو قرآنی تعلیم قرار دینا۔

(۸) عقائدِ اسلام میں کمی بیشی کرتے ہوئے، صرف پانچ کی تعداد ہی کو پیشِ نظر رکھنا۔

(۹) ڈارون کے نظریۂ ارتقاء (Theory of Evolution) کو "قرآنی حقیقت" قرار دینا۔

(۱۰) اشتراکیت کے اقتصادی نظام کو، قرآن کے جعلی پرمٹ پر درآمد کرنا۔

تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ.

اب اس "انقلابی اسلام" کا کوئی جزو بھی ایسا نہیں ہے، جس کی تائید و حمایت، اُس تفسیر طبری سے اخذ کی جائے، جس کی ہر آیت کی تشریح میں، فرامینِ نبویؐ اور اعمالِ رسولؐ ہی نہیں، بلکہ صحابہؓ کے اقوال و اعمال کا ریکارڈ بھی موجود ہے۔ "مفکرِ قرآن" صاحب، جب یہ دیکھتے ہیں کہ ان امورِ عشرہ میں سے کسی ایک کی موافقت بھی، نہ تو تفسیر طبری ہی کرتی ہے، اور نہ ہی وہ دیگر تفاسیر، جو اس کے تتبع میں منصۂ شہود پر آئی ہیں، تو ان پر سخت مایوسی چھا جاتی ہے۔ تہذیبِ مغرب کی ذہنی غلامی اور فکری اسیری کا شکار ہونے کی بناء پر، قرآن سے قطرہ قطرہ نچوڑ کر، جو "انقلابی اسلام" خود انھوں نے پیش کیا ہے، وہ اپنی اس "پچاس سالہ" محنت پر پانی پھرتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ امام طبری کا صرف یہی قصور ہے کہ ان کی تفسیر میں، ایک لفظ بھی "مفکرِ قرآن" کو، اپنے خود ساختہ اسلام کی تائید میں نہیں مل پایا۔ اور پھر ویسے بھی، اس "انقلابی اسلام" کے لیے، قرآن کی سرے سے کوئی ضرورت ہی نہیں ہے، کیونکہ اہلِ مغرب نے بغیر کسی قرآن کے، اس "اسلام" کو، "مفکرِ قرآن" کے کتاب اللہ میں غوطہ زن ہونے سے بہت پہلے سے اپنا رکھا ہے۔ آخر "مفکرِ قرآن" کے پیش کردہ اسلام کا وہ کون سا جزو، کون سا تصور اور کون سا عمل ہے، جو مغربی معاشرت اور اشتراکی معیشت میں پہلے سے موجود نہیں ہے۔ "مفکرِ قرآن" کی "پچاس سالہ قرآنی خدمات" کی حیثیت، اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ نصف صدی تک، پانی میں مدھانی چلاتے رہے ہیں، اور پھر اپنی ان "خدمات" کو گولڈن

جوبلی منانے کا بہانہ بنا کر، سطحِ زمین سے بطنِ ارض میں منتقل ہوگئے۔ بہر حال، وہ مجبور تھے کہ صرف تفسیر طبری ہی نہیں بلکہ ہر اُس تفسیر کی مخالفت کریں، جو ان کے مَن گھڑت اسلام کے خلاف ہو۔ تفسیر طبری اور اسی نوع کی دیگر تفاسیر کی مخالفت میں، جو جذبۂ محرکہ پایا جاتا ہے، یہ اسی کا تقاضا ہے کہ وہ آتش در نعل ہو کر، یہ لکھتے ہیں کہ...... "قرآن کا مفہوم، تفسیر طبری میں مقید ہو کر رہ گیا ہے، اور غور و تدبر کے سب دروازے بند ہو کر رہ گئے ہیں"

تفسیر طبری کی خوبیاں

جہاں تک تفسیر طبری کی خوبیوں کا تعلق ہے، اس کی بناء پر ہر عصر و مصر میں، اسے خراجِ تحسین پیش کیا جاتا رہا ہے، کیونکہ یہ تفسیر منقول الآثار تفاسیر کا اوّلین ماخذ ہے۔ استدلال و استنباط اور اقوالِ مختلفہ کی توجیہہ و ترجیح کے پہلو سے اس میں ایسی خصوصیت پائی جاتی ہیں، جن کا تعلق، عقل و دانش اور حریت فکر و نظر کے ساتھ ہے۔ پھر اس میں جس روایت اور اثر کو بھی پیش کیا گیا ہے، پوری سند کے ساتھ کیا گیا ہے، تاکہ جس کا جی چاہے وہ خود چھان پھٹک کر کے دیکھ لے کہ آیا وہ ضعیف ہے یا قوی، صحیح ہے یا غیر صحیح۔ ابن جریر (صاحب تفسیر) خود بھی، ایک تجربہ کار ناقد کی حیثیت سے، اسناد پر نقد و تبصرہ کر کے، ناقابل اعتماد روایات کو ردّ کر دیتے ہیں۔ وہ اپنی تفسیر میں بے مقصد اُمور کی کھوج کرید سے احتراز کرتے ہیں۔ اور فہم قرآن اور تفہیم کتاب اللہ کے پیش نظر، اُن ہی امور پر اپنی توجہ کو مرکوز رکھتے ہیں جن سے دینی بصیرت کے ساتھ ساتھ، ترغیب عمل پیدا ہوتی ہے۔ تفسیر بالماثور کے ساتھ، وہ، لغت اور اشعارِ جاہلیت سے بھی استشہاد کرتے ہیں، اور جہاں ضرورت داعی ہوتی ہے، وہاں صرفی و نحوی مسائل پر بھی اظہارِ خیال فرماتے ہیں۔ فقہی احکام کے ضمن میں، وہ، نہ صرف یہ کہ علماء و فقہاء کے مسالک و مذاہب کا تذکرہ کرتے ہیں، بلکہ دلائل کے ساتھ، ان میں ترجیح اور محاکمہ بھی فرماتے ہیں۔ استنباطِ مسائل میں جودتِ استدلال کا بھرپور مظاہرہ فرماتے ہیں، یہاں تک کہ ائمۂ اربعہ کی طرح، ان ہی کے پایہ کے، یکے از ائمہ فقہ قرار پاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ جس طرح، ائمۂ اربعہ کے علاوہ، دیگر فقہاء (مثل سفیان ثوری وغیرہ) کے مذاہب کو دوام

حاصل نہ ہوسکا، انھیں بھی یہ سعادت نہ مل پائی۔ مزید برآں، وہ ماہر علم کلام بھی ہیں، اکثر آیات کی تفسیر میں، انھوں نے علم الکلام کے بعض پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی ہے جو اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ اس فن میں بھی مہارتِ تامہ رکھتے ہیں۔ ان کی تفسیر کی زبان بھی ادیبانہ اور دلکش ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر شہر اور ہر دہر میں، اہل علم، اس تفسیر کی تعریف میں رطب اللسان رہے ہیں۔

یقیناً یہ تفسیر، کسی معصوم عن الخطاء شخص کی مرہونِ قلم نہیں ہے، اس میں بعض خامیاں اور کمزوریاں موجود ہیں، لیکن اس کی خوبیوں کا پلڑا اس قدر بھاری ہے کہ خامیاں صرفِ نظر ہو جاتی ہیں۔ علماء سلف و خلف نے اس تفسیر کو جس طرح خراجِ تحسین پیش کیا ہے، وہ مندرجہ ذیل اقتباس سے واضح ہے:

(۱) ...... امام جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں:

((کتابہ اجل التفاسیر واعظمها .... فانه یتعرض لتوجیه الاقوال وترجیح بعضها علی بعض والاعراب واستنباط فهو یفوقها بذالك .)) ❶

''ابن جریر کی تفسیر، جملہ کتب تفاسیر سے اعظم و افضل ہے...... اس میں تفسیری اقوال کی توجیہہ و ترجیح، کلمات کی نحوی حالت اور استنباطِ مسائل سے بھی تعرض کیا گیا ہے، جس میں یہ اَوروں پر فائق و برتر ہے۔''

(۲) ...... امام نووی فرماتے ہیں:

((کتاب ابن جریر فی التفسیر لَمْ یُصَنِّفْ أَحَدٌ مِثْلَهُ .)) ❷

''تفسیر ابن جریر جیسی کوئی کتاب، کسی نے بھی تصنیف نہیں کی ہے۔''

(۳) ...... ابو حامد اسفرائنی کا فرمان ہے:

---

❶ الاتقان، جلد: ۲، صفحہ: ۱۹۰۔

❷ طبقات الشافعیہ الکبریٰ، جلد: ۳، صفحہ: ۱۲۳۔

((لو سافر رجل الی الصین حتّٰی یحصل له کتاب تفسیر محمد بن جریر ، لم یکن ذالك کثیرا .)) ❶

''اگر کوئی شخص، تفسیر ابن جریر حاصل کرنے کے لیے چین کا سفر بھی اختیار کرے، تو کچھ بڑی بات نہیں ہے۔''

(۴) ...... شیخ الاسلام، امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''لوگوں میں جو کتب تفاسیر متداول ہیں، تفسیر ابن جریر ان سب سے صحیح تر ہے۔ اس میں علماءِ سلف کے اقوال، صحیح سند کے ساتھ مذکور ہیں۔ ابن جریر، مقاتل بن سلیمان اور کلبی جیسے جھوٹے راویوں سے روایت نہیں کرتے۔'' ❷

(۵) ...... پروفیسر غلام احمد حریری، اس تفسیر کی بابت رقمطراز ہیں:

''ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ تفسیر ابن جریر کو، باقی کتب تفاسیر کے مقابلہ میں، دونوں قسم کا شرفِ تقدم حاصل ہے۔ چنانچہ یہ تفسیر زمانی سبقت و تقدم کی بھی حامل ہے، اور فنی اعتبار سے بھی دیگر تفاسیر پر برتری رکھتی ہے۔ سبقت زمانی تو اس لیے کہ یہ اوّلین تفسیر ہے جو ہم تک پہنچی۔ اس سے قبل، تفسیر کے سلسلہ میں جو کوشش کی گئیں، وہ گردشِ ایام کے ساتھ رخصت ہو گئیں، اور ان میں سے کچھ بھی باقی نہیں، ماسواء ان اقوال کے جن کو ابن جریر نے اپنی کتاب میں سمو لیا ہے، جہاں تک اس تفسیر کی فنی برتری کا تعلق ہے، اس کا مدار و انحصار، اس کے اسلوبِ نگارش پر ہے، جو مؤلف نے اختیار کیا ہے۔'' ❸

تفسیر طبری کو طلوعِ اسلام کا خراجِ تحسین

اب آخر میں، تفسیر طبری، کو جو خراجِ تحسین، طلوعِ اسلام میں پیش کیا گیا ہے، ایک نظر

---

❶ بحوالہ معجم الادباء، جلد: ۱۸، صفحہ: ۴۲۔

❷ فتاویٰ ابن تیمیہ، بحوالہ تاریخ تفسیر و مفسرین (ترجمہ از غلام احمد حریری)، صفحہ: ۲۳۹۔

❸ تاریخ تفسیر و مفسرین، صفحہ: ۲۴۰۔

اس پر بھی ڈال لیجیے، اور پھر طلوعِ اسلام کے اس متضاد رویہ کو بھی ملاحظہ فرمایئے، جس کے تحت، وہ، جب چاہتا ہے، اس تفسیر کی تعریف وتحسین میں رطب اللسان ہو جاتا ہے، اور جب چاہتا ہے، اس کی مذمت کرتے ہوئے، اسے اپنی خودساختہ ”عجمی سازش“ کے سلسلہ کی ایک مثبت یا منفی کڑی بنا ڈالتا ہے:

> ”تیسری صدی ہجری کے اواخر اور چوتھی صدی ہجری میں پورے قرآن کی تفسیریں لکھی گئیں مثلاً تفسیر ابن جریر طبری متوفی ۳۱۰ ھ، تفسیر ابن منذر متوفی ۳۱۸ ھ، تفسیر ابن ابی حاتم ۳۲۷ ھ، تفسیر امام حاکم متوفی ۳۵۹ ھ، تفسیر ابن حیان متوفی ۳۶۹ ھ، وغیرہ۔
>
> ان میں سے ہر ایک نے صحابہ وتابعین اور ان کے بعد کے علماء سے روایات درج کی ہیں۔ خود اپنی طرف سے کوئی بات نہیں لکھی ہے، بجز ابن جریر طبری کے، جن کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ہر آیت کو نقل کرنے کے بعد، اس کے ایک ایک لفظ کے معانی لکھتے ہیں۔ متقدمین کے جو اختلاف ہوتے ہیں، ان کو اسناد کے ساتھ درج کرتے ہیں۔ پھر خود ان میں سے ایک کو ترجیح دے کر، اس کے وجوہ لکھ دیتے ہیں۔ الفاظ سے گزر کر آیات کے مفہوم کے متعلق بھی، ان کا رویہ بعینہٖ یہی ہے۔ کہیں کہیں استنباطِ مسائل، اور وجوہِ اعراب سے بھی بحث کرتے ہیں۔ الغرض، ان کی تفسیر اسلام میں پہلی تفسیر ہے جس میں مؤلف نے اپنی دماغی کوشش اور ذہنی کاوش سے بھی کام لیا ہے، اور ہر موقع پر اس کی شخصیت نظر آتی ہے۔ دراصل، ان کی تفسیر اُن کل اسلامی علوم کا مجموعہ ہے، جو اس وقت تک علماءِ اسلام کے پاس تھے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ امت کا اجماع ہے کہ ابن جریر جیسی تفسیر کسی نے نہیں لکھی۔ امام ابو حامد اسفرائنی کا قول ہے کہ اگر کسی نے چین تک کا سفر کر کے بھی تفسیر طبری کو حاصل کر لیا، تو کوئی بڑی زحمت نہیں اُٹھائی۔ آج روئے زمین پر پورے قرآن کی سب سے پہلی تفسیر یہی ہے۔ یہ اُم التفاسیر ہو چکی

ہے، کیونکہ زمانۂ مابعد میں جتنی تفسیریں لکھی گئیں، سب کی سب اسی سے ماخوذ ہیں۔ اس میں خرابی صرف یہ ہے کہ رطب و یابس ہر قسم کی روایات درج کر دی گئی ہیں، لیکن چونکہ سند، ہر روایت کی اس کے ساتھ ہے، اس وجہ سے جانچنا نہایت آسان ہے۔ امام ابن تیمیہ کے شاگردِ رشید، حافظ ابن کثیر نے اسی کا خلاصہ اور تنقیح کر کے، اپنی تفسیر مرتب کی ہے۔'' ❶

یہ ہے وہ تفسیر ابن جریر، جس کی پرزور مخالفت، ''مفکر قرآن'' صاحب، صرف اس لیے کرتے رہے کہ...... ① یہ تفسیر، اُن کے اُس ''انقلابی اسلام'' کے کسی جزو کی بھی، نہ صرف یہ کہ حمایت نہیں کرتی، جسے اُنھوں نے مغربی معاشرت کے فاسد اجزاء کے ساتھ، اشتراکیت کی پیوندکاری کے نتیجہ میں، قرآنی ٹھپہ لگا کر پیش کیا ہے، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر، یہ عدیم المثال تفسیر، تاریخی شواہد کے ساتھ، اُس اسلام کا نقشہ پیش کرتی ہے، جس پر مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ کے مقالات و معمولات کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ ② مزید برآں، یہ تفسیر، اس ''عجمی سازش'' کی راہ میں سنگ گراں ہے، جسے ''مفکر قرآن'' صاحب، تسویل نفس کے بل بوتے پر گھڑ کر، اُسے عالم واقعہ کی ایک ''حقیقت'' کے طور پر پیش کرنے پر تلے رہے ہیں۔

(۵۲) امام طبری کی تاریخ

تفسیر طبری کو نشانہ بنا ڈالنے کے بعد، ''مفکر قرآن'' صاحب، ''امام طبری کی تاریخ'' کے زیرِ عنوان، جو کچھ لکھتے ہیں، اسے بالاقساط پیش کیا جا رہا ہے، تاکہ ہر قسط کا جائزہ بھی لیا جا سکے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

(۱) ......''جو اسلام عہدِ رسالت مآب ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم میں عملاً رائج و نافذ تھا، اس کے سامنے آنے کی ایک شکل یہ ہو سکتی تھی کہ اس دور کی صحیح تاریخ مرتب ہو جاتی۔ امام طبری نے یہ راستہ بھی روک دیا۔............ ❷

---

❶ طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۴۹ء، صفحہ: ۴۶۔ معارف القرآن، مقدمہ، جلد: ا، صفحہ: ۲۸۔

❷ شاہکار رسالت، ص ۵۰۵۔

امر واقعہ یہ ہے کہ عہد رسالت مآب ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم میں، جو اسلام رائج اور نافذ تھا، ہماری تاریخ، اُسی اسلام کو ہمارے سامنے لاتی ہے۔ اسلامی تمدن، دینی معاشرت، مبنی بروحی معیشت و سیاست، عدلیہ و مقننہ، تعلیم و ثقافت اور حکومتی نظم ونسق کا پورا ڈھانچہ، اُسی اسلام پر قائم تھا، جو خود رسول اللہ ﷺ نے قرآنِ کریم اور اپنی سنت پر استوار کیا تھا، اور متحدہ ہندوستان میں، پرویز صاحب کا پیش کردہ اسلام، چونکہ ''قرآن وسنت'' پر اساس پذیر تھا، اس لیے وہ تاریخ کے بھی مطابق تھا، اور دورِ قدیم کی مزدکیت اور دورِ حاضر کی اشتراکیت کے بھی خلاف تھا۔ لیکن قیامِ پاکستان کے بعد، چونکہ ''مفکر قرآن'' کا اپنا ''اسلام'' بدل گیا، اس لیے انھیں یہ شکوہ پیدا ہو گیا کہ ہماری تاریخ، اُن کے ''بدلے ہوئے اسلام'' کے مطابق، عہد نبوی اور خلافت راشدہ کا نقشہ پیش نہیں کرتی۔ ایک صحیح البصارت آدمی جب بھینگا ہو جائے، تو اس کے زاویۂ نگاہ میں کجی پیدا ہو جاتی ہے، اور وہ کسی چیز کو درست پہلو سے نہیں دیکھتا۔ یہی حال، ہمارے ''مفکر قرآن'' کا ہے، ان کے زاویۂ نگاہ میں جو تغیر واقع ہوا، تو اب انھیں، قرآن وسنت پر مبنی اسلام ''عجمی مذہب'' دکھائی دینے لگا، اور یورپ کی بے حجاب و برہنہ معاشرت کے بے حیا لوازمات کے ساتھ، اشتراکی معیشت کا جوڑ، ''قرآنی اسلام'' نظر آنے لگا۔ متحدہ ہندوستان میں، معارف، ترجمان القرآن اور دیگر مجلّات میں، منکرین حدیث کی مخالفت میں، جس اسلام کو پیش کیا کرتے تھے، اس کا ہر جز، اب ان کی اعوجاجی نگاہوں کو غیر مناسب دکھائی دینے لگا، اور پھر وہ، جب ہر شئے کو، اپنے متغیر نقطۂ نظر سے، بدل ڈالنے پر تُل گئے تو ہر معاملہ میں تضاد و تناقض پیدا ہونے لگا۔ نتیجہ یہ کہ قلم تھامنے کے وقت سے لے کر، مرتے دم تک، اُنھوں نے اس قدر تضادات و تناقضات پیش کیے ہیں کہ ع

سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے!

کتب پرویز بالعموم، اور طلوعِ اسلام کی فائل بالخصوص، تضادات و تناقضات کا وسیع و عریض خارزار ہے۔ آج کچھ کل کچھ، یہاں کچھ وہاں کچھ، کبھی کچھ کبھی کچھ۔ حجابِ نسواں، گیت سنگیت، مصوری و مجسمہ سازی۔ ملکیت مال و اراضی، ضبط تولید، خلیفۃ اللہ اور خلافت

الہیہ انسانی فطرت، وقتِ موت کا تعین و تقرر، دین و مذہب کا معنی و مفہوم، حجیتِ سنتِ رسول بطور ماخذِ قانون، الغرض، ان تمام امور میں، اور ان جیسے دیگر معاملات میں، وہ کون سا امر ہے جس میں واضح تضاد و تناقض کا رویہ نہیں اپنایا گیا۔ سمتِ قبلہ اور نگاہوں کے فوکس کی ہر تبدیلی کے ساتھ، وہ مرغ بادنما کی طرح بدلتے رہے ہیں، اور ساتھ ہی ان کی یہ خواہش بھی رہی ہے کہ خود ان کے بدلنے کے ساتھ، دنیا کی ہر چیز کو بھی بدل جانا چاہیے۔ زمین کو بھی متغیر ہونا چاہیے اور آسمان کو بھی۔ حقائق و واقعات کو بھی، تغیر کی بھینٹ چڑھنے کے لیے، ہر لمحہ، اُن کے حضور دست بستہ حاضر رہنا چاہیے۔ گردشِ لیل و نہار کو بھی، اُن کے اشارہ ابرو پر، آمادۂ انقلاب رہنا چاہیے، حتی کہ کائنات کی ہر چیز کو، اُن سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔

میں نے اپنی کتاب ”جناب غلام احمد پرویز، اپنے الفاظ کے آئینے میں“ میں مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر دس پندرہ مثالیں ایسی پیش کی ہیں، جن سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ”مفکر قرآن“ کا ”قرآنی اسلام“، ۱۹۴۷ء سے قبل کچھ اور تھا، اور قیامِ پاکستان کے بعد، کچھ اور ہو گیا۔ اب یہ بات، وابستگانِ طلوعِ اسلام ہی جانتے ہیں کہ اُن کے بعد والے ”قرآنی اسلام“ نے، پہلے ”قرآنی اسلام“ کو منسوخ کر ڈالا ہے، یا پہلا اسلام، متحدہ ہندوستان کے ”عبوری دور کا اسلام“ تھا، جسے قیامِ پاکستان کے بعد والے اسلام نے، اپنے تکمیلی دور میں پہنچ کر، اُسی طرح پیچھے ہٹا دیا ہے، جس طرح (بقولِ پرویز) پانی مل جانے کی صورت میں تیمم کا حکم پیچھے ہٹ جاتا ہے۔

تاریخ طبری اور اسلامی تاریخ کا پرویزی تصور

اب اسے ”مفکر قرآن“ کا المیہ سمجھیے یا تاریخ طبری کی کوتاہی، کہ کارل مارکس کی اشتراکیت کے ساتھ مغرب کی معاشرتی عادات و اطوار کی پیوندکاری کے نتیجہ میں، جو ”اسلام“ انھوں نے قرآن سے نچوڑ ڈالا ہے، اُس کے کسی بھی جزو کی تاریخ طبری سے تائید و حمایت نہیں ہوتی۔ یہ تاریخ نہ تو عہدِ نبوی اور خلافتِ راشدہ میں پائے جانے والے تعددِ ازواج کو معیوب گردانتی ہے، اور نہ ہی حجاب و نقاب کی مخالفت کر کے، کشفِ وجوہ کو، خواتین کا ”قرآنی پردہ“ قرار

دیتی ہے۔ نہ ہی یہ عورت کے دائرۂ عمل کو گھر کی چار دیواری میں سمیٹے رکھنے کی مخالفت کرتی ہے، اور نہ ہی انھیں گھر سے باہر نکال کر، مردانہ دائرۂ کار میں، جج یا سربراہِ مملکت کے عہدہ پر براجمان کرتی ہے۔ نہ ہی صدرِ اوّل میں، اہلِ اسلام کی مخلوط سوسائٹی کا کوئی ذکر کرتی ہے، اور نہ ہی بالغ ذکور واناث کی مخلوط تعلیم کا کوئی تصور پیش کرتی ہے۔ نہ ہی اُس ''نظامِ ربوبیت'' کے وجود کا کوئی پتہ نشان دیتی ہے جسے چودہ صدیوں بعد، ''مفکرِ قرآن'' نے قرآن کے جعلی پرمٹ پر، کمیونزم سے مستورد کیا ہے، اور نہ ہی زمین کی نجی ملکیت اور مال و دولت کی شخصی ملکیت کی نفی کا کوئی تصور پیش کرتی ہے۔ نہ ہی، اس مبارک دور میں گیت سنگیت اور موسیقی کے حلال و جائز ہونے کا کوئی سراغ دیتی ہے، اور نہ ہی مجسموں کی کسی صنعت کا یا مصوری کی کسی حرفت کا نام ونشان ظاہر کرتی ہے۔ الغرض، جب ''مفکرِ قرآن'' نے یہ دیکھا کہ قرآنِ کریم سے کشید کردہ، اُن کے ''انقلابی اسلام'' کے کسی جزو کی بھی تائید وحمایت، یہ تاریخ (طبری) نہیں کرتی، تو وہ اس کے خلاف، بڑے غیظ وغضب کے ساتھ، وہی رویہ اختیار کرنے پر اُتر آئے، جو کسی حبشی نے، آئینے میں اپنا بھدا بھجنگ اور کالا چہرہ دیکھتے ہوئے، زمین پر دے مارنے کی صورت میں اپنایا تھا۔ چنانچہ ہمارے ''مفکرِ قرآن'' صاحب، جب اسلام کے صدر اوّل کی تاریخ کو، اپنے حالیہ ''قرآنی اسلام'' کے خلاف پاتے ہیں، تو اسے حبشی کی طرح پھینک دیتے، اور اس سے چھٹکارا پانے کے لیے، یہ سوال اُٹھا دیتے ہیں کہ:

> ''کیا ہماری تاریخ اس قابل نہیں کہ اس کو کہیں دریا برد کردیا جائے، اور ہمیشہ کے لیے اس سے چھٹکارا پالیا جائے۔'' ①

کیوں؟ کس لیے؟...... اس لیے کہ بقولِ پرویز صاحب:

> ''قرآن کو صحیح طور پر، سمجھنے کے راستہ میں، سب سے بڑی رکاوٹ، ہماری غلط تاریخ ہے۔'' ②

---

① طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۵۳ء، صفحہ: ۲۶۔

② طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۵۹ء، صفحہ: ۱۰۔

اس تاریخ کا ''غلط'' ہونا، اس بناء پر ہے کہ یہ اُس ''اسلام'' کے معیار پر پورا نہیں اُترتی جسے ''مفکر قرآن'' نے، مغربی معاشرت سے عادات واطوار کی خیرات لے کر، اور اشتراکیت سے معاشی نظام کی بھیک مانگ کر، قرآنی فکر کے نام پر پیش کیا ہے چنانچہ، وہ، اپنے اسی خودساختہ ''قرآنی اسلام'' کو واحد معیار وسند اور تنہا حجت اور اتھارٹی قرار دیتے ہوئے، یہ فرماتے ہیں کہ:

> ''جب میں اپنے تاریخی سرمایہ پر نگاہ ڈالتا ہوں، تو اس میں اسلامی نظام، اسلامی سیاست یا اسلامی ریاست کے متعلق، قرآنی نقطۂ نظر سے لکھا ہوا کچھ نہیں ملتا۔'' ①

اب ظاہر ہے کہ بھینگی اور یرقان زدہ آنکھ کو، کوئی چیز بھی صحیح نقطہ نظر سے اصلی رنگ میں دکھائی نہیں دیا کرتی۔ چنانچہ ہمارے ''مفکر قرآن'' صاحب کو بھی، ہماری تاریخ میں، ان کے خودساختہ قرآنی نقطہ نظر سے کچھ نظر نہیں آتا۔

سوال یہ ہے کہ ہماری تاریخ، اگر ''اسلام'' کے مطابق نہیں ہے، تو پھر آخر کس تاریخ کو ''تاریخ اسلام'' کہا جائے؟ اس سوال کے جواب میں ''مفکر قرآن'' صاحب، جو کچھ فرماتے ہیں، اس پر بے ساختہ ہماری زبان پر یہ الفاظ آجاتے ہیں: ؎

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

وہ فرماتے ہیں، اور کیا خوب انکشاف کرتے ہوئے، فرماتے ہیں:

> ''یورپ کی جدید تاریخ، ایک بدلے ہوئے نام کے ساتھ، اسلام ہی کی تاریخ ہے۔'' ②

الغرض، امام طبری نے اپنی تاریخ مرتب کرکے، جس ''اسلام'' کا راستہ روکا ہے وہ محمد رسول اللہ والذین معہ کا وہ اسلام نہیں ہے جو قرآن وسنت کی بنیاد پر، اللہ کے رسول کے ہاتھوں نفاذ پذیر ہوا تھا، اور جسے بعد میں خلفاءِ راشدین نے، قرآن وسنت ہی

---

① طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۸۱ء، صفحہ: ۳۴۔

② طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۴۰ء، صفحہ: ۶۴۔

کے خطوط پر وسعت دی تھی، بلکہ وہ ’’اسلام‘‘ ہے، جسے ’’مفکر قرآن‘‘ نے مغرب کی فکری اسیری اور اشتراکیت کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہو کر، ’’نظامِ ربوبیت‘‘ کی آکاس بیل کی صورت میں، شجرِ اسلام پر مسلط رکھنے کی ناپاک جسارت کی ہے۔

امام طبری کا ’’جرم‘‘

اس بحث کے آغاز میں، شاہکارِ رسالت کا جو اقتباس ’’امام طبری کی تاریخ‘‘ کے زیرِ عنوان، درج کیا گیا ہے، اس کی دوسری قسط ملاحظہ فرمایئے، جو پہلی قسط کے ساتھ متواتر و مسلسل وابستہ ہے، ’’مفکر قرآن‘‘ صاحب، فرماتے ہیں:

> (۲)...... انھوں نے اپنی تفسیر کے ساتھ، ایک تاریخ بھی مرتب کر دی جو تیرہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہی سُنّی مسلمانوں کی سب سے مبسوط تاریخ ہے۔ اس اعتبار سے طبری کی تفسیر کو اُمّ التفاسیر اور ان کی تاریخ کو اُمّ التواریخ کہا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں جتنی کتب تاریخ بعد میں مرتب ہوئیں، ان کا ماخذ طبری کی تاریخ ہے۔ اس تاریخ میں، اُنھوں نے یہ التزام کیا ہے کہ آیاتِ قرآنی کا جو مفہوم، اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے، اس کی تائید میں عہدِ رسالت مآب ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے واقعات اپنی تاریخ میں درج کر دیے ہیں، اور اس عہد کے جو واقعات، اپنی تاریخ میں درج کیے ہیں، ان کی تائید میں، اپنی تفسیر میں روایات درج کر دی ہیں۔‘‘ ①

واقعی امام طبری کا اس سے بڑا جرم اور کیا ہو سکتا ہے کہ انھوں نے قرآن کی جو تفسیر بیان کی ہے، اس کی تائید میں، عہدِ رسالت مآب ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے واقعات، اپنی تاریخ میں درج کر دیے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ یہ جرم کرنے کی بجائے، غیر مسلم اقوام سے معاشرتی عادات و اطوار کی خیرات لے لیتے، اور اگر کارل مارکس، اس وقت پیدا نہیں ہوا تھا، تو پھر کیا ہوا، مزدکیت کا بانی تو پیدا ہو کر گزر ہی چکا تھا، اُسی سے ’’نظامِ ربوبیت‘‘ کی بھیک لے

---

① شاہکارِ رسالت، صفحہ: ۵۰۵۔

کر، قرآنی اسلام کہتے ہوئے پیش کر ڈالتے۔ لیکن امام طبری نے، اُمت مسلمہ کے ساتھ بڑی زیادتی کی کہ تفسیر قرآن کے بعد، عہد نبوی اور خلافت راشدہ، نیز صحابہ کے واقعات، اپنی تاریخ میں درج کر دیے۔ اور عصر حاضر تک، امام طبری کی یہ اعتداء و زیادتی جاری رہی۔ اور اگر اب بٹالہ کے ''خالص عرب'' علاقے میں، ایک ''عربی مفکر قرآن'' پیدا ہو کر، ''خالص قرآن'' کے نام پر، مغربی معاشرت کے لوازم کے ساتھ، کارل مارکس کی اشتراکیت کو ملا کر، نیا ''دین الٰہی'' پیش نہ کرتا، تو اُمت مسلمہ قیامت تک ''عجمی سازش'' کا شکار رہتی۔ اب امت مسلمہ کو سجدۂ شکر بجا لانا چاہیے کہ دور ماضی کی مفروضہ ''عجمی سازش'' کی موسلا دھار بارش کی بجائے ''مفکر قرآن'' نے ایک ایسا پرنالہ مہیا کر دیا ہے، جس میں سے، اشتراکیت + خدا = اسلام، جیسی مساوات کا متعفن اور بدبودار پانی بہہ رہا ہے۔

(۵۳) ''اسلام، دین نہ رہا، مذہب بن گیا''

امام طبری پر فردِ جرم عاید کرنے کے بعد، ''مفکر قرآن'' صاحب...... ''اسلام، دین نہ رہا، مذہب بن گیا''...... کی سرخی جماتے ہیں اور پھر تحریر فرماتے ہیں:

> ''ماورائے قرآن، خدا سے براہِ راست علم حاصل ہونے کے عقیدہ کا نتیجہ، اتنا ہی نہیں تھا کہ اس سے وضعی حدیثیں وجود میں آ گئیں، اور انھوں نے دین کی حیثیت اختیار کر لی۔ اس کا نتیجہ یہ بھی تھا کہ اسلام، سرے سے دین ہی نہ رہا، یہ مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ دین اور مذہب میں کیا فرق ہے؟ اسے ہم تیسرے باب میں تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ اس کا لب لباب یہ ہے کہ دین اپنی آزاد مملکت میں زندگی کا عملی نظام بن سکتا ہے۔ اپنی آزاد مملکت سے مراد ہے وہ مملکت جس میں قوانین خداوندی (قرآنِ حکیم کے احکام اور اصول و اقدار) حکومت کے قوانین کی حیثیت سے نافذ ہوں، اور عمل پیرا ہوں۔ اگر ایسی مملکت نہ رہے تو پھر دین باقی نہیں رہتا، وہ مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے، مذہب میں دین کے ارکان رسمی شکل میں باقی رہ جاتے ہیں، جن کا عملی نتیجہ کچھ مرتب نہیں

ہوتا۔ ان کی ادائیگی سے انسان، بزعمِ خویش، یہ سمجھ کر کہ میں احکامِ خداوندی کی اطاعت کر رہا ہوں، اپنے آپ کو (جھوٹا) اطمینان دلا لیتا ہے، اور بس۔" ❶

اس اقتباس میں "مفکرِ قرآن" نے تین باتیں بیان کی ہیں، اور تینوں ہی بعید از حقیقت ہیں:

(الف) یہ کہ، قرآن کے علاوہ وحی کے عقیدہ کے باعث، وضعی احادیث وجود میں آ گئیں۔

(ب) یہ کہ، اسلام سرے سے دین ہی نہ رہا، یہ مذہب میں تبدیل ہو گیا، کیونکہ دین اپنی آزاد مملکت ہی میں عملی نظامِ زندگی بن سکتا ہے۔

(ج) "آزاد مملکت" سے مراد وہ مملکت ہے جس میں قرآنِ حکیم کے احکام، اصول و اقدار، حکومت کے قوانین کی حیثیت سے نافذ اور عمل پیرا ہوں۔

(الف) قرآن کے علاوہ وحی

جہاں تک (الف) میں بیان کردہ امر کا تعلق ہے، تو اس کے دو پہلو ہیں:

اوّلاً: یہ کہ وحی صرف قرآن تک ہی محدود ہے یا خارج از قرآن بھی اس کا وجود ہے۔

ثانیاً: وضعِ احادیث کا معاملہ۔

(۱) ثبوتِ وحی خارج از قرآن

آیا قرآن کے علاوہ بھی حضورِ اکرم ﷺ کو وحی آیا کرتی تھی؟ یا آپ کی ساری وحی، قرآن تک ہی محدود تھی؟ منکرینِ حدیث نے اس معاملہ میں اپنا ایمان و اعتقاد، "مفکرِ قرآن" ہی کی جیب میں ڈال رکھا ہے جو یہ کہا کرتے تھے، کہ وحی صرف قرآن کے دفتین تک ہی محصور ہے۔ اس مسئلہ پر علماءِ کرام نے بہت کچھ لکھا ہے، اور قرآنی آیات سے، قرآن کے علاوہ وحی کے ثبوت پیش کیے ہیں۔ ۱۹۶۱ء میں، مولانا مودودی رحمہ اللہ اور یکے از منکرینِ حدیث، ڈاکٹر عبدالودود صاحب کے درمیان، جو قلمی مراسلت ہوئی تھی، اُس میں مولانا مودودیؒ نے، ایک آیت سے تین صورتوں میں وحی کا ثبوت پیش کیا تھا، اور سات آیات، اس حقیقت کی دلیل میں پیش کی تھیں کہ آپ ﷺ کو، قرآن ے علاوہ بھی وحی ملا کرتی تھی۔ یہ پوری مراسلت

---

❶ شاہکارِ رسالت، ص ٥٠٦۔

اور خارج از قرآن وحی کے دلائل و شواہد کی ساری بحث، آج بھی ”سنت کی آئینی حیثیت“ نامی کتاب میں دیکھی جاسکتی ہے۔ لیکن مَیں، ان آٹھ آیات کے علاوہ، ایک ایسی قرآنی دلیل پیش کر رہا ہوں جس کا انکار، پرویز صاحب بھی نہیں کر پائے تھے۔

ہر شخص، اس حقیقت کو جانتا ہے کہ قرآنِ کریم جس ترتیب سے نازل ہوا تھا، اُس ترتیب سے جمع نہیں کیا گیا۔ اس کی نزولی ترتیب، جمعی ترتیب سے مختلف ہے۔ اس کا اعتراف، خود ”مفکرِ قرآن“ نے بھی یہ کہہ کر کیا ہے:

> ”قرآنِ کریم جس مرتب شکل میں اُمت کو دیا گیا ہے، وہ اس کے نزول کی تاریخی ترتیب نہیں ہے، یعنی یہ نہیں کہ جو سورہ (یا آیت) سب سے پہلے نازل ہوئی تھی، وہ قرآن میں سب سے پہلے رکھی گئی ہے، اور سب سے آخری سورہ (یا آیت) وہ ہے جو سب سے آخر میں نازل ہوئی تھی۔ اس کی ترتیب میں ایک اور انداز اختیار کیا گیا ہے۔“ ❶

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآنِ مجید کی نزولی ترتیب سے صرفِ نظر کرتے ہوئے، جس نئی ترتیب کے ساتھ اسے جمع کیا گیا ہے، وہ مبنی بروحی (توقیفی) ترتیب تھی؟ یا محمد بن عبداللہ کی اپنی خواہش نفس پر مبنی ایک خودساختہ ترتیب تھی؟ اس کا جواب، طلوعِ اسلام میں، بایں الفاظ دیا گیا ہے۔

> ”آنحضرت ﷺ قرآنِ مجید کی آیات کو جوڑنے، اور سورتوں کو ترتیب دینے میں، اللہ تعالیٰ کی وحی کا اتباع فرمایا کرتے تھے۔“ ❷

اب اگر واقعی (اور یقیناً) آنحضرت ﷺ نے، اتباعِ وحی ہی میں آیاتِ سُور اور سُوَرِ قرآن میں جمعی ترتیب قائم فرمائی تھی، تو بائیس یا تئیس سال میں، متفرق اوقات میں نازل ہونے والی قرآنی عبارتوں میں یہ ترتیب، جس وحی پر قائم ہوئی تھی، وہ قرآن میں کہاں موجود ہے؟ فی الحال اس سوال کو نظر انداز کیجیے کہ نزولِ قرآن کی اس پوری مدت میں، وحی کی ہر قسط

---

❶ طلوعِ اسلام، اکتوبر ۱۹۸۳ء، صفحہ: ۱۲۔

❷ طلوعِ اسلام، ستمبر ۱۹۵۸ء، صفحہ: ۲۸۔

کے نزول پر، آپ ﷺ کو جمع آیات و سُوَر کی ترتیب سے بذریعہ وحی آگاہ کیا جاتا تھا؟ یا پورے قرآن کے نزول کے بعد، ایک ہی مرتبہ وحی نے، اندازِ ترتیب میں، آپ ﷺ کی راہنمائی کی تھی؟ اگر قرآنِ حکیم میں، ایسی کوئی آیت موجود نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود بھی، آپ ﷺ نے، وحی کے اتباع ہی میں، یہ جمعی ترتیب اپنائی تھی، تو یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ آپ ﷺ کو، قرآن کے علاوہ بھی، وحی آیا کرتی تھی۔

اور تو اور، خود ''مفکرِ قرآن'' (جعفر شاہ پھلواروی کو، اُن کے پیش کردہ سوال پر......

''بتاؤ، قرآن کی ترتیب، وحی کے مطابق ہوئی تھی یا نہیں؟'') ...... جواباً یہ لکھتے ہیں:

> ''میں کہتا ہوں کہ بالکل وحی کے مطابق تھی۔ یہ ترتیب خود اللہ نے متعین کی تھی۔ آپ فرماتے ہیں کہ بتاؤ، قرآن میں یہ الفاظ کہاں لکھے ہیں کہ فلاں سورت کو فلاں مقام پر رکھ لو۔ میں کہتا ہوں کہ ان الفاظ کے لکھنے کی ضرورت ہی نہ تھی، اس لیے کہ آیت کی ترتیب ہی اس وحی کا مقصود تھا، سو وہ پورا ہو گیا۔'' ❶

ذرا اور آگے چل کر، اسی مکتوب میں، پھر لکھتے ہیں:

> ''اللہ تعالیٰ نے جبریل کی وساطت سے وحی کی کہ فلاں آیت فلاں مقام پر آئے گی۔ حضور ﷺ نے اس آیت کو اس مقام پر رکھ دیا۔ میں کہتا ہوں کہ اس صورت میں وحی کا منشا پورا ہو گیا۔ اس کے لکھنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔'' ❷

ایک اور خط میں، وہ پھر، یہ واضح کرنے کے لیے کہ ''ترتیب قرآن کے لیے، خدا کے حکم و ہدایت کو، قرآن میں لکھنے کی ضرورت ہی نہ تھی''، یہ مثال پیش کرتے ہیں:

> ''لیکن سوچیے کہ کیا ان الفاظ کو قرآن میں درج کرنے کی ضرورت تھی؟ اگر آپ کسی کو کوئی مضمون املاء کراتے ہوں۔ دورانِ املاء میں، یہ کہیں کہ اس پیراگراف کو فلاں پیراگراف کے بعد لکھنا، تو کیا مضمون نویس، اس مضمون میں آپ کے یہ الفاظ بھی درج کر دے گا؟ وہ صرف یہ کرے گا کہ اس پیراگراف کو، اس کے

---

❶ طلوعِ اسلام، جولائی ۲۰۰۵ء، صفحہ: ۳۸۔

❷ طلوعِ اسلام، جولائی ۲۰۰۵ء، صفحہ: ۴۰۔

بیان کردہ مقام پر رکھ دے گا۔ اس کے لیے وحی کی ایک نئی قسم ماننے کی ضرورت کیسے لاحق ہوگئی؟“ ❶

یہ الفاظ پڑھتے ہی، بے ساختہ ہماری زبان پر یہ الفاظ آ جاتے ہیں

الجھا ہے پاؤں یار کا زلفِ دراز میں
لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

بندۂ خدا! وحی کی نئی قسم کا اثبات آپ خود کر رہے ہیں۔ بقول آپ کے، جس سرچشمہ سے پورا قرآن آیا ہے، اُسی سرچشمہ سے یہ ہدایت بھی آئی ہے کہ فلاں آیت یا فلاں سورت کو، فلاں آیت یا فلاں سورت سے پہلے یا بعد میں رکھئے، یا بالفاظ دیگر، آپ کی اپنی پیش کردہ مثال میں، جو زبان، کسی کو مضمون املا کروا رہی ہے، وہی زبان، یہ حکم بھی دے رہی ہے کہ اس پیراگراف کو فلاں مقام پر رکھئے۔ اور مضمون نویس، عملاً اتباعِ حکم میں، اُس پیراگراف کو اس کے مطلوبہ مقام پر لکھ دیتا ہے۔ اور اتباع و پیروی کے لحاظ سے، وہ املاءِ مضمون کے حکم میں اور اُس حکم میں جو املاءِ مضمون کا حصہ نہیں ہے، کوئی فرق نہیں پاتا، بلکہ اس کے ہر حکم کی پیروی لازم سمجھتا ہے، خواہ یہ حکم، متنِ مضمون میں درج کرنے کے لیے دیا جائے، یا نہ درج کرنے کے لیے دیا جائے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو، قرآنی احکام کے علاوہ، خارج از قرآن حکم دیا کہ ”قرآن کو نزولی ترتیب کی بجائے، ایک اور انداز سے مرتب کیجیے، جس کی تعلیم بھی اُسی طرح وحی پر مبنی ہے جس طرح خود قرآن، وحی پر اساس پذیر ہے، تو یہ بات آپ سے آپ، وحی کی ایک ایسی قسم کا اثبات کر ڈالتی ہے، جو قرآن کے علاوہ، اور خارج از قرآن وحی ہے لیکن عملاً اتباع و انقیاد کے لحاظ سے، یہ دوسری وحی بھی پہلی وحی کی طرح لازم اور ضروری ہے، اس لیے کہ وحی من حیث الوحی، بجائے خود اس قابل ہے کہ اس کی پیروی کی جائے، اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں جہاں بھی حکم دیا ہے، وحی کی پیروی کا حکم دیا ہے، خواہ وہ وحی، کتابی وحی ہو یا کتاب کے علاوہ زائد از کتاب وحی ہو۔

”مفکرِ قرآن“ کا اس قسم کی سخن سازی کرنا کہ...... ”ترتیبِ قرآن سے آگاہ کرنے والی وحی کے مطابق، جب آیات وسور میں ترتیب قائم کر دی گئی، تو اسے درج کرنے کی ضرورت نہ

---

❶ طلوعِ اسلام، جولائی ۲۰۰۵ء، صفحہ: ۴۰۔

رہی" ...... ایک بیکار اور مہمل بحث ہے جو "مفکر قرآن" نے اصل مسئلہ سے راہِ فرار اختیار کرنے کے لیے چھیڑی ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے ہی نہیں کہ ترتیب قرآن سے آگاہ کرنے والی وحی کو لکھنا چاہیے یا نہیں، بلکہ یہ ہے کہ وحی (خواہ لکھی گئی ہو یا نہ لکھی گئی) بجائے خود واجب الاتباع ہے، اور پیغمبر خدا ﷺ نے، نزول ترتیب سے ہٹ کر، وحی کی روشنی میں، نئی ترتیب میں قرآنِ کریم کو مرتب فرما کر، خود اپنے طرزِ عمل سے یہ بات ثابت کر دی کہ:

(۱) وحی، صرف وہی نہیں ہے جس پر قرآن مشتمل ہے، بلکہ قرآن کے علاوہ بھی آپ ﷺ کو وحی ملا کرتی تھی۔

(۲) اتباع و پیروی کے لحاظ سے، دونوں قسم کی وحیوں میں تفریق نہیں کی جا سکتی۔ وحی، بحیثیت وحی، اس امر کی مستحق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے۔

(۳) وحی کا حکم، خواہ وہ مکتوب ہو یا غیر مکتوب، بہر حال اور بہر صورت واجب الاطاعت ہے، لہٰذا منکرین حدیث کی یہ بات غلط اور باطل ہے کہ قرآن چونکہ لکھ لیا گیا تھا، اس لیے وہ وحی ہے، اور جو کچھ لکھا نہیں گیا، وہ وحی نہیں ہے۔ یہاں زیر بحث مسئلہ میں، جس حکم کے تحت، حضور ﷺ نے قرآن کو نئی ترتیب میں جمع فرمایا ہے، وہ باوجودیکہ لکھا نہیں گیا، قطعی وحی ہے، اور آپ ﷺ نے قرآن ہی کی طرح اس پر عمل فرمایا ہے۔

عقیدۂ وحی اور وضع حدیث

اب رہا "مفکر قرآن" کا یہ خیال کہ خارج از قرآن وحی کے عقیدہ سے وضع احادیث کا دروازہ کھل گیا، تو یہ ایک فریب کارانہ مغالطہ ہے۔ اس صورتِ حال کا اگر تجزیہ کیا جائے تو دو سوال اُبھر کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔

(۱) کیا کتاب اللہ کے علاوہ بھی، پیغمبر کو وحی ملتی ہے یا نہیں؟

(۲) واضعین نے وضع احادیث کیوں کیا؟

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے، اس کا جواب، قرآنِ کریم کی متعدد آیات سے یہ ملتا ہے کہ پیغمبر کو کتابی وحی کے علاوہ بھی وحی ملا کرتی ہے۔ منکرین حدیث، محض اپنی ہٹ دھرمی

سے، اس حقیقت کا انکار کرتے ہیں، ورنہ جہاں تک دلائل و براہین کا تعلق ہے، مولانا مودودیؒ مرحوم نے، اس مسئلہ پر، ڈاکٹر عبدالودود کے ساتھ اپنی مراسلت میں، ایسی اطمینان بخش بحث کی ہے جو پیاسے کی سیرابی اور بیمار کی شفایابی کا ذریعہ ہے۔ اس لیے یہ بات قطعی واضح اور شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ پیغمبر کو، کتاب کے علاوہ بھی وحی ملتی ہے۔ اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے کہ فرعون، جس وحی کا منکر ہو کر، غرقِ آب ہوا تھا، وہ تورات پر مشتمل وحی نہیں تھی، بلکہ تورات کے علاوہ وحی تھی، کیونکہ تورات تو غرقابیٔ فرعون کے بعد، کوہِ طور پر، حضرت موسیٰ کو اُس وقت دی گئی جب کہ وہ اپنی قوم کو لے کر سمندر پار کر کے، صحرائے سینا میں ڈیرے ڈال چکے تھے۔

اب جب کہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ پیغمبر علیہ السلام کو کتابی وحی کے علاوہ بھی وحی کی جاتی تھی، تو اس کا اتباع لازم ٹھہرا۔ تب وہ لوگ، جو خدا پرست نہیں بلکہ ہوا پرست تھے، اور طلب گار آخرت نہیں بلکہ فریفتگانِ دنیا تھے، وہ چاہتے تھے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف، کوئی بات منسوب کر کے، دنیوی مفاد حاصل کیا جائے۔ یہیں سے ہمیں اس سوال کا جواب بھی مل جاتا ہے کہ واضعینِ حدیث نے وضعِ حدیث کا کام کیوں کیا؟ اُن کا احادیث کو وضع کرنا، بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ معاشرہ میں حدیث کو مبنی بر وحی اور واجب الاطاعت سمجھا جاتا تھا، لہٰذا، وضعِ حدیث، بجائے خود، حجیت حدیث کی دلیل ہے۔ مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہی خوب لکھا ہے:

> "جو شخص یہ کہتا ہے کہ بہت سے لوگوں نے حدیثیں گھڑ بھی تو لی تھیں، ہم اس سے یہ کہیں گے کہ حدیثوں کا گھڑا جانا خود اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ آغازِ اسلام میں پوری اُمت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال کو قانون کا درجہ دیتی تھی، ورنہ آخر گمراہی پھیلانے والوں کو جھوٹی حدیثیں گھڑنے کی ضرورت ہی کیوں پیش آئی؟ جعل ساز لوگ وُہی سکے تو جعلی بناتے ہیں جن کا بازار میں چلن ہو۔ جن نوٹوں کی بازار میں کوئی قیمت ہی نہ ہو، انھیں کون بیوقوف

جعلی طور پر چھاپے گا؟ پھر ایسی بات کہنے والوں کو شاید معلوم نہیں ہے کہ اس اُمت نے اوّل روز سے اس بات کا اہتمام کیا تھا کہ جس ذاتِ پاک کے اقوال و افعال قانون کا درجہ رکھتے ہیں، اس کی طرف کوئی غلط بات منسوب نہ ہونے پائے، اور جتنا جتنا غلط باتوں کے اس ذات کی طرف منسوب ہونے کا خطرہ بڑھتا گیا، اُتنا ہی اس اُمت کے خیر خواہ، اس بات کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کرتے چلے گئے کہ صحیح کو غلط سے ممیز کیا جائے۔ صحیح اور غلط روایات کی تمیز کا یہ علم، ایک بہت بڑا عظیم الشان علم ہے جو مسلمانوں کے سوا دنیا کی کسی قوم نے ایجاد نہیں کیا ہے۔ سخت بد نصیب ہیں وہ لوگ، جو اس علم کو حاصل کیے بغیر، مغربی مستشرقین کے بہکاوے میں آ کر، حدیث و سنت کو ناقابل اعتبار ٹھہراتے ہیں، اور نہیں جانتے کہ اپنی اس جاہلانہ جسارت سے وہ اسلام کو کتنا بڑا نقصان پہنچا رہے ہیں۔"

اسی حقیقت کو مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے، جسٹس محمد شفیع کے ایک عدالتی فیصلہ پر تنقید کرتے ہوئے، بایں الفاظ دہرایا ہے:

"فاضل جج نے اس بات کو بڑی اہمیت دی ہے کہ ہزار در ہزار حدیثیں گھڑی گئیں اور اس بات پر بڑا زور دیا ہے کہ تحقیق کرنے والے اس پر خصوصیت کے ساتھ غور کریں۔ لیکن ہم عرض کرتے ہیں کہ تحقیق کرنے والوں کو ساتھ ساتھ اس سوال پر بھی غور کرنا چاہیے کہ یہ ہزار در ہزار حدیثیں اُس زمانے میں آخر گھڑی کیوں گئیں؟ ان کے گھڑے جانے کی وجہ یہی تو تھی کہ حضور ﷺ کا قول و فعل حجت تھا اور آپ ﷺ کی طرف ایک غلط بات منسوب کر کے جھوٹے لوگ کوئی نہ کوئی فائدہ اُٹھانا چاہتے تھے۔ اگر وہ حجت نہ ہوتا اور کسی شخص کے لیے اپنے کسی دعوے کے حق میں حدیث لانا اور نہ لانا یکساں ہوتا تو کسی کو کیا پڑی تھی کہ ایک غلط بات تصنیف کرنے کی تکلیف اُٹھاتا۔ دنیا میں ایک جعل ساز وہی نوٹ تو بناتا

ہے جو بازار میں قدر و قیمت رکھتا ہو۔ جس نوٹ کی کوئی قیمت نہ ہو، اُسے آخر کون احمق جعلی بنائے گا؟" ①

الغرض، اسلام کے صدرِ اوّل میں، از روئے قرآن، لوگ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ پیغمبرِ خدا ﷺ کو، قرآن کے علاوہ بھی وحی آتی ہے، اور یہ کہ آپ ﷺ کا وہ اسوۂ حسنہ، جس کی پیروی اہل ایمان پر لازم کی گئی ہے، سراسر مبنی بر وحی ہے، اور یہ کہ آپ ﷺ کا ہر قول و عمل، مرضاتِ الٰہیہ کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے، اس لیے وہ قانونی حیثیت رکھتا ہے۔ اب اگر کوئی بدبخت، اپنے کسی دنیوی مفاد کے لیے، آپ ﷺ کی طرف ایسی بات منسوب کر ڈالتا ہے جو آپ ﷺ نے نہیں فرمائی، تو وہ ایک مبنی برحق عقیدے کی آڑ میں ناجائز فائدہ اُٹھاتا ہے۔ اُس نے اگر وضع حدیث کا دروازہ کھولا ہے تو اس کی ذمہ داری اُسی بدبخت پر ہے، نہ کہ ایک درست اور مبنی بر قرآن عقیدے پر۔ اُس کی اس حرکت سے ایک صحیح عقیدہ، باطل نہیں ہو جاتا ہے اور نہ کسی واضع حدیث کے غلط طرزِ عمل کے باعث، اُس صحیح عقیدے کو ترک کیا جا سکتا ہے۔ ہر دور میں ایسے لوگ موجود رہے ہیں جو الفاظِ قانون سے روحِ قانون کے خلاف ناجائز فائدہ اُٹھاتے رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کو دیکھتے ہوئے، نہ تو قانون کو کالعدم قرار دیا جا سکتا ہے، اور نہ ہی اُس کا اس بناء پر انکار کیا جا سکتا ہے کہ بعض مفاد پرست لوگ اپنے مفاد کے لیے، اس قانون کو اپنا آلۂ کار بنا لیتے ہیں، لیکن منکرین حدیث، اپنی معکوس ذہنیت کی بناء پر، اُس عقیدہ و قانون ہی کے انکار پر تل جاتے ہیں، جس سے اغراض پرست لوگ ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

(ب) دین اسلام، مذہب میں بدل گیا

اس مبحث کے آغاز میں دیئے ہوئے اقتباس میں "مفکر قرآن" نے جو دوسری بات لکھی ہے، وہ یہ ہے کہ ...... "اسلام سرے سے دین ہی نہ رہا، یہ مذہب میں بدل گیا" ...... "مفکر قرآن" کے انتہائی بڑے اکاذیب واباطیل میں سے، ایک یہ بھی ہے کہ "دین کسی اور چیز کا نام ہے، اور مذہب کسی اور شئے کا۔" پھر وہ اُس چیز کو جسے علماءِ اُمت سلفاً خلفاً، قرآن و

---

① سنت کی آئینی حیثیت، صفحہ: ۳۴۷ تا ۳۴۸۔

سنت کی بنیاد پر پیش کرتے ہیں، ''مذہب'' کا نام دیتے ہیں، اور مغرب کی فاسد معاشرت سے جن اعمال و اقدار کو، اشتراکیت کے ساتھ ملا کر، قرآن کے جعلی پرمٹ پر درآمد کرتے ہیں، اسے ''دین'' کا نام دیتے ہیں، حالانکہ متحدہ ہندوستان میں، جناب غلام احمد پرویز، دین اور مذہب کو مترادف المعنی قرار دیا کرتے تھے، اور دین کو مذہب اور مذہب کو دین کے معنی و مفہوم میں پیش کیا کرتے تھے۔ اس حقیقت کی پوری وضاحت، میری کتاب ''جناب غلام احمد پرویز، اپنے الفاظ کے آئینے میں'' میں موجود ہے، لیکن پاکستان بننے کے بعد، جہاں دیگر صحیح باتوں کو ترک کر کے اُنھوں نے غلط اور گمراہ کن اُمور کو اختیار کیا، وہاں اُن میں سے ''دین و مذہب'' کی تفریق کا یہ خودساختہ تصور بھی اپنایا ہے، اور پھر اس تصور کو، طلوعِ اسلام میں بھی اور کتب پرویز میں بھی، ایک یلغاری پراپیگنڈے کے زور پر، اپنے حلقۂ قارئین کے قلوب و اذہان میں راسخ کیا گیا، اور یہاں تک کہا گیا کہ:

> ''حقیقت یہ ہے کہ مذہب کا لفظ ہی غیر قرآنی ہے۔ قرآن نے یہ لفظ کہیں استعمال نہیں کیا۔'' ❶

اور ''مفکر قرآن'' چونکہ بٹالہ کے ''خالص عرب'' علاقے میں پیدا ہوئے تھے، عربی اور وہ بھی صرف قرآنی عربی ہی ان کی مادری زبان تھی، اس لیے وہ اپنی نگارشات میں صرف وہی الفاظ اور اصطلاحات استعمال کیا کرتے تھے جو قرآن میں موجود ہیں۔ غیر قرآنی مفردات سے وہ واقف ہی نہیں تھے۔ اس لیے لوگوں کو یہ باور کر لینا چاہیے کہ ''نظامِ ربوبیت''، ''مرکز ملت''، ''سنٹرل اتھارٹی'' اور ''قانون مکافات'' وغیرہ کی جو اصطلاحات، اُنھوں نے اپنے لٹریچر میں استعمال کی ہیں، وہ سب کی سب ''قرآنی اصطلاحات'' ہیں۔ ان میں سے کوئی اصطلاح بھی ''غیر قرآنی'' نہیں ہے۔ اب اگر کوئی لفظ، قرآن میں استعمال نہیں ہوا، تو وہ صرف ''مذہب'' کا لفظ ہے، جو سراسر غیر قرآنی لفظ ہے۔ پھر ''مفکر قرآن'' صاحب، اپنی اس لَے کو اور بڑھاتے ہیں، تو اپنی خانہ زاد تفصیلات کے ذریعے، دین اور مذہب میں ایسے

---

❶ طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۶۰ء، صفحہ: ۳۱۔

ایسے فروق و امتیازات پیش کرتے ہیں جو طلوعِ اسلام، مئی جون ۱۹۶۳ء کے صفحہ ۴۳ تا ۷۶ تک پھیلے ہوئے ہیں، اور پھر وہی، ڈھاک کے تین پات، نتیجہ یہ نکالتے ہیں کہ...... "اسلام کے ساتھ یہی کچھ ہوا، کہ وہ دین نہ رہا بلکہ مذہب بن گیا"......

بہر حال، ۱۹۶۳ء میں، دین و مذہب کے فروق و امتیازات کو تفصیل سے پیش کر ڈالنے کے بعد، دروغ گورا حافظہ نہ باشد، کی واضح مثال، یوں ہمارے سامنے آتی ہے کہ ایک نہیں، بہت سے مقامات پر، دین اور مذہب کو مترادف المعنی الفاظ جانتے ہوئے استعمال کیا، صرف تین اقتباسات بطورِ نمونہ مشتے از خروارے ملاحظہ فرمایئے:

(۱) ...... "مطالبۂ پاکستان کی بنیاد اس فتویٰ پر تھی کہ اسلام کی رو سے ہندوستان میں بسنے والے مسلمان، اپنے مذہب پر (جسے دین کہا جاتا ہے) ایک الگ قوم ہیں۔" ❶

(۲) ...... "ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان متنازعہ فیہ مسائل، سیاسی یا معاشی نہیں تھے۔ اس اختلاف کی بنیاد مذہب پر تھی۔" ❷

(۳) ...... "دنیا میں جس قدر کشت و خون مذہب کے نام پر ہوا ہے، دیگر وجوہات یا محرکات کے نتیجہ میں اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں آیا۔ ان سب کے خلاف قرآنِ کریم نے اعلان کر دیا کہ دین (عرفِ عام میں مذہب) کے معاملہ میں کسی قسم کا جبر نہیں۔" ❸

مذہب پرویز کا (پاکستان میں آنے کے بعد) سارا کھڑاک ہی "دین" اور "مذہب" کی تفریق پر قائم ہے، لیکن ۱۹۶۳ء میں، "مذہب" اور "دین" میں تفریق کر ڈالنے کے بعد، ۱۹۶۹ء، ۱۹۷۴ء اور ۱۹۷۹ء میں، پھر یہ اعتراف کر کے کہ عرفِ عام میں دونوں الفاظ ایک ہی مفہوم کے حامل ہیں، "مفکرِ قرآن" نے اپنے خارزارِ تضادات میں مزید اضافہ کر ڈالا۔

---

❶ طلوعِ اسلام، مارچ ۱۹۶۹ء، صفحہ: ۵۷۔ ❷ طلوعِ اسلام، ستمبر ۱۹۷۴ء، صفحہ: ۲۴۔

❸ تفسیر مطالب الفرقان، جلد: ۳، صفحہ:...... (مطبوعہ نومبر ۱۹۷۹ء)

پریم اور شانتی کا مذہب (تصنیف پرویز)

''مفکر قرآن'' جناب چودھری غلام احمد پرویز، جو قیامِ پاکستان کے بعد، اسلام کو مذہب کی بجائے، دین کہنے لگ گئے تھے اور اس پہلو سے یہ نکتہ آفرینی بھی فرمایا کرتے تھے کہ ''مذہب کا لفظ ہی قرآن میں نہیں ہے'' متحدہ ہندوستان میں، نہ صرف یہ کہ اسلام کو مذہب کہا کرتے تھے بلکہ وہ ''پریم اور شانتی کا مذہب'' کے نام سے ایک کتاب کے بھی مؤلف تھے۔ اس کتاب پر، ترجمان القرآن میں، مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کا جو جچا تلا، غیر جانبدارانہ اور مبنی برعدل وانصاف تبصرہ شائع ہوا تھا، ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے:

> پریم اور شانتی کا مذہب ـــــ تالیف جناب چودھری غلام احمد پرویز صاحب۔ بی اے
>
> ''جناب پرویز سے ناظرین ترجمان القرآن خوب واقف ہیں۔ اُن کے نام ہی سے لوگ خوب اندازہ کرلیں گے کہ یہ چھوٹا سا پمفلٹ، کن خوبیوں کا حامل ہوگا۔ تاہم تبصرہ نگار کا فرض ہے کہ ہر چیز کا حسن وقبح سامنے لاکر رکھ دے۔
>
> فاضل مؤلف نے اس رسالہ میں کوشش کی ہے کہ اسلام کا جو بھیانک تصور، اغیار کے مکروہ اور بے اصل پراپیگنڈے نے غیر مسلم دماغوں میں پیدا کردیا ہے، اسے قرآن کی تعلیمات کے سیدھے سادے لفظوں میں پیش کرکے دور کردیا جائے، اور بلاشبہ اس کام کو اُنھوں نے بڑی خوبی کے ساتھ انجام دیا ہے۔ وحی، ایمان، قرآن اور ختم نبوت کے مسائل کے ساتھ ساتھ، بعض اسلامی احکام کو جس دلآویز، مؤثر، عام فہم اور سلجھے ہوئے اندازِ بیان میں اُنھوں نے پیش کیا ہے، وہ متعصب سے متعصب انسان کے دل میں بھی، اسلام کی حقانیت کا نور، کم سے کم ایک مرتبہ تو چمکا ہی دے گا۔ لیکن اس بات سے ہمیں سخت اختلاف ہے کہ دوسروں کے لیے اسلام کو مزین بنانے کی خاطر، ہم ان تخیلات کو اسلام کی طرف منسوب کریں جو ان کو اپیل کرنے والے ہوں مگر خود اسلام میں موجود نہ ہوں۔

اسلام کو پریم اور شانتی کا مذہب کہنا کسی طرح درست نہیں۔ ”پریم“ اور ”شانتی“ یہ دونوں الفاظ، ہندوؤں کے فلسفۂ اخلاق اور ان کے تصوراتِ روحانیت کی ترجمانی کرتے ہیں، جن پر اہنسا پرمودھرما اور نروان کے نصب العین کی بناء قائم ہوتی ہے۔ ہندو فلسفی، دنیا کی زندگی کو، مایا کا جال سمجھتا ہے اور اس مایا کے جال، میں پھنستے ہی، اسے آواگون کے چکر میں پڑ جانے کا خوف ہوتا ہے، اس لیے وہ نظام اجتماعی کی ذمہ داریاں قبول کرنے سے جی چراتا ہے اور حیاتِ دنیا سے منہ موڑ کر، اپنے لیے عافیت اور سکون کا گوشہ تلاش کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ عدل کی بجائے پریم، اور مجاہدہ کی بجائے شانتی کے تصورات، اس کے ذہن کو اپیل کرتے ہیں۔ منصب خلافت کے فرائض نہ قبول کرنے والے کے لیے ”پریم“ اور رزم گاہِ خیر و شر سے منہ موڑنے والے کے لیے ”شانتی“ کے سوا، اور کون سی معراجِ تخیل ہو سکتی ہے؟ مگر اسلام سرے سے اس تصور حیات ہی کا مخالف ہے۔ اس کا تصور یہ ہے کہ انسان زمین پر خدا کا خلیفہ ہے، اور یہاں اُسے اس لیے بھیجا گیا ہے کہ اپنے نفس کی طاقتوں اور کائنات کی ساری قوتوں سے خدا کی مرضی کے مطابق پورا پورا کام لے، اور اپنی سعی و کاوش سے دنیا کی زندگی کو ایسا کامیاب بنائے کہ وہ خدا کے مقرر کیے ہوئے معیارِ کامیابی پر پوری اُترے، اور اس پر آخرت کی کامیابی کا نتیجہ مترتب ہو۔ اس نظام میں پریم اور شانتی بھی اپنی جگہ پر ہیں مگر ان کو اوّلیت کا شرف حاصل نہیں ہے بلکہ اوّلیت کا شرف صرف ایک چیز کو حاصل ہے اور وہ یہ ہے کہ آفاق و انفس کی تمام متصادم قوتوں کے درمیان، قانونِ الٰہی کے مطابق عدل قائم کیا جائے، اور اس عدل کو قائم کرنے کے لیے، منفرداً و مجتمعاً تمام اخلاقی اور مادی طاقتوں سے مجاہدہ کیا جائے۔ لہٰذا، اسلام کو اگر کسی چیز کا مذہب کہا جاسکتا ہے، تو وہ پریم اور شانتی نہیں، بلکہ عدل اور جہاد فی سبیل اللہ ہے۔“ ①

---

① ترجمان القرآن، جلد: ۱۲، عدد: ۲، صفحہ: ۱۵۰۔

پھر اس پمفلٹ کا اشتہار، قیامِ پاکستان سے قبل، طلوعِ اسلام کے ایک شمارہ میں، بایں الفاظ، شائع کیا گیا تھا:

> ”آج دنیا جس امن و سلامتی اور محبت کی طلبگار ہے، وہ سوائے قرآنِ کریم کے دنیا کے کسی گوشہ میں نہیں مل سکتی۔ دنیا جنگ و جدل اور نوع بشری کی تقسیم در تقسیم سے گھائل ہو چکی ہے۔ اس کو ایسے مرہم کی تلاش ہے جو زخموں کو مندمل کر کے زمین کو انسان کے لیے بہشت زار بنا دے۔“
>
> ## ”رسالہ پریم و شانتی کا مذہب“
>
> آپ کو بتائے گا کہ یہ دولت صرف اسلام کے آستانہ پر بٹتی ہے، آپ بھی اس کا مطالعہ فرمائیے اور کثرت سے غیر مسلموں میں تقسیم کر کے بتائیے کہ اسلام، سراپا محبت و سلامتی ہے۔
>
> تین پیسے کے ٹکٹ ارسال کرنے پر یہ رسالہ مفت ارسال کیا جائے گا۔“ ①

حقیقت یہ ہے کہ ”مفکرِ قرآن“ صاحب کا ”عجمی اسلام“ کا راگ الاپتے ہوئے یہ کہنا کہ ”اسلام سرے سے دین رہ ہی نہیں گیا، بلکہ مذہب میں تبدیل ہو گیا“ ایک بے جا سخن سازی ہے، جو محض اپنے تخیل کی گاڑی کو دھکا دینے کے لیے اختیار کی گئی ہے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد، شورائی خلافت، جب موروثی ملوکیت میں بدل گئی، تو اس سے جو فرق واقع ہوا، وہ حکمرانوں کے سیاسی اُمور سے متعلق تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امارت، مشاورت کا نتیجہ نہ رہی، اور امارت پالینے کے بعد، اس کا نظام چلانے کے لیے بھی مشورہ ترک کر دیا گیا، اس سے یقیناً اسلامی آئین کی روح کمزور پڑ گئی، تاہم کسی حکمران نے بھی یہ جرأت نہ کی، کہ دستور و آئین ہی کو منسوخ یا تبدیل کر دیا جائے، اور اگر کسی حکمران نے ایسی حرکت کی بھی، تو کسی نہ کسی بندۂ خدا نے اُٹھ کر، مزاحمت کی، بہرحال سیاسی دائرہ میں اس تبدیلی کے باوجود، زندگی کے باقی شعبے آغازِ اسلام سے لے کر، قرآن و سنت ہی پر قائم ہیں۔ معاشرتی زندگی، ان ہی اصول و آداب اور اداروں پر قائم تھی جو اسلام کے آغاز

---

① طلوعِ اسلام، اگست ۱۹۳۸ء، صفحہ: ۴۰۔

ہی میں متعین کر دیے گئے تھے، تعلیم و تعلم کی ساری سرگرمیاں، اسلام ہی کے فلسفہ پر مبنی تھیں، جہادی کاوشیں بھی، اُسی طرح برقرار تھیں جیسے صدرِ اوّل میں جاری و ساری تھیں، تعزیر و عقوبات کا نظام بھی وہی تھا جو عہدِ نبوی اور خلفاءِ راشدین میں نافذ و قائم تھا۔ چنانچہ، خلافت راشدہ کے بعد حکومتوں کی صحیح پوزیشن فی الواقع یہ رہی ہے جسے سیّد مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا ہے:

> ”درحقیقت نہ وہ پوری اسلامی تھیں، نہ پوری غیر اسلامی۔ ان میں اسلامی دستور کی دو اہم چیزوں کو بدل دیا گیا تھا۔ ایک یہ کہ امارت انتخابی ہو، دوسرے یہ کہ حکومت کا نظام مشورے سے چلایا جائے۔ باقی ماندہ اسلامی دستور چاہے اپنی صحیح اسپرٹ میں برقرار نہ رکھا گیا ہو، لیکن اسے منسوخ یا تبدیل نہیں کیا گیا۔ ان حکومتوں میں قرآن و سنت ہی کو ماخذ قانون مانا جاتا تھا۔ عدالتوں میں اسلامی قانون ہی نافذ ہوتا تھا، اور مسلمان حکمرانوں نے کبھی یہ جرأت نہیں کی کہ قانونِ اسلام کو منسوخ کر کے، اس کی جگہ انسانی ساخت کے قوانین جاری کر دیں، اور اگر کبھی کسی حکمران نے اس کی جرأت کی تو تاریخ اسلام گواہ ہے کہ کسی نہ کسی اللہ کے بندے نے اُٹھ کر، اس کے خلاف جہادِ عظیم کیا، یہاں تک کہ اس فسق کا سدباب ہو کر رہا۔ مجدد الف ثانی اور ابن تیمیہ رحمہما اللہ نے اس طرح کی کوششوں کے مقابلے میں جو کچھ کیا، اس پر تاریخ گواہ ہے۔“ ❶

اور ہمارے ”مفکر قرآن“ یہ جو راگ الاپا کرتے تھے کہ خلافت راشدہ کے بعد، اسلام بالکلیہ ختم ہو گیا۔ دورِ جاہلیت کی یہودیت اور نصرانیت کو مسلمانوں نے گلے لگا لیا۔ اور سارے معاشرے پر عجمیت چھا گئی، تو یہ مبالغہ آمیز سیاہ تصویر، صرف اور صرف اپنی من گھڑت ”عجمی سازش“ کے اثبات کی راہ ہموار کرنے کے لیے تراشی گئی ہے۔

(ج) آزاد مملکت سے مراد؟

آغازِ مبحث میں، جس اقتباس پرویز کو پیش کیا گیا ہے، اس میں آخری بات یہ کہی گئی

---

❶ ترجمان القرآن، جنوری ۱۹۵۳ء، صفحہ: ۳۵ تا ۳۶۔

ہے کہ آزاد مملکت سے مراد، وہ مملکت ہے جس میں قرآنِ حکیم کے احکام، اصول و اقدار، حکومت کے قوانین کی حیثیت سے نافذ اور قابل عمل ہوں۔ حالانکہ یہ بھی یکے از اکاذیب و اباطیل ہے، کیونکہ آزاد مملکت سے مراد، قرآن و سنت پر قائم ریاست ہے، اور ایسی ہی حکومت، عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں قائم تھی، یہ وہ حقیقت ہے جس کا انکار، اسلم جیراجپوری جیسا کٹر منکر حدیث بھی نہیں کر سکا ہے، چنانچہ وہ خود خلافت راشدہ کے متعلق یہ لکھتے ہیں:

''خلافت راشدہ میں تشریع کی بنیاد، قرآن اور سنت پر تھی۔'' ❶

قرآن و سنت پر مبنی حکومت ہی، اہل اسلام کے نزدیک، اسلامی حکومت ہے۔ رہی وہ ''قرآنی حکومت'' جو مغرب کی فاسد معاشرت کے اجزاء، اور اشتراکیت کے اقتصادی نظام کے ملغوبہ کے طور پر، قرآنی غلاف میں پیش کی گئی ہے، تو اس کا وجود، نہ تو عہد نبوی میں دکھائی دیتا ہے، اور نہ ہی خلافت راشدہ میں۔ لیکن بہرحال ''مفکر قرآن'' کی دور رس نگاہوں نے ''قرآنی حکومت'' کا وجود ڈھونڈ لیا تھا۔ کہاں اور کس زمانہ میں؟ ملاحظہ فرمائیے، طلوع اسلام کی طرف سے اس سوال کا جواب:

> ''ہندوستان کی تاریخ میں اکبر کی شخصیت بڑی متنازعہ فیہ ہے۔ اس کی طرف جتنی باتیں منسوب کی جاتی ہیں، مؤرخین ان پر آج تک متفق نہیں ہو سکے۔ اگر کوئی ایک ان کی تائید کرتا ہے تو دوسرا ان کی تردید کرتا ہے۔ ہم اس وقت اس تاریخی بحث میں نہیں الجھنا چاہتے، لیکن ایک بات کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں۔ کشفی صاحب نے لکھا ہے کہ علماء نے جو محضر مرتب کیا تھا، اس کی رُو سے یہ طے پایا تھا کہ اختلافی مسائل میں آخری فیصلہ سلطان کا ہوگا، اور اس فیصلے کا شرع کے مطابق ہونا لازم قرار دیا گیا تھا۔ اُنھوں نے لکھا ہے کہ اگر شرع کی جگہ ''قرآن'' کا لفظ ہوتا تو نتیجہ کچھ اور ہوتا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس محضر میں شرع نہیں بلکہ

---

❶ تاریخ الامت، از اسلم جیراجپوری، جلد: ۳، صفحہ: ۲۵۷۔

"قرآن" ہی لکھا گیا۔ اس وقت ہمارے سامنے ملا بدایونی کی "منتخب التواریخ" نہیں کہ ہم اس کے الفاظ پیش کر سکتے، لیکن اکرام صاحب نے اپنی کتاب (The History of Religion) کے صفحات ۲۴۷، ۲۴۸ پر اس پورے محضر کا انگریزی ترجمہ دیا ہے، اس کی رُو سے محضر میں یہ کہا گیا ہے کہ:

> اگر اس کے بعد کوئی ایسا مسئلہ پیش ہو جس میں مجتہدین کی آراء ایک دوسرے سے مختلف ہوں، اور سلطان اپنی خداداد بصیرت کی بناء پر، رعایا کی بہبود اور سیاسی مصالح کے پیش نظر، ان باہم دِگر متعارض اور متضاد آراء میں سے کسی ایک کو اختیار کر کے اس کے مطابق احکام صادر کر دے تو ان احکام کی اطاعت ہم پر اور تمام رعایا پر فرض ہوگی۔ نیز سلطان اگر کوئی نیا حکم جاری کرنا چاہے تو ہم پر اور دیگر رعایا پر اس کی اطاعت بھی فرض ہوگی بشرطیکہ وہ حکم قرآنِ پاک کی آیات کے مطابق ہو، اور اس سے مقصد رعایا کی بہبود ہو۔" ❶

اس اقتباس کی بنیاد پر، اکبر بادشاہ کی حکومت کو "قرآنی حکومت" ثابت کرنے کے لیے، طلوعِ اسلام نے یہ اندازِ استدلال اختیار کیا ہے:

> "اس سے ظاہر ہے کہ بادشاہ کے فیصلے کو، قرآن کی حدود میں مقید رکھا گیا تھا اور یہ چیز عین اسلام کے مطابق ہے۔ علماء اور فقہاء کی بحث میں، فیصلے کا حق رئیس مملکت کو حاصل ہونا، اسلام میں قانون سازی کے اصول کے عین مطابق ہے۔ اسلام میں علماء یا کسی اور کو، قاضی کا منصب حاصل نہیں ہوتا۔ علماء کی حیثیت محض مشیر یا وکیل کی ہوتی ہے۔ فیصلہ کا اختیار یا تو مملکت کی طرف سے مقرر کردہ جج کو حاصل ہوتا ہے یا خود مملکت کی مرکزی اتھارٹی کو۔ اور ان کا یہ اختیار مشروط ہوتا ہے اس شرط کے ساتھ کہ ان کا فیصلہ قرآن کے خلاف نہیں ہوگا۔ اکبر کا فیصلہ دونوں شرطوں کو پورا کرتا ہے، اور اسلام کے عین مطابق ہے۔" ❷

---

❶ طلوعِ اسلام، اگست و ستمبر ۱۹۶۴ء، صفحہ: ۷۱۔

❷ طلوعِ اسلام، اگست ستمبر ۱۹۶۴ء، صفحہ: ۷۱۔

اب جب کہ یہ ثابت ہو گیا کہ بادشاہ اکبر کی حکومت ''قرآنی حکومت'' تھی، تو یہ جاننا بھی ضروری ہے، کہ یہ کیسی حکومت تھی؟ اور اس ''قرآنی حکومت'' کی کیا برکات ظہور میں آئیں؟ اس کے متعلق خود طلوعِ اسلام ہی ایک مقام پر، یہ لکھتا ہے کہ:

> ''اس قوم کے اندر شہنشاہ جلال الدین اکبر کا وجود، اسلام اور اہل اسلام کے حق میں، ایسا زہریلا ثابت ہوا جس کا روئے زمین پر کوئی تریاق نہ ہو۔ اس بدبخت نے مذہب مقدس اسلام کی تنسیخ کا اعلان کیا، اور اس کی ساری عمر، ہندو قوم کو خوش رکھنے اور ان کے سیاسی اقتدار کی بلندی میں صرف ہوئی۔ وہ روزِ اوّل سے ایسا بدبخت اور ایسا بے نصیب تھا کہ وہ افغانوں کی ایسی غیور قوم کی فوق العادت جرأت اور بہادری سے کوئی فائدہ نہ اُٹھا سکا۔ اگر وہ اس قوم کو ہاتھ میں لیتا تو وہ مشرکین ہند کے سارے مقبوضات اور براعظم ایشیاء کے باقی ملکوں کو فتح کرنے اور ان کے اندر اسلام کا پیغام پہنچانے میں کامیاب رہتا، لیکن اس نے اس قوم کو، جو بقرارِ فرمان ﴿ لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِلَّذِينَ آمَنُوا الْيَهُودَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا ﴾، جو خود اُس کی، اُس کی اولاد کی، اور سارے اہل اسلام کی فطری دشمن تھی، اسے گلے لگایا۔ اور اس قوم کو، جو حقیقت میں اس کے کام آ سکتی تھی، اس کو زیادہ سے زیادہ قعرِ مذلت اور نکبت میں ڈالے رکھنے کی پالیسی اختیار کی۔ ہائے بدبختی ہماری کہ اُس نے ایسی قوم کو، جو صدہا سال سے جمود اور بے حسی کے سمندر میں غرق تھی، اس کو نہ صرف بیدار کر دیا، بلکہ ملک ہند میں متحدہ قومیت کی بنیاد رکھ کر، اسلام اور اہل اسلام کے دوبارہ اُبھرنے کی اُمیدوں کو خاک میں ملا دیا، اور مشرک قوم کو سیاسی حیات کی اس سربلندی پر پہنچا دیا کہ وہ اس لائق ہو گئی کہ تھوڑی مدت کے اندر سرزمین ہند، سندھ اور افغانستان کے اندر، اسلام اور اہل اسلام کا نام و نشان مٹا کر، اپنی فتوحات کا جھنڈا کوہِ ہندوکش پر گاڑ سکے۔ اگر اس دوران میں، اچانک پردۂ غیب سے، ایک مردِ خدا، قوم افغان سے احمد

> شاہ ابدالی کی صورت میں رونما ہو کر، مرہٹہ فتوحات کے سیلاب کو نہ روکتا، اور ۱۷۶۱ء میں بمقام پانی پت، قوم مذکور کی ساری عسکری قوت کو نیست و نابود نہ کرتا تو بے شک مشرک قوم درۂ خیبر کی راہ سے تمام افغانستان پر قابض ہو کر، رام راج کی اس پرانی یادگار کو تازہ کرنے میں کامیاب ہو جاتی جو ۲۷۳/۲۳۱ ق م راجہ اشوک کے عہد میں تھی۔ اس لیے کہ قوم مذکور، ساری سلطنت مغلیہ پر، فاتحانہ قبضہ کرنے کے بعد، قلعہ اٹک پر رام راج کا جھنڈا گاڑ چکی تھی۔ خدا کی پناہ!“ ❶

”قرآنی حکومت“ کے ”مرکز ملت“ جناب جلال الدین اکبر کی ”اسلامی اور قرآنی خدمات“ کو جان لینے کے بعد، اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی اور کے پیش نظر بھی ”قرآنی حکومت“ کے قیام کا مقصد تھا؟ طلوع اسلام کے تحقیقی اور تفتیشی مزاج نے بڑی کھوج کرید کے بعد، کتب تواریخ کو کھنگال کر، اس سوال کا جو جواب تلاش کیا ہے، اس کو بھی ملاحظہ فرمائیے:

> ”یہ قرآن ہی تو ہے جس کے متعلق ایک عیسائی مفکر فرانسیسی جرنیل نپولین بونا پارٹ نے کہا تھا...... ”مجھے اُمید ہے وہ دن دُور نہیں جب میں تمام ملکوں کے دانشمند اور تعلیم یافتہ لوگوں کو اکٹھا کروں گا، اور ایک ایسی حکومت بناؤں گا جو قرآن کے اصولوں پر مبنی ہوگی۔“ ❷

اکبر بادشاہ جیسے ”مرکز ملت“ کی ”قرآنی حکومت“ کے بعد نپولین بونا پارٹ کی ”قرآنی حکومت“ کے قیام کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا یا نہیں؟ اس سوال کا جواب، مسلمانوں کی تاریخ سے مل تو نہیں سکتا۔ کیوں؟ اس لیے کہ ”مفکر قرآن“ کا فرمان ہے کہ:

> ”میں جب اپنے تاریخی سرمایہ پر نظر ڈالتا ہوں تو اس میں اسلامی نظام، اسلامی سیاست یا اسلامی ریاست کے متعلق قرآنی نقطہ نگاہ سے لکھا ہوا کچھ بھی نہیں ملتا، جو کچھ لکھا ہوا ملتا ہے، وہ ہمارے (مسلمانوں کے) دورِ ملوکیت کی تاریخ ہے۔“ ❸

---

❶ طلوع اسلام، جولائی ۱۹۴۸ء، صفحہ: ۷۰، ۷۱۔

❷ طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۶۴ء، صفحہ: ۱۵۸۔

❸ طلوع اسلام، جولائی ۱۹۸۱ء، صفحہ: ۳۴۔

جب ہماری تاریخ کی صورتِ حال یہ ہے تو پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ ''مفکر قرآن'' صاحب فرماتے ہیں:

> ''اس صورت میں کیا ہماری تاریخ اس قابل نہیں کہ اس کو کہیں دریا برد کر دیا جائے، اور ہمیشہ کے لیے اس سے چھٹکارا پا لیا جائے۔'' ❶

لیکن اپنی تاریخ کو دریا برد کر دینے کے بعد، یہ تاریخی خلاء کیوں کر پر ہوگا؟ اس کے جواب میں ''مفکر قرآن'' نے جو کچھ فرمایا ہے، وہ...... ''پہنچی وہیں پہ خاک، جہاں کا خمیر تھا'' ...... کے مصداق ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

> ''پندرھویں صدی عیسوی سے لے کر بیسویں صدی تک انگلستان کے اکثر ممتاز اہل قلم یعنی چاسر، مارلو، جانسن بیکن، شیکسپیئر، کارلائل اور براؤننگ، نصرانیت کے حلقہ بگوش ہونے کے بعد، ذہنی اعتبار سے انسانیت کی طرف مائل تھے، گویا یورپ کی تاریخ، ایک بدلے ہوئے نام کے ساتھ، اسلام ہی کی تاریخ ہے۔'' ❷

بہرحال، بات یہ ہو رہی تھی کہ جلال الدین اکبر نے ''قرآنی حکومت'' قائم کی، اور وہ خود اس حکومت کے ''مرکز ملت'' تھے۔ اُس کے بعد، نپولین بوناپارٹ نے ''قرآنی حکومت'' قائم کر کے، ''مرکز ملت'' کا اعزاز پانے کا منصوبہ بنایا، جس کے پایۂ تکمیل کو پہنچنے کا علم، مسلمانوں کی اُس تاریخ سے تو نہیں مل سکتا، جس میں ''قرآنی نقطۂ نظر'' سے لکھا ہوا، ''مفکر قرآن'' کو کچھ نہیں مل سکا، پھر کیا اس کا علم، اُس ''تاریخ یورپ'' سے ہو سکتا ہے جسے ایک ''بدلے ہوئے نام'' کے ساتھ، اُنھوں نے ''تاریخ اسلام'' کہا ہے؟ لیکن افسوس کہ ''مفکر قرآن'' اس ''تاریخ اسلام'' سے بھی، اس سوال کا جواب دیئے بغیر، اس دنیا سے سدھار گئے۔

چل دیئے یوں ہی دل کو تڑپا کر ● کون دیکھے یہ بے بسی دل کی

نپولین کے بعد، ''قرآنی حکومت'' کو قائم کرنے کی آرزوئیں، ''مفکر قرآن'' کے سینے میں مچلتی رہیں، چنانچہ وہ طلوعِ اسلام کے ذریعہ سے یہ صدا بلند کرتے رہے کہ...... ''آؤ لوگو!

---

❶ طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۵۳ء، صفحہ: ۲۶۔

❷ طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۴۰ء، صفحہ: ۶۴۔

یہیں نورِ خدا پاؤ گے۔"

"صدرِ اسلام کے بعد، ہماری تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ قرآنی نظام کی آواز بلند ہو رہی ہے۔" ①

یہ کہتے ہوئے، "مفکر قرآن" کو یہ یاد نہ رہا کہ "تاریخ میں پہلا موقع تو وہ تھا، جب اکبر بادشاہ نے "قرآنی حکومت" قائم کی تھی۔ خیر! چھوڑیئے "مفکر قرآن" کے اس شعوری یا غیر شعوری تضاد کو۔ یہاں لائق توجہ اور قابل غور بات تو یہ ہے کہ طلوع اسلام کی اس آواز سے پہلے، پوری دنیائے اسلام، قرآن کو چھوڑ کر "عجمی سازش" کا شکار ہو چکی تھی، اور اب وہ اُس "قرآنی نظام" کی طرف لوٹ رہی ہے، جسے چودہ صدیوں میں نہ کوئی مفسر سمجھ سکا، اور نہ کوئی محدث۔ نہ کوئی فقیہ جان سکا اور نہ کوئی مؤرخ، نہ کسی عالم کو معلوم ہو سکا اور نہ کسی مجتہد کو۔ یہ سب لوگ بے عقل اور بے سمجھ تھے۔ اس نظام کے اقتصادی حصے کو اگر کوئی جان سکا تو وہ صرف کارل مارکس تھا۔ اب رہے اس نظام کے معاشرتی طور طریقے، تو انھیں بغیر کسی قرآن کے، صرف اہل مغرب ہی نے سمجھا، اور عملاً قبول کیا۔ ان کو دیکھ کر، "قرآنی نظام" ہمارے "مفکر قرآن" کی سمجھ میں آیا۔

(۵۴) آیت استخلاف

اس کے بعد، "مفکر قرآن" صاحب، آیت استخلاف کے بارے میں فرماتے ہیں:

"استخلاف فی الارض (اپنی آزاد مملکت) کے سلسلہ میں، قرآنِ کریم میں جو متعدد آیات آئی ہیں، ان میں سرفہرست، سورۂ نور کی آیت جلیلہ ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ:

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ

---

① طلوع اسلام، جون ۱۹۶۶ء، صفحہ

> لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ ﴾ [٢٤/٥٥]
>
> ”جو لوگ تم میں سے ایمان لائیں گے اور عمل صالح کریں گے خدا نے وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ انھیں اس دنیا میں حکومت عطا کرے گا، اس طرح جس طرح اس نے انہی جیسے لوگوں کو ادوارِ سابقہ میں حکومت عطا کی تھی۔ یہ حکومت اس لیے عطا ہوگی کہ اس کے ذریعہ سے خدا اس دین کو متمکن کردے جسے اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے، اور تاکہ اُن کا خوف امن سے بدل جائے، اور اس طرح وہ اس قابل ہوجائیں کہ وہ صرف خدا کی محکومیت اختیار کریں اور اس میں کسی اور کو شریک نہ کریں۔ جو لوگ اس کے بعد، اس ابدی صداقت سے انکار کریں گے وہ فاسق ہوں گے۔“
>
> اس سے ظاہر ہے کہ ایمان و عمل کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض ہے، اور اسی سے دین کا تمکن ہوسکتا ہے، یعنی اپنی حکومت کے بغیر دین کا تمکن ممکن نہیں۔“ ①

اس اقتباس میں، ”مفکر قرآن“ نے دو باتیں بیان کی ہیں:

ایک یہ کہ ایمان اور عمل صالح کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض ہے، حالانکہ اس دنیا میں ایسے پیغمبر بھی گزرے ہیں جن کے ایمان و عمل صالح میں رتی برابر بھی شک نہیں کیا جاسکتا: لیکن اس کے باوجود بھی، اُنھیں استخلاف فی الارض حاصل نہیں ہوا۔ حضرت یحیٰ، حضرت عیسیٰ حضرت یعقوب علیہ السلام کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ اگر ایمان اور عمل صالح کا لازمی نتیجہ، استخلاف فی الارض ہوتا تو حضرت داوٗد، حضرت سلیمان اور حضرت یوسف علیہ السلام کی طرح، ہر نبی اور ہر رسول ہی دنیاوی اقتدار پالیتا۔ جہاں تک دنیوی اقتدار و غلبہ کا تعلق ہے یہ آزمائشی طور پر ہر اچھے اور برے قسم کے لوگوں کو ملتا رہا ہے، اور آئندہ بھی ملتا رہے گا۔ نمرود و فرعون، اور شداد و ہٹلر اور بش اور موہن سنگھ جیسے ایمان و عمل صالح سے عاری لوگ بھی برسر اقتدار آتے

---

① شاہکار رسالت، صفحہ: ۵۰۶۔

رہے ہیں اور آیندہ بھی فساق و فجار اور بغاۃ اور عصاۃ، ”آزاد مملکت“ پاتے رہیں گے۔ اس ضمن میں، قرآن کا اصول یہ نہیں ہے کہ استخلاف فی الارض، ایمان و عمل صالح کا لازمی نتیجہ ہے، بلکہ یہ اللہ کی اُس مشیت پر منحصر ہے، جس کے تحت، وہ جسے چاہتا ہے، آزمائشی طور پر نعمت اقتدار، اسے عطا فرما دیتا ہے جیسا کہ الاعراف آیت ۱۲۸ میں مذکور ہے:

﴿ إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ط ﴾ ”زمین اللہ کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے، اس کا وارث بنا دیتا ہے۔“

[الاعراف: ۱۲۸]

اس لیے نہ تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ جسے اقتدار مل گیا ہے وہ لازماً ایمان و عمل صالح ہی کا نتیجہ ہے، اور نہ ہی یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس کو اقتدار و تمکن فی الارض حاصل نہیں ہوا، وہ فقید الایمان اور محروم عملِ صالح ہے۔

اب رہی سورۂ نور کی زیرِ بحث آیت، تو اس میں مذکور وعدہ کا تعلق، خاص طور سے ان لوگوں سے تھا، جو وحی پر مبنی قوانین (نہ کہ طبیعی قوانین) پر عمل پیرا تھے، اور جسے اللہ نے صحابہ کے حق میں پورا فرما دیا۔

دوسری بات، بلکہ غلطی ”مفکر قرآن“ نے یہ کی ہے کہ استخلاف کو صرف حکومت و فرمانروائی کے معنیٰ میں لے کر، ہر اُس ظالم، فاسق، فاجر، کافر اور باغی و طاغی کو مومنین صالحین کی صف میں لا کھڑا کیا ہے، جسے کبھی دنیا میں ”تمکن فی الارض“ اور ”آزاد مملکت“ مل گئی اور پھر جیسا کہ ”مفکر قرآن“ کی دیگر تحریروں سے واضح ہوتا ہے، سارا زور، اس امر پر صرف کر دیا کہ کائنات کی مخفی اور طبیعی قوتوں کو، اپنے قابو میں لا کر ارضی غلبہ و تمکن حاصل کیا جائے، یہ اُن کی دوسری غلطی ہے۔

موقف پرویز کا تفصیلی جائزہ

قبل اس کے کہ ”مفکر قرآن“ کے اس اقتباس کے آیندہ حصہ کو بھی یہاں پیش کیا جائے، یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ اس آیت میں استخلاف فی الارض کے وعدہ کو جو معنیٰ پہنا کر

سخن سازی کی گئی ہے، اس کی حقیقت کیا ہے۔

قرآنِ کریم میں خلافت و استخلاف کا لفظ، تین معانی میں استعمال ہوا ہے، اور قرآنی سیاق وسباق یہ واضح کر دیتا ہے کہ کہاں یہ الفاظ، کن معانی کے حامل ہیں۔

(۱)۔۔۔۔ اس کا ایک معنی یہ ہے کہ ’’خدا کے دیئے ہوئے اختیارات کا حامل ہونا‘‘ بایں معنی، پوری اولادِ آدم، زمین میں خلیفہ ہے۔

(۲)۔۔۔۔ دوسرے معنی ہیں ’’خدا کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہوئے، اس کے امرِ شرعی (نہ کہ امرِ تکوینی) کے تحت، اختیاراتِ خلافت کو استعمال کرنا۔‘‘ اس معنی میں صرف مومن صالح ہی خلیفہ قرار پاتا ہے، کیونکہ وہی صحیح طور پر خلافت کا حق ادا کرتا ہے، اور اس کے برعکس کافر و فاسق اور منافق و ملحد خلیفہ نہیں، بلکہ باغی ہے، کیونکہ مالکِ حقیقی کے ملک میں، اس کے دیئے ہوئے اختیارات کو وہ نافرمانی کے طریقے پر استعمال کرتا ہے۔

(۳)۔۔۔۔ تیسرے معنی ہیں ’’ایک غالب قوم کے بعد، دوسری قوم کا اس کی جگہ لینا۔‘‘ پہلے دونوں معنی خلافت بمعنی نیابت سے ماخوذ ہیں اور یہ آخری معنی خلافت بمعنی جانشینی سے ماخوذ ہے۔

ان تینوں معانی کو بیان کرنے کے بعد، سیّد ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

> ’’اب جو شخص بھی یہاں اس آیت کو سیاق وسباق میں پڑھے گا وہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس امر میں شک نہیں کر سکتا کہ اس جگہ خلافت کا لفظ، اس حکومت کے معنی میں استعمال ہوا ہے، جو اللہ کے امرِ شرعی کے مطابق (نہ کہ محض قوانینِ فطرت کے مطابق) اس کی نیابت کا ٹھیک ٹھیک حق ادا کرنے والی ہو۔ اسی لیے کفار تو درکنار اسلام کا دعویٰ کرنے والے منافقوں تک کو اس وعدے میں شریک کرنے سے انکار کیا جا رہا ہے۔ اسی لیے فرمایا جا رہا ہے کہ اس کے مستحق صرف ایمان اور عملِ صالح کی صفات سے متصف لوگ ہیں، اسی لیے قیامِ خلافت کا ثمرہ یہ بتایا جا رہا ہے کہ اللہ کا پسندیدہ دین، یعنی اسلام، مضبوط بنیادوں پر قائم

> ہو جائے گا، اور اسی لیے اس انعام کو عطا کرنے کی شرط یہ بتائی جا رہی ہے کہ خالص اللہ کی بندگی پر قائم رہو، جس میں شرک کی ذرہ برابر آمیزش نہ ہونے پائے۔ اس دعوے کو یہاں سے اُٹھا کر بین الاقوامی چوراہے پر لے پہنچنا اور امریکہ سے لے کر رُوس تک جس کی کبریائی کا ڈنکا بھی دنیا میں بج رہا ہو، اس کے حضور اسے نذر کر دینا جہالت کی طغیانی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یہ سب طاقتیں بھی اگر خلافت کے منصب عالی پر سرفراز ہیں تو آخر فرعون اور نمرود ہی نے کیا قصور کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں لعنت کا مستحق قرار دے دیا۔" ①

ہمارے "مفکر قرآن" صاحب تو مولانا مودودی رحمہ اللہ سے اپنے فکری اختلاف کو صحت مند علمی زبان میں بیان کرنے کی بجائے، سوقیانہ زبان میں، کینہ و کدورت اور حسد و عداوت کا بخار نکالنے کے لیے بیان کیا کرتے تھے، اور وہ بھی مولانا مودودی رحمہ اللہ کا نام لے کر، لیکن مولانا مودودی رحمہ اللہ کا یہ عالم تھا کہ اُنھوں نے اگر کہیں فکر پرویز کی تردید کی ہے، تو ان کا نام لیے بغیر، محض اُن کے فاسد خیالات، باطل نظریات اور غلط افکار کی تردید کی ہے، کیونکہ مولانا مودودی مرحوم کو ذاتِ پرویز سے کوئی عناد نہ تھا۔ اور ایسا کرتے ہوئے، نہایت پرزور استدلال کے ساتھ، شستہ اور شگفتہ اندازِ بیان اختیار کیا ہے، جیسا کہ مندرجہ ذیل اقتباس سے ظاہر ہے:

> "بعض لوگ خلافت کو محض حکومت و فرمانروائی اور غلبہ و تمکن کے معنی میں لے لیتے ہیں۔ پھر اس آیت سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جس کو بھی دنیا میں یہ چیز حاصل ہے وہ مومن صالح اور اللہ کے پسندیدہ دین کا پیروکار، بندگیٔ حق پر عامل اور شرک سے مجتنب ہے اور اس پر مزید ستم یہ ڈھاتے ہیں کہ اپنے اس غلط نتیجے کو ٹھیک بٹھانے کے لیے، ایمان، صلاح، دین، حق، عبادت الٰہی اور شرک ہر چیز کا مفہوم بدل کر وہ کچھ کر ڈالتے ہیں جو اُن کے اس نظریہ کے مطابق ہو۔ یہ قرآن کی بدترین معنوی تحریف ہے جو یہود و نصاریٰ کی تحریفات سے بھی بازی لے گئی

---

① تفہیم القرآن، جلد: ۳، صفحہ: ۴۱۸ تا ۴۱۹۔

ہے، اس نے قرآن کی ایک آیت کو وہ معنی پہنا دیے ہیں جو پورے قرآن کی تعلیم کو مسخ کر ڈالتے ہیں، اور اسلام کی کسی ایک چیز کو بھی اس کی جگہ پر باقی نہیں رہنے دیتے۔ خلافت کی اس تعریف کے بعد لامحالہ وہ سب لوگ اس آیت کے مصداق بن جاتے ہیں جنھوں نے کبھی دنیا میں غلبہ و تمکن پایا ہے یا آج پائے ہوئے ہیں خواہ وہ خدا، وحی، رسالت، آخرت ہر چیز کے منکر ہوں اور فسق و فجور کی ان تمام آلائشوں میں لتھڑے ہوئے ہوں جنھیں قرآن نے کبائر قرار دیا ہے۔ جیسے سود، زنا، شراب اور جوا۔ اب اگر یہ سب لوگ مومن صالح ہیں اور اسی لیے خلافت کے منصب عالی پر سرفراز کیے گئے ہیں تو پھر ایمان کے معنی قوانین طبیعی کو ماننے اور اصلاح کے معنی ان قوانین کو کامیابی کے ساتھ استعمال کرنے کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں؟ اور اللہ کا پسندیدہ دین، اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ علومِ طبیعی میں کمال حاصل کر کے صنعت و حرفت اور تجارت و سیاست میں خوب ترقی کی جائے؟ اور اللہ کی بندگی کا مطلب پھر اس کے سوا اور کیا رہ جاتا ہے کہ ان قاعدوں اور ضابطوں کی پابندی کی جائے جو انفرادی اور اجتماعی سعی و جہد کی کامیابی کے لیے فطرتاً مفید اور ضروری ہیں، اور شرک پھر اس کے سوا اور کس چیز کا نام رہ جاتا ہے کہ ان مفید قواعد و ضوابط کے ساتھ کوئی شخص یا قوم کچھ نقصان دہ طریقے بھی اختیار کر لے؟ مگر کیا کوئی شخص جس نے کھلے دل اور کھلی آنکھوں کے ساتھ کبھی قرآن کو سمجھ کر پڑھا ہو، یہ مان سکتا ہے کہ قرآن میں واقعی ایمان اور عمل صالح، دین حق اور عبادت الٰہی، اور توحید اور شرک کے یہی معنی ہیں؟ یہ معنی یا تو وہ شخص لے سکتا ہے جس نے کبھی پورا قرآن سمجھ کر نہ پڑھا ہو، اور صرف کوئی آیت کہیں سے اور کوئی کہیں سے لے کر اس کو اپنے نظریات و تصورات کے مطابق ڈھال لیا ہو، یا پھر وہ شخص یہ حرکت کر سکتا ہے جو قرآن کو پڑھتے ہوئے، ان سب آیات کو اپنے زعم میں سراسر لغو اور غلط قرار دیتا چلا گیا ہو،

> جن میں اللہ تعالیٰ کو واحد رب اور الٰہ، اور اس کی نازل کردہ وحی کو واحد ذریعۂ ہدایت، اور اس کے مبعوث کردہ ہر پیغمبر کو حتمی طور پر واجب الاطاعت رہنما تسلیم کرنے کی دعوت دی گئی ہے، اور موجودہ دنیوی زندگی کے خاتمے پر، ایک دوسری زندگی کے محض مان لینے ہی کا مطالبہ نہیں کیا گیا ہے، بلکہ یہ بھی صاف صاف کہا گیا ہے کہ جو لوگ اس زندگی میں اپنی جوابدہی کے تخیل سے منکر یا خالی الذہن ہو کر، محض اسی دنیا کی کامیابیوں کو مقصود سمجھتے ہوئے کام کریں گے وہ فلاح سے محروم رہیں گے۔ قرآن میں ان مضامین کو اس کثرت سے اور ایسے مختلف طریقوں سے، اور ایسے صریح اور صاف الفاظ میں بار بار دہرایا گیا ہے کہ ہمارے لیے یہ باور کرنا مشکل ہے کہ اس کتاب کو ایمانداری سے پڑھنے والا کوئی شخص، ان غلط فہمیوں میں بھی پڑ سکتا ہے جن میں آیت استخلاف کے یہ نئے مفسر مبتلا ہوئے ہیں۔'' ❶

ایک کا جرم، دوسرے کے سر!

الغرض سیاق و سباق سے قطع نظر کرتے ہوئے آیت استخلاف کو ان مفاہیم و معانی کا ماخذ بنانے کے بعد، جو پہلے سے دل و دماغ میں رچے بسے ہوئے ہیں، ''مفکر قرآن'' صاحب، (پہلے اقتباس کے تسلسل میں) فرماتے ہیں:

> ''لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ امارت کے لیے حکومت (استخلاف فی الارض) لازمی شرط نہیں اور تاریخ اس پر شاہد ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا، دیگر ائمہ میں سے کوئی بھی صاحب حکومت نہ تھا۔ اس مشکل کے حل کے لیے کہا گیا کہ مذکورہ بالا آیت میں استخلاف سے مراد دنیوی حکومت نہیں بلکہ ''روحانی امارت'' ہے۔ اصول کافی میں ہے......'' ❷

اب ذرا ''مفکر قرآن'' کی اس شاطرانہ چالبازی کو ملاحظہ فرمائیے کہ اولاً استخلاف فی الارض کو، ایمان اور عمل صالح کا لازمی نتیجہ قرار دیا۔ ثانیاً استخلاف بمعنی اقتدار و حکومت کا جو

---

❶ تفہیم القرآن، جلد: ۳، صفحہ: ۴۱۷۔

❷ شاہکار رسالت، صفحہ: ۵۰۷۔

وعدہ، اُن لوگوں سے مخصوص تھا، جو وحی کے عطا فرمودہ قوانین پر عامل تھے اُسے تکوینی قوانین پر عامل افراد سے وابستہ کیا، اور پھر ثالثاً اُن میں سے جو صاحبِ اقتدار اور اہلِ حکومت نہ ہو سکے، تو ان کے ایسا نہ ہونے کی توجیہہ کتبِ شیعہ کے ذریعے، امام ابوجعفر امام رضا، امام عبداللہ کے اقوال سے کر ڈالی۔

”عجمی سازش“ کے مآخذ

یہاں قارئین کرام پر یہ حقیقت واضح رہنی چاہیے کہ ”مفکر قرآن“ نے اپنی جس مزعومہ ”عجمی سازش“ کو، اپنی قلمکاریوں کے ساتھ پیش کیا ہے، اس کے لیے سارا بنیادی مواد اور مسالہ، کتبِ شیعہ، عقائد شیعہ اور تاریخ شیعہ سے لیا ہے۔ شاذ و نادر ہی کسی سنی کتاب سے صحیح و سالم مواد لیا ہے۔ شاہکارِ رسالت کا یہ آخری باب، جو ”عجمی سازش“ ہی کے لیے وقف کیا گیا ہے، صفحہ ۴۳۹ سے لے آخری صفحہ ۵۲۸ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس پورے باب میں جتنا مواد بھی پیش کیا گیا ہے، اس کا بہت بڑا اور غالب حصہ، شیعہ مکتبۂ فکر کی کتب سے ماخوذ ہے، اور کچھ مواد وہ ہے جو کسی مستشرق کے قلم سے مخالفت اسلام میں نکلا ہے، لیکن اسے براہِ راست مستشرق کی اپنی کتاب سے پیش کرنے کی بجائے بالواسطہ اُن مصنفین کی کتب سے پیش کیا گیا ہے جو ”مفکر قرآن“ ہی طرح، مغرب کی فکری غلامی اور ذہنی اسیری میں مبتلا ہیں، اور کہیں عبارتوں میں مسخ و تحریف، کتر بیونت، چکمہ بازی اور مغالطہ آرائی کے کرتب دکھائے گئے ہیں، اور بعض جگہ تو بالکل بے پر کی اُڑائی گئی ہے، ایسی کہ اس کا سرے سے کوئی حوالہ ہی نہیں دیا گیا، جیسا کہ مندرجہ ذیل مثالوں سے ظاہر ہے:

◁1 .... وہ ایرانی دانشور جو ایمان لائے، ان کی اکثریت کے متعلق، بغیر کسی ثبوت و دلیل کے ”مفکر قرآن“ صاحب نے یہ دعویٰ کیا ہے۔ اور وہ دعویٰ بھی اس قدر متضاد کہ جس چیز کو وہ نہیں کہنا چاہتے، اسے کہہ بھی ڈالتے ہیں:

> ”ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے اور نہ ہی کہنا چاہتے ہیں کہ یہ سب اسلام لانے والے، دل میں کوئی کھوٹ لے کر مسلمان ہوئے تھے۔ لیکن جیسا کہ آگے چل کر نظر

> آئے گا، ان کے ارباب فکر ونظر کا بیشتر حصہ، اس مقصد کے لیے زمرۂ اُمت مسلمہ میں داخل ہوا تھا کہ اس طرح وہ مسلمانوں میں اپنے قدیم مجوسی نظریات و معتقدات، آسانی سے پھیلا سکیں۔'' ①

قطع نظر اس کے کہ ایران کی مفتوحہ آبادی میں سے ''ارباب فکر ونظر'' اور ''عامۃ الناس'' کی یہ تفریق کس دلیل پر کی گئی ہے، یا بلادلیل، یہ تفریق محض اس ظن وگمان پر قائم کی گئی ہے کہ آگے چل کر، اُمت مسلمہ میں، جن ''مجوسی نظریات ومعتقدات'' کے نفوذ کو، وہ ''ثابت'' کرنا چاہتے ہیں، اُس کا امکان، عامۃ الناس کی بجائے، ''ارباب فکر ونظر'' ہی سے وابستہ کیا جاسکتا ہے، ہم صرف یہ استفسار کرنا چاہتے ہیں کہ ''مفکر قرآن'' کو صدیوں بعد، کس آسمان سے یہ وحی نازل ہوئی کہ...... ''فتح ایران کے بعد، اُن کے بیشتر ارباب فکر ونظر، اس مقصد کے لیے زمرۂ اُمت مسلمہ میں داخل ہوئے تھے کہ اس طرح وہ اپنے مجوسی نظریات ومعتقدات آسانی سے پھیلا سکیں گے؟''

◁2 ....اب رہے ایرانی مفتوحین میں سے عامۃ الناس، تو اُن کے ایمان کی کیفیت کو ''مفکر قرآن'' نے تقریباً چودہ صدیوں بعد، اُن کے سینوں کو ٹٹول کر، یہ فتویٰ صادر فرمایا ہے:

> ''ان میں سے جو لوگ نیک نیتی سے بھی مسلمان ہوئے تھے، ان کا اسلام لانا ایسا ہی تھا جیسا ان بدوی قبائل کا، اسلام لانا، جن کے متعلق قرآنِ کریم میں ہے: ﴿قَالَتِ الْأَعْرَابُ اٰمَنَّا﴾...... ''یہ بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں۔'' ﴿قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا﴾...... ''ان سے کہو کہ تم ایمان نہیں لائے۔'' ﴿وَلٰكِنْ قُوْلُوْا أَسْلَمْنَا﴾ ''تمھیں یہ کہنا چاہیے کہ تم نے اسلامی مملکت کے سامنے سرِتسلیم خم کردیا ہے۔'' اس لیے کہ؛ ﴿وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾ ''ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں میں نہیں اُترا۔'' ②

---

① شاہکارِ رسالت، صفحہ: ۴۴۲۔

② شاہکارِ رسالت، صفحہ: ۴۴۲۔

اب ذرا اس دلیل کو ملاحظہ فرمائیے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے، اعراب (بدوؤں) کے ایمان کے متعلق علیم بذات الصدور ہونے کی بناء پر شہادت دی ہے کہ ان کے دلوں میں ایمان داخل نہیں ہوا، اور اُنھوں نے بظاہر ہی سرِ تسلیم خم کیا ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ ایرانیوں کے دلوں میں بھی ایمان داخل نہیں ہوا، اور وہ بھی بظاہر ہی اسلام لائے تھے، اور ان کا رویۂ تسلیم و انقیاد بھی صرف نمائشی حد تک محدود تھا۔ اب یہ بات وابستگان طلوع اسلام ہی جانتے ہیں کہ ایرانی مفتوحین کے متعلق، ”مفکر قرآن“ کا یہ اعلان ان کے عالم الغیب ہونے کی بناء پر ہے، یا ”مزاج شناسِ خدا“ ہونے کی بناء پر۔

3 .... اپنی مزعومہ ”عجمی سازش“ کے کھوٹے سکے کو، کھرا ظاہر کرنے کے لیے، ان دو خانہ ساز محاذوں کا ذکر ”مفکر قرآن“ بایں الفاظ کرتے ہیں:

> ”اس مقصد کے لیے عجمی سازش کے دو نمایاں محاذ، ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک محاذ کا مقصد، اسلامی سلطنت کو کمزور کر کے اپنا سیاسی غلبہ حاصل کرنا تھا، اور دوسرے کا منتہیٰ، اسلام کو کسی نہ کسی طرح، عجمی تصورات، نظریات و معتقدات کے رنگ میں رنگ (بلکہ ڈبو) دینا تھا۔“ ①

کسی مستند تاریخ میں (بلکہ شاید کسی گری پڑی کتاب تاریخ میں بھی) ان دونوں محاذوں کا ذکر نہیں ہے، اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے جب کہ اس ”عجمی سازش“ کا سارا تانا بانا، ساڑھے تیرہ صدیوں بعد، دفترِ طلوع اسلام ہی میں بنا گیا ہے۔

4 .... ”مفکر قرآن“ خوفِ خدا سے عاری، اور آخرت میں اپنی جوابدہی سے بے پروا ہو کر، علماءِ اُمت پر یہ الزام تھوپتے ہیں کہ وہ مروّجہ اسلام ہی کو حقیقی اسلام سمجھتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ”اب ظاہر ہے کہ جب مروّجہ اسلام کے بارے میں یہ کہا جائے کہ یہ غیر اسلامی معتقدات و نظریات سے ملوث ہے تو یہ بات ہمارے مذہب پرست طبقہ پر یقیناً

---

① شاہکارِ رسالت، صفحہ: ۴۴۳۔

> گراں گزرے گی، اس لیے کہ وہ اس پر مصر ہوتے ہیں کہ جس اسلام کے وہ پیرو ہیں، وہی حقیقی اسلام ہے۔" ❶

حالانکہ علماء ببانگ دہل یہ اعلان کرتے رہتے ہیں کہ مروّجہ اسلام میں قدیم اور جدید جاہلیت کے اثرات موجود ہیں، اس لیے ان کی دعوت ہی یہ ہے کہ قرآن و سنت پر مبنی اُس اسلام کی طرف رجوع کیا جائے جو عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں نفاذ پذیر تھا۔ اور مولانا مودودی رحمہ اللہ کی تو تحریک ہی اس لیے معرضِ وجود میں آئی کہ مروّجہ اسلام کی جگہ، خالص دین اسلام کی اقامت ہو۔ کیونکہ خلافت راشدہ کے بعد، زندگی کی گاڑی اپنا کانٹا بدل چکی تھی، جس کے نتیجہ میں جاہلیت قدیمہ گھس آئی اور پھر عالم اسلام پر مغربی تسلط کے نتیجہ میں جدید جاہلیت کے اثرات بھی پیدا ہو گئے۔ یہی حقیقت دیگر علماء بھی اب تک بیان کرتے چلے آرہے ہیں۔ بطورِ شہادت، مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کے دو اقتباسات، نذرِ قارئین ہیں۔ وہ اپنے ایک مقالہ بعنوان "شہادتِ حق" میں تحریر فرماتے ہیں:

> (۱) ...." انفرادی اور اجتماعی طور پر عام مسلمان اپنے عمل میں اسلام کی جو نمایندگی کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ اسلام کے زیر اثر پرورش پانے والے افراد کسی حیثیت سے بھی کفر کے تیار کیے ہوئے افراد سے بلند یا مختلف نہیں ہیں۔ بلکہ بہت سی حیثیتوں سے ان کی بہ نسبت فروتر ہیں۔ وہ جھوٹ بول سکتے ہیں، وہ خیانت کر سکتے ہیں، وہ ظلم کر سکتے ہیں وہ دھوکہ دے سکتے ہیں، وہ قول و قرار سے پھر سکتے ہیں۔ وہ چوری اور ڈاکہ زنی کر سکتے ہیں۔ وہ دنگا فساد کر سکتے ہیں۔ وہ بے غیرتی اور بے حیائی کے سارے کام کر سکتے ہیں۔ ان سب بداخلاقیوں میں ان کا اوسط کسی کافر قوم سے کم نہیں ہے۔
>
> پھر ہماری معاشرت، ہمارا رہن سہن، ہمارے رسم و رواج، ہماری تقریبات، ہمارے میلے اور عرس، ہمارے جلسے اور جلوس، غرض ہماری اجتماعی زندگی کا کوئی

---

❶ شاہکار رسالت، ص ۴۴۳۔

پہلو ایسا نہیں ہے جس میں ہم اسلام کی کسی حد تک بھی صحیح نمایندگی کرتے ہوں۔ یہ چیز گویا اس بات کی زندہ شہادت ہے کہ اسلام کے پیرو خود ہی اپنے لیے اسلام کے بجائے جاہلیت کو زیادہ قابل ترجیح سمجھتے ہیں۔" ❶

(۲) ...."اپنے آپ کو مسلمان کہہ کر نمایندے تو اسلام کے بنے ہوئے ہیں مگر اپنے مجموعی قول و عمل سے شہادت زیادہ تر، جاہلیت، شرک، دنیا پرستی اور اخلاقی بے قیدی کی دے رہے ہیں۔ خدا کی کتاب طاق پر رکھی ہے اور رہنمائی کے لیے ہر امام کفر اور ہر منبع ضلالت کی طرف رجوع کیا جا رہا ہے۔ دعویٰ خدا کی بندگی کا ہے اور بندگی ہر شیطان اور طاغوت کی کی جا رہی ہے۔ دوستی اور دشمنی نفس کے لیے ہے اور فریق دونوں صورتوں میں اسلام کو بنایا جا رہا ہے، اور اس طرح اپنی زندگی کو بھی اسلام کی برکتوں سے محروم کر رکھا ہے اور دنیا کو بھی اس کی طرف راغب کرنے کی بجائے الٹا متنفر کر رہے ہیں اور بعید نہیں کہ مستقبل اس حال سے بھی بدتر ہو۔ اسلام کا لیبل اتار کر کھلم کھلا کفر اختیار کر لیجیے تو کم از کم آپ کی دنیا تو ویسی ہی بن جائے گی جیسی امریکہ، رُوس اور برطانیہ کی ہے۔ لیکن مسلمان ہو کر نا مسلمان بنے رہنا اور خدا کے دین کی جھوٹی نمایندگی کر کے دنیا کے لیے بھی ہدایت کا دروازہ بند کر دینا وہ جرم ہے جو آپ کو دنیا میں بھی پنپنے نہ دے گا۔" ❷

مولانا مودودی رحمہ اللہ کے علاوہ، بیسیوں اور علماء کی بھی عبارات پیش کی جا سکتی ہیں، جن سے غلام احمد پرویز کی اس افتراء پردازی کی تردید و تغلیط ہو جاتی ہے کہ علماءِ کرام، مرّوجہ اسلام ہی کو حقیقی اسلام سمجھتے ہیں۔ لیکن چونکہ "مفکر قرآن" صاحب، خود مغربی معاشرت کے اجزاء کو، اشتراکیت کے اقتصادی نظام کے ساتھ ملا کر، اسے اپنا "اصلی اور انقلابی اسلام" قرار دیتے ہیں، اس لیے انھیں "قرآن و سنت پر مبنی اسلام"، "عجمی اسلام" نظر آتا ہے، اور اپنا

---

❶ اسلامی نظامِ زندگی، صفحہ: ۲۷۶۔

❷ اسلام نظامِ زندگی، صفحہ: ۲۸۳۔

دوغلا مذہب (Hybrid Religion) "قرآنی دین" دکھائی دیتا ہے۔ اس لیے وہ اسے معیار مان کر، علماء پر یہ بہتان باندھتے ہیں کہ وہ مروّجہ اسلام ہی کو حقیقی اسلام قرار دیتے ہیں۔

5 .... "مفکرِ قرآن"، خالق و مخلوق، دونوں سے شرم و حیا نہ کرتے ہوئے، علماء پر دوسرا بہتان یہ تراشتے ہیں کہ وہ روایات و تاریخ کو سند و حجت کا درجہ دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> "ان کے نزدیک، دین میں سند اور حجت، روایات اور تاریخ ہیں۔" ❶

منکرینِ حدیث میں سے وہ لوگ، جنھوں نے اپنے عقیدہ و ایمان کو "مفکرِ قرآن" کی جیب میں ڈال رکھا ہے اور اپنی عقل و فکر کو بھی اُن کے ہاں گروی کر رکھا ہے، ان سے کہنا سننا تو بیکار ہے، لیکن جو لوگ، روایاتِ حدیث کی اصل قدر و قیمت جاننا چاہتے ہیں، انھیں چاہیے کہ مولانا مودودی رحمہ اللہ کی اُس پوری مراسلت کا مطالعہ فرمائیں جو اُن کے، اور یکے از منکرینِ حدیث، ڈاکٹر عبدالودود صاحب کے درمیان واقع ہوئی تھی اور جو ترجمان القرآن کے ستمبر ۱۹۶۱ء کے شمارہ میں، منصبِ رسالت نمبر کے خصوصی شمارہ میں شائع ہوئی تھی، اور پھر اس کے بعد، آج تک "سنت کی آئینی حیثیت" کے نام سے کتابی صورت میں منظرِ عام پر آ رہی ہے۔ اس کے مطالعہ سے انھیں خود معلوم ہو جائے گا کہ "مفکرِ قرآن" کے اس بہتان کی اصل حقیقت کیا ہے۔

اب رہا تاریخ کو سند و حجت ماننا تو یہ پھر ایک بے جا الزام تراشی ہے، جس کا کوئی ثبوت کسی عالم کی کسی تحریر سے پیش نہیں کیا جا سکتا۔ "مفکرِ قرآن" کا شیوہ یہ تھا کہ وہ اپنی خصلتِ بد کو، اپنے حریفوں کی طرف منسوب کیا کرتے تھے تاکہ خود کو ایسی بری عادت سے بالاتر قرار دے سکیں۔ ورنہ جہاں تک مشمولاتِ تاریخ کو حجت و سند سمجھنے کا تعلق ہے، یہ اُن کی اپنی عادت تھی۔ تاریخ میں کسی جگہ یہ مذکور ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے بعض نے بعض کی داڑھی پکڑی، اور ایسا کرنا، کبھی تو محض پیار و محبت کی بناء پر، معاشرتی رواج کے طور پر تھا، اور کہیں غیظ

---

❶ شاہکارِ رسالت، صفحہ: ۴۴۳۔

وغضب کے باعث۔ اب "مفکر قرآن" کو غصے کی حالت میں، ایسا کرنا، صحابہ رضی اللہ عنہم کے مقام کے منافی محسوس ہوا تو فوراً یہ اعتراض جڑ دیا کہ تاریخ میں تو اس قسم کے واقعات بھی مذکور ہیں کہ "صحابہ رضی اللہ عنہم ایک دوسرے کی داڑھیاں نوچا کرتے تھے" حالانکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی انسان اور بشر ہی تھے۔ لیکن اس قسم کے واقعات کو منصب صحابیت کے منافی قرار دیتے ہوئے، اُنھیں خیال آ جاتا ہے کہ جس چیز کو وہ تاریخ کی رُو سے صحابہ کے شایانِ شان نہیں سمجھتے، وہی چیز (تاریخ ہی نہیں بلکہ) قرآنِ مجید میں، ایک جلیل القدر نبی علیہ السلام کے بارے میں بھی مذکور ہے، یعنی یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بڑے بھائی، حضرت ہارون علیہ السلام کی داڑھی اور سر پکڑ کر، اپنی طرف کھینچا۔ (یَجُرُّهُ إِلَيْهِ) اب صورتِ حال یہ پیدا ہوگئی کہ جو عیب، صحابہ رضی اللہ عنہم کے حوالہ سے کتب تاریخ میں، اُنھیں نظر آیا، وہی عیب، اپنی اشنع وافتح صورت میں، انبیاء ومرسلین کے حوالہ سے، قرآنِ کریم میں مذکور ہے۔ اس طرح یہ واقعہ، اگر تاریخ کے دامن پر ایک بدنما دھبہ ہے، تو اس سے کہیں زیادہ بدنما داغ قرآن پر لگ جاتا ہے۔ پھر ایسے واقعات کی بنیاد پر تاریخ، دریا برد کیے جانے کے لائق ٹھہرتی ہے، تو قرآن اس سے بھی زیادہ غرقابی کا سزاوار ٹھہرتا ہے، پھر اگر ایسا واقعہ، صحابیت کے منافی ہونے کی بناء پر، اس امر کا مقتضی ہے کہ جس تاریخ میں یہ مذکور ہے وہ ساقط الاعتبار قرار پائے، تو اس سے زیادہ (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) قرآن ساقط الاعتبار قرار پاتا ہے۔ یہ ہے، نہ جائے ماندن، نہ پائے رفتن، کی وہ کھائی جس میں "مفکر قرآن" گرے ہیں۔ اب اگر وہ تاریخ کا انکار کریں، تو اس سے زیادہ اُن پر قرآن کا انکار لازم آتا ہے۔

کیا آپ کو معلوم ہے کہ "مفکر قرآن" صاحب، اس کھائی سے کیسے باہر نکلے؟ اس طرح کہ تاریخی واقعہ کو حجت وسند قرار دیتے ہوئے، اعتراض جڑ دیا۔ اور قرآن کی آیت کی معنوی تحریف کر کے، یہ تاثر دیا کہ قرآن میں داڑھی اور سر کو پکڑ کر کھینچنے کا ذکر ہی نہیں ہے۔ چنانچہ وہ سورہ طٰہٰ کی آیت ۹۴ کا (جس میں لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي کے الفاظ آئے ہیں) ترجمہ بایں الفاظ کرتے ہیں:

> ”ہارون بولا: اے میرے عزیز بھائی! تو مجھ پر اس طرح خفا نہ ہو، اور نہ ہی مجھے یوں ہدفِ ملامت بنا (میں نے اگر سختی میں کمی کی تو صرف اس خیال سے کہ) میں ڈرا، کہیں تم یہ نہ کہو، تو نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا، اور میری بات کا کچھ پاس نہ کیا۔“ ❶

اس تحریف شدہ ترجمہ سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ”مفکر قرآن“ کو اپنے غیر قرآنی تصورات کس قدر عزیز ہیں۔ وہ اگر انھیں مفید مطلب محسوس ہوں، یا تاریخی واقعات میں پایا جانے والا عیب وسقم، اگر قرآن میں بھی انھیں دکھائی دے، تو پھر وہ...... خود بدلتے نہیں، قرآن کو بدل دیتے ہیں...... کا جیتا جاگتا مصداق بن جایا کرتے تھے۔

◁۵ .... علماءِ کرام پر، تاریخ و روایات کے حوالے سے بہتان تراشی کرنے کے بعد، ”مفکر قرآن“ بلاحوالہ، بلاسند، اور بلاثبوت، یہ بے پر کی اُڑاتے ہیں کہ علماء نے ان پر جو فتویٰ کفر عائد کیا تھا، وہ اس وجہ سے تھا کہ اُنھوں نے، بعد از تحقیق، بوقت نکاح، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر ۱۷ سے ۱۹ سال بیان کی تھی، چنانچہ وہ اس پر علماء کا ردِّ عمل، یوں بیان کرتے ہیں:

> ”آپ کو معلوم ہے کہ ان حضرات کی طرف سے ردِّ عمل کیا ہوا؟ انھوں نے کہا کہ اس سے بخاری شریف کی روایت کو غلط تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا یہ شخص منکر حدیث اور دائرۂ اسلام سے خارج ہے، چنانچہ میرے خلاف، ایک ہزار علماءِ کرام نے کفر کا فتویٰ صادر فرما دیا۔“ ❷

حالانکہ پرویز صاحب کی جن عبارات پر، فتویٰ کفر عاید کیا گیا ہے، ان میں، ”عمر عائشہؓ بوقت نکاح“ کے متعلق سرے سے کوئی اقتباس موجود ہی نہیں، موجب کفر، یہ تمام عبارات، طلوعِ اسلام، مئی جون ۱۹۶۲ء کے شمارہ میں صفحہ ۱۳۷ تا ۱۶۷ تک، خود پرویز صاحب ہی کے تحریر دہ مضمون میں موجود ہیں۔ اس شمارہ کا مطالعہ، ”مفکر قرآن“ کے اس جھوٹ کا پول کھول

---

❶ برقِ طور، صفحہ: ۱۰۱۔

❷ شاہکارِ رسالت، صفحہ: ۴۴۵ تا ۴۴۶۔

دینے کے لیے کافی ہے۔

ماخذ پرویز کی تفصیل

یہ مثالیں تو اس امر کی ہیں کہ بے سند اور بلا حوالہ بات کرنا، ''مفکر قرآن'' کی عادت تھی۔ اسی عادت کا ایک پہلو بہتان تراشی اور افتراء پردازی ہے۔ پھر اُمور و واقعات کو اپنے ڈھب پر لانے کے لیے، کتر بیونت، قطع و برید، مسخ و تحریف، خیانت کاری اور فریب دہی سے کام لینا بھی، ''مفکر قرآن'' کا شیوہ تھا۔ اپنے مزعومات کے اثبات کے لیے، رائی برابر کوئی چیز بھی کہیں سے مل جائے تو اُسے پہاڑ بنا کر وہ پیش کرتے تھے، لیکن خلاف مطلب، اگر پہاڑ کی سی وزنی چیز بھی، ان کی راہ میں آئے، اور اس سے صرف نظر بھی ممکن نہ ہو تو اسے تاویل و تحریف کے ڈائنامائیٹ سے اُڑا دینے پر جت جایا کرتے تھے۔ ''عجمی سازش'' کے افسانہ کی تراش خراش کے لیے، ''مفکر قرآن'' نے سب سے زیادہ مواد اور مسالہ (جیسا کہ پہلے مذکور ہو چکا ہے) کتب شیعہ، عقائد شیعہ، فرق شیعہ اور تاریخ شیعہ سے اخذ کیا ہے۔ جہاں کہیں علماءِ اہل سنت کی کتب سے اقتباسات پیش کیے ہیں وہاں یا تو حوالۂ ماخذ کے بغیر ایسا کیا ہے، یا تراجم میں ہیر پھیر سے کام لیا ہے، یا اپنے اضافی الفاظ کے ذریعے مفہوم کو تبدیل کر دیا ہے، اور ان کے سر برآوردہ علماء پر بہتان تراشی کی ہے۔ اُن کے بعض اقوال کو، جو فی نفسہٖ درست ہیں، اُنھیں ایسے محامل پر محمول کیا ہے جن سے غلط اور گمراہ کن تاثر پیدا کیا جا سکے۔ ان تمام اُمور کے ثبوت، اگرچہ گذشتہ صفحات میں پیش کیے جا چکے ہیں، اور آئندہ بھی، ان کی نشاندہی ہم حسب موقع کرتے رہیں گے۔ فی الحال، تو یہ دیکھیے کہ ''مفکر قرآن'' نے اپنی کتاب شاہکارِ رسالت کے آخری باب کو، جو ''عجمی سازش'' کے متعلق، ۹۰ صفحات پر مشتمل ہے، ان میں سے ''عجمی سازش'' کے ''اثبات'' کے لیے، پیش کردہ مواد کا غالب حصہ، شیعہ کے افکار و معتقدات، ان کی تاریخ، فرقہ بندی اور ان کے اقوالِ ائمہ پر مشتمل ہے، جیسا کہ درج ذیل جدول سے ظاہر ہے۔ اس جدول کے نمبر شمار کے بعد، پہلے کالم میں، شاہکارِ رسالت کا صفحہ نمبر درج کیا گیا ہے، جس پر اقتباس واقع ہے، قطع نظر اس کے کہ جو اقتباس (اس صفحہ پر) دیا گیا ہے، وہ مصنف

کے اصل الفاظ میں ہے یا ''مفکرِ قرآن'' نے اسے خود اپنے الفاظ میں پیش کیا ہے، اور قطع نظر اس امر کے بھی، کہ اقتباس، مع حوالہ دیا گیا ہے یا بغیر حوالۂ ماخذ کے۔ دوسرے کالم میں، اُس صفحہ پر موجود اقتباسات کی تعداد پیش کی گئی ہے۔ تیسرے کالم میں، وہ عنوان دیا گیا ہے جس کے تحت، پرویز صاحب نے شاہکارِ رسالت میں اقتباسات پیش کیے ہیں، تاکہ قاری کو اقتباس کی تلاش میں دقت نہ ہو۔ چوتھے کالم میں، ان اقتباسات کا ماخذ پیش کیا گیا ہے، اور آخری کالم میں، اقتباس سے متعلقہ کوئی وضاحت یا تفصیل پیش کی گئی ہے۔

نمبر شمار	صفحہ نمبر از شاہکارِ رسالت	تعداد اقتباسات	زیرِ عنوان	ماخذ اقتباسات	تفصیل و توضیح
۱	۴۴۴-۴۴۵	تین	تقیہ	کتاب الشافی ترجمہ اصول الکافی	جملہ اقتباسات، اقوالِ ائمہ شیعہ ہیں جو شیعہ کتاب سے ماخوذ ہیں۔
۲	۴۴۸	ایک	بطورِ حق وراثت	نہج البلاغہ	خطباتِ سیّدنا علی رضی اللہ عنہ پر مشتمل کتاب، معروف کتب شیعہ میں سے ہے۔
۳	۴۴۸	ایک	بطورِ حق وراثت	بلاحوالہ	''چچا کی موجودگی میں بھتیجا مستحق وراثت نہیں ہوتا'' مسخِ حقیقت کی بھونڈی کوشش پرویز
۴	۴۵۰	ایک	رجعت کا عقیدہ	بلاحوالہ	یہ شیعہ عقیدہ ہے لیکن اس کے تمام اُمت مسلمہ کا عقیدہ ہونے کا تاثر دیا گیا ہے۔
۵	۴۵۱	ایک	کفر و ایمان کا خط امتیاز	بلاحوالہ	یہ شیعہ عقائد، ان کے ائمہ کے الہامی علم پر مبنی ہیں۔

۶	۴۵۲	ایک	شہر بانو کے متعلق شیعہ روایت	کتاب الشافی شرح اصول الکافی	یہاں پرویز صاحب نے کتب شیعہ سے شہر بانو کا زوجۂ حسینؓ ہونا تسلیم کیا ہے۔
۷	۴۵۳۔۴۵۴	ایک	حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ	بلاحوالہ	عقیدۂ شیعہ کہ اہل بیت کے سوا جو افراد ثلاثہ مسلمان رہ گئے تھے، ان میں سلمانؓ فارسی بھی ہیں۔
۸	۴۵۴ پر حاشیہ	ایک	حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ	فروع کافی۔ باب الروضہ	جو مرتد نہیں ہوئے ان میں قنبر اور عمار بن یاسر بھی تھے۔
۹	۴۵۵	ایک	حسینؓ کے معاویہؓ کے ساتھ تعلقات	شرح ابن ابی الحدید	یہ بھی ایک شیعہ عالم کی کتاب کی شرح ہے۔
۱۰	۴۵۶۔۴۵۹	ایک	بنی امیہ اور بنی عباس کی رقابت	بلاحوالہ	یہ بھی تاریخ شیعہ سے ماخوذ ہے۔
۱۱	......	ایک	امام مہدی کی آمد	بلاحوالہ	بقول پرویز، ابو مسلم خراسانی، حدیث کی آڑ میں امام مہدی بن کر آیا۔
۱۲	۴۷۰	ایک	بغداد شیعیت کا مرکز تھا	بلاحوالہ	حالانکہ یہ شیعہ سنی کا مشترک شہر تھا، ابوحنیفہ کوفہ اور بغداد سے یکساں متعلق تھے ان میں احناف کی تعداد، شیعہ سے زیادہ تھی۔
۱۳	۴۷۱	ایک	خود ایرانیوں کا اعتراف	تجلیات روح ایران در ادوار تاریخی بحوالہ تحقیق مزید بسلسلہ خلافت معاویہ و یزید	معلوم نہیں اقتباسات میں خیانت وفریب ہے یا نہیں۔ پھر حوالہ بھی ناصبیت کے علمبردار محمود عباسی کی کتاب سے دیا گیا ہے، اصل کتاب سے نہیں۔

۱۴	۴۷۱۔۴۷۲	ایک	خود ایرانیوں کا اعتراف	عجمی مذاہب کا اثر، مسلمانوں کے عقاید پر	ایک منکر حدیث (خواجہ عباد اللہ) کی کتاب سے دوسرے منکر حدیث (پرویز) نے استفادہ کیا۔
۱۵	۴۷۲۔۴۷۳	ایک	اسلام کی اساسات	عبارتِ پرویز	یہ اقتباس مبنی بر حقیقت ہونے کی بجائے مبنی بر عقائد پرویز ہے۔
۱۶	۴۷۴۔۴۸۱	ایک	ائمہ شیعہ کا شجرہ نسب اور شیعہ فرقے		شیعہ فرقوں کی تاریخ بلاحوالہ ”مفکر قرآن“ نے اپنے قلم سے پیش کی ہے۔
۱۷	۴۷۶۔۴۷۷	ایک	اسماعیلیوں کے عقائد	ہمارے اسماعیلی مذہب کی حقیقت اور اس کا نظام	یہ ایک اسماعیلی مصنف ڈاکٹر زاہد علی کی تصنیف ہے۔
۱۸	۴۷۸۔۴۷۹	چار	محرف قرآن، باطنی معانی	ہمارے اسماعیلی مذہب کی حقیقت اور اس کا نظام	یہ ایک اسماعیلی مصنف ڈاکٹر زاہد علی کی تصنیف ہے۔
۱۹	۴۷۹۔۴۸۰	تین	امامت	....	یہ ایک اسماعیلی مصنف ڈاکٹر زاہد علی کی تصنیف ہے۔
۲۰	۴۸۰	ایک	آغا خانی اور بوہرے	مذہب اور باطنی تعلیم	یہ مرزا محمد سعید دہلوی کی تصنیف ہے، معلوم نہیں کہ وہ سُنی تھا یا شیعہ؟
۲۱	۴۸۱	ایک	امامیہ یا اثنا عشری اصول الکافی	کتاب الشافی شرح اصول الکافی	کلینی کی مرتب کردہ شیعی کتاب۔

۲۲	۴۸۱_۴۸۲	چار	محدث کا عقیدہ	الشافی جلد اوّل	شیعہ کتاب
۲۳	۴۸۲_۴۸۶	پندرہ	اس میں اور نبوت میں عملاً کوئی فرق نہیں	الشافی شرح اصول الکافی، جلد: ۱	شیعہ کتاب
۲۴	۴۸۶_۴۸۸	چار	حضرت علی کا مقام	شیعہ رسالہ ''معارف اسلام''	چاروں اقتباسات معاصر مجلّہ ''معارف اسلام'' سے ماخوذ ہیں۔
۲۵	۴۸۸_۴۹۰	پانچ	موجودہ قرآن محرف ہے	الشافی شرح اصول الکافی، جلد: ۱	شیعہ کی حدیث کی کتاب
۲۶	۴۹۰_۴۹۱	دو	قرآن کے باطنی معانی	الشافی، جلد اوّل	جیسا کہ پہلے مذکور ہو چکا ہے، یہ شیعہ کی کتاب ہے۔
۲۷	۴۹۱_۴۹۳	تین	قرآن کے علاوہ وحی کے مجموعے	الشافی، جلد اوّل	جیسا کہ پہلے مذکور ہو چکا ہے، یہ شیعہ کی کتاب ہے۔
۲۸	۴۹۴	ایک	جامعین حدیث سب ایرانی تھے	ہمارے اسرائیلی مذہب کی حقیقت اور اس کا نظام	اسماعیلی مصنف ڈاکٹر زاہد علی کی کتاب ہے۔
۲۹	۴۹۵	دو	الکافی کی ضعیف روایات	الشافی، جلد اوّل	فرقہ شیعہ کی کتابِ حدیث
۳۰	۴۹۵	ایک	مجھ پر انکارِ حدیث کا الزام	مقدمہ الشافی، جلد اوّل	فرقہ شیعہ کی کتابِ حدیث
۳۱	۴۹۶_۴۹۸	ایک	جمع قرآن کے متعلق شکوک و شبہات	مقامِ حدیث	مقامِ حدیث، مسخ حقائق پر مشتمل، پرویز کی اپنی تصنیف ہے۔

۳۲	۵۰۴	ایک	امام ابن جریر طبری	طلوع اسلام	اس اقتباس میں امام طبری کے خلاف تین بہتان تراشے گئے ہیں۔
۳۳	۵۰۶_۵۰۸	تین	آیۂ استخلاف کا مفہوم بدل گیا	اصول کافی	شیعہ فرقہ کی کتاب حدیث۔
۳۴	۵۰۸_۵۰۹	ایک	مذہب وسیاست میں ثنویت	بلاحوالہ	”مذہبی پیشوائیت کے نام سے علماء پر طعن اور بہتان تراشی پر مبنی تحریر پرویز ہے۔
۳۵	۵۰۹_۵۱۰	پانچ	قانون سازی کا امکان ختم کردیا	بلاحوالہ	بلاحوالہ، بلاثبوت، علماء پر ایک، شافعی پر ایک، اہل حدیث پر ایک، اہل حدیث و اہل فقہ پر مشترک ایک، اور جملہ مسلمانوں پر ایک بہتان تراشا گیا ہے۔
۳۶	۵۱۳	ایک	تقدیر کا عقیدہ	بلاحوالہ	بلا حوالہ، بلاثبوت، یہ دعوائے پرویز کہ عقیدہ تقدیر، مجوس کا وضع کردہ ہے۔
۳۷	۵۱۶	ایک	تقدیر کے متعلق روایات	الشافی شرح اصول الکافی	شب برأت کے متعلق، شیعہ کتاب سے اقتباس لیا گیا ہے۔

شاہکارِ رسالت میں ”عجمی سازش“ کے ”اثبات“ کے لیے وقف، اس (آخری) باب میں کل ستتر (۷۷) اقتباسات میں سے ترپن (۵۳) اقتباسات، کتب شیعہ سے لیے گئے ہیں، اس کے علاوہ، ایک حوالہ ناصبیت کے علمبردار محمود عباسی کی کتاب سے لیا گیا ہے، اور دوسرا، مرزا سعید دہلوی کی تصنیف میں سے ماخوذ ہے، مرزا سعید شیعہ تھا یا نہیں، معلوم نہیں۔

اس کے علاوہ سات اقتباسات، قادیانی ماخذ سے لے کر، ''عجمی سازش'' کے خاکہ میں رنگ بھرا گیا ہے۔ دو اقتباسات کتبِ تصوف سے ماخوذ ہیں، کچھ عبارتیں، فتنۂ انکارِ حدیث سے وابستہ مصنّفین سے لی گئی ہیں۔ رہے اہل سنت علماء، تو ان کی کتب سے صرف گیارہ حوالے لیے گئے ہیں، جن میں سے سات حوالے صحاح ستہ سے لے کر، ''عجمی سازش'' کی تکمیل کی گئی ہے۔ پھر اہل سنت کی کتب میں سے جو اقتباسات لیے گئے ہیں، اُن میں سے بعض بغیر حوالۂ ماخذ کے ہیں، بعض ایسے ہیں جنھیں خود محدثین و مؤرخین نے کھوٹے سکے قرار دے کر، نظر انداز کر دیا ہے، کہیں مطلب برآری کے لیے ترجمہ غلط کیا گیا ہے، کہیں استدلال و استنتاج میں غلطی کی گئی ہے، کہیں خود ساختہ اضافوں کے ذریعے مفہوم و مراد کو اپنے ڈھب پر لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور کہیں ''مفکر قرآن'' نے اپنی ذہانت و فطانت کا یوں مظاہرہ کیا ہے، کہ سادہ سی بات میں، جہاں کسی چیز کا اشارہ تک نہیں، وہاں سے محض اپنی طباعی کے زور پر من پسند مفہوم نچوڑا گیا ہے۔ اور پھر ایک فرقہ خاص سے مأخوذ اقتباسات کی بھرمار کے ساتھ، نتیجہ یہ نکالا گیا ہے کہ ''عجمی سازش'' کا اثر، اُس مخصوص فرقہ تک ہی محدود نہیں رہا ہے، بلکہ پوری اُمت مسلمہ ہی اس ''سازش'' کا شکار ہوگئی ہے۔ پھر اس سازش کو زبان و ادب کی بڑی ملمع کاریوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، اس اُمید پر کہ ادب کی چاشنی، زہر باطل کو چھپا ڈالے گی، حقیقت، مقفّٰی اور مسجع لفظوں کی بھینٹ چڑھ جائے گی اور اندازِ بیان کی دل کشی، صداقت کا گلا گھونٹ دے گی۔ اور یوں ''عجمی سازش'' کے خود ساختہ افسانہ کو، دنیا ''حقیقت'' سمجھ لے گی۔

* * *

باب سوم

گاڑی اپنا کانٹا بدلتی ہے

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، ''مفکرِ قرآن'' نے اپنی افترائی اور اختراعی صلاحیتوں کے بل پر، اہل تشیع کے اقتباسات پر مبنی، جس ''عجمی سازش'' کو ایجاد کیا ہے، اس پر یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ عالم اسلام میں، شیعہ فرقہ، ہمیشہ اور ہر جگہ ایک مختصر سی اقلیت پر مشتمل رہا ہے، اس کے تصورات و تخیلات اور عقائد و نظریات، اُن ہی تک محدود رہے ہیں، عام اہل اسلام کی اکثریت، ہر عصر و مصر میں، ان معتقدات سے محفوظ و مصئون ہی رہی ہے، پھر آخر، پوری کی پوری اُمت مسلمہ، اُس ''عجمی سازش'' کا شکار کیسے ہو گئی، جس کا سارا نہیں تو غالب تانا بانا، کتبِ شیعہ ہی کے اقتباسات سے تیار کیا گیا ہے؟ اس سوال کا جواب دینے کے لیے ''مفکر قرآن'' نے، ایسا ساحرانہ اندازِ نگارش اختیار کیا ہے کہ قارئین کرام، پرویز صاحب کی مقفّٰی اور مسجّع عبارتوں کے بہاؤ میں یہ محسوس کریں کہ ''عجمی سازش'' کی گاڑی، اب اپنا کانٹا بدلتی ہے، اور شیعہ افکار و نظریات کی پٹڑی سے اُتر کر، ایک ایسی پٹڑی پر محوِ حرکت ہونے لگی ہے، جس کی آخری منزل پر پہنچ کر مسافر، خود یہ محسوس کریں کہ پوری اُمت مسلمہ، اس سازش کا شکار ہو چکی ہے۔ چنانچہ، اس مقصد کے پیش نظر، ''مفکر قرآن'' صاحب، اپنے جملہ اخلاقی رذائل سے بھرپور کام لیتے ہیں، اور کذب و زُور، مکر و فریب، مغالطہ آفرینی، کتر بیونت، مسخ و تحریف، قطع و برید اور افتراء پردازی میں سے کسی حربے سے گریز نہیں کرتے، چنانچہ اپنے ہدفِ مقصود کو پالینے کے لیے، وہ، اہل سنت کے اعاظم رجال پر خوب بہتان تراشی کرتے ہیں۔ پرویزی حیلوں سے تقلیبِ اُمور، تنکیسِ واقعات اور مسخِ حقائق کرتے ہیں۔ قرآنی مفردات میں خودساختہ اور من پسند معانی داخل کرتے ہیں۔ محدثین اور فقہاء پر تہمت طرازی کرتے ہیں۔ علماءِ حدیث اور علماءِ تفسیر کو افتراء پردازی کا نشانہ بناتے ہیں۔ الغرض، پوری اُمت مسلمہ کو اپنی

خودساختہ ’’عجمی سازش‘‘ کا شکار ’’ثابت‘‘ کرنے کے لیے، ہر ناجائز تدبیر، ہر غیر مناسب چال، ہر ناروا حربہ اور ہر بے جا ہتھکنڈا بلا تامل اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد، ان ہی حربوں کے ساتھ، وہ، ایسا بعید از حقیقت مواد، اپنی لفاظی اور جذبات کے مرکب کی صورت میں پیش کرتے چلے جاتے ہیں، جس سے پوری اُمت مسلمہ، ’’عجمی سازش‘‘ کی لپیٹ میں نظر آئے۔

اس حقیقت کے شواہد، آئندہ صفحات میں، قدم قدم پر، آپ کے لیے دیدہ نواز ہوں گے، لیکن ہم یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ گذشتہ صفحات میں ’’عجمی سازش‘‘ کے جن نکات کو، ہم نے تسلسل کے ساتھ، نمبروار پیش کیا ہے، اس کے تسلسل کو، محض نئے باب کی وجہ سے توڑ کر، ازسرِنو نمبر شماری کا سلسلہ قائم نہ کریں، بلکہ گذشتہ نمبروں کے سلسلہ ہی میں، آئندہ نکات کو بھی منسلک کرتے جائیں، کیونکہ ’’مفکر قرآن‘‘ نے بہرحال، ان جملہ نکات کو، شاہکارِ رسالت کے ایک ہی (آخری) باب میں، تسلسل کے ساتھ پیش کیا ہے۔

(۵۵) مذہب وسیاست میں ثنویت

خلافت راشدہ کے بعد، جو نظامِ حکومت قائم ہوا، اُس میں حکمرانوں کا اخلاقی نقطۂ نظر بھی تبدیل ہوا، اور قیامِ حکومت اور نصب امامت کے طریقۂ کار میں بھی تغیر واقع ہوا۔ اخلاقی رویے میں یہ فرق پڑا کہ سربراہانِ مملکت ہی نہیں، بلکہ ان کے اعوان و انصار بھی، ریاست کو خدا کی امانت سمجھنے کی بجائے، ذاتی جاگیر سمجھنے لگ گئے، اور تشکیل حکومت اور سربراہِ مملکت کا انتخاب، مشاورت کی بجائے، وراثتی ترکہ بن کر رہ گیا۔ حکمران چوں کہ خود دین اسلام کی پابندیوں کو اپنے لیے گراں سمجھتے تھے، اس لیے اُن پر خدا و رسول کا ہر وہ حکم، ناقابل قبول قرار پا گیا جو ان کے سیاسی مصالح سے ٹکراتا تھا۔ یوں دن بدن حکومت کی گاڑی نے، جب قرآن و سنت کی پٹڑی سے کانٹا بدلا تو وہ دینی بندشوں سے آزاد اور اپنی سیاسی مصلحتوں کے جال میں پھنستی چلی گئی۔ سربراہانِ مملکت چوں کہ دین سے دور تھے، اس لیے اُن سے خدمتِ دین اور

اشاعتِ دین کی کیا توقع ہو سکتی تھی، بلکہ اس کے برعکس، دین کے مخلص خادموں کی راہ میں روڑے اٹکانے لگے۔ دین کی خدمت، اسلام کی اشاعت اور عامتہ الناس کو دین سے وابستہ رکھنے کا فریضہ، آخر کسی کو تو انجام دینا ہی تھا۔ ان کاموں سے دست برداری اور کنارہ کشی کا نتیجہ، پوری اُمت کو ارتداد کے راستے پر ڈالنے کے مترادف تھا۔ آخرت میں اپنی جواب دہی کا احساس کرتے ہوئے، اس اُمت کے بہی خواہ، اور اسلام کے خیر خواہ اور مخلص علماء نے اس کٹھن کام کا بیڑا اُٹھایا۔ چنانچہ اسلام اور ملت مسلمہ کے مستقبل کو دینی بنیادوں پر استوار رکھنے کے لیے، پورے دین کی تعلیم و اشاعت کو انھوں نے اپنا فریضۂ حیات قرار دیا۔ اس صورتِ حال میں ''مفکرِ قرآن'' کی یہ بات، قطعی غلط اور سراسر جھوٹ ہے کہ:

> ''مذہب و سیاست کی ثنویت کے نظریہ کے تحت، امورِ مملکت اور امورِ شریعت بھی دو الگ الگ شعبوں میں بٹ گئے۔ امورِ مملکت بادشاہوں کے حصے میں آ گئے اور امورِ شریعت مذہبی پیشوائیت کی تحویل میں۔ شخصی قوانین (Personal Laws) اور ملکی قوانین (Public Laws) کی تفریق بھی اسی ثنویت کا نتیجہ ہے۔'' ❶

اُس دور میں، امرِ واقعہ یہ ہے کہ...... (۱) پرسنل اور پبلک لاء کی یہ ثنویت پیدا ہی نہیں ہوئی تھی۔ یہ چیز بہت بعد کی پیداوار ہے۔ (جیسا کہ آگے چل کر واضح ہو جائے گا)۔ (۲) علماءِ کرام نے، جن میں فقہاء و محدثین وغیرہ سب شامل ہیں اور جنھیں ''مفکرِ قرآن'' نے مطعون کرنے کے لیے، اور اپنی ''عجمی سازش'' کے خانہ زاد افسانہ میں رنگ بھرنے کے لیے، انھیں ''سازشی کردار'' کا حامل قرار دیا ہے، پورے دین کی تعلیم اس خوبی سے دی تھی کہ تعلیم یافتہ حضرات، ایک صحیح اسلامی مملکت کو چلانے کی پوری پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ائمہ و علماءِ کرام کو، جن اموی یا عباسی حکمرانوں نے حکومتی عہدے بالعموم اور مناصب قضاء بالخصوص، قبول کرنے کی درخواست کی تھی، اُن کے متعلق انھیں پورا یقین تھا کہ وہ امورِ سلطنت

---

❶ شاہکار رسالت، صفحہ ۵۰۷۔

کو انجام دینے کے اہل تھے۔ لیکن اس ''مذہبی پیشوائیت'' نے اگر ان عہدوں کو ٹھکرا دیا تھا تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ، اہلیت سے عاری تھے، بلکہ یہ تھی کہ خودسر حکمرانوں کے ہاں سے ایسے عہدے قبول کر کے وہ ان کے ظلم وستم کا آلۂ کار نہیں بننا چاہتے تھے، اور دوسری وجہ یہ تھی، کہ وہ ان دنیوی عہدوں کے لالچی بھی نہیں تھے۔

ان کی نظر، ہمیشہ خدمت دین، اشاعت اسلام اور تعلیمی و تدریسی سرگرمیوں کے نتیجہ میں، اُس اجر ومعاوضہ پر ہی رہی، جو آخرت میں اُنھیں ملنے والا تھا۔ دنیا پرست، اور لادین بلکہ سات سمندر پار سے آ کر برصغیر پر مسلط ہونے والی کھلی کھلی کافرانہ حکومت کی مشینری کا کل پرزہ بننا، اُس صاحب ''معارف القرآن'' ہی کا کام ہو سکتا ہے، جو محض روٹی کا غلام ہو، اور پھر ''لاء کمیشن'' کا رکن بن کر، پھولے نہ سمانا بھی، کسی ایسے ہی حریص منصب، ''مفکر قرآن'' کو زیب دیتا ہے جو اُس مسلم لیگ کا حامی و پیشوا تھا جس کی سیاست کا ماخذ، قرآن وسنت کی بجائے، فرنگی آئین ہونے کا اعتراف، خود انھوں نے، ۱۹۳۹ء ہی میں بایں الفاظ کر ڈالا تھا:

> ''مسلم لیگ ابھی بمشکل چند قدم چل سکی ہے کہ اس کے اندر بھی ان خطرات کے آثار شروع ہو گئے ہیں جو بڑی بڑی منظم جماعتوں کو تباہ کر کے رکھ دیتے ہیں۔ چوں کہ ہماری سیاست کے ماخذ، قرآن وسنت کی بجائے، بالعموم دساتیرِ افرنگ ہیں، اس لیے ان کی دیکھا دیکھی لیگ میں دائیں اور بائیں بازو کا شاخسانہ چھڑتا نظر آتا ہے۔'' ❶

قارئینِ کرام! اس اقتباس میں '' قرآن وسنت'' کا لفظ دیکھ کر ششدر نہ ہوں، قیامِ پاکستان سے قبل، وہ، قرآن کے ساتھ حدیث اور کتاب اللہ کے ساتھ، سنت اور کلام اللہ کے ساتھ اسوۂ حسنہ کا بھی ذکر کیا کرتے تھے۔ مصلحتاً؟ یا مخلصاً؟ یہ بات، اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ لیکن، آزادی کا اثر، یہ ہوا کہ ان کا تصورِ قرآن، حدیث سے، اور سنت سے منقطع ہو گیا، اور علامہ اقبال اگر زندہ رہتے، تو اُنھیں، اپنا نظریہ بدل کر، یہ ترمیم کرنے پر مجبور ہونا پڑتا کہ......

''آزادی'' میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر''۔

---

❶ طلوعِ اسلام، ستمبر ۱۹۳۹ء، صفحہ ۷۷۔

الغرض، خلافت راشدہ کے بعد، علماءِ کرام، فقہاءِ عظام اور محدثینِ ذی شان نے تعلیمِ دین اور اشاعتِ اسلام کے نتیجہ میں، جو کارکن تیار کیے، وہ ہر لحاظ سے، ہر شعبۂ حکومت کو سنبھالنے اور چلانے کے اہل تھے، کیوں کہ ریاست کے بالائی امور، جو نصب امارت اور انتخاب سربراہ سے متعلق تھے، ان کے سوا زندگی کا مجموعی رویہ، انحطاط و زوال کے باوجود، بہت حد تک اسلام کے مطابق ہی تھا۔ بلکہ خود ہمارے برصغیر میں بھی، باوجودیکہ حکمرانوں میں خدمت اسلام کی وہ لگن موجود نہ تھی جو خلفاءِ راشدین کا طرۂ امتیاز تھی، صوفیاء'' علماء اور مسلم، تاجروں کی بدولت، عامۃ الناس کی زندگی میں اسلامی اقدار و روایات غالب تھیں، اور یہاں کا خود کار نظام تعلیم، جو حکومتی دخل اندازی سے پاک تھا، اچھے مسلمان اور اچھے شہری تیار کر رہا تھا۔ ۱۷۹۹ء تک برصغیر میں چور کا ہاتھ کاٹا جاتا رہا ہے۔ لیکن بہت بعد میں، جب اہل اسلام، مغربی طاقتوں سے مغلوب ہو گئے، اور بدیسی حکمرانوں نے، مسلمانوں پر، اپنا نظامِ حیات اپنی معاشرت، اپنا سیاسی نظام اور اپنا تعلیمی نظام مسلط کر دیا، اور پبلک لاء کو مکمل طور پر بدل دیا، تو پھر وہ صورتِ حال پیدا ہوئی جسے ''مفکر قرآن'' نے اپنے اقتباسِ بالا میں ''شخصی اور ملکی قوانین میں تفریق'' کا نام دیا ہے۔ لیکن انھوں نے محض اپنی ذہنی خیانت اور قلبی عیاری سے کام لے کر، اُن نتائج و عواقب کو، جو مغربیت کے مقابلہ میں اہل اسلام کی مغلوبیت اور غلامی کے دور میں (بہت بعد میں) پیدا ہوئے، اُس دور سے وابستہ کر ڈالا ہے، جو خلافت راشدہ کے بعد کا اموی اور عباسی دور ہے۔

''مفکر قرآن'' کی ایک اور دروغ گوئی

اس کے بعد، ''مفکر قرآن'' ایک اور کذب بیانی، بایں الفاظ کرتے ہیں:

> اس سے اتنا ہی نہیں ہوا کہ حکومت دو حصوں میں بٹ گئی۔ اس سے قانون سازی کا وہ سارا طریق ہی الٹ گیا جو قرآن کا تجویز کردہ اور دین کی اساس تھا۔ قرآنی نظام سیاست کی رو سے، قانون سازی کا اصول یہ تھا کہ اُمت، باہمی مشاورت سے، احکام واصولِ قرآنی کی حدود میں رہتے ہوئے، اپنے زمانے کے تقاضوں

کے متعلق، جزئی قوانین وضع کرتی تھی۔ ❶

اس اقتباس میں یہ جو کہا گیا ہے کہ "اُمت...... احکام واصولِ قرآنی کی حدود میں رہتے ہوئے...... جزئی قوانین وضع کیا کرتی تھی۔" قطعی غلط اور سرتاپا جھوٹ ہے۔ اسلام کی سب سے سچّی اور سُچّی، کھری اور اصلی حکومت وہ تھی جسے خود نبی اکرم ﷺ نے قائم فرمایا تھا، اور خلفاءِ راشدین نے نبوی خطوط پر ہی اُسے مزید وسعت دی تھی۔ وہ حکومت بھی (تنہا قرآن کی بجائے) قرآن وسنت پر مبنی تھی، جیسا کہ چاروں خلفائے راشدین کے طرزِ عمل سے واضح ہے۔ خلیفۂ اوّل، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں، خود "مفکرِ قرآن" نے، اسی کتاب شاہکارِ رسالت میں یہ لکھا ہے کہ اُنھوں نے اپنے اوّلین خطبۂ خلافت میں یہ فرمایا تھا:

> تم میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور رسول کی اطاعت کروں۔ لیکن اگر مجھ سے کوئی ایسا کام سرزد ہو، جس سے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کا پہلو نکلتا ہو، تو تم پر میری اطاعت واجب نہیں۔ ❷

اور ایک دوسرے مقام پر، اُن کے خطبۂ خلافت کے اصلی الفاظ بھی دیے گئے ہیں:

> ((أَطِيعُونِي مَا أَطَعْتُ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَإِذَا عَصَيْتُ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَلَا طَاعَةَ لِي عَلَيْكُمْ .))
>
> "میری اطاعت کرو، اس وقت تک جب تک کہ میں اللہ اور رسول کی اطاعت کرتا رہوں۔ اگر میں اللہ اور رسول کی نافرمانی کروں تو میری اطاعت تم پر واجب نہیں۔" ❸

مسخِ حقائق کے پرویزی حیلے

قبل اس کے کہ باقی خلفاءِ راشدین کا طرزِ عمل بیان کیا جائے، یہاں "مفکرِ قرآن" کی دو اغلاط اور ایک فریب کاری کا پول کھول دینا ضروری ہے۔ وہ اکثر یہ کہا کرتے تھے کہ

---

❶ شاہکارِ رسالت، صفحہ ۵۰۹۔

❷ شاہکارِ رسالت، صفحہ: ۵۴۔

❸ طلوعِ اسلام، مارچ ۱۹۶۱ء، صفحہ: ۳۵۔

قرآن میں:

(۱) اللہ اور رسول سے مراد، مرکز نظام اسلامی ہے۔ ❶

(۲) اللہ اور رسول سے مراد، اسلامی مملکت یا قرآنی نظامِ حکومت ہوتا ہے۔ ❷

(۳) یہ حقیقت کہ اللہ اور رسولؐ سے مراد، مرکز ملت ہے، قرآن میں ایسے واضح الفاظ میں اور شرح و بسط سے بیان ہوئی ہے کہ ان مقامات کو بغور دیکھ لینے کے بعد، اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ ❸

اب غور فرمایے کہ (منکرین حدیث کی اصطلاح میں) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، خود ''مرکز ملت'' تھے۔ اور وہ ''مرکز ملت'' ہو کر بھی، اپنے آپ کو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا پابند قرار دیتے ہیں، اور اپنی اطاعت کو اُس وقت تک لوگوں کے لیے جائز قرار دیتے ہیں، جب تک وہ خود، اللہ اور اس کے رسول کے مطیعِ فرمان رہتے ہیں۔ خدا اور رسول کی نافرمانی کی صورت میں، لوگوں پر یہ لازم و واجب نہیں سمجھتے کہ وہ ان کی پیروی و اطاعت پر برقرار رہیں .... لیکن یہ نکتہ، کہ قرآن میں، جہاں بھی اللہ و رسول کے الفاظ آئے ہیں، اُن سے مراد، ''مرکز ملت'' ہے، خلیفہ اوّل کی سمجھ میں نہ آیا۔ وہ بیچارے یہی سمجھتے رہے کہ وہ ''مرکز ملت'' ہونے کی حیثیت سے، خود، اللہ اور رسول، نہیں ہیں، بلکہ اللہ (خالق کائنات) اور رسول (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کے مطیع و تابع فرمان ہیں۔ اگر کہیں خلیفہ اول کی بیعت کے وقت، ''طلوعِ اسلام'' رونما ہو چکا ہوتا، تو ان سے کہتا ...... ''اے مرکز ملت! اللہ اور رسول، تو تم خود ہو۔ کیا آپ کو اتنا بھی علم نہیں کہ ''قرآن میں جہاں بھی اللہ اور رسول کے الفاظ آئے ہیں، ان سے مراد، مرکز ملت ہے۔ اب مرکز ملت بن جانے کے بعد، آپ کس اللہ اور رسول کی اطاعت پر اُتر آئے ہیں؟''

---

❶ تفسیر مطالب الفرقان، جلد: ۴، صفحہ: ۳۴۰۔

❷ تفسیر مطالب الفرقان، جلد: ۶، صفحہ: ۷۰۔

❸ معراج انسانیت، صفحہ: ۳۱۸۔

"اطاعت" کا غلط مفہومِ پرویز

"مفکرِ قرآن" صاحب، اس قدر خودسر اور مستبد المزاج تھے کہ وہ اپنی طرف سے ایک نرالی اُپج اختیار کر کے یہ دعویٰ کیا کرتے تھے کہ عربی میں یہی (اُن کا بیان کردہ مفہوم ہی) اصل مفہوم ہے۔ اب اگر کوئی عرب، "مفکرِ قرآن" کے نرالے اور خودساختہ مفہوم کو نہیں جانتا، تو یہ اُس عرب کی جہالت ہے، ورنہ "مفکرِ قرآن" تو گویا سبوح قدوس ہیں، جن کے بیان کردہ معانی سراپا صدق وصحت ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ ایک مقام پر یہ نکتہ آفرینی فرماتے ہیں کہ:

> اطاعت کے لیے احکامات کا سننا بنیادی شرط ہے، اور احکامات وہی سنے جاسکتے ہیں جو کسی زندہ اتھارٹی کی طرف سے دیے جائیں۔ اس نقطہ (اصل لفظ نکتہ ہے۔ قاسمی) کو، عزیزانِ من! بڑی اچھی طرح سے ذہن نشین فرمالیجیے کہ یہی دین کی لم ہے۔ اطاعت کتابوں کی رو سے نہیں کی جاسکتی۔ زندہ اتھارٹی کی رو سے کی جاسکتی ہے۔ ❶

اور کئی ایک مقام پر کتبِ پرویز میں یہ عبارت بھی موجود ہے۔ صرف ایک حوالہ ملاحظہ فرمایئے:

> عربی زبان میں اطاعت کے معنیٰ ہی ہیں، زندہ کی فرماں برداری۔ ❷

پہلے اقتباس میں یہ کہا گیا ہے کہ "اطاعت کتابوں کے ذریعہ سے نہیں کی جاسکتی"۔ لیکن "مفکرِ قرآن" صاحب، نبیؐ کی ذات کو پس پشت ڈال کر، سارا زور ہی کتاب اللہ کی اطاعت پر دیتے ہیں، (یہ ایک الگ بات ہے کہ اُن کے نزدیک، اطاعت قرآن سے مراد، دراصل اُس مفہومِ پرویز کی اطاعت ہے، جسے وہ قرآن کے گلے مڑھ دیتے ہیں)۔ اور دوسرے اقتباس میں یہ کہا گیا ہے کہ "اطاعت کے معنیٰ ہی ہیں، زندہ کی فرماں برداری۔"

اور سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، بیچارے خالص عرب ہو کر بھی، اطاعت کے مفہوم کو نہیں سمجھ پائے۔ اور وہ، خدا کے ساتھ، فوت شدہ رسول کی بھی، یہ کہہ کر اطاعت فرما رہے ہیں کہ...... أَطِيْعُونِي مَا أَطَعْتُ اللهَ وَرَسُوْلَهُ ...... کیا خوب ہے کہ جو معنیٰ، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، عرب اور پروردۂ آغوشِ رسالت ہو کر بھی نہیں سمجھ سکے، وہ معنیٰ، چودہ صدیوں بعد، ہمارے

---

❶ طلوعِ اسلام، مئی ۱۹۷۶ء، صفحہ: ۱۴۔

❷ طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۷۹ء، صفحہ: ۷۹۔

’’مفکرِ قرآن‘‘ اور طلوعِ اسلام، عجمی ہو کر سمجھ گئے۔ کیا کہنے (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بلادت و کند ذہنی کے اور کیا کہنے ’’مفکرِ قرآن‘‘ کی ذہانت و فطانت کے۔ قاتلهم الله انى يؤفكون.

’’مطابقِ قرآن‘‘ بنانے کی دُھن میں تاریخی حقائق کی تحریف

اب آخر میں ’’مفکرِ قرآن‘‘ کا یہ تحریفی کارنامہ بھی ملاحظہ فرمالیجیے کہ حضرت ابو بکرؓ صدیق کے خطبۂ خلافت کے جس جملہ پر یہاں بحث ہو رہی ہے، وہ چوں کہ خلیفۂ اوّل کی ’’اطاعتِ رسول‘‘ کا بھی ثبوت ہے، اور ’’مفکرِ قرآن‘‘ کو، اطاعتِ رسول، کا لفظ سن کر ہی کھجلی ہونے لگتی ہے، اس لیے وہ اس جملہ میں تحریف کرتے ہوئے، اطاعتِ رسول کا لفظ نکال دیتے ہیں، چنانچہ بعد میں، ایک مقام پر تحریف شدہ اور مسخ کردہ مفہوم کو بایں الفاظ لکھتے ہیں:

> اس اصول کو، حضرت ابو بکر صدیق نے اپنے پہلے خطبہ خلافت میں، ان الفاظ میں پیش کیا تھا...... تم میری اطاعت اُس وقت تک کرو، جب تک میں اللہ کے احکام کی اطاعت کروں۔ اگر میں اس کی نافرمانی کروں، تو تم پر میری اطاعت فرض نہیں ہے۔ ①

یوں ’’مفکرِ قرآن‘‘ صاحب، کتر بیونت، قطع و برید اور مسخ و تحریف کی ’’قرآنی شمشیر‘‘ کی نوک سے، خلافت راشدہ کی تاریخ کو ’’مطابقِ قرآن‘‘ بنایا کرتے تھے۔

آمدم بر سرِ مطلب

اس جملۂ معترضہ کے بعد، اب باقی خلفاءِ راشدین کے طرزِ عمل کو ملاحظہ فرمایے کہ وہ سب بھی نرے قرآن کی نہیں، بلکہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے بھی پابند تھے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں، اُن کا مسلک، خود ان کے اس خط سے واضح ہو جاتا ہے جو اُنھوں نے قاضی شریح کے نام لکھا تھا:

((اذا وجدت شيئًا في كتاب اللّٰهِ ناقضْ به ولا تلتفت الى

---

① طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۸۴ء، صفحہ: ۳۰۔

غیرہ، وان اتاك شيٌ ليس في كتاب اللّٰه فاقض بما سَنَّ رسول اللّٰه ﷺ وان اتاك ما ليس في كتاب اللّٰه ولم يَسُنَّ رسول اللّٰه ﷺ فاقض بما اجمع عليه الناس وان اتاك ماليس في كتاب اللّٰه ولا سنة رسول اللّٰه ﷺ ولم يتكلم فيه احد قبلك فان شئت ان تجتهد رَأيَك فتقدم، وان شئت ان تتاخَّر فتاخر وما لدى التاخير الا خيرًا لك .)) ❶

اس عربی عبارت کے مفہوم کو، اردو زبان میں، مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے یوں پیش فرمایا ہے:

> ''اگر تم کوئی حکم کتاب اللہ میں پاؤ تو اس کے مطابق فیصلہ کرو، اور اس کی موجودگی میں کسی دوسری چیز کی طرف توجہ نہ کرو، اور اگر کوئی ایسا معاملہ ہو جس کا حکم کتاب اللہ میں نہ ہو تو رسول اللہ ﷺ کی سنت میں جو حکم ملے، اس پر فیصلہ کردو، اور اگر معاملہ ایسا ہو جس کا حکم، نہ کتاب اللہ میں ہو، نہ سنت رسول میں، تو اس کا فیصلہ اس قانون کے مطابق کردو جس پر اجماع ہو چکا ہو۔ لیکن اگر کسی معاملہ میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ دونوں خاموش ہوں اور تم سے پہلے اس کے متعلق کوئی اجماعی فیصلہ نہ ہوا ہو، تو تمھیں اختیار ہے کہ یا تو پیش قدمی کر کے اپنی اجتہادی رائے سے فیصلہ کردو، یا پھر ٹھہر کر انتظار کرو (کہ اس معاملہ میں کوئی اجماعی فیصلہ ہو جائے) اور میرے نزدیک تمھارا انتظار کرنا زیادہ بہتر ہے۔'' ❷

خود طلوعِ اسلام نے بھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ طرزِ عمل، خود اُن کے اپنے الفاظ میں، یہ کہہ کر تسلیم کیا ہے کہ:

> ''میں سنت رسول اللہ ﷺ اور سنت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اتباع کروں گا۔'' ❸

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد، خلیفۂ ثالث، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا طرزِ عمل بھی، ان کے خطبۂ خلافت سے ظاہر ہے:

---

❶ اعلام الموقعین، جلد:۱، صفحہ:۶۱ تا ۶۲۔

❷ سنت کی آئینی حیثیت، صفحہ:۱۱۶۔

❸ طلوعِ اسلام، جون ۱۹۵۶ء، صفحہ:۲۱۔

> خبردار رہو! میں پیروی کرنے والا ہوں، نئی راہ نکالنے والا نہیں ہوں۔ میرے اوپر کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کی پابندی کے بعد، تمہارے تین حق ہیں، جن کی میں ذمہ داری لیتا ہوں۔ ایک یہ کہ میرے پیشرو خلفاء کے زمانے میں تمہارے اتفاق و اجماع سے جو فیصلے اور طریقے طے ہو چکے ہیں، ان کی پیروی کروں گا۔ دوسرے یہ کہ جو امور اب اہل خیر کے اجماع و اتفاق سے طے ہوں گے ان پر عمل درآمد کروں گا۔ تیسرے یہ کہ تمہارے اوپر دست درازی کرنے سے باز رہوں گا۔ جب تک تم ازروئے قانون، مواخذہ کے مستوجب نہ ہو جاؤ۔ ①

چوتھے خلیفہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہیں۔ ان کا طرزِ عمل، اُس سرکاری فرمان سے واضح ہے جو خود انھوں نے خلیفہ بنتے ہی، اہل مصر سے اپنی بیعت لینے کے لیے، اپنے گورنر حضرت قیس بن سعد بن عبادہ کے ہاتھ ارسال فرمایا تھا۔ اس میں وہ فرماتے ہیں:

> ”خبردار رہو، تمہارے اوپر ہمارا یہ حق ہے کہ ہم اللہ عزوجل کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کے مطابق عمل کریں، اور تم پر وہ حق قائم کردیں جو کتاب و سنت کی رُو سے حق ہو، اور رسول اللہ ﷺ کی سنت جاری کریں اور تمہاری بے خبری کی حالت میں بھی تمہاری خیر خواہی کرتے رہیں۔“ ②

چاروں خلفائے راشدین کے انفرادی طرزِ عمل کے بعد، اب بحیثیت مجموعی یہ دیکھیے کہ اس وقت اسلامی ریاست کا قانون کیا تھا؟ تنہا قرآنِ کریم؟ یا قرآن و سنت دونوں؟ اس سلسلہ میں طلوعِ اسلام کے ادارۂ سابقہ ”میزان پبلی کیشنز لمیٹڈ کی شائع کردہ کتاب کا اقتباس پیش کرنا ہی کافی ہے۔ اس کتاب پر بطورِ مصنف محمد اسلم جیراجپوری کا نام جڑا ہوا ہے۔

> ”خلافت راشدہ میں تشریع کی بنیاد قرآن اور سنت پر تھی۔ اگر کوئی ایسا واقعہ پیش آجاتا جس کے بارے میں کوئی صریح حکم نہ ہوتا تو امثال و نظائر پر قیاس کر کے

---

① تاریخ طبری بحوالہ سنت کی آئینی حیثیت، صفحہ: ۱۱۷۔

② تاریخ طبری بحوالہ سنت کی آئینی حیثیت، صفحہ: ۱۱۸۔

اس کا حکم نکالتے تھے۔" ❶

یہ ہے خلفاءِ راشدین کا سنت رسول ﷺ کے بارے میں طرزِ عمل۔ معلوم نہیں کہ منکرین حدیث، کن خلفاء کا ذکر کرتے ہیں، جو خود کو قضایاءِ رسول ﷺ کے بدل ڈالنے کا مجاز سمجھتے تھے۔ پھر ان لوگوں کا یہ مؤقف بھی، دلیل سے عاری، مجرد دعویٰ ہی ہے کہ خلفاءِ راشدین، قرآنی احکام کو تو دائمی اور مستقل طور پر واجب الاطاعت جانتے تھے مگر اللہ کے رسولؐ کے فیصلوں میں سے جن کو چاہتے تھے، برقرار رکھتے تھے اور جن کو چاہتے تھے بدل ڈالتے تھے، اور ان کی جگہ نئے فیصلے کر ڈالتے تھے۔ منکرین حدیث کی طرف سے جب چند ایسی مثالیں، مغالطہ آرائی کے پیش نظر، غلط انداز میں پیش کی گئیں، تو سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے، نہ صرف یہ کہ ان لوگوں کی اغلاط کو واضح کیا، بلکہ انھیں یہ چیلنج بھی دیا:

> میں عرض کرتا ہوں کہ تمام منکرین حدیث مل کر اس طرح کی مثالوں کی ایک مکمل فہرست پیش فرمادیں۔ میں ان شاء اللہ ثابت کردوں گا کہ ان میں سے ایک بھی اس امر کی مثال نہیں ہے کہ خلافت راشدہ میں حضور ﷺ کے فیصلے بدلے گئے تھے۔ ❷

کیا احکامِ سنت قابل تغیر وتبدل ہیں؟

فتنہ انکارِ حدیث کے علمبردار، جناب چودھری غلام احمد پرویز کا یہ حال تھا کہ ان کی فضاءِ دماغی میں اُٹھنے والے ہر جھکڑ کے ساتھ، ان کا مؤقف بھی مرغ بادنما کی طرح بدل جایا کرتا تھا۔ قرآنی احکام کو ناقابل تغیر وتبدل سمجھنا اور حدیث وسنت کے احکام کو لائق تغیر وتبدل جاننا بھی، ان کی تلون مزاجی اور تضاد بیانی کی واضح دلیل ہے۔ ایک زمانہ تھا جب مؤخر الذکر احکام کو بھی، قرآنی احکام کی طرح، تغیر وتبدل سے بالاتر کہا کرتے تھے، اور عامتہ الناس کو یہ وعظ فرمایا کرتے تھے:

> یہ تو ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اسلامی شریعت کے احکام دو قسم پر مبنی ہیں، ایک

---

❶ تاریخ الامت، جلد: ۲، صفحہ: ۲۵۷۔ ❷ سنت کی آئینی حیثیت، صفحہ: ۱۱۸۔

> تو وہ جس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ ان کے لیے قرآنِ کریم کی نصوص صریحہ اور رسول اللہ ﷺ کا اسوۂ حسنہ موجود ہے۔ لیکن دوسری قسم اُن احکام کی ہے جو اُمت کے عام حالات سے تعلق رکھتے ہیں۔ چونکہ حالات، مزاولت زمانہ سے بدلتے رہتے ہیں، اس لیے ان کے متعلق احکام بھی اٹل نہیں ہو سکتے۔ ❶

یہ اقتباس واضح کرتا ہے کہ قیامِ پاکستان سے قبل، وہ قرآنی احکام کو بھی اور اسوۂ رسول کے قضایا کو بھی تغیر و تبدل سے بالاتر مانتے تھے۔ لیکن بعد میں، جب ان کا ذہن بدلا اور فتنۂ انکارِ حدیث کا بپتسمہ پایا، تو اُنھوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ قرآنی احکام تو ناقابل تغیر و تبدل ہیں لیکن حضور ﷺ کے فیصلے بدلے جا سکتے ہیں۔ اور اُمت مسلمہ کے وہ علماءِ کرام، جن کے مؤقف کے ''مفکر قرآن'' ماضی میں حامی و ہمنوا رہے ہیں، ان کو اب اُنھوں نے ''ملاازم''، ''پریسٹ ہڈ'' اور ''مذہبی پیشوائیت'' کے نام سے مطعون کرنا شروع کر دیا، اور حسب عادت، ان کے خلاف، اتہام تراشی اور بہتان تراشی پر اُتر آئے۔

(۵۶) امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ پر بہتان

''مفکر قرآن'' خلافِ حقیقت، اپنا یہ اصول بیان کرنے کے بعد، کہ اُمت، صرف اور صرف قرآنی احکام و اصول کی حدود میں رہ کر، جزئی قوانین وضع کیا کرتی تھی، اور صرف قرآنی احکام و اصول ہی غیر متبدل ہیں، پھر کذب و زُور کا سہارا لے کر یہ لکھتے ہیں کہ

> مشاورت کا نظام بادشاہت نے ختم کر دیا، اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلنے والے قوانین کا تصور، مذہبی پیشوائیت نے ناجائز قرار دے دیا۔ امام شافعیؒ کے پیش کردہ مسلک حدیث کی رو سے عقیدہ یہ قرار پایا کہ احکام و قوانین سب کے سب احادیث کے اندر موجود ہیں۔ یہ مکمل بھی ہیں اور غیر متبدل بھی۔ اس لیے نہ کسی نئے قانون کے وضع کرنے کی ضرورت ہے، نہ موجودہ احکام میں ردّ و بدل کی اجازت۔ یہ اہل حدیث کا مسلک تھا اہل فقہ نے شروع شروع میں...... ❷

---

❶ طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۴۰ء، صفحہ: ۲۵۔

❷ شاہکارِ رسالت، صفحہ: ۵۰۹۔

یہ اقتباس، ''مفکرِ قرآن'' کے جھوٹ کا پلندہ ہے۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ نہ تو زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلنے والے قوانین کے تصور ہی کو، مذہبی پیشوائیت نے ناجائز قرار دیا، اور نہ ہی امام شافعی نے وہ بات کہی جسے ''مفکرِ قرآن'' نے بہتاناً ان کی طرف منسوب کر ڈالا ہے۔ ہم منکرین حدیث کو یہ چیلنج دیتے ہیں کہ امام شافعی کا کوئی ایسا اقتباس، خود امام موصوف ہی کے الفاظ میں پیش کریں جس میں وہ کچھ کہا گیا ہو، جو اقتباس بالا میں، اُن کے گلے مڑھا گیا ہے، اور جتنا ہمیں وقوعِ قیامت پر یقین ہے، اتنا ہی ہمیں اس بات پر یقین ہے کہ منکرین حدیث، قیامت تک ایسی کوئی بات، امام شافعی ؒ کے لٹریچر سے پیش نہیں کر سکتے۔ ﴿ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴾۔ اب سوائے اس کے، ہم منکرین حدیث کو کیا کہہ سکتے کہ: ﴿ فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝ ﴾ [البقرة: ٢٤]

بعض لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ اپنے مخالفین کی بات کو، کبھی تو سیاق وسباق سے کاٹ کر، ان کے خلاف بہتان تراشی کرتے ہیں، اور کبھی کوئی ایسی بات جو منکرین حدیث کے ٹیڑھے ذہنی سانچوں میں ڈھل نہ سکتی ہو، اُسے بہتاناً اپنے مخالفین کی طرف منسوب کر ڈالتے ہیں، اور کبھی اپنے حریفوں کی بات کو، خود اُن کے اپنے الفاظ میں پیش کرنے کی بجائے، اپنے ہی الفاظ کا جامہ پہنا کر پیش کرتے ہیں، اور مفہوم کچھ اور ہی بنا ڈالتے ہیں، اور پھر اس بدلے ہوئے مفہوم پر، اپنے ذوقِ تردید اور شوقِ تنقید کو پورا کرتے ہیں۔ لیکن منکرین حدیث، اس معاملہ میں سب سے آگے بڑھ کر، یہ حرکت بھی کرتے ہیں کہ اپنی طرف سے ایک بات گھڑ کر، اُسے اپنے مخالفین کے گلے مڑھتے ہوئے، ''اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے'' کے مصداق، یہ ڈھنڈورا پیٹ کر آسمان سر پر اُٹھا لیتے ہیں کہ دوسرے لوگ، ان کے خلاف یہی گھٹیا رویہ اختیار کرتے ہیں، جو دراصل، خود ان کا اپنا رویہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر طلوعِ اسلام لکھتا ہے:

> ہمارے خلاف پراپیگنڈا کرنے والوں کی کیفیت جدا ہے۔ وہ یہ نہیں کرتے کہ جو کچھ طلوعِ اسلام کہتا ہے، اُسے اس کے الفاظ میں، اپنے قارئین کے سامنے پیش

> کرکے، اُس پر قرآنِ کریم کی روشنی میں تنقید کریں۔ وہ کرتے یہ ہیں کہ اپنی طرف سے ایک غلط بات وضع کرتے ہیں، اور اسے طلوعِ اسلام کی طرف منسوب کرکے گالیاں دینا شروع کردیتے ہیں۔ ①

حالانکہ ''مفکرِ قرآن'' کی یہ خصلتِ بد، یہاں کھل کر سامنے آرہی ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ کی بات کو، خود اُن کے اپنے الفاظ میں پیش کرنے سے اجتناب کررہے ہیں، اور اپنی طرف سے یہ غلط بات وضع کرتے ہیں کہ...... ''احکام وقوانین، سب کے سب، احادیث کے اندر موجود ہیں۔ یہ مکمل بھی ہیں اور غیر متبدل بھی۔ اس لیے نہ کسی نئے قانون کے وضع کرنے کی ضرورت ہے، اور نہ موجودہ احکام میں ردّ و بدل کی اجازت'' ......اور پھر اسے امام شافعی رحمہ اللہ کے گلے مڑھ رہے ہیں۔ اس صریح جھوٹ، واضح دروغ اور بین کذب پر بے ساختہ ہماری نوکِ قلم پر، اللہ تعالیٰ کے یہ الفاظ آجاتے ہیں۔ لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِيْنَ .

ہم جب ''مفکرِ قرآن'' کی تحریفات وتلبیسات، مغالطات ومخادعات، افتراءات و بہتانات، تقلیب امور اور مسخ حقائق، قطع و برید اور کتر بیونت، اور اکاذیب واباطیل کو دیکھتے ہیں، تو ہمیں ہمارے رسولِ صادق ومصدوق علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ فرمان مبارک یاد آجاتا ہے...... ''خبردار، جھوٹ سے بچتے رہو۔ جھوٹ بدی کی طرف لے جاتا ہے اور بدی جہنم کی طرف لے جاتی ہے، جھوٹا آدمی جھوٹ بولتا رہتا ہے، اور کذب وزُور ہی کے قصد وتلاش میں سرگرم رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ اللہ کے ہاں کذاب (سخت جھوٹا بصیغۂ مبالغہ) لکھ دیا جاتا ہے۔ لیکن ''مفکرِ قرآن'' صاحب، جس قدر زور وقوت کے ساتھ اکاذیب واباطیل پیش کیا کرتے تھے، اُسی قدر ضد اور ہٹ دھرمی کے ساتھ، وہ، الزامِ دروغ گوئی کو، اپنے مخالفین کے سر تھوپا کرتے تھے، اور اُلٹا انھیں کذب گو کہتے ہوئے، مسلسل یہ پراپیگنڈہ کیا کرتے تھے کہ علماءِ کرام نے ان کے خلاف، جھوٹ بولنے کے لیے، یہ کہہ کر، ایک شرعی عذر تراش رکھا ہے کہ...... ''عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر، جھوٹ بولنے کی نہ صرف اجازت ہے، بلکہ

---

① طلوعِ اسلام، اپریل ۱۹۷۹ء، ص ۶۱۔

بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے‘‘...... اس مسئلہ کو آڑ بنا کر، ہمارے ’’مفکرِ قرآن‘‘ صاحب، جب بھی، جس قدر کثرت کے ساتھ جھوٹ بولا کرتے تھے، اُسی قدر شدّت و حدّت کے ساتھ، وہ علماءِ کرام کے خلاف کذب بیانی کا پیہم پراپیگنڈہ کیا کرتے تھے، تاکہ اس یلغاری پراپیگنڈے کی اوٹ میں، خود ان کے اکاذیب واباطیل چھپے رہیں۔ اور عیار و مکار لوگ، اپنے عیوب و نقائص پر پردہ ڈالے رکھنے کی خاطر، ایسی شاطرانہ چالیں چلتے رہتے ہیں۔ اس نفسیاتی حقیقت کا خود طلوعِ اسلام نے بھی اعتراف کیا ہے، اس لیے ہم، اُسی کا اقتباس، بطورِ آئینہ پیش کیے دیتے ہیں، تاکہ وہ خود بھی:۔

> اپنی روش کا نفسیاتی تجزیہ کر کے دیکھیں کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان کا نفس، دوسروں کی تنقیص میں اس لیے مصروف ہے، تاکہ اس کی اپنی سہل انگاری ڈھکی رہے اور اسے چھپانے کے لیے، اس نے بلند نصب العین کو آڑ بنا رکھا ہو۔ فریب نفس سے اکثر ایسا ہوا کرتا ہے۔ ❶

(۵۷) محدثین اور فقہاء پر بہتان تراشی

گذشتہ مبحث میں، دیئے گئے اقتباسِ پرویز میں، امام شافعی رحمہ اللہ کو نشانہ بہتان بنانے کے بعد، ’’مفکرِ قرآن‘‘ نے محدثین کرام اور فقہاءِ عظام پر یوں افتراء پردازی کی ہے:

> امام شافعی رحمہ اللہ کے پیش کردہ مسلک حدیث کی رو سے عقیدہ یہ قرار پایا کہ احکام و قوانین، سب کے سب احادیث کے اندر موجود ہیں .... یہ اہل حدیث کا مسلک تھا۔ اہل فقہ نے شروع شروع میں اس مسلک کی مخالفت کی اور کہا کہ قرآن اور حدیث کی روشنی میں قیاس (اجتہاد) کی رو سے، نئے نئے احکام مستنبط کیے جا سکتے ہیں، اور جس حکم پر اجماع ہو جائے وہ اُمت کے لیے قانون بن جائے گا .... لیکن بعد میں انھوں نے بھی یہ عقیدہ اختیار کر لیا کہ اب اجتہاد کا دروازہ بند ہے، اس لیے نہ سابقہ فقہی فیصلوں میں تبدیل ہو سکتی ہے، اور

---

❶ طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۴۰ء، صفحہ: ۱۳۔

نہ ہی نئے احکام ہی وضع کیے جاسکتے ہیں۔ ①

اس اقتباس میں ''مفکر قرآن'' نے تین انحرافات کا ارتکاب کیا ہے، جن کا بالاختصار جائزہ درج ذیل ہے:

۱۔ کیا قیاس اور اجتہاد ہم معنی ہیں؟

''مفکر قرآن'' نے قیاس اور اجتہاد میں سے ایک لفظ کو بین القوسین رکھ کر، دوسرے لفظ کا اسے ہم معنی قرار دیا ہے، اور یہ خلافِ حقیقت بات ہے، آج تک کوئی فقیہہ اور محدث، اجتہاد کا منکر نہیں گزرا۔ ہر صاحب علم و دانش، اجتہاد کا قائل رہا ہے اور رہے گا۔ جب کہ قیاس کی شرعی حیثیت کا بعض علماء وفقہاء نے انکار کیا ہے۔ ان دونوں فقہی اصطلاحات میں کیا فرق ہے؟ اسے امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب الاحکام فی اصول الاحکام میں تفصیلاً بیان کیا ہے، کیونکہ وہ خود، اجتہاد کے قائل اور قیاس کے منکر تھے، بلکہ منکرین قیاس کے یکے از ائمہ و پیشوا تھے۔ مذکورہ کتاب میں، امام ابن حزم نے اس موضوع پر، جو بحث کی ہے۔ وہ ان کے جودتِ استدلال، ذہانت و فطانت، عقل و دانش، فہم و فراست اور باریک بینی و دقیقہ رسی کا شاہکار ہے۔ لیکن ''مفکر قرآن'' کا قیاس و اجتہاد کو ایک قرار دینا، خود واضح کر دیتا ہے کہ فقہی امور کی واقفیت میں وہ کس قدر مفلس و کنگال ہیں۔

۲۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ پر بہتان

''مفکر قرآن'' نے اپنے دوسرے انحراف میں، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ پر یہ بہتان تراشا ہے کہ ان کے نزدیک، جملہ احکام وقوانین کا ماخذ صرف احادیث ہیں۔ حالانکہ وہ ہمیشہ قرآن و حدیث (یا کتاب وسنت) کو (نہ کہ تنہا قرآن کو، یا تنہا احادیث کو) ادلہ شرعیہ تسلیم کرتے رہے ہیں، چنانچہ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے، نصوصِ قرآن پر مبنی، ان کے اجتہادات و استنباطات کو ''احکام القرآن'' کے نام سے ایک کتاب میں جمع کر دیا ہے، اسی کتاب میں، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فرمان (بزبان عربی) موجود ہے:

> ''امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر اپنی وحی کا اتباع اور سنن رسول اللہ ﷺ کی پیروی کو فرض قرار دیا ہے، اللہ نے اپنی کتاب میں فرمایا

---

① شاہکار رسالت، صفحہ: ۵۰۹۔

> ......"اے ہمارے پروردگار! ان لوگوں میں ایک ایسا رسول مبعوث فرما، جو ان پر تیری آیات کی تلاوت کرے، اور انھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے۔" ...... پھر اللہ کا یہ فرمان ہے: ......" اللہ نے اہل ایمان پر احسان فرمایا جبکہ اُن ہی میں سے، ایک رسول، اُن میں مبعوث فرمایا جو ان پر اللہ کی آیات کی تلاوت کرتا ہے اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔" ...... اسی معنی کی دیگر آیات کو ذکر کرنے کے بعد، امام شافعی نے فرمایا ......" اللہ تعالیٰ نے کتاب کا ذکر کیا ہے جس سے مراد قرآن ہے، اور حکمت کا ذکر کیا ہے، جو سنت رسول ہے جیسا کہ میں نے علماءِ قرآن میں سے نہایت پسندیدہ لوگوں سے سنا ہے۔" ❶

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی اپنی عبارت سے، "مفکر قرآن" کے بہتان کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے، کہ امر واقعہ وہ نہیں جسے "مفکر قرآن" نے مسخ و تحریف کے ذریعہ پیش کیا ہے، بلکہ یہ ہے کہ قرآن اور سنت رسول (دونوں) کو اسلامی قانون کا ماخذ مانتے ہیں۔

۳۔ سدِّ بابِ اجتہاد کی حقیقت

بابِ اجتہاد کیوں کر بند ہوا؟ کیا اس کی بندش، شعوری منصوبے کا ثمرہ تھی یا ذہنی انحطاط اور علمی زوال کا فطری اور منطقی نتیجہ تھی؟ اس ضمن میں بھی "مفکر قرآن" نے اصل حقیقت بیان کرنے کی بجائے، مسخ و تحریف، بلکہ اختلاق و افتراء سے کام لیا ہے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ ائمہ اربعہ کے بعد، ہر شعبۂ حیات میں، اُمت مسلمہ، اُس زوال و زبوں حالی کا شکار ہوتی چلی گئی جس کا آغاز، خلافت راشدہ کے خاتمہ کے ساتھ ہو چکا تھا۔ معاشرتی انحطاط کے ساتھ ذہنی پستی بھی چھائے چلی گئی۔ تاہم اس دورِ انحطاط میں بھی، علم حدیث اور علم فقہ میں، ایسی بلند پایہ ہستیاں پیدا ہوئیں، جن کی نظیر، دیکھنے کے لیے، آج تک چشم فلک، بے تاب ہے، لیکن اُن کے بعد، جو اخلاف صفحۂ ہستی پر نمودار ہوئے، ان میں نہ ہی اسلاف کا سا عمقِ فکر تھا، اور نہ ہی دور رس نگاہ تھی۔ وہ نہ ہی اپنی سمع و بصر کے بھرپور استعمال

---

❶ احکام القرآن، جلد: ا، صفحہ: ۲۸۔ (للشافعی، وجمعه البیهقی)

کے ذریعے، پرانی تحقیقات میں، اپنے مشاہدات و تجربات کا اضافہ کر سکے، اور نہ ہی اپنے فؤاد کی (فکری، ذہنی اور تحقیقی) صلاحیتوں سے اکتشافات کی نئی راہیں کھول سکے۔ اسلاف کی علمی و فکری تحقیقات پر، شروح و تعلیقات کے ردّے چڑھاتے رہنا ہی، اب اُن کے نزدیک ''خدمت علم'' قرار پا گیا۔ نہ سلف کا سا گہرا شعور، نہ اُن کی سی عبقری فقاہت، نہ ویسی ژرف نگاہی، نہ اُن کی سی دقیقہ رسی، نہ اُن کی سی تحقیق و جستجو، نہ اُن جیسی قوتِ استدلال اور صلاحیتِ استنباط۔ یہ تھیں وہ اصل وجوہ، جن کے باعث، اسلاف کی تقلید رواج پا گئی، اور جب کم علمی اور کوتاہ بینی کے باعث، اجتہاد ناممکن ہو گیا، تو اس کا دروازہ خود بخود بند ہو گیا، اس کی بندش کسی مفتی کے فتویٰ یا کسی مجلسِ علماء کے اجماع و اتفاق کا نتیجہ نہ تھی، (جیسا کہ ''مفکر قرآن'' نے یہ تاثر دیا ہے) بلکہ یہ علمی زبوں حالی اور نظر کی کوتاہی، کا ایک ناگزیر نتیجہ تھا۔ ایسے حالات میں، اگر اجتہاد کا دروازہ چوپٹ کھلا بھی رہتا، تو اس کا نتیجہ، اُمت مسلمہ میں موجود انتشار و تشتت کو اور بڑھا دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ دورِ انحطاط میں، اُمت کے اتحاد و یکجہتی کے پیش نظر، بعض بالغ نظر خیر خواہانِ اُمت نے، درسِ اجتہاد کی بجائے، روشِ تقلید کی تلقین کی ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال بھی، اسی مؤقف کے حامی و ہمنوا تھے، کہ صلاحیتِ اجتہاد نہ ہونے کے باعث، بابِ اجتہاد کو بند ہی رہنا چاہیے۔ اس ضمن میں، وہ اپنی تقریر استدلال یوں پیش فرماتے ہیں:

مضمحل گردد چوں تقویم حیات
ملت از تقلید می گیرد ثبات

جب زندگی کی ساخت کمزور پڑ جاتی ہے، تو اس وقت قوم، تقلید ہی سے استحکام پاتی ہے۔

راہِ آباء رو کہ ایں جمعیت است
معنیء تقلید ضبط ملت است

اپنے آباء کے راستہ پر چل کہ اسی میں جمعیت ہے، تقلید کا مطلب، ملت کو ضبط کے تحت لانا ہے۔

اے پریشاں محفلِ دیرینہ ات
مرد شمع زندگی در سینہ ات

(اے مسلمان!) تیری قدیم محفل پریشان ہو چکی، تیرے سینے کے اندر زندگی کی

شمع بجھ چکی ہے۔

نقش بر دل معنیٔ توحید کن
چارہ کارِ خود از تقلید کن

تو اپنے دل پر دوبارہ توحید کا نقش کندہ کر، اور اپنے اسلاف کی تقلید سے اپنی مشکلات کی چارہ سازی کر۔

اجتہاد اندر زمان انحطاط
قوم را برھم ھمی پیچد بساط

انحطاط کے زمانہ میں اجتہاد، قوم کا شیرازہ بکھیر دیتا ہے، اور اس کی بساط لپیٹ دیتا ہے۔

ز اجتہادِ عالمان کم نظر
اقتداء بر رفتگاں محفوظ تر

کوتاہ نظر عالموں کے اجتہاد سے، اسلاف کی پیروی، خطرات سے محفوظ تر چیز ہے۔ ❶

لیکن ''مفکر قرآن'' صاحب، جب یہ کہتے ہیں کہ تقلید، قرآن کی رُو سے بدترین جرم ہے، اور وہ جب اُمت مسلمہ کو تقلید کی زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھتے ہیں، اور پھر اپنے اضطراب وقلق کا اظہار یوں فرماتے ہیں کہ

> میں جب پاکستان کے وسیع وعریض خطہ پر نگاہ ڈالتا ہوں، تو عام طور پر یہ دیکھتا ہوں کہ
>
> ؏ نہ کہیں لذتِ کردار، نہ افکارِ عمیق
>
> اور ایک ٹھنڈی سانس سے یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا ہوں کہ
>
> ؏ آہ! محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق ❷

تو اس کا یہ معنی ہرگز نہیں ہے کہ وہ خود مقلد نہیں تھے۔ وہ مقلد تھے، اور بڑے پختہ ذہن کے جامد مقلد تھے۔ ان کی پوری عمر، تقلید ہی میں گزری ہے۔ وہ مرتے دم تک روشِ تقلید ہی پر جمے رہے ہیں۔ بس فرق صرف یہ ہے کہ وہ امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک اور امام احمد بن

---

❶ رموز بیخودی مع ترجمہ اردو از میاں عبدالرشید۔ ص ۲۷۴ تا ۲۷۷۔ ❷ سلیم کے نام، ج ۱، ص ۵۱۔

حنبل (رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) کی تقلید کی بجائے، امام چارلس ڈارون، امام کارل مارکس، امام لینن اور امام ریناں (وغیرہم علیہم ما علیہم) کی تقلید فرمایا کرتے تھے۔ اُن کے اپنے "دیدہ تر کی بے خوابیاں"، اور ان کے "دل کی پوشیدہ بے تابیاں" اور اُن کے "نالۂ نیم شب کے نیاز" اور اُن کی "خلوت و انجمن کے گداز" وقفِ راہ تقلید ہی رہے ہیں، اپنی اسی روشِ تقلید ہی کی بناء پر، مغرب کی بے حیا اور عریانیت افزاء معاشرت کے جملہ اطوار و عادات کو، اشتراکیت کے ساتھ پیوند کاری کے نتیجہ میں، اُنھوں نے، فکرِ قرآن کا چکمہ دے کر درآمد کرلیا ہے جس کے بغیر، اہل مغرب، ان امور کو عملاً اپنائے ہوئے ہیں۔

الغرض! اجتہاد کا سدِ باب، نہ تو کسی مفتی کے فتویٰ ہی کے نتیجہ میں ہوا، اور نہ ہی یہ کسی عصر و مصر کے علماءِ کرام کا کوئی اجماعی و اتفاقی فیصلہ تھا۔ اس کا واحد سبب، اُس اہلیت و صلاحیت کا فقدان تھا جو کارِ اجتہاد کو انجام دینے کے لیے ناگزیر ہے۔ جہاں کہیں یہ اہلیت و صلاحیت پائی گئی، وہاں یہ دروازہ از خود کھل گیا، اور وقت کے مسائل کا قرآن و سنت کی روشنی میں حل پیش کر دیا گیا۔ امام ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم، شیخ احمد سرہندی، مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جیسی عظیم الشان ہستیاں، اس کی واضح مثالیں ہیں۔

(۵۸) اہل حدیث پر بہتان تراشی

"مفکرِ قرآن" علماءِ اہل حدیث (اور محدثین کرام) پر یوں بہتان تراشی کرتے ہیں:

> اہل حدیث کا عقیدہ یہ تھا کہ جب قرآن اور حدیث میں تضاد پایا جائے، تو حدیث کا حکم برقرار رہے گا، کیونکہ حدیث، قرآن پر قاضی بھی ہے، اور اسے منسوخ بھی کرسکتی ہے۔ ①

میرا مطالعہ اور میرا تجربہ یہ واضح کرتا ہے کہ اگرچہ چودہ صدیوں میں، ایک سے ایک بڑھ کر گمراہ فرقے پیدا ہوئے ہیں، مگر ان فِرقِ ضالّہ میں سے، منکرین حدیث سے بڑھ کر، دروغ گو، جھوٹا، خیانت کار اور مغالطہ آرا گروہ، آج تک پیدا نہیں ہوا۔ دورانِ کذب گوئی،

---

① شاہکارِ رسالت، صفحہ: ۵۰۹۔

ان لوگوں کو کبھی خوفِ خدا یا مخلوقِ خدا سے شرم و حیا لاحق نہیں ہوتی۔ جملہ منکرین حدیث میں سے، کوئی ماں کا لعل، قیامت تک، کسی بھی اہل حدیث عالم کی، کسی بھی کتاب سے یہ عقیدہ پیش نہیں کر سکتا کہ...... ''قرآن و حدیث میں تضاد کی صورت میں حکم حدیث برقرار رہے گا'' ...... نہ اُن کا یہ عقیدہ ہے، اور نہ ہی اس کی حمایت میں، وہ یہ کہتے ہیں کہ...... ''حدیث، قرآن پر قاضی بھی ہے، اور اس کی ناسخ بھی ہے۔'' ...... ''مفکرِ قرآن'' کی یہ عادت تھی کہ وہ ایک خاص موقع و محل پر کہی ہوئی معقول بات کو بھی، اس کے سیاق و سباق اور محل و مقام سے کاٹ کر، غیر معقول معانی کا حامل بنا ڈالتے تھے، اور اپنی شاطرانہ ذہنیت کے باعث، ایک مناسب بات میں، غیر مناسب مفہوم داخل کر دیا کرتے تھے۔

علماءِ حدیث، اس کے سوا کچھ نہیں کہتے ہیں کہ، حدیث، (بشرطیکہ وہ صحیح ثابت ہو) اجمالِ قرآن کی تفصیل، بیان کرتی ہے، اور قرآن کی طرح، وہ بھی ماخذِ قانون اور سرچشمۂ احکام ہے، اور رسول کی اطاعت (یا سنت نبی کی پیروی) ہی، اتباعِ قرآن اور اطاعتِ وحی کا واحد ذریعہ ہے، تنہا قرآن کی پیروی، بغیر اطاعت رسول کے محض اتباعِ ہوا بن کر رہ جاتی ہے۔ اور امر واقعہ بھی یہی ہے، جیسا کہ خود پرویز صاحب نے بھی کبھی اس حقیقت کا بایں الفاظ، اعتراف کیا تھا:

> کتاب بلا تعمیل یہ واضح نہیں کر سکتی کہ اس کے احکام پر کس شکل اور کس نوعیت سے عمل پیرا ہونا چاہیے۔ اس کے لیے انسانوں میں سے رسول منتخب کیے گئے تا کہ وہ ان احکام پر خود عمل پیرا ہو کر، دوسروں کے لیے ایک اسوہ قائم کریں، لہٰذا حکم دیا گیا کہ رسول کی اطاعت کرو۔ مقصودِ آخری یا منتہیٰ اگرچہ اطاعت خدا ہی تھا، لیکن بجائے اس کے کہ اس اطاعت کی شکل، ہر ایک کی اپنی مرضی یا زیادہ سے زیادہ فہم و ادراک پر چھوڑا جاتا، حکم دے دیا کہ اپنی رائے کو دخل نہ دو۔ بلکہ جس طرح سے یہ رسول کر کے دکھاتا ہے یا کرنے کا حکم دیتا ہے، اس کے مطابق کرتے جاؤ۔ یہی اطاعت خدا ہو جائے گی۔

جس نے رسول کا حکم مانا، اُس نے گویا خدا کی اطاعت کی۔ ❶	﴿مَنۡ يُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ﴾

اسی مقالہ میں، آگے چل کر، پرویز صاحب رقمطراز ہیں

> اصل یہ ہے کہ رسول کا اتباع ہی قرآن کا اتباع ہے، کیونکہ رسول کو خود حکم دیا گیا ہے کہ:

جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر وحی کی جاتی ہے، اس کا اتباع کرو۔	﴿اِتَّبِعۡ مَاۤ يُوۡحٰۤى اِلَيۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ ۚ﴾

> لہٰذا ان احکام کی موجودگی میں اب یہ کسی کی اپنی مرضی ومنشا کے ماتحت نہ رہا کہ جس طرح جی چاہے، قرآن کا اتباع کرلے، بلکہ قرآن کا اتباع ہو ہی اس شکل میں سکتا ہے، جس میں رسول نے کیا یا کرنے کا حکم دیا۔ ❷

متحدہ ہندوستان میں پرویز صاحب کا یہ موقف ومسلک، علماءِ حدیث کے عقیدہ سے سرمو بھی کوئی فرق نہیں رکھتا، لیکن جب قیامِ پاکستان کے بعد، ''مفکرِ قرآن'' کا اپنا ذہن پلٹا، اور اُن کے دماغ نے زقندِ معکوس لگائی، تو اب، اتباعِ قرآن کا ذریعہ، اطاعتِ رسول نہ رہا، بلکہ اطاعتِ رسول کا ذریعہ اتباعِ قرآن قرار پاگیا۔ (اور پھر یہ ''اتباعِ قرآن'' بھی محض زبانی کلامی حد تک ہی محدود رہا، ورنہ عملاً ''اتباعِ قرآن'' درحقیقت، اُس مفہوم کا اتباع قرار پایا، جسے ''مفکرِ قرآن'' نے (یا کسی اور صاحب نے) منسوب الی القرآن کرڈالا۔ اب اس منکوس ذہنیت اور معکوس فکر کے تحت، اُنھوں نے یہ راگ الاپنا شروع کردیا، کہ کتاب وسنت، دو الگ الگ ماخذِ قانون نہیں ہیں، بلکہ ایک ہی چیز ہے جسے کتاب وسنت کہا جاتا ہے اور اس سے مراد، صرف اور صرف قرآن ہے۔

> کتاب وسنت سے مراد، اللہ کی کتاب ہے جس کی اتباع رسول اللہ ﷺ نے

---

❶ معارف، اپریل ۱۹۳۵ء، صفحہ: ۲۸۰ تا ۲۸۱۔

❷ معارف، اپریل ۱۹۳۵ء، صفحہ: ۲۸۲۔

فرمائی۔ ❶

حالانکہ اس سے قبل، وہ قرآن وسنت یا کتاب واسوۂ رسول کو الگ الگ ماخذ قانون قرار دیا کرتے تھے۔

> ۱ ...... اپنے ماحول کو مدنظر رکھ کر، قرآن واسوۂ حسنہ کی روشنی میں جو مسائل، اُنھوں (سلف) نے مستنبط کیے تھے آج کے ماحول کے مطابق ویسے ہی دساتیرو قوانین، آج بھی مرتب کیے جاسکتے ہیں۔ ❷
>
> ۲ ...... دین کی بناء قرآنِ کریم اور آنحضرت ﷺ کے اسوۂ حسنہ پر تھی جیسے آپ کو کرتے دیکھتے یا حکم پاتے، اس کے مطابق عمل کرتے۔ ❸

۱۹۴۰ء میں، وہ، ''اہل قرآن'' کو، اسوۂ حسنہ سے وابستہ نہ ہونے کی بناء پر، بعید از قرآن قرار دیا کرتے تھے، اور انھیں یہ وعظ فرمایا کرتے تھے، کہ قرآن کو اسوۂ حسنہ کی روشنی میں سمجھیے۔

> جو اہل قرآن ہونے کے مدعی ہیں، وہ قرآن ورسول کے باہمی تعلق سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے، قرآن سے بہت دُور جا پڑے ہیں۔ لہٰذا تمسک بالکتاب، کسی گروہ بندی سے حاصل نہیں ہوگا۔ اس کے لیے تو ضرورت ہے کہ تمام انسانی مرکزوں سے منہ موڑ کر، احکام قرآنی کو، اسوۂ حسنہ کی روشنی میں دیکھتے ہوئے واجب الاتباع سمجھا جائے اور ہر رسم وروایت، جو اس کے خلاف نظر آئے، اسے ردّ کردیا جائے۔ ❹

لیکن قیامِ پاکستان کے بعد، ذہنِ پرویز نے جو پلٹا کھایا، تو اسوۂ حسنہ، محدود فی القرآن ہوگیا، اور اگر، کہیں قرآن سے باہر اسوۂ حسنہ موجود بھی ہو، تو انسانیت کے لیے وہ مشعل راہ نہیں ہے۔ چنانچہ اب یہ اعلان کیا جانے لگا کہ

---

❶ طلوع اسلام، مارچ ۱۹۵۱ء، صفحہ: ۱۶۔

❷ طلوع اسلام، جنوری ۱۹۴۰ء، صفحہ: ۲۴۔

❸ طلوع اسلام، مئی ۱۹۴۰ء، صفحہ: ۵۸۔

❹ طلوع اسلام، جنوری ۱۹۴۰ء، صفحہ: ۲۵ تا ۲۶۔

۱ ...... تعمیرِ سیرت کے لیے، قرآنی تعلیم کو دل کی گہرائیوں میں اتارا جائے، اور رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو جسے قرآن نے بیان کیا ہے، شمع راہ بنایا جائے۔ ①

۲ ...... سیرتِ محمدیہ کے جو گوشے قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ ان کی صداقت میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس کے باہر جو کچھ ہے، اس کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار، قرآنِ کریم ہے۔ جو اس کے مطابق ہے، وہ صحیح ہے، جو اس کے خلاف ہے، وہ غلط ہے۔ ②

قیامِ پاکستان سے قبل، عقیدۂ پرویز یہ تھا کہ ”قرآن بھی محفوظ ہے، اور نقوشِ نبی بھی محفوظ ہیں:

> حضورؐ، خاتم النبیین ہو کر تشریف لائے، اور اس مقصدِ رسالت کو اس انداز سے پورا کیا کہ آپ کے بعد، نہ کسی اور پیغام کی ضرورت باقی رہی، اور نہ ہی اس پیغام پر کسی نئے عمل کر کے دکھانے والے کی، کہ یہ پیغام ازلی، یہ صوتِ سرمدی، قرآن کی دفتین میں محفوظ ومصئون چلا آتا ہے کہ باطل اس کے پاس تک بھی نہیں پھٹک سکتا۔ اور اس پیغام پر عمل، ان نقوشِ قدم کے ذرّے ذرّے سے آفتاب کی طرح روشن اور زندہ ہے، جن نقوشِ سے صراطِ مستقیم کے نشان، ادھر اُدھر تک سیدھے ملتے چلے جاتے ہیں۔
>
> ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ط﴾ ③

لیکن قیامِ پاکستان کے معرضِ وجود میں، آتے ہی، قرآنی پیغام پر جو عمل، ”حضور ﷺ کے ”نقوشِ قدم کے ذرّے ذرّے سے آفتاب کی طرح روشن اور زندہ“ تھا، وہ نہ تو شمع راہ ہی رہا اور نہ محفوظ ومصئون ہی رہا۔

الغرض، پاکستان میں جب ”مفکرِ قرآن“ کی فکر ونظر کا قبلہ تبدیل ہوا، اور، حدیث،

---

① طلوعِ اسلام، جون ۱۹۵۶ء، صفحہ: ۷۰۔

② طلوعِ اسلام، اگست، ۱۹۶۱ء، صفحہ: ۱۱۔

③ طلوعِ اسلام، مارچ ۱۹۴۰ء، صفحہ: ۳۲۔

سنت، اسوۂ حسنہ اور اطاعت رسول۔ سب کا مفہوم بدل گیا، تو انھیں، ہر وہ چیز، جو مغرب کے معاشرتی اور اشتراکیت کے معاشی نظام کے خلاف محسوس ہوئی، پھر وہ اُسے ''عجمی اسلام'' کے نام پر مطعون کرنے لگے۔ قرآن و سنت پر مبنی اسلام کو، مطعون و مجروح کرنے کے لیے، حکمت عملی یہ اپنائی کہ اسے ''ملا کا اسلام'' قرار دے کر، نشانہ بنایا جائے۔ اس ضرورت کے پیش نظر عیسائیت، یہودیت اور ہندومت کے ہاں سے ''پریسٹ ہڈ'' کا تصور لے کر، اسے ''ملاازم'' اور ''مذہبی پیشوائیت'' کے خودتراشیدہ لیبل کے تحت، علماء، فقہاء اور محدثین کی تحقیر و توہین اور تذلیل و تضلیل کی مہم چلائی گئی۔ یوں علماءِ حدیث کے خلاف، جنھیں سابقہ ادوار میں، محدثین یا اہل حدیث (بمقابلہ اہل فقہ) کہا جاتا تھا، ''مفکر قرآن'' نے تبراء بازی اور دشنام طرازی کو اپنا وظیفۂ حیات بنا ڈالا۔ اس مبحث کی ابتداء میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ ''مفکر قرآن'' کی اسی تبدیل شدہ ذہنیت کا کرشمہ ہے، ورنہ ہندوستان میں، جو کچھ کہہ رہے تھے، وہ نہ صرف علماءِ حدیث بلکہ علماء فقہ کی حمایت و ہمنوائی پر مبنی تھا، ''مفکر قرآن'' چاہتے تھے کہ ان کے بدلنے سے زمین و آسمان کیا، بلکہ کائنات کی ہر چیز کو بدل جانا چاہیے لیکن جب علماء حدیث، پرویز صاحب کے ساتھ قلابازی نہ لگا پائے، تو وہ ان کے خلاف پھٹ پڑے۔

(۵۹) اہل فقہ پر بہتان تراشی

گذشتہ مبحث کے آغاز میں، پرویز صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے، اُس کے بعد، وہ لکھتے ہیں:

> یہی عقیدہ، (کہ حدیث و فقہ کے مقابل، قرآن مرجوح ہے۔ قاسمی) اہل فقہ نے بھی اختیار کرلیا۔ چنانچہ فقہ حنفی کے ایک مسلّم امام ابوالحسن عبیداللہ الکرخی کا قول ہے کہ:
>
> > ہر وہ آیت جو اس مسلک کے خلاف ہو، جس پر ہمارے اصحاب ہیں، وہ یا تو مؤوّل ہے اور یا منسوخ۔ اور اس طرح جو حدیث اس قسم کی ہو، وہ مؤوّل یا منسوخ ہے۔ (تاریخ فقہ اسلامی، صفحہ: ۴۲۱)
>
> یعنی اگر قرآن کے کسی حکم اور فقہ کے کسی فیصلہ میں اختلاف نظر آئے تو پہلے یہ کوشش کرنی چاہیے کہ قرآنی آیت کی اس طرح تاویل کی جائے کہ اس کا مفہوم

> فقہ کے مطابق ہو جائے، اور اگر ایسا کسی طرح بھی ممکن نہ ہو، تو پھر سمجھ لینا چاہیے کہ وہ آیت منسوخ ہے۔ اہل حدیث چونکہ کسی حدیث کو (جو ان کے ہاں صحیح قرار دی گئی ہو) منسوخ نہیں تسلیم کرتے، اس لیے اس نکتہ پر اہل حدیث اور اہل فقہ میں باہمی بحث و نزاع ہوتی ہے۔ جہاں تک قرآنی احکام کے منسوخ ہو جانے کا تعلق ہے، اس میں دونوں متفق ہوتے ہیں۔ ①

یہ اقتباس بھی مغالطہ آرائی اور کذب وزُور پر مشتمل ہے۔

جہاں تک مغالطہ آرائی کا تعلق ہے، وہ لفظ ''منسوخ'' کی آڑ میں کی گئی ہے، اور اسی کی بنیاد پر، امام کرخی کی عبارت کو غلط مفہوم دیا گیا ہے۔ دورِ ماضی میں، احناف کے ہاں، ''منسوخ'' کا لفظ، اس معنی میں استعمال نہیں ہوا کرتا تھا، جس میں آج ''مفکر قرآن'' نے استعمال کیا ہے۔ ادوارِ گذشتہ میں، یہ لفظ، قرآن کے کسی حکم عام کو مخصوص کر دینے کے معنی میں مستعمل تھا، یا کسی ایسے مدعا کو بیان کرنے کے لیے مستعمل تھا جو الفاظ سے ظاہر نہ ہوتا ہو۔ سنت کی آئینی حیثیت پر مراسلت کے دوران، جب یکے از منکرین حدیث، ڈاکٹر عبدالودود نے یہی اعتراض اُٹھایا، تو مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے جواباً یہ تحریر فرمایا کہ

> یہ بات، آپ نے ایک غلط فہمی کے تحت لکھی ہے جسے صاف کرنا ضروری ہے۔ فقہاء حنفیہ جس چیز کو ''نسخ الکتاب بالسنۃ'' کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں، اس سے مراد، دراصل، قرآن کے کسی حکم عام کو مخصوص (Qualify) کرنا، اور اس کے ایسے مدعا کو بیان (Explain) کرنا ہے جو اس کے الفاظ سے ظاہر نہ ہوتا ہو۔ مثلاً سورۃ البقرہ میں، والدین اور اقربین کے لیے وصیت کا حکم دیا گیا تھا۔ پھر سورۃ النساء میں تقسیم میراث کے احکام نازل ہوئے، اور فرمایا گیا کہ یہ حصے، متوفی کی وصیت پوری کرنے کے بعد نکالے جائیں۔ نبی ﷺ نے اس کی وضاحت یہ فرمادی کہ: ((لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ .)) یعنی اب وصیت کے ذریعہ

---

① شاہکار رسالت، صفحہ: ۵۰۹ تا ۵۱۰۔

> سے کسی وارث کے حصے میں کمی بیشی نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ قرآن میں، اللہ تعالیٰ نے وارثوں کے حصے خود مقرر کر دیئے ہیں۔ ان حصوں میں اگر کوئی شخص، وصیت کے ذریعہ سے کمی بیشی کرے گا تو قرآن کی خلاف ورزی کرے گا۔ اس طرح، اس سنت نے وصیت کی عام اجازت کو، جو بظاہر قرآن کی ان آیتوں سے مترشح ہوتی تھی، غیر وارث مستحقین کے لیے خاص کر دیا، اور یہ بتا دیا کہ شرعاً جو حصے وارثوں کے لیے مقرر کر دیئے گئے ہیں، ان میں کمی بیشی کرنے کے لیے وصیت کی اس عام اجازت سے فائدہ نہیں اُٹھایا جا سکتا۔ اسی طرح، قرآن کی آیت وضو (المائدۃ:۱۱) میں پاؤں دھونے کا حکم دیا گیا تھا، جس میں کسی حالت کی تخصیص نہ تھی۔ نبی ﷺ نے مسح علی الخفین پر عمل کر کے اور اس کی اجازت دے کر، یہ واضح فرما دیا کہ یہ حکم، اس حالت کے لیے ہے جب کہ آدمی موزے پہنے ہوئے نہ ہو، اور موزے پہننے کی صورت میں پاؤں دھونے کی بجائے مسح کرنے سے حکم کا منشا پورا ہو جاتا ہے۔ اس چیز کو خواہ نسخ کہا جائے، یا تخصیص یا بیان۔ اس سے مراد، یہی ہے، اور یہ اپنی جگہ بالکل صحیح اور معقول چیز ہے۔ اس پر اعتراض کرنے کا آخر ان لوگوں کو کیا حق پہنچتا ہے جو غیر نبی ہونے کے باوجود، قرآن کے بعض صریح احکام کو، محض اپنے ذاتی نظریات کی بنیاد پر، ''عبوری دور کے احکام'' قرار دیتے ہیں، جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ عبوری دور، جب ان کی رائے نامبارک میں گزر جائے گا تو قرآن کے وہ احکام منسوخ ہو جائیں گے۔ ①

منکرین حدیث کے سرخیل، چوہدری غلام احمد پرویز صاحب، دراصل، نبی علیہ الصلاۃ والسلام کے مقابلہ میں خم ٹھونک کر سامنے آ گئے ہیں، اُن کو حضور اکرم ﷺ یا اُن کی سنت سے اس قدر بغض وعناد ہے کہ وہ پیغمبر خدا یا ان کی سنت کو یہ اختیار دینے کے لیے ہرگز آمادہ نہیں ہیں کہ وہ قرآن کے کسی حکم عام کی تخصیص کریں، حالانکہ حضور اکرم ﷺ مامور من اللہ ہستی تھے، لیکن

---

① سنت کی آئینی حیثیت، صفحہ:۵۶ تا ۵۷۔

خود اپنے لیے ''مفکرِ قرآن'' صاحب، نہ صرف یہ کہ ایسے اختیارات کے قائل تھے بلکہ حسب خواہش انھیں استعمال بھی کر ڈالتے تھے۔ مثلاً قرآنِ کریم، جرمِ سرقہ کی سزا، قطع ید بیان کرتا ہے، اور ہمارے ''مفکرِ قرآن'' صاحب، قرآنِ مجید کے اس حکم عام کی دو پہلوؤں سے تخصیص کرتے ہیں۔ اوّلاً: اس پہلو سے کہ وہ قرآن کی طے کردہ اس سزا کو، جو واحد سزائے سرقہ (The Only Punishment) ہے، انتہائی سزا (The Maximum Punishment) قرار دیتے ہیں، اور اس کی توجیہہ بایں الفاظ کرتے ہیں۔

> اگر یہ دیکھو کہ پانی سر سے گزر چکا ہے، اور یہ جرم عام ہو رہا ہے تو اس کی انتہائی سزا یہ بھی ہو سکتی ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ ①

اور دوسرے پہلو سے سزائے سرقہ کی تخصیص، یوں کرتے ہیں کہ اسے مطلق چور کی بجائے، ''عادی چور'' کی سزا قرار دیتے ہیں۔

> قطع ید کی سزا، عادی مجرموں کے لیے ہے۔ ②

الغرض، منکرین حدیث، نہ تو نبی ﷺ کو، اور نہ ہی آپؐ کی سنت کو یہ اختیار دیتے ہیں کہ وہ قرآن کے حکم عام کو مخصوص کر دیں، لیکن ''مفکرِ قرآن'' صاحب، جہاں چاہتے ہیں، قرآن کے حکم عام کو مخصوص کر ڈالتے ہیں۔

بہرحال، اگر ماضی کے فقہاءِ حنفیہ کے تخصیص العام کے عمل کو، آج کے نسخ کے مفہوم میں لے کر، معرضِ اعتراض میں رکھا جا سکتا ہے، تو ''مفکرِ قرآن'' کا اپنا عمل بھی، اعتراض کی زد میں آئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اب رہا ''مفکرِ قرآن'' کا یہ کہنا کہ...... ''چونکہ اہل حدیث، کسی حدیث کو (جو ان کے نزدیک صحیح قرار دی گئی ہو) منسوخ تسلیم نہیں کرتے، اس لیے اس نکتہ پر، اہل حدیث اور اہل فقہ میں باہمی بحث و نزاع ہوتی ہے۔''...... تو یہ ایسا کذبِ صریح ہے جس میں سچائی کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ اہل حدیث، نسخِ حدیثِ صحیح کے بھی قائل ہیں، اور اس کا ثبوت، اس حدیث

---

① قرآنی قوانین، صفحہ: ۱۱۸۔

② طلوعِ اسلام، مارچ ۱۹۷۹ء، صفحہ: ۶۔

سے بھی ملتا ہے، جس میں حضورِ اکرم ﷺ نے اپنے اس حکم کو منسوخ فرما دیا، جس میں ابتداءً آپ ﷺ نے زیارتِ قبور سے منع فرما دیا تھا۔ ایک اہل حدیث عالم، مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ، اپنی ایک کتاب میں، اسی حدیث کو پیش فرماتے ہیں:

> ((عن ابن مسعود ان رسول اللہ ﷺ قال کنت نھیتکم عن زیارۃ القبور فزوروھا فانھا تزھد فی الدنیا وتذکر الآخرۃ .))
>
> [ابن ماجۃ۔ مسلم، ابو داؤد۔ ابن حبان۔ حاکم۔ ترمذی]
>
> آنحضرت ﷺ نے فرمایا: میں نے تمہیں قبروں کی زیارت سے روکا تھا۔ اب ان کی زیارت کرو، اس سے دنیا کی رغبت کم ہوتی ہے، اور آخرت یاد آتی ہے۔ ❶

یہ حدیث، جسے ایک اہل حدیث عالم دین ہی کی کتاب سے پیش کیا گیا ہے، اس امر کو واضح کر دیتی ہے کہ یہ لوگ، صحیح حدیث کو منسوخ ماننے میں تامل نہیں کرتے، اور "مفکر قرآن" اپنی خوئے دروغ گوئی کی بناء پر مجبور تھے کہ ان پر بہتان تراشی کر ڈالیں۔

پھر آخر میں، ان کا یہ کہنا کہ ...... "جہاں تک قرآنی احکام کے منسوخ ہو جانے کا تعلق ہے، اس میں دونوں (یعنی اہل فقہ بھی اور اہل حدیث بھی۔ قاسمی) متفق ہیں۔" ...... ایک ادھوری حقیقت کا اعتراف ہے۔ دونوں ہی نہیں بلکہ تینوں ہی متفق ہیں، اور تیسرا فریق، خود "مفکر قرآن" صاحب ہیں، جو اگرچہ "نسخ" کو مانتے ہیں، مگر نسخ کے لفظ کے ساتھ نہیں، بلکہ "عبوری دور کے احکام" کے لیبل کے ساتھ۔ تاکہ "نسخ" کی آڑ میں، علماءِ کرام کو نشانہ بنایا جائے، اور عیارانہ وشاطرانہ چال چلتے ہوئے، نسخ ہی کی حقیقت کو، "عبوری دور کے احکام" کہہ کر تسلیم بھی کر لیا جائے۔ اور یہ رویہ، اپنے غلط مؤقف کے ساتھ بددیانتی کو بھی جمع کر لینے کے مترادف ہے۔

(۶۰) نظامِ سرمایہ داری کا احیاء

اس کے بعد، "مفکر قرآن" صاحب یہ واضح کرنے کے لیے، کہ نظامِ سرمایہ داری کا

---

❶ تحریک آزادیٔ فکر، صفحہ: ۳۶۴۔

احیاء، کب اور کیسے ہوا؟ یہ فرماتے ہیں کہ یہ سب کچھ روایات کے ذریعہ، عباسی دور میں ہوا۔ چنانچہ وہ ''نظامِ سرمایہ داری کا احیاء'' کے زیرِ عنوان لکھتے ہیں:

> ہم سرِدست اس اصولی نکتہ تک محدود رہنا چاہتے ہیں کہ قرآن کی بجائے روایات کو، دین میں سند قرار دینے کے بعد، ایسا کرنا کچھ بھی مشکل نہ تھا۔ (جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے۔) یہ روایات، عہدِ عباسی میں وضع اور مرتب ہوئی تھیں، جب سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام، مملکت پر مسلط ہو چکا تھا، اسے اسلامی قرار دینے کے لیے، روایات وضع کی گئیں، جن میں سے کچھ کتبِ حدیث میں جمع ہوگئیں اور کچھ کتبِ تاریخ میں۔ انہی روایات پر مبنی فقہ مرتب کی گئی۔ لہٰذا، نظامِ سرمایہ داری، حدیث اور فقہ دونوں کی رُو سے عین اسلامی بنادیا گیا۔ ❶

مسخِ حقائق، تحریفِ واقعات اور تقلیبِ امور میں، ہمارے ''مفکرِ قرآن'' صاحب، لاثانی شخصیت تھے۔ مغالطہ آرائی میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔ حقائق کی غلط تعبیر کے ذریعہ، قلوب واذہان میں انحراف پیدا کرڈالنا، اُن کی خاص ٹیکنیک تھی۔ اب یہاں غور فرمایئے تو سوءِ تعبیر کے ذریعہ، جو دجل اور فریب کیا گیا ہے، اس کا پردہ چاک ہوجاتا ہے۔

علماءِ کرام، جس چیز کو سند اور حجت قرار دیتے ہیں، وہ نفسِ حدیث وسنت ہے (نہ کہ کتبِ روایات)۔ اب ''مفکرِ قرآن'' خود فرماتے ہیں کہ روایات، عہدِ عباسی میں ''وضع'' اور مرتب ہوئی تھیں، لیکن نفسِ حدیث وسنت کو، سند وحجت مانتے ہوئے، ان کا اتباع عہدِ نبوی اور خلافتِ راشدہ، اور ادوارِ مابعد میں بھی ہوتا رہا ہے، قطع نظر اس کے کہ جس حدیث وسنت کی پیروی کی جارہی تھی، وہ قرآن کے مجمل حکم کی تفصیل وتشریح کرتی ہے یا قرآن سے زائد کوئی ایسا حکم دیتی ہے، جس پر قرآن خاموش ہے۔ صحابہ کرام کے فرداً فرداً، اتباعِ حدیث وسنن کو بیان کرنے کی بجائے، چند اصحابؓ رسولؐ کے اتباعِ سنن واحادیث پر اکتفاء کیا جاتا ہے، اگرچہ اس سے قبل، چاروں خلفاءِ راشدین کا عمل، مذکور ہوچکا ہے۔ صحابہ کرام میں سب سے

---

❶ شاہکارِ رسالت، صفحہ: ۵۱۱۔

بلند پایہ شخصیت، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، اتباع حدیث اور تمسک بالسنہ کی بابت، اُن کے چند واقعات ملاحظہ فرمائیے۔ اور یہ واقعات بھی طلوع اسلام ہی کے لٹریچر سے پیش کیے جا رہے ہیں۔

۱ .... حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس، ایک عورت آئی جو اپنے پوتے کے ترکہ میں سے حصہ مانگتی تھی۔ انھوں نے فرمایا کہ میں کتاب اللہ میں تیرا حصہ نہیں پاتا۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے دادی کو سدس دلوایا ہے۔ فرمایا، کوئی تمھارے اس قول پر شاہد ہے؟ محمد بن مسلمہ نے کہا کہ میں شہادت دیتا ہوں۔ اس وقت اس کو ایک سدس دلوا دیا۔ ❶

غور فرمائیے، میراث جدہ میں، خلیفہ اوّلؓ، حضور ﷺ کے ایک ایسے مسنون فیصلہ کی اتباع کر رہے ہیں، جو بقول اُن کے قرآن میں موجود نہیں ہے، بلکہ زائد از قرآن ہے، لیکن منکرین حدیث، ایسے ''زائد از قرآن'' فیصلوں کو ''خلاف قرآن'' کہہ کر حدیث وسنت کو ردّ کر دیا کرتے ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ایسے امور و معاملات میں بھی، قضایاءِ رسولؐ کے پابند تھے جو دینی اہمیت کے لحاظ سے شاید آخری درجے کے مسائل ہوں۔ آخر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ امیر عساکر زید ہو یا بکر۔ اہمیت وفضیلت تو نفس جہاد کی ہے، نہ کہ اس امر کی کہ سالارِ فوج کون ہے، لیکن چونکہ فیصلہ، اُس رسولؐ کا تھا جس کی اطاعت، عین اطاعت خدا تھی، اور جس کی زندگی اہل ایمان کے لیے اسوۂ حسنہ تھی، اس لیے خلیفۂ اول نے قضیۂ رسولؐ پر عمل پیرا ہونا اور عمل درآمد کروانا ضروری اور لازم سمجھا، یہاں تک کہ وہ لوگ بھی شرح صدر پا گئے جو اس معاملہ میں اختلاف کر رہے تھے۔

حضرت اُسامہؓ، زید بن حارثہ کے بیٹے تھے، جو آنحضرتؐ کے مشہور غلام تھے، علاوہ بریں، نوعمر نوجوان تھے۔ ان کا سن، اس وقت سترہ سال کا تھا۔ انصار کی

---

❶ طلوع اسلام، نومبر ۱۹۵۰ء، صفحہ: ۶۳۔

> طرف سے حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ اگر آپ لشکر بھیجتے ہی ہیں تو کسی شریف النسل اور سن رسیدہ شخص کو، اس کا امیر مقرر فرمایئے، یہ سن کر، حضرت ابوبکر غصہ سے بے تاب ہو گئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی داڑھی پکڑ کر کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے اُسامہ کو سردار مقرر کیا ہے، میں ان کو برطرف کر دوں؟ ❶

اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عمل بالحدیث بھی ملاحظہ فرمایئے۔ اس سے قبل (گزشتہ صفحات میں) یہ بات گزر چکی ہے کہ وہ قرآن کے بعد، جس چیز پر اپنے فیصلوں کی بنیاد رکھا کرتے تھے، وہ سنت رسول تھی، بلکہ سنت ابی بکر رضی اللہ عنہ بھی۔

> اُن کے بعد، عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو کچھ لوگ، ان سے ناراض تھے اور کچھ راضی۔ لیکن جب وہ دنیا سے رُخصت ہوئے تو جو پہلے ناراض تھے وہ بھی ان سے راضی تھے۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے ساتھی (حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ) کے نقشِ قدم پر معاملات کو سنوارا۔ وہ ان دونوں کا اس طرح اتباع کرتے تھے جیسے بچہ اپنی ماں کا۔ ❷

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک، کسی کام کو کر ڈالنے کی وجہ اور علت، بس یہی کافی تھی کہ حضورِ اکرم ﷺ نے وہ عمل کیا ہے، خواہ وہ اپنے اندر نفع وضرر کا کوئی پہلو رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔ حجرِ اسود کو بوسہ دینے میں، اطاعت رسول کا یہی جذبہ کارفرما تھا۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

> میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے، نہ نفع دے سکتا ہے، اور نہ نقصان۔ واللہ! اگر میں رسول اللہ ﷺ کو بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھتا تو میں تجھے کبھی بوسہ نہ دیتا۔ ❸

"مفکرِ قرآن"ـــ "مزاج شناسِ رسولؐ" بھی اور "مزاج شناسِ عمرؓ" بھی خواہ کوئی بات کتنی ہی ثقہ اور ثابت شدہ ہو، لیکن اگر وہ ہمارے "مفکرِ قرآن" کے "گمانِ مبارک" سے متصادم ہو، تو محض اسی بناء پر، اُس کا ردّ کر ڈالنا، اُن پر لازم ہو جاتا ہے۔

---

❶ تاریخ الامت، جلد: ۲، صفحہ: ۴۴۔

❷ شاہکارِ رسالت، صفحہ: ۴۲۵۔

❸ شاہکارِ رسالت، صفحہ: ۸۱۔

چنانچہ تقبیلِ حجرِ اسود کے ضمن میں، اقتباس بالا کے ساتھ ہی، اپنا ''خیال'' بایں الفاظ پیش کرتے ہیں:

> ہمارے خیال میں، اس روایت کا آخری حصہ وضعی ہے، اور بعد کا اضافہ۔ رسول اللہ، اس پتھر کو چومتے نہیں ہوں گے۔ نہ ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایسا کیا ہوگا۔ ❶

یہ ہے ہمارے ''مفکرِ قرآن'' کی ''مزاج شناسیٔ رسولؐ'' اور ''مزاج شناسیٔ عمرؓ''۔ آخر کیوں نہ حجرِ اسود کو چومتے ہوں گے؟

> اس لیے کہ کسی پتھر کو چومنے سے، اس کی تقدیس (مقدس ہونے) کا تصور اُبھرتا ہے، اور یہ چیز، توحید کی تعلیم کے منافی ہے، جسے قرآن نے پیش کیا ہے۔ ❷

اب اس ''مزاج شناسِ رسول'' سے یہ بات کون پوچھے کہ اگر تقبیلِ حجرِ اسود سے تقدیس لازم آتی ہے تو بیت اللہ کے طواف اور صفا و مروہ کی سعی سے یہ تقدیس کیوں نہیں پیدا ہوتی؟ پھر ہر باپ کا اپنے بچوں کو چومنا، اور خود حضورِ اکرم ﷺ کا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ماتھے کو بوسہ دینا بھی کیوں تقدیس کا ذریعہ نہیں؟ اپنے آپ کو، خدا کے رسول سے بھی بڑھ کر توحید کا علمبردار سمجھنا، ''مفکرِ قرآن'' کے قلبی روگ کا آئینہ دار ہے۔ اور ''مفکرِ قرآن'' کا اصلی روگ ہے بھی یہی کہ وہ ہر دینی عمل اور اسلامی قدر کو اپنے اُن گمانات و خیالات کے ترازو میں تولتے ہیں، جو فضائے دماغی میں اُٹھنے والی ہر لہر کے ساتھ، بدل جاتے ہیں، اور یوں اُن کا موقف، اللہ، رسولؐ اور صحابہؓ کے موقف سے ٹکراتا رہتا ہے، اور اس کے ساتھ ہی، ان کے تضادات کے بینک بیلنس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

قرآنی توحید اور ''مفکرِ قرآن'' کی توحید

اب اگر بوسہ دینا، حجرِ اسود کی تقدیس کا ذریعہ بنتا ہے، تو یہ محض ''مفکرِ قرآن'' کا ذاتی گمان اور شخصی خیال ہے، کسی قرآنی نص پر مبنی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ پھر اپنے اس گمان و خیال کو معیارِ حق قرار دے کر، ایک ایسی ٹھوس اور ثابت شدہ حقیقت سے انکار کرنا، جس کا تحقق،

---

❶ شاہکارِ رسالت، ص ۸۱۔

❷ شاہکارِ رسالت، ص ۸۱۔

ہستی رسولؐ اور ذاتِ صحابیؓ کے عمل سے ہوا ہے، خود کو ان ہستیوں پر مقدم رکھنے کے مترادف ہے، جس کا صدور کسی مسلمان سے ممکن نہیں ہے۔

مزید برآں، اگر تقبیلِ حجرِ اسود سے، تقدّس کا تصور ابھرتا بھی ہو، تو اس کے منافی توحید ہونے کی ''قرآنی دلیل'' کیا ہے؟ کیا یہ اللہ کا فرمان ہے؟ کیا اُس کے نبیؐ نے ایسا کہا ہے؟ اب کیا منکرینِ حدیث کے ہاں، ''مفکرِ قرآن'' کا خیال بھی حجت وسند قرار پا گیا ہے؟

''مفکرِ قرآن'' کے متعلق، اُن کے اندھے مقلدین، یہ ڈھنڈورہ بھی پیٹا کرتے ہیں کہ:۔

۱ …… اس مفکر نے اپنی ساری زندگی، اس کتاب کے حقائق و معارف کے افہام و تفہیم میں صرف کر دی ہے۔ ❶

۲ …… یہ ہے وہ ذکر للعالمین، جس کے مفہوم مبین پر مذہبی پیشوائیت نے دبیز پردے ڈال رکھے تھے اور جناب پرویز صاحب، اپنی جراَت ایمانی اور بصیرتِ فرقانی سے، اسے ان پردوں سے باہر نکال لائے۔ ❷

۳ …… جو تہجد کی تنہائیوں میں، قرآن کے گرد آلود غلاف کو صاف کیا کرتا تھا۔ ❸

۴ …… بابا جی کہ جو غلام احمد پرویز تھے، کی زندگی کے وہ حاصل حیات پچاس سال، جو اُنھوں نے قرآن کو خالصتاً قرآن کے ذریعہ سمجھنے اور سمجھانے میں بسر کیے، روشنی کی ایک واضح لکیر کی صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ❹

چھوڑیئے اس بات کو کہ ''مفکرِ قرآن'' نے قرآن کو، قرآن کی روشنی میں سمجھا اور پیش کیا ہے، یا مغربی معاشرت اور اشتراکی معیشت کی روشنی میں۔ اسے بھی نظر انداز کیجیے کہ انھوں نے قرآن پر، مذہبی پیشوائیت کے ڈالے ہوئے پردوں کو دور کیا ہے یا یورپ کی بے حیا معاشرت، اُس کے فاسد تمدن اور اشتراکیت کی قاہرانہ اور جابرانہ آمریت کے دبیز پردے، قرآن پر ڈالے ہیں، اور اس سے بھی چشم پوشی کیجیے کہ تہجد کی تنہائیوں میں، بہترین عمل،

---

❶ طلوعِ اسلام، اکتوبر ۱۹۷۷ء، صفحہ: ۱۷۔

❷ طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۷۸ء، صفحہ: ۲۰۔

❸ طلوعِ اسلام، اپریل ۱۹۸۵ء، صفحہ: ۲۳۔

❹ طلوعِ اسلام، اپریل ۱۹۸۵ء، صفحہ: ۳۳۔

خدائے قدوس کے حضور قیام کرتے ہوئے، یَتْلُوْنَ اٰیٰتِ اللّٰہِ اٰنَآءَ الَّیْلِ وَھُمْ یَسْجُدُوْنَ کا مصداق بنتا ہے، یا گردو غبار سے اٹے ہوئے قرآن کے غلاف کو صاف کرنا ہے، (جب کہ قرآن کا گردو غبار سے اٹا ہوا ہونا، خود اس بات کی دلیل ہے کہ نہ اُسے کبھی کھولا گیا اور نہ ہی پڑھا گیا)۔ فی الحال تو آپ اس بات پر غور فرمایئے کہ اگر واقعی ’’مفکر قرآن‘‘ نے کبھی قرآن کو کھولا اور پڑھا ہوتا، تو انھیں معلوم ہوتا کہ قرآنِ کریم، ایک پتھر تو رہا ایک طرف، وہ تو پہاڑی سلسلے کی ایک پوری وادی کو مقدس قرار دیتا ہے۔

﴿ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝﴾ [طٰہٰ: ١٢]

’’(اے موسیٰ!) اپنے جوتے اتار دیجیے، آپ ایک مقدس وادی طویٰ میں ہیں۔‘‘

اور فقط ایک وادی ہی نہیں، بلکہ قرآن تو اس سے آگے بڑھ کر، پورے فلسطین کی سرزمین کو مقدس قرار دیتا ہے۔

﴿ يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ﴾

[المائدۃ: ٢١]

’’(موسیٰ نے فرمایا) اے میری قوم! اس مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ، جسے اللہ نے تمہارے نام لکھ دیا ہے۔‘‘

اب قرآن اور خدائے قرآن نے جس توحید کا ہمیں سبق دیا ہے، اُسے ایک پتھر کیا، پورے علاقۂ فلسطین کا تقدس بھی مجروح نہیں کرتا، لیکن ہمارے ’’مفکر قرآن‘‘ کی توحید، محض اتنی سی بات سے ہی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتی ہے کہ تقبیل حجر اسود سے، اس میں تقدس کا تصور ابھر آتا ہے۔

تقبیل حجر اسود کی اس مختصر بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ’’مفکر قرآن‘‘ کس طرح اپنے ظن و گمان کو معیار قرار دے کر کتب احادیث و تاریخ کے حقائق کو جھٹلایا کرتے تھے۔

آمدم برسر مطلب

بوسۂ حجر اسود پر بحث، جملۂ معترضہ کی حیثیت رکھتی ہے، اس سے قبل، اصل موضوع جس

پر اظہارِ خیال ہو رہا تھا۔ صحابہ کرام کا عمل بالحدیث تھا۔ اس سلسلہ میں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تعلیمی سرگرمیوں میں، ان کا علم حدیث میں اخذ و ابلاغ بھی ملاحظہ فرمائیے

> ایک تیسرا نمونہ ہمیں حضرت ابن عباس میں نظر آتا ہے۔ تفسیر اور سیر کی کتابیں، ان کا جو کچھ تصور پیش کرتی ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنھیں، مختلف نواحی میں وسیع معلومات حاصل تھیں۔ شعر، انساب، ایام عرب پر ان کی نظر تھی۔ صحابہ کے پاس جو کچھ احادیث یا علم ہوتا تھا اسے معلوم کرنے کی وہ کوشش کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیادہ تر حدیثیں انصار کے پاس تھیں۔ میں ان میں سے کسی کے پاس جاتا اور اسے سویا ہوا پاتا۔ اگر میں چاہتا تو میری خاطر انھیں جگایا بھی جا سکتا تھا، لیکن میں ان کے دروازے پر بیٹھا رہتا اور ہوائیں میرے چہرے پر گرد و غبار اُڑاتی رہتیں، حتیٰ کہ جب انھیں خود ہی جاگنا ہوتا تو جاگ جاتے، اور جو کچھ مجھے ان سے دریافت کرنا ہوتا دریافت کر کے چلا جاتا۔ ❶

کتب احادیث و تاریخ میں سے ایسے بے شمار واقعات کو پیش کیا جا سکتا ہے، لیکن چونکہ میں طلوعِ اسلام ہی کے لٹریچر سے ایسے واقعات کو پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں، اس لیے اتمامِ حجت کے لیے ان ہی واقعات پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ عباسی دور میں روایات کے مرتب اور مدوّن ہونے سے پہلے، صحابہ و تابعین وغیرہم کا عمل بالحدیث، تعلیم حدیث اور تعلم سنن وغیرہ کی یہ کارگزاریاں، کیا نفس حدیث و سنن کی دینی اہمیت ظاہر نہیں کرتیں؟ یہ بات بالکل بے جا اور لغو ہے کہ کتب روایات کب مرتب اور مدون ہوئیں؟ اصل سوال تو یہ ہے کہ ان روایات کی ترتیب و تدوین سے قبل، ان کی دینی حیثیت کو مان کر، ان پر عمل ہو رہا تھا یا نہیں؟ اور یہ بات طلوعِ اسلام کے لٹریچر ہی سے واضح ہے کہ صحابہ کرام (اور تابعین و تبع تابعین کے ہاں) سنن رسولؐ اور احادیث نبی بھی معمول بہا تھیں، جو بجائے خود ان کی دینی حیثیت پر دال ہیں۔

---

❶ طلوعِ اسلام، اگست ۱۹۵۷ء، صفحہ: ۵۵۔

عباسی دور میں، ترتیب و تدوین روایات کے عمل سے "مفکر قرآن" کا یہ تاثر پیدا کرنا کہ اس سے پہلے روایاتِ حدیث وسنن کا وجود ہی نہ تھا، محض ایک شاطرانہ مغالطہ آرائی ہے، پھر وہ اس مغالطہ کے ساتھ، اس کذبِ صریح کو بھی ملحق کر ڈالتے ہیں کہ ان روایات کو "وضع" بھی عباسی عہد میں کیا گیا تھا۔

باقی رہا یہ امر کہ...... "جب سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام، مملکت پر مسلط ہو چکا تھا، تو اسے اسلامی قرار دینے کے لیے روایات وضع کی گئیں، جن میں سے کچھ کتب احادیث میں جمع ہو گئیں اور کچھ کتب تاریخ میں۔ ان ہی روایات پر مبنی فقہ مرتب کی گئی، لہٰذا، سرمایہ داری نظام، حدیث اور فقہ، دونوں کی رو سے عین اسلام بنا دیا گیا" ...... تو یہ سب کچھ "مفکر قرآن" صاحب نے، اپنے ہی خیالات کی دنیا میں گھوم پھر کر فرما دیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں کارل مارکس کی تراشی ہوئی اشتراکیت کا وہ نظام رائج تھا، جسے اُنھوں نے "نظامِ ربوبیت" کے زیرِ عنوان قرآنی فکر کے نام پر درآمد کیا ہے، اور پھر بعد میں، اس کی جگہ سرمایہ دارانہ نظام نے لے لی، حالانکہ نہ تو اسلام کے صدرِ اوّل میں "نظامِ ربوبیت" کا پھندا لوگوں کی گردنوں پر پڑا ہوا تھا، اور نہ ہی ایسا تھا کہ حدیث و سنت معمول بہا نہ تھے۔ اسلام کے مکمل نفاذ کے اُس سنہری دور میں، جو معاشی نظام رائج تھا، وہ نہ تو اشتراکی نظام تھا اور نہ ہی سرمایہ دارانہ نظام تھا، البتہ وہ ایسا نظام تھا جس میں (ا) ذاتی اور انفرادی ملکیت کا اصول کارفرما تھا، اور کتاب اللہ و سنت رسول اللہ اور آخرت میں جواب دہی جیسے عقائد کی کوکھ سے جنم لینے والا اخلاقی نظام ہی، اس اقتصادی نظام کا پشت پناہ تھا۔ بعد کے ادوار میں، جب کہ اخلاقی نظام کی چولیں ڈھیلی پڑ گئیں، تو پھر ہر شعبۂ حیات میں بھی بگاڑ پیدا ہوتا چلا گیا۔ یہ ہے وہ اصل صورتِ حال، جس کو مسخ کر کے "مفکر قرآن" یہ کہہ رہے ہیں کہ روایات نے "وضع ہو کر" سرمایہ دارانہ نظام کو برقرار رکھا تھا۔ جو لوگ آغازِ اسلام کے اقتصادی نظام، اور بعد کے تبدیل شدہ احوال کا تفصیلی مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، اُن سے درخواست ہے کہ وہ میری کتاب ...... "جنابِ پرویز صاحب کے "نظامِ ربوبیت" پر ایک نظر" ...... کا مطالعہ فرمائیں۔

(۶۱) ''حدیث وفقہ کی رُو سے نظامِ سرمایہ داری کا اسلام قرار پانا''

اس کے بعد، یہ واضح کرنے کے لیے کہ حدیث وفقہ کی رُو سے، نظامِ سرمایہ داری، کیونکر عین اسلام بن گیا، ''مفکرِ قرآن'' فرماتے ہیں:

> قرآنِ کریم میں نظامِ سرمایہ داری کے خلاف بے شمار آیات آئی ہیں۔ ان میں دو تین آیات سورۂ توبہ کی ہیں، جن میں یہ کہا گیا ہے:
>
> ﴿ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ٥ يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ٥﴾ [التوبة: ۳۴۔۳۵]
>
> ''جو لوگ سونا چاندی (مال و دولت) جمع کرتے ہیں، اور اسے فی سبیل اللہ (انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے، قوانین خداوندی کے ماتحت) خرچ کرنے کے لیے کھلا نہیں رکھتے۔ (اے رسول!) تو ان کے لیے خدا کی طرف سے الم انگیز عذاب کا اعلان کردے (یہ عذاب، اس دن وارد ہوگا جب) اس مال کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا، اور اس سے ان کی پیشانی، پہلو اور کمر کو داغا جائے گا اور کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ مال و دولت، جسے تم نے اپنی ذات کے لیے مختص کر رکھا تھا، اب تم اس کا مزہ چکھو۔''
>
> ظاہر ہے کہ قرآن کا یہ حکم، سرمایہ داری کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیتا ہے، اب دیکھئے کہ حدیث کی رُو سے اس آیت کی تفسیر کیا کی گئی ہے۔ ابوداؤد میں ہے:
>
> ابن عباس کہتے ہیں کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تو مسلمانوں پر اس کا خاص اثر ہوا، یعنی اُنھوں نے اس حکم کو گراں خیال کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے کہا کہ میں تمہاری فکر کو دُور کردوں گا، اور اس مشکل کو حل کردوں گا، پس عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا: ''یا نبی

> اللہ! یہ آیت آپ کے صحابہ پر گراں گزری ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لیے فرض کی ہے کہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کردے، اور میراث کو اس لیے فرض کیا ہے کہ جو لوگ تمہارے بعد رہ جائیں، ان کو مال مل جائے۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ حضور کا یہ بیان سن کر، عمر رضی اللہ عنہ نے جوشِ مسرت سے اللہ اکبر کہا۔
>
> یعنی اس تفسیر کی رو سے، جسے ارشادِ رسالت مآب کہہ کر پیش کیا گیا، قرآنِ کریم کی اس آیت کا مطلب یہ ہوگیا کہ اگر سال بھر کے بعد، اڑھائی فیصد زکوٰۃ دے دی جائے، تو پھر جس قدر جی چاہے، دولت جمع کی جاسکتی ہے۔ اس کی تائید میں تاریخ آگے بڑھی، اور اس نے بتایا کہ صحابہ کرام میں بڑے بڑے سرمایہ دار موجود تھے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے پاس بیشمار دولت تھی، حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف رضی اللہ عنہ کے کاروبار کا یہ عالم تھا کہ ان کے مالِ تجارت کے کارواں کا اگلا اونٹ مدینہ میں ہوتا تھا اور پچھلا اُونٹ مصر میں۔ اسی قسم کی روایات اور تاریخ پر متفرع فقہ کے وہ احکام مستنبط ہوئے جن کی رو سے مال و دولت اور جائیداد اور زمین کی ملکیت پر کسی قسم کی حد بندی کی ہی نہیں جاسکتی۔ ①

یہ طویل اقتباس صرف اس لیے دیا گیا ہے کہ ''مفکرِ قرآن'' کا اصل موقف، خود ان ہی کے الفاظ میں قارئین کرام کے سامنے آجائے۔ سب سے پہلے ترجمہ آیات میں جو کرشمہ سازی کی گئی ہے، اسے الفاظ کی بے جا اور مسرفانہ بھرمار میں مضمر رکھا گیا ہے۔ پھر حدیث کے ترجمہ میں بھی ایسے الفاظ داخل کیے گئے ہیں، جن کی کوئی گنجائش، متنِ حدیث میں نہیں پائی جاتی۔ پھر استدلال میں بھی کجی اختیار کی گئی ہے۔ لیکن ان سب امور سے صرفِ نظر کرتے ہوئے، ہم یہ عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ جب انسان کا ذہن بدل جاتا ہے تو وہ نئے افکار و نظریات کو قبول کرتا ہے، اور دیانتداری کا دم بھرتے ہوئے، اپنے پرانے معتقدات کو ترک

---

① شاہکارِ رسالت، صفحہ: ۵۱۱ تا ۵۱۲۔

کر دیتا ہے، لیکن جو اخلاقی نامردی کا شکار ہو یا مصلحت پرستی اس کا شعار ہو یا اپنے پرانے عقائد کو برملا چھوڑ دینے کی ہمت نہ پاتا ہو، تو وہ اپنے پرانے اور جدید نظریات میں مفاہمت و ہم آہنگی پیدا کرنے میں جت جایا کرتا ہے، چنانچہ اس کوشش میں وہ کبھی ایک انتہاء کو لڑھک جاتا ہے اور کبھی دوسری انتہاء کو۔ کبھی وہ فقیہہ مصلحت بین کا روپ اپناتا ہے اور کبھی رندِ بادہ خوار کا۔ یہ رویہ قدم قدم پر تضادات وتناقضات کی پیدائش کا موجب بنتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ''مفکر قرآن'' کے لٹریچر میں اس قدر تناقضات وتضادات ہیں کہ

؎ سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے

''مفکر قرآن'' کے تضادات

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ''مفکر قرآن'' کے بے شمار تضادات میں سے چند وہ مثالیں پیش کر دی جائیں، جو موضوعِ زیرِ بحث سے تعلق رکھتی ہیں۔

1 .... ایک زمانہ تھا جب ''مفکر قرآن''، اسلام اور اشتراکیت کے درمیان موازنہ و محاکمہ کرتے ہوئے یہ فرمایا کرتے تھے کہ:

> یہ اشتراکیت، ذاتی اور انفرادی ملکیت کو تسلیم نہیں کرتی، لیکن اسلام ہر شخص کی کمائی کو اس کی ذاتی ملکیت قرار دیتا ہے۔ ❶

لیکن پھر جب، وہ، زلفِ اشتراکیت کے گرہ گیر ہوئے، تو پھر یہ کہنے لگ گئے:

> قرآن، جس معاشی نظام کو پیش کرتا ہے، اس کی رو سے دولت کا اکتناز یا وسائل پیداوار پر انفرادی ملکیت جائز ہی نہیں۔ ❷

2 .... قیامِ پاکستان سے قبل، اسلام اور اشتراکیت پر اپنے تحقیقی مطالعہ کا ماحصل، وہ ان الفاظ میں میں بیان کیا کرتے تھے:

> غرض، اصل اور فرع دونوں میں اشتراکیت، قرآن کے سراسر خلاف ہے، اور جب کوئی اس تحریک کی تائید کرے گا تو قرآن کا رشتہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ

---

❶ طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۳۹ء، صفحہ: ۵۲۔

❷ طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۵۶ء، صفحہ: ۹۔

جائے گا۔ ❶

لیکن جب عجل اشتراکیت کی محبت "مفکر قرآن" کی رگ رگ میں سرایت کر گئی، تو انھیں قرآن کا معاشی نظام، اشتراکیت کے معاشی نظام کے مماثل نظر آنے لگا:

جہاں تک کمیونزم کے معاشی نظام کا تعلق ہے، وہ قرآن کے تجویز کردہ معاشی نظام کے مماثل ہے۔ ❷

3 .... تخمیر اشتراکیت ہونے سے قبل، وہ، يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ کا ترجمہ، بایں الفاظ کرتے تھے:

"آپ سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں، کہہ دیجیے کہ جتنا آسان ہو۔ ❸

لیکن جب وہ لیلائے اشتراکیت کے مجنوں بن گئے، تو مفہوم آیت، مسرفانہ الفاظ کی بھرمار میں یوں بیان فرمایا:

> يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ. اے رسول! تجھ سے یہ لوگ پوچھتے ہیں کہ ہم اپنی کمائی میں سے کس قدر دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے دیں؟ قُلِ الْعَفْوَ [۲: ۲۱۹] ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زائد ہے، سب کا سب۔ ❹

4 .... متحدہ ہندوستان میں، اسلام کے معاشی نظام کی بنیاد پر، تفاضل فی الرزق اور تفاوت فی المال کے بھی قائل تھے، اور اس کا یہ نتیجہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ خود صحابہ کرام میں صاحب ثروت اور خوشحال افراد کے ساتھ ساتھ، مفلس اور مفلوک الحال افراد بھی موجود تھے .... لیکن .... اشتراکیت کا بپتسمہ پاتے ہی، خوشحال اور متموّل صحابہ "سرمایہ دار" قرار پاگئے اور ان کے وسیع کاروبار کے متعلق، تاریخی حقائق، نہ صرف یہ کہ "خلافِ قرآن" قرار پاگئے، بلکہ وہ "مفکر قرآن" کی طنز و تشنیع کے بھی سزاوار

---

❶ طلوع اسلام، جولائی ۱۹۳۹ء، صفحہ: ۸۷۔

❷ نظامِ ربوبیت، صفحہ: ۳۵۸۔

❸ تحریک پاکستان اور پرویز، صفحہ: ۳۰۷۔

❹ طلوعِ اسلام، مارچ ۱۹۷۹ء، صفحہ: ۴۶۔

ہو گئے۔ (اس امر کے متعلق، اقتباسات، آگے آ رہے ہیں۔)

مفہومِ آیت (۹:۳۴، ۳۵)

الغرض "مفکر قرآن" نے سورۂ توبہ کی ان دو آیات کا جو ترجمہ پیش کیا وہ سراسر اشتراکیت زدہ ترجمہ ہے۔ رہی، سنن ابی داؤد کی حدیث، تو اس پر بحث آگے آ رہی ہے، یہاں تو ہم سورۂ توبہ کی آیات کا صحیح مفہوم پیش کرنا چاہتے ہیں۔ الفاظ آیات ملاحظہ فرمائیے:

﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا	جو لوگ سونے اور چاندی کو ذخیرہ کرتے اور
يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ	راہِ خدا میں انھیں خرچ نہیں کرتے، انھیں
بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝﴾ [التوبة: ٣٤]	دردناک عذاب کی بشارت دے دیجیے۔

کیا اس سے یہ وہم پیدا نہیں ہوتا کہ آیت میں مطلق مال جمع کرنا ہی، باعث عذاب ہے؟ اس لیے آیت کے عموم میں اتنی گنجائش بھی نظر نہیں آتی کہ روزمرہ کے اخراجات سے زائد، ایک پیسہ بھی کسی کی ملکیت میں رہے، یا خواتین خانہ کے پاس، سونے کا ایک تار بھی زیور کے طور پر رہ سکے، لہٰذا، زائد از ضرورت ایک پیسہ بھی، اور طلائی روپہلی زیوراتِ مستعملہ کے علاوہ، ایک تار بھی اگر موجود رہا تو موجب عذاب ہوگا، پھر اس اشکال کو تقویت دینے والے وہ قرآنی احکام بھی ہیں، جو راہِ خدا میں، مساکین وفقراء کی اعانت میں، انسداد غلامی اور حریت غلاماں میں، صدقہ وخیرات اور زکوٰۃ میں، بیویوں کو حقِ مہر اور نان ونفقہ دینے میں، اور بصورتِ جرم وجنایات، کفاروں کی ادائیگی میں خرچ کرنے کے لیے قرآن میں مذکور ہیں۔ اب اگر مال جمع نہ ہو، اور وہ ضرورت سے زائد بھی نہ ہو، تو ان احکام پر عمل کیسے ہو؟ اس لیے صحابہ پر فکر و پریشانی واقع ہوئی، اسی پریشانی کا اظہار، رسولِ خدا سے، جب کیا گیا، تو آپؐ نے فرمایا کہ "بقدرِ نصاب (یا زائد از نصاب) مال ودولت اور سونا چاندی رکھنے والا فرد، اگر اس پر اڑھائی فیصد زکوٰۃ ادا کر دے، تو وہ قرآنِ کریم کی اس وعید کا مستحق نہیں رہتا۔ اب بتائیے، اس پر اعتراض کیا ہے؟

اڑھائی فیصد زکوٰۃ کا اقرار بھی اور انکار بھی

"مفکرِ قرآن" کا یہ اعتراض، دراصل اشتراکیت پر اندھا ایمان رکھنے کا نتیجہ ہے، ورنہ اُن پر ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے کہ نہ یہ آیت (۱۰:۳۴) انھیں اشتراکیت زدہ نظر آتی تھی، اور نہ ہی اڑھائی فیصد زکوٰۃ، انھیں خلافِ قرآن دکھائی دیتی تھی۔ اُس زمانے میں، ایک کروڑ پتی آدمی، اُن کے نزدیک "سرمایہ دار" نہیں تھا، کیونکہ وہ اڑھائی فیصد کی شرح سے زکوٰۃ ادا کرنا واجب سمجھتا تھا۔ چنانچہ پرویز صاحب خود، صدرِ اسلام کے اہل ایمان کے متعلق یہ لکھتے ہیں:

> مسلمانوں کو اپنی آمدنی کا چالیسواں حصہ حکومت کو ادا کرنا پڑتا تھا، اور اس کے علاوہ ہر قسم کی فوجی خدمت بھی اُن کے ذمہ تھی .... ایک کروڑ پتی مسلمان سے کم از کم اڑھائی لاکھ بطورِ زکوٰۃ وصول کیا جائے گا۔ ❶
>
> جمع شدہ مال پر، جس پر سال گزر جائے، چالیسواں حصہ، اللہ تعالیٰ کی راہ میں، جو قوم کی حمایت اور خلقِ خدا کی بہتری کی راہ ہے، نکال کر خرچ کیا جائے، تاکہ مال صرف اغنیاء ہی کے درمیان نہ پھرتا رہے، بلکہ غربا اور ضرورت مندوں میں آکر، ایک طرح سے اشتراک اور اشتمال بھی ہو جائے۔ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ط ❷

لیکن جب "مفکرِ قرآن" کارل مارکس کی اشتراکیت کے عشق میں انتہاء کو پہنچ گئے، اور کمیونزم کی اندھی محبت میں مبتلا ہوئے تو پھر جس طرح ساون کے اندھے کو ہر طرف ہرا ہی ہرا سوجھتا ہے، انھیں بھی ہر چیز، اشتراکیت کے رنگ میں مصبوغ نظر آئی، اور پھر زکوٰۃ کا مفہوم، مالی بچت پر، اڑھائی فیصد نہ رہا، بلکہ زائد از ضرورت پورے کا پورا مال، زکوٰۃ قرار پا گیا جسے حکومت کو دینا لازم ٹھہرا۔

> مملکت میں تمام کا سب افراد، ان کاموں کو، جو ان کے سپرد کیے جائیں گے، اپنی

---

❶ طلوعِ اسلام، جون ۱۹۳۹ء، صفحہ: ۴۸۔

❷ طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۴۱ء، صفحہ: ۲۰۔

> اپنی صلاحیت و استعداد کے مطابق، پوری تندہی سے انجام دیں گے، اور اس کے ماحصل میں سے بقدرِ ضرورت لے کر، فاضلہ دولت، اُس نظام کی سنٹرل اتھارٹی (مرکزِ ملت) کی تحویل میں دے دیں گے ……… آپ آج کی اصطلاح میں کہہ سکتے ہیں کہ زکوٰۃ، اسلامی مملکت کی جملہ آمدنی (Revenue) کو کہا جائے گا۔ ❶

اب ظاہر ہے کہ جب اشتراکیت کی عینک آنکھوں پر چڑھ جائے، تو قرآنی آیات یا تو اشتراکیت نواز نظر آئیں گی، یا پھر سرمایہ داری نظام کی مخالف۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ توبہ کی متذکرہ بالا آیات، ''مفکرِ قرآن'' کی نگاہ میں ''سرمایہ داری نظام کو جڑ بنیاد سے اکھاڑنے والی آیات'' قرار پائی ہیں۔

اسلام کا معکوس تصور

ایک سرسری اندازے کے مطابق، قرآن کریم میں تقریباً ۱۷۲ آیات ایسی ہیں، جو مال و دولت کی ذاتی ملکیت پر دلالت کرتی ہیں، لیکن ''مفکرِ قرآن'' نے قرآنِ مجید کی صرف ایک آیت (۲:۲۱۹) کا ایک ایسا مفہوم گھڑا، جس نے معاشرتی اور معاشی نظام کے حوالے سے سارے قرآن کو الٹا کر رکھ دیا ہے، اور اب یہ الٹا قرآن، عہدِ رسالت مآب اور خلافت راشدہ میں نافذ اسلام کا یہ تصور پیش کرتا ہے کہ:

> اسلام خود ایک سوشلسٹ نظام تھا، یہ ایک بہت بڑا انقلاب تھا۔ ❷

الغرض، ایک آیت کے وضعی مفہوم نے، احیاءِ اشتراکیت کے لیے، ''مفکرِ قرآن'' کو سند مہیا کر دی، اور وہ تمام آیات، جن میں کفار و مشرکین کا ہستی باری تعالیٰ پر کماحقہ ایمان نہ لاتے ہوئے، اور طلبگارِ آخرت ہونے کی بجائے، سگانِ دنیا بن کر سونا چاندی اور مال و دولت جمع کرنے پر، اُن کی مذمت کی گئی ہے، انھیں ''مفکرِ قرآن'' نے مخلص اہلِ ایمان پر چسپاں کرنا

---

❶ تفسیر مطالب الفرقان، جلد: ۲، صفحہ: ۲۰۷۔

❷ طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۵۰ء، صفحہ: ۶۸۔

شروع کر دیا، تاکہ اشتراکیت کی راہ ہموار کی جا سکے، اور قرآنِ کریم کے وہ احکام، جو صدقہ و خیرات، قرض و اقراض اور ترکہ و میراث وغیرہ سے متعلق ہیں، انھیں ”مفکر قرآن“ نے ”مزاج شناسِ خدا“ ہونے کی بنیاد پر (یا اپنے ہم نام، متنبّی قادیان کی طرح خدا سے براہِ راست علم پانے کا ڈھونگ رچا کر) ”عبوری دور کے احکام“ قرار دے دیا۔ اور قرآنِ کریم کی وہ آیات، جو اپنے اندر دائمی اور مستقل احکام لیے ہوئے تھیں، انھیں ”عبوری دور کے احکام“ قرار دے کر، ”تکمیلی دور میں“ ساقط العمل بنا دیا۔ پھر اشتراکیت سے ”شکمی مساوات“ کا تصور سے لے کر، اور اسے ایک قطعی معیار قرار دے کر، قرآنِ کریم کی بیان کردہ تفاضل فی الرزق کی اُس حقیقت کو، جو وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ (النحل:۷۱) جیسی آیات میں مذکور ہے، انھیں تحریف کی بھینٹ چڑھاتے ہوئے، ان کا یہ مفہوم بیان کیا کہ ایسی آیات سے مراد، ”تفاوت فی المال“ اور ”تفاضل فی الرزق“ نہیں، بلکہ ”رزق کمانے کی صلاحیتوں میں فرق و تفاضل“ ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی، اشتراکیت سے ”مساوی تقسیم دولت“ کا تصور لے کر، اسے ایک حتمی معیار قرار دیتے ہوئے، قرآن کی بیان کردہ ”تفاضل فی الرزق“ کی حقیقت کو، ”دولت کی غلط تقسیم“ کا نام دیا گیا، جس کے نتیجہ میں وہ صحابہ کرام، جو مال و زر کے اعتبار سے صاحب ثروت اور خوشحال تھے، وہ اب ”سرمایہ دار طبقہ“ قرار پا گئے۔

”مفکر قرآن“ کی اصول شکنی

یہ سب کچھ صرف ایک آیت (۲:۲۱۹) میں، ”مفکر قرآن“ کے خود ساختہ مفہوم کو گھسیڑ ڈالنے کے باعث ہوا ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا، اور یہی ہوا بھی کہ یہ آیت، ان صدہا آیات سے متصادم اور متعارض ہو گئی، جو اسلام کے مالیاتی نظام کے متعلق قرآن میں مذکور ہیں۔ پھر اس تناقض و تعارض کو دُور کرنے کے لیے، انھیں قدم قدم پر، ”پرویزی حیلوں“ سے کام لینا پڑا، حالانکہ کسی آیت کا مفہوم پیش کرتے ہوئے، یہ بھی دیکھنا لازم ہے کہ وہ مفہوم، دوسری آیات کے خلاف تو نہیں ہے، اس اصول کو، خود پرویز صاحب، نے بھی تسلیم کیا ہے۔

> ایک اہم اصول، قرآن فہمی کا یہ بھی ہے کہ اس کی تعلیمات میں اختلاف نہیں ہے، ﴿ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۝ ﴾ [٤ : ٨٢] ''اگر یہ قرآن، اللہ کے سوا کسی غیر کی طرف سے ہوتا، تو لوگ اس میں بہت اختلاف پاتے۔'' اس لیے کسی آیت کی ایسی تفسیر نہیں کی جاسکتی جو دوسری آیت کے خلاف پڑتی ہو۔ ❶

لیکن ہمارے ''مفکر قرآن'' اس اصول کو بالائے طاق رکھتے ہوئے، مختلف مواقع پر، ایک آیت کی ایسی تفسیر بیان کیا کرتے تھے جو ان کی دیگر مواقع پر کی گئی تفسیر سے ٹکرایا کرتی تھی۔ چنانچہ ان کے لٹریچر سے اس کی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، جو یہ واضح کرتی ہیں کہ ''اصول شکنی'' ہی ان کا اصولِ حیات تھا۔ ان کا یہی رویہ، تضادات وتناقضات کا وسیع خار زار پیدا کرتا رہا ہے۔ چنانچہ پھر اپنے ان متضاد اور متناقض اقوال کی روشنی میں، وہ احادیث رسول کے ''صحیح'' و ''غلط'' یا ''مطابق قرآن'' اور ''مخالف قرآن'' ہونے کا فیصلہ کیا کرتے تھے۔

''مفکر قرآن'' بمقابلہ رسولِ قرآن

حقیقت یہ ہے کہ ''مفکر قرآن''، رسول اللہ ﷺ کے مقابلہ میں خم ٹھونک کر سامنے آئے، اور ایک ایک اصطلاح کے بیان کردہ مفہومِ رسول کو ''عجمی سازش کا شکار'' اور قرآن و سنت پر مبنی اسلام کو ''عجمی سازش'' کا نتیجہ کہہ کر ردّ کیا، اور پھر خود قرآنی مفردات میں، آج کی تہذیب غالب اور اشتراکیت کے زیر اثر، اپنا خود ساختہ مفہوم داخل کیا۔ اور اسے منسوب الی القرآن کر ڈالا۔ پھر اپنے اس مَن گھڑت مفہوم کو ''قرآنی مفہوم'' قرار دے کر، اسے ایک ایسا معیار قرار دیا جس پر وہ فرامین محمدؐ کو جانچا کرتے تھے، اور جو فرمودۂ رسولؐ، اس معیار پر پورا نہ اُترتا، اسے ''خلاف قرآن'' قرار دے کر مسترد کر ڈالتے تھے، پھر جونہی فضائے دماغی میں نئے خیال کا جھکڑ آتا، اور مرغ بادنما کی طرح ''مفہوم قرآن'' بدل جاتا، تو اس کے ساتھ ہی،

---

❶ معارف القرآن، جلد: ۱، صفحہ: ۴۰ تا ۴۱۔

احادیث رسول کے ردّ و قبول کا معیار بھی بدل جاتا تھا۔ جن دنوں "مفکر قرآن" صاحب، اڑھائی فیصد زکوٰۃ کے قائل تھے، اُن دنوں ایسی احادیث "خلافِ قرآن" نہ تھیں جس میں یہ شرح زکوٰۃ مذکور ہے، (اور یہ شرح بجائے خود، ذاتی اور نجی ملکیت مال کو مستلزم ہے)، لیکن اشتراکیت کے زیر اثر مفہومِ زکوٰۃ بدل کر، کل محاصلِ حکومت (Revenue) قرار پا گیا، تو اب وہ تمام احادیث، بیک جنبشِ قلم "خلافِ قرآن" قرار پا گئیں، جن میں زکوٰۃ، اپنے اصل مفہوم کے ساتھ مذکور ہے۔ "مفکر قرآن" کے ہر اُس نئے تصور کی بناء پر، جسے وہ منسوب الی القرآن کر ڈالتے تھے، احادیث رسول میں ردّ و قبول اور ادھیڑ بن کا نیا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ یوں ہر لمحہ، ہر نئے خیال کی کروٹ پر، صورتِ حال بدل جاتی تھی۔ لیکن "مفکر قرآن" صورتِ حال کے منقلب ہو جانے کا الزام، اپنے خود ساختہ تصور پر عائد کرنے کی بجائے، اُلٹا احادیث رسول پر عائد کیا کرتے تھے کہ..... "اس حدیث نے قرآن کا مفہوم اُلٹ کر رکھ دیا ہے، لہٰذا یہ وضعی حدیث ہے، جو سرمایہ دارانہ نظام کی حمایت کے لیے وضع کی گئی ہے۔"

ردّ حدیث کی پرویزی ٹکنیک

اوپر سنن ابو داؤد کی جس حدیث کو وضعی قرار دیا گیا ہے، اس میں یہی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ ایک اور مقام پر، اس حدیث کو ردّ کرنے کے لیے "مفکر قرآن" نے جو پرویزی حیلۂ واردات اپنایا ہے، اور جس طرح، اسے نشانۂ تنقید بنا کر، وضعی حدیث قرار دیا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بھی جائزہ لے لیا جائے، سب سے پہلے الفاظِ حدیث ملاحظہ فرمائیے:

((عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ لما نزلت هٰذه الآية والذين يكنزون الذهب والفضة، قال كبر ذالك على المسلمين فقال عمر انا افرج عنكم فانطلقوا وقالوا يا نبى الله انه كبر على اصحابك هذه الآية. فقال رسول الله ﷺ ان الله لم يفرض الزكوٰة الا ليطيب ما بقى من اموالكم وانما فرض المواريث لتكون لمن

بعدکم قال فکبر عمر .)) ❶

> ” ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کرتے ہوئے کہا کہ جب یہ آیت وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ اُتری تو مسلمانوں پر گراں گزری۔ تب حضرت عمرؓ نے فرمایا: ”میں تمہارا اشکال یا پریشانی دور کیے دیتا ہوں۔“ سب لوگ خدمت نبوی میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا: ”اے نبی اللہ! تمہارے اصحاب پر یہ آیت گراں گزری ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ نے زکوٰۃ اسی لیے فرض کی ہے کہ تمہارے باقی اموال پاک ہو جائیں۔ اور میراث اس لیے فرض کی کہ تمہارے بعد والوں کو مال مل جائے۔“ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اللہ کی کبریائی بیان کی۔ (یا اللہ اکبر کہا)۔“

یقیناً یہ آیت، بوقت نزول، صحابہؓ پر گراں گزری۔ مگر کس لیے؟ اس لیے کہ حکم خدا کو وہ ماننا نہیں چاہتے تھے؟ ہرگز نہیں، پھر وجہ گرانی کیا تھی؟ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، وجۂ گرانی وہ اشکال تھا، جو ایک طرف، تو آیت کا ظاہر مفہوم مطلق جمعِ مال کا مخالف و مانع تھا، خواہ یہ مال انتہائی قلیل ہی کیوں نہ ہو، اور دوسری طرف خود قرآن ہی، انھیں انفاق فی سبیل اللہ، ادائیگی زکوٰۃ اور ادائیگی کفارہ جات بصورتِ ارتکابِ جنایات، قرض و اقراض وغیرہ کے احکام بھی دیتا ہے، جن پر عمل، اس کے بغیر ممکن ہی نہیں کہ ان کے پاس زائد از ضرورت مال موجود ہو۔ اب ایک طرف جمع مال پر وعید اور دوسری طرف، انفاق فی سبیل اللہ کا ایسا تاکیدی حکم کہ گویا، انفاق نہ کرنے والا اپنے آپ کو ہلاکت میں گراتا ہے۔ یہ تھی وہ پریشانی، اور اشکال، جو صحابہ کو لاحق ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے کہا: ”میں تمہاری پریشانی کو دور کیے دیتا ہوں۔“

اور وہ یوں کہ خدمت نبوی میں حاضر ہو کر، اس الجھن کو پیش کیا جائے، چنانچہ سب لوگ، خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ ﴿ فَانْطَلَقُوْا ﴾ اور تنہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نہیں، بلکہ

---

❶ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، باب فی حقوق المال۔

سب نے عرض کیا: ﴿ قَالُوْا ﴾ حضورِ اکرم ﷺ نے جواباً فرمایا، کہ اللہ نے زکوٰۃ اسی لیے فرض کی ہے کہ تمہارے بقیہ اموال پاک ہو جائیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ: ﴿ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ ﴾ کیونکہ جب تک مستحقین زکوٰۃ کا حصہ، صاحب مال کی دولت میں مخلوط رہے گا، وہ مال پاک نہیں ہوگا، اور یہ پاکیزہ مال ہی دراصل، اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی نعمت ہے، اور میراث، اس لیے فرض کی ہے کہ تمہارے بعد والوں کو جو مال ملے، وہ پاکیزہ حالت میں، اسلاف سے اخلاف کی طرف منتقل ہو۔ کلامِ نبوی سے یہ واضح ہوا کہ اگر جمع مال مطلقاً ممنوع ہوتا، تو اللہ تعالیٰ نہ زکوٰۃ ہی کو فرض قرار دیتا، اور نہ ہی میراث کا قاعدہ جاری فرماتا۔ آپ ﷺ کی اس وضاحت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اشکال حل ہوا، فکر و پریشانی کا ازالہ ہوا، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر اللہ کی کبریائی بیان کی۔ (یا اللہ اکبر کہا۔)

''مفکر قرآن'' کا تحریفی مفہومِ حدیث

لیکن ''مفکر قرآن'' نے مفہومِ حدیث کو جس طرح اشتراکیت کے عشق میں مبتلا ہو کر، مسخ و تحریف کا نشانہ بنایا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک نظر پھر اس پر بھی ڈال لی جائے، تکرار کی کوفت کے باوجود، اسے دوبارہ پیش کیا جا رہا ہے، اور تحریفات کی نشاندہی بھی ساتھ ہی (بین القوسین) کی جا رہی ہے۔

> حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ جب مندرجہ بالا آیت (یعنی ۹:۳۴، ۳۵۔ قاسمی) نازل ہوئی، تو مسلمانوں پر اس کا خاص اثر ہوا (یعنی کفار پر تو عام اثر ہوا، لیکن مسلمانوں پر خاص اثر ہوا...... ہمیں معلوم نہیں کہ یہ حدیث کے کن الفاظ کا ترجمہ ہے۔ قاسمی) یعنی انھوں نے اس حکم کو گراں خیال کیا، (اس گرانی پر بحث، تفصیل کے ساتھ آگے آ رہی ہے۔ قاسمی)۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو کہا کہ میں تمہاری فکر کو دُور کر دوں گا (اور وہ اسی طرح کہ، آیت سے پیدا ہونے والی الجھن کو خدمت نبوی ہی میں پیش کر کے حل کروایا جائے گا۔ چنانچہ وہ سب خدمت اقدس میں حاضر ہوئے،

اور عرض کیا: فَانْطَلَقُوْا وَقَالُوْا ...... قاسمی) عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے (قطعی غلط اور صریح جھوٹ۔ تمام صحابہ جنھیں یہ اشکال لاحق ہوا، حاضرِ خدمتِ رسالت مآب ہوئے۔ قاسمی) اور تنہا عمر رضی اللہ عنہ نے نہیں بلکہ سب صحابہ نے عرض کیا (قالوا جمع کا صیغہ ہے۔ قاسمی) کہ اے نبی اللہ! یہ آیت آپ کے صحابہ پر گراں گزری ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''خداوند تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لیے فرض کی ہے کہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کر دے اور میراث کو اِس لیے فرض کیا ہے کہ جو لوگ تمہارے بعد رہ جائیں، ان کو مال مل جائے۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ حضور کا یہ بیان سن کر، عمر رضی اللہ عنہ نے جوشِ مسرت سے اللہ اکبر کہا۔ (جوشِ مسرت کے الفاظ ''مفکرِ قرآن'' کا خودساختہ اضافہ ہیں۔ قاسمی)

متن کے بغیر، یہ حدیث، خودساختہ الحاقی اور اضافی عبارتِ ترجمہ کے ساتھ نقل کرنے کے بعد، ''مفکرِ قرآن'' فرماتے ہیں:

> آپ غور فرمایئے کہ اس ایک روایت نے کس طرح اسلام کے پورے کے پورے معاشی نظام کو الٹ کر رکھ دیا ہے (یعنی اس معاشی نظام کو، جسے ''مفکرِ قرآن'' نے اشتراکیت کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہو کر، قرآنی فکر کے نام پر درآمد کیا ہے۔ قاسمی) اس روایت سے، جو ظاہر ہے کہ وضعی ہے، (وضعی اس اعتبار سے کہ وہ پرویز صاحب کے خودساختہ اور ''وضعی'' مفہوم پر پوری نہیں اُترتی۔ قاسمی) سے یہ ثابت ہوا کہ......
>
> ۱ ...... صحابہ سب کے سب سرمایہ دار تھے، اور دولت جمع کرنا، ان کا شعار تھا۔ (یقیناً وہ دولت رکھتے تھے، اور قرآن کے عطا کردہ حقِ ملکیت کی بناء پر رکھتے تھے، تاکہ انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعے، آخرت کی کمائی کریں، نہ کہ دنیا میں گلچھرے اڑانے میں یہ دولت صرف ہو۔ قاسمی)
>
> ۲ ...... صحابہ کی (معاذ اللہ) کیفیت یہ تھی کہ خدا ایک حکم نازل کرتا ہے، اس کا رسول، اس حکم کو ان تک پہنچاتا ہے، لیکن وہ حکم ان پر گراں گزرتا ہے، وہ اسے

بدلوانے کی کوشش کرتے ہیں۔ (بدلوانے کی نہیں، بلکہ اپنے اشکال کو رفع کروانے کی کوشش کرتے ہیں۔ قاسمی) اور اس کے لیے سرمایہ پرستوں کا سب سے بڑا نمایندہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، رسولؐ کے پاس جاتا ہے۔ (اوّل، تو یہی بات غلط ہے کہ تنہا حضرت عمرؓ حضور کے پاس جاتے ہیں، جب کہ صحیح بات یہ ہے کہ وہ صحابہ جنھیں یہ اشکال لاحق ہوا تھا، وہ سب ہی خدمت نبوی میں حاضر ہوتے ہیں۔ اور پھر حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی کے لیے، عجلِ اشتراکیت کی عقیدت میں سرشار ہو کر، ''سرمایہ داروں کا نمایندہ'' کے الفاظ استعمال کرنا، انتہائی سوءِ ادب ہے، ظاہر ہے کہ جو نبی علیہ السلام کی گستاخی سے باز نہیں آتا وہ صحابی کا احترام کیا کرے گا۔ قاسمی)

۳ ...... رسول اللہ ﷺ (معاذ اللہ) یہ فرماتے ہیں کہ تم خدا کے اس حکم کا کچھ خیال نہ کرو۔ (یہ کن الفاظِ حدیث کا ترجمہ ہے؟ متن حدیث میں کوئی ایسی عبارت نہیں ہے، جس کا یہ ترجمہ ہو، آخر یہ مبالغہ آرائی اور رنگ آمیزی، کیا تحریف کے ذریعے، مفہومِ حدیث کو اپنے ڈھب پر لانے کی مذموم کوشش نہیں ہے؟۔ قاسمی)

۴ ...... تم جتنی دولت چاہو، جمع کرتے جاؤ ...... (یہ پھر وہی رنگ آمیزی اور مغالطہ آرائی ہے، جو قبل ازیں مذکور ہو چکی ہے۔ قاسمی)

۵ ...... بس اس میں سے اڑھائی فیصد زکوٰۃ نکال دیا کرو، باقی دولت سب پاک ہو جائے گی۔ (واضح رہے کہ اس اڑھائی فیصد زکوٰۃ کا ذکر، قرآن میں نہ ہونے کے باوجود، متحدہ ہندوستان میں خود پرویز صاحب اس کے قائل تھے، بلکہ اس شرح زکوٰۃ کی حمایت و مدافعت میں، ماہنامہ نگار میں چھپنے والے، ''حق گو'' صاحب کی تردید بھی کیا کرتے تھے، جو منکر حدیث تھا، لیکن بعد میں، جب پرویز صاحب، خود منکر حدیث بن کر، اعلانیہ انکار حدیث کا مسلک اپنا چکے، تو وہی کچھ کہنا شروع کر دیا، جو خود ''حق گو'' صاحب کہا کرتے تھے۔ قاسمی) ❶

---

❶ طلوع اسلام، اگست ۱۹۸۳ء، ص ۲۶۔

حدیث رسول ؐ، "مفکر قرآن" کی درایت کی زد میں

"مفکر قرآن" نے ایک ثابت المتن اور صحیح المفہوم حدیث کو، اپنی جس درایت کا نشانہ بنایا ہے، یہ بعینہٖ وہی درایت ہے جو مستشرقین کے ہاں پائی جاتی ہے۔ پرویز صاحب کے یہ اعتراضات، یا تو اس بناء پر ہیں کہ وہ حدیث کا مفہوم سمجھ ہی نہیں پائے، اور یہ ان کے علم حدیث سے ناواقفیت کی دلیل ہے، یا پھر اس بناء پر، کہ حدیث کا درست مفہوم پالینے کے باوجود، اسے دانستہ اپنی تحریف کی بھینٹ چڑھایا ہے، اور یہ ان کی بالقصد ذہنی خیانت اور بدنیتی کی دلیل ہے۔ بہرحال، اس حدیث پر، وہ، یہ تین بنیادی اعتراضات کرتے ہیں۔

1. صحابہ کا بحیثیت "سرمایہ دار" دولت جمع کرنا، ان کا شیوہ تھا۔
2. صحابہ پر حکم خدا کا ناگوار وگراں گزرنا۔
3. حضور ﷺ کا صحابہ کو یہ تلقین کرنا کہ حکم خدا کی پروانہ کرو۔

پہلے تنقیدی نکتہ کا جائزہ

حدیث رسول ؐ پر، مستشرقین سے مستعار شدہ درایت کی بناء پر، "مفکر قرآن" کا پہلا تنقیدی (بلکہ تغلیطی) نکتہ یہ ہے کہ...... "صحابہ کرام، سب کے سب سرمایہ دار تھے، اور دولت جمع کرنا، ان کا شیوہ تھا"...... یہ سیرتِ صحابہ کو مسخ کرنے کے مترادف ہے۔

وحی کی روشنی میں، رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں قائم ہونے والے معاشرہ میں، صحابہ کرام، حقوقِ ملکیت رکھتے تھے، اور اسلامی حدود میں رہ کر، آزادانہ کاروبار کرتے تھے۔ ان کی معاشی حالت میں فرق و تفاوت بھی تھا۔ افراد کی اکتسابی صلاحیتوں میں تنوع کے ساتھ ذاتی ملکیت کا وجود، تفاوت فی الرزق کو مستلزم ہے۔ لہٰذا، اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ بعض صحابہ، آسودہ حال اور صاحب ثروت تھے۔ اور بعض اُن کے مقابلہ میں خستہ حال تھے، لیکن ہمارے "مفکر قرآن" صاحب، "نظامِ سرمایہ داری" کی مخالفت کے زیر اثر، جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو "سرمایہ دار" کہتے ہیں، تو ان کے نزدیک، اس کا مفہوم "سرمایہ پرست" ہوتا ہے، کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام میں فی الواقع، لوگ، خدا پرست ہونے کی بجائے سرمایہ پرست ہی ہوتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ

مزید برآں، خوشحال و متمول صحابہ کرام کی فراوانیٔ دولت، دنیا پرستی کی بجائے، آخرت

طلبی کی راہ میں صرف ہوتی تھی۔

جس زمانہ میں، پرویز صاحب کے دل و دماغ پر بظاہر اشتراکیت کا پینٹ نہیں چڑھا تھا، اُس دور میں، وہ، خود صحابہ کے تفاضل فی الرزق کے قائل تھے، بلکہ اسے قرآن سے ثابت کرتے ہوئے، قرآنی نظام معیشت کا ناگزیر اور منطقی نتیجہ قرار دیتے تھے۔

> قرآنِ کریم کی رُو سے ایک دوسرے پر، رزق میں فضیلت جائز ہے۔ ﴿ وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ﴾ [۱۶ : ۷۱] ''اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر باعتبار روزی کے، فضیلت دی ہے۔'' ①

تفاوت فی الرزق کی بناء پر، دو طبقوں کا وجود میں آنا، ناگزیر ہے، متمول طبقہ اور مفلس طبقہ۔ خود پرویز صاحب، صحابہؓ میں سے، متمول، آسودہ حال اور صاحب ثروت طبقہ کے بعد، ضعیف المعاش، مفلوک الحال اور مفلس صحابہ کا ذکر، بایں الفاظ کرتے ہیں:

> مالی تفوق کے اعتبار سے، خود دورِ صحابہ میں، مختلف طبقات موجود تھے، حضرت زبیر بن العوام کے کاروبار میں ایک ہزار مزدور روزانہ کام کرتے تھے، حضرت طلحہ کی روزانہ آمدنی کا اوسط، ایک ہزار دینار تھا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی تجارتی ترقی کا یہ عالم تھا کہ ایک باران کا قافلہ مدینہ میں آیا، تو اس میں سات سو اونٹوں پر اشیاءِ خوردنی لدی ہوئی تھیں، لیکن مسلمانوں میں ان ہستیوں کا نام، اگر آج تک صلوٰۃ وسلام کے ساتھ لیا جاتا ہے، تو اس کی وجہ، ان کی دولت وثروت نہیں، بلکہ ان کا وہ ایمان، تقویٰ، اعمال صالحہ، ایثار اور قربانی ہیں جو آنے والی نسلوں کے لیے، انھوں نے نمونہ کے طور پر یادگار چھوڑا ہے۔ انہی متمول صحابہ کے ساتھ ساتھ، اصحابِ صفہ جیسے مفلوک الحال حضرات کا نام بھی، آج تک باعث افزائش ایمان وعمل ہے۔ ②

---

① معارف القرآن، جلد:۱، صفحہ:۲۱۔

② طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۳۹ء، صفحہ:۶۹

یہ ”سرمایہ پرست“ نہیں، بلکہ ”صاحب سرمایہ“ صحابہ کرام ہی تھے، جنھوں نے رازق کے مقابلہ میں رزق کو کبھی اہمیت نہیں دی، بلکہ اپنے ایمان بالغیب کی بناء پر، ان دیکھے رازق کے حکم پر، اپنے گاڑھے پسینے کی کمائیوں کو قربان کر ڈالا۔ اور جب بھی اسلام پر کبھی کوئی آڑا وقت آیا، انھوں نے اپنے خزانوں کے منہ کھول دیئے، اور رسول اللہ ﷺ کے قدموں پر اپنے مال و دولت کو ڈھیر کر دیا۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر، انفاقِ صحابہ کا ذکر کرتے ہوئے، کبھی، پرویز صاحب نے یہ بھی لکھا تھا:

> صحابہ کا یہ عالم تھا کہ جو کچھ کسی کے پاس تھا، لے کر حاضر ہو گیا۔ حضرت عثمان نے نو سو اونٹ، ایک سو گھوڑے، اور ایک ہزار دینار پیش کیے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے چالیس ہزار درہم دیئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، کئی ہزار روپے کا نقد جنس لے کر حاضر ہوئے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے گھر میں، اللہ اور رسول کی محبت کے سوا کچھ بھی چھوڑ کر نہ آئے، حضرت ابوعقیل انصاری نے دو سیر چھوہارے لا کر حاضر کیے اور عرض کیا کہ رات بھر کسی کے کھیت پر مزدوری کر کے چار سیر چھوہارے حاصل کیے۔ دو سیر بال بچوں کو دے آیا ہوں، اور دو سیر حاضر خدمت ہیں۔ ①

ان ایمان افروز اور یقین پرور واقعات کی روشنی میں، جس کا جی چاہے، وہ صحابہ کرام کی خوشحالی اور غناء کو، اور پھر راہِ خدا میں ان کے فیاضانہ صرفِ مال کو، ”سرمایہ دار“ اور ”سرمایہ پرست“ کے الفاظ سے نشانہ بنا لے، اور دولت جمع کرنے کو، ان کا شعار قرار دے لے، اور جس کا جی چاہے، ان کی سیرت کے اس پہلو کو، (طنز و تعریض) کی بجائے، خوبی و کمال پر محمول کر لے۔

لیکن بعد میں، جب ”مفکر قرآن“ کے رگ و پے میں، اشتراکیت کی محبت سرایت کر گئی، اور اُنھوں نے اُمتِ محمدیہ کے سامری کی حیثیت سے، اشتراکیت ہی کے بچھڑے کو

---

① معارف القرآن، جلد: ۴، صفحہ: ۵۶۰۔

(''نظامِ ربوبیت'' کے نام سے) پیش کر دیا، تو پھر لگے تاریخ کو کوسنے۔

اس کی تائید میں تاریخ آگے بڑھی، اور اس نے بتایا کہ صحابہ کرام میں بڑے بڑے سرمایہ دار موجود تھے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس بے شمار دولت تھی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے کاروبار کا یہ عالم تھا کہ ان کے مالِ تجارت کا کارواں کا اگلا اونٹ مدینہ میں ہوتا تھا اور پچھلا اُونٹ مصر میں۔ ❶

تاریخ کو ''مطابق قرآن'' بنانے کا پرویزی حیلہ

اشتراکیت کا چشمہ پالینے کے بعد، اور قرآن کریم کو اشتراکیت کے رنگ میں رنگ دینے کے بعد، اُن تاریخی حقائق کو، جن میں صحابہ کرام کے غناء وتمول اور دولت وثروت کا ذکر ہے، ردّ کر دینے کے لیے، یہ ''قرآنی وعظ'' فرماتے ہیں:

> جب بھی قرآن کے کسی بیان اور محمد رسول اللہ والذین معہ کی تاریخ کے کسی واقعہ میں تضاد نظر آئے، تو قرآن کے بیان کو صحیح اور تاریخ کے واقعہ کو غلط قرار دینا چاہیے۔ یہ ایک ایسی حقیقت باہرہ ہے، جس کے لیے کسی دلیل و شہادت کی ضرورت نہیں، یہ آپ اپنی دلیل ہے۔ ❷

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ صحابہ کرام میں، مالی تفوق کا وجود، صرف تاریخی حقیقت ہی نہیں، بلکہ قرآنی حقیقت بھی ہے۔ لیکن چونکہ خود ''مفکر قرآن'' کا اپنا ذہن بدل گیا ہے، اس لیے وہ قرآن کو پہلے اپنے ذہنی سانچہ میں ڈھالتے ہیں، بجائے اس کے کہ وہ خود اپنے ذہن کو قرآنی سانچہ میں ڈھالیں، یا بالفاظِ دیگر، وہ قرآن کے قطعی الفاظ میں، اپنا خود ساختہ مفہوم گھسیڑتے ہیں، اور پھر تاریخی واقعہ کو اپنے اس من گھڑت مفہوم کی روشنی میں ''خلافِ قرآن'' قرار دیتے ہیں۔ صحابہ کرام کا متمول، صاحب ثروت، دولت مند، اور خوشحال و تونگر ہونے کا یہ تاریخی واقعہ، دراصل، ''خلافِ قرآن'' نہیں ہے، بلکہ یہ صرف، اس مفہوم کے خلاف ہے، جسے عشق

---

❶ شاہکار رسالت، صفحہ: ۵۱۲۔

❷ طلوع اسلام، جولائی ۱۹۵۹ء، صفحہ: ۱۲۔

اشتراکیت کے زیر اثر، "مفکر قرآن" نے قرآنِ کریم کے گلے مڑھ دیا ہے۔

اب چونکہ خدا کی راہ میں، صحابہ کرام کے یہ فیاضانہ اخراجات، ان کی ذاتی ملکیت مال اور ان میں باہمی تفاضل فی الرزق پر دلالت کرتے ہیں، جو، اب پرویز صاحب کے بدلے ہوئے ذہن کے مطابق "خلافِ قرآن" قرار پا چکے ہیں، اس لیے انھیں ضرورت محسوس ہوئی کہ اشتراکیت کے مطابق، "قرآنی نظامِ ربوبیت" کی راہ ہموار کی جائے، اور اس کوشش میں کہیں بھی، صحابہ کے "سرمایہ دارانہ اخراجات" کا ذکر نہ آنے پائے۔ اس لیے، معارف القرآن جلد چہارم کو، جب "معراجِ انسانیت" کے نام سے پیش کیا گیا، تو صحابہ کرام کے ایمان و اخلاص اور ایثار و قربانی کے تفصیلی تبصرہ کو مکمل طور پر حذف کر دیا گیا، اور اقتباسِ بالا کا صرف یہ ابتدائی جملہ برقرار رکھا گیا۔

> یہ معرکہ، اخلاص و منافقت کی امتحان گاہ تھا، چنانچہ ایک طرف صحابہ کا یہ عالم تھا کہ جو کچھ کسی کے پاس تھا، لے کر حاضر ہو گیا۔ ❶

"مفکر قرآن" کی فضاءِ دماغ میں اُٹھنے والی ہر لہر کے ساتھ، یوں حقائق میں تبدیلی واقع ہو جایا کرتی تھی، اور پھر وہ مطمئن ہو جایا کرتے تھے کہ مسخ واقعات سے، ہماری تاریخ "مطابق قرآن" ہو گئی ہے۔

دوسرے تنقیدی نکتہ کا جائزہ

"مفکر قرآن" نے حدیث زیر بحث کو رد کرنے کے لیے، جو دوسرا تنقیدی، (بلکہ تغلیطی) نکتہ بیان کیا ہے، وہ، ان کے الفاظ میں یہ ہے:

> صحابہ کی معاذ اللہ کیفیت یہ تھی کہ خدا ایک حکم نازل کرتا تھا۔ اس کا رسول، اس حکم کو ان تک پہنچاتا ہے، لیکن وہ حکم، ان پر گراں گزرتا ہے۔ وہ اسے بدلوانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے لیے، معاذ اللہ، سرمایہ پرستوں کا سب سے بڑا نمایندہ، حضرت عمرؓ، رسول اللہ کے پاس جاتا ہے۔ ❷

---

❶ معراجِ انسانیت، صفحہ: ۲۹۲۔

❷ طلوعِ اسلام، اگست ۱۹۸۳ء، ص ۲۶۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے "سرمایہ پرستوں کا سب سے بڑا نمایندہ" کے الفاظ کا استعمال، "مفکرِ قرآن" کی انتہا درجے کی سوءِ ادبی ہے۔ پھر یہ کہنا کہ وہ، خدا کے حکم کو بدلوانے کی کوشش کرتے ہیں۔ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ (المائدہ:۴۱) کی بدترین مثال ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ صحابہ کرام کو یہ اشکال لاحق ہوا، کہ قرآن کے حکم عام میں، اتنی سی گنجائش بھی نہیں ہے کہ زائد از ضرورت مال و دولت میں سے ایک پیسہ بھی، اور زائد از ضرورت سونے چاندی کے زیورات میں سے، ایک طلائی یا روپہلی تار بھی رکھا جا سکے۔ اگر وہ ایسا کریں تو عذابِ الیم کے مستحق قرار پائیں گے، جب کہ قرآن، انھیں انفاق فی سبیل اللہ، قرض و اقراض، بصورتِ جنایات ادائیگیٔ کفارہ، آزادیٔ غلاماں، بیویوں کو نان ونفقہ اور حق مہر کی ادائیگی، اور دیگر امورِ خیر میں صرفِ مال کے احکام بھی جاری کرتا ہے، جن پر عملدرآمد اس کے بغیر ممکن نہیں کہ لوگوں کے پاس عفو المال ہو۔ اب اگر ان کے پاس زائد از ضرورت کچھ رقم جمع ہی نہ ہو، تو وہ ان احکام پر کیسے عمل پیرا ہو سکتے ہیں؟ اس اشکال کے ازالہ کے لیے جملہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے جب حضورِ اکرم ﷺ سے بات کی، تو آپ ﷺ کے جواب سے اُن سب کے اشکال کا ازالہ ہو گیا۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اللہ اکبر کہہ کر، اللہ کی کبریائی کا اظہار فرمایا۔

"مفکرِ قرآن" نے اس سیدھے سادے واقعہ کو، اشتراکیت کے رنگ میں خود مصبوغ ہو کر، اپنی "مفکرانہ دانشوری" کی بھینٹ چڑھا دیا، اور پھر قرآنی حکم کو بدلوا ڈالنے کی کوشش بلکہ گناہ کو، جملہ صحابہ کے سر تھوپ دیا۔ اور انھیں، اُن مشرکین سے جا ملایا، جو تبدیلیٔ قرآن کے لیے، حضورِ اکرم ﷺ سے یہ مطالبہ کیا کرتے تھے کہ:

﴿ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ۭ﴾ [یونس: ۱۵]

"ہمارے پاس کوئی اور قرآن لے آؤ، یا (کم از کم) اسے ہی بدل ڈالو۔"

صحابہ پر حکمِ خدا کا گراں گزرنا

اب رہا "صحابہ پر کسی حکمِ خدا کا گراں گزرنا" تو یہ، نہ تو کوئی قابلِ تعجب بات ہے، اور نہ ہی نا قابلِ انکار چیز ہے۔

صحابہ کرام بلاشبہ، انبیاء کرام کے بعد، صالح ترین انسانوں کا طبقہ تھا، لیکن یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ ان کی جس سیرت کا آج بلند و بالا تصور، ہمارے قلوب و اذہان میں راسخ ہو چکا ہے، وہ ان کے ایمان لانے کے پہلے دن ہی نہیں پیدا ہو گئی تھی، بلکہ وہ آہستہ آہستہ تدریجاً اس مقامِ رفیع پر فائز ہوئے تھے۔ کسی حکم خدا پر، ان کے طبائع میں گرانی کا پیدا ہونا، تقاضائے بشریت بھی ہے، جس پر خود قرآن شاہد ہے۔ یہاں زیر بحث صورتِ حال میں، صحابہؓ پر یہ حکم، بجائے خود گراں نہیں گزرتا، بلکہ اس اشکال کی بناء پر ایسا ہوتا ہے، جس کے ازالہ کے لیے سب صحابہؓ خدمت نبوی میں حاضر ہوتے ہیں، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ، رفع اشکال کے بعد، اللہ کی تعریف کے گن گاتے ہوئے، اللہ اکبر کہتے ہیں۔

اب لیجیے، ملاحظہ فرمائیے، قرآنِ کریم کی صرف دو آیات، جن میں صحابہ کرام پر حکم خدا کا گراں گزرنا مذکور ہے۔

پہلا واقعہ

ہجرت مدینہ کے بعد، جب اوّلین حکم قتال نازل ہوا، تو کیفیت صحابہ کو خود خدا نے یوں بیان فرمایا:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ [البقرة: ۲۱۶]

تم پر جنگ کرنا لازم قرار دیا گیا ہے، اور وہ تمھیں ناگوار ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں ناگوار گزرے مگر وہی تمہارے لیے بہتر ہو، اور ممکن ہے کہ ایک چیز تمھیں پسند ہو مگر وہی تمہارے لیے بری ہو، اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔

خود پرویز صاحب نے بھی، یہاں صحابہ کرام پر ”حکم خدا کے گراں گزرنے“ کو تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں:

> مال کے بعد، جانوں کی قربانی کا مرحلہ آئے گا، یعنی تم کو مخالفین سے جنگ بھی کرنی پڑے گی۔ یہ مرحلہ تم پر گراں گزرے گا، کیونکہ تم لوٹ مار کی خاطر جنگ

> کرنے کے عادی ہو۔ انسانیت کی بہبود کے لیے، جس میں ایثار ہی ایثار ہو، ذاتی منفعت کوئی نہ ہو، جنگ کرنا کارے دارد۔ ①

عہد نبوی کے منافقین، انتہائی بدطینت تھے۔ لیکن اس کے باوجود، کسی بد سے بدتر منافق میں بھی، پرویزی روح موجود نہ تھی، ورنہ وہ صحابہ کرام کو طنز وطعن کا نشانہ بناتے ہوئے، یہ ضرور کہتے کہ...... "صحابہ کی (معاذ اللہ) کیفیت یہ ہے کہ خدا ایک حکم نازل کرتا ہے، اور اس کا رسول، اس حکم کو، ان تک پہنچاتا ہے۔ لیکن وہ حکم، ان پر گراں گزرتا ہے۔ وہ اسے بدلوانے کی کوشش کرتے ہیں............"

دوسرا واقعہ

غزوۂ بدر کے موقع پر، ایک طرف ابوسفیان کا بے زور تجارتی قافلہ تھا، جس پر غلبہ پالینے کی صورت میں، کافی زیادہ مال و دولت کے ملنے کی توقع تھی، اور دوسری طرف، قریش کا لشکر جرار تھا، جو تعداد میں مسلمانوں کے لشکر سے تین گنا بڑا تھا۔ اللہ یہ چاہتا تھا کہ مسلمان تجارتی قافلہ کے درپے ہونے کی بجائے، لشکر قریش سے نبرد آزما ہوں، لیکن اہل ایمان پر اللہ کا یہ حکم گراں گزر رہا تھا۔ اور گراں بھی ایسا کہ گویا وہ موت کے منہ میں دھکیلے جارہے ہیں، اب قرآن کریم کے الفاظ بھی، اور "مفکر قرآن" کا ترجمہ بھی ملاحظہ فرمائیے:

﴿كَمَآ أَخۡرَجَكَ رَبُّكَ مِنۢ بَيۡتِكَ بِالۡحَقِّ وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنَ الۡمُؤۡمِنِينَ لَكٰرِهُونَ ○ يُجَادِلُونَكَ فِي الۡحَقِّ بَعۡدَ مَا تَبَيَّنَ كَأَنَّمَا يُسَاقُونَ إِلَى الۡمَوۡتِ وَهُمۡ يَنظُرُونَ ○﴾

[الانفال: ۵-۶]

" (اس معاملہ میں بھی ویسا ہی سمجھ) جس طرح (جنگ بدر میں) یہ بات ہوئی تھی کہ تیرے پروردگار نے سچائی کے ساتھ، تجھے تیرے گھر سے نکالا تھا، اور یہ واقعہ تھا کہ مومنوں کا ایک گروہ، اس سے ناخوش تھا۔ وہ تجھ سے اس امر میں جھگڑ پڑے، اور باوجودیکہ معاملہ واضح ہو چکا تھا، وہ باہر نکل کر

---

① تفسیر مطالب الفرقان، جلد: ۳، صفحہ: ۳۰۴۔

> مقابلہ ہونے سے اس درجہ ناخوش تھے کہ گویا انھیں زبردستی موت کے منہ میں دھکیلا جا رہا ہے۔" ①

یہاں، صحابہ کرام کے لیے لَکٰرِهُوْنَ کے الفاظ، خود اللہ تعالیٰ نے استعمال کیے ہیں۔

صحابہ کرام کے حکمِ خدا کو گراں سمجھنے کے یہ دونوں واقعات، اُسی قرآن سے پیش کیے جا رہے ہیں، جس کے متعلق، "مفکر قرآن" کے اندھے مقلدین یہ ڈھنڈورا پیٹا کرتے ہیں کہ قرآن، ہر وقت، ان کے سامنے کھلا رہتا تھا۔ اور وہ ہر وقت قرآن ہی پر غور و فکر کرتے رہتے تھے۔

تیسرے نکتے کا تنقیدی جائزہ

"مفکر قرآن" کا حدیث زیر بحث پر، تیسرا تنقیدی و تردیدی نکتہ بایں الفاظ پیش کیا گیا ہے:

> رسول اللہ (معاذ اللہ) یہ فرماتے ہیں کہ تم خدا کے اس حکم کا خیال نہ کرو۔ تم جتنی جی چاہے دولت جمع کرتے جاؤ۔ بس اس میں سے اڑھائی فیصد زکوٰۃ کو نکال دیا کرو۔ باقی دولت سب پاک ہو جائے گی۔ ②

یہ اعتراض، حدیث رسول کو نہ سمجھنے کی بناء پر، یا سمجھ بوجھ کر، اشتراکیت کی محبت میں گرفتار ہو کر، نہ ماننے کی بناء پر پیدا ہوا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے نہ تو یہ فرمایا اور نہ ہی حدیث میں وہ کچھ مذکور ہے، جو "مفکر قرآن" نے بہتانا لکھ ڈالا ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کو ایک اشکال محسوس ہوا۔ انھوں نے حضور ﷺ سے ذکر کیا۔ آپ ﷺ نے جو کچھ فرمایا، اس سے یہ ظاہر ہوا کہ آیت میں مطلق جمع مال کی سزا نہیں بیان کی گئی، بلکہ اس جمع مال کی سزا بیان کی گئی ہے، جس میں سے خدا اور اس کے بندوں کے حقوق ادا نہ کیے گئے ہوں، کیونکہ زکوٰۃ، فی الواقع حق اللہ اور حق العباد کا ایک جامع عنوان ہے۔ پس کنز، وہ ہے جس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ نہ کیا جائے۔ (لَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ کے الفاظ، اسی حقیقت کے مظہر ہیں) اور خدا اور خلق خدا کے حقوق یکسر نظر انداز کر دیے جائیں۔ ایسے کنز کی واقعی وہ سزا ہے

---

① معارف القرآن، جلد۴، ص۵۱۸۔

② طلوع اسلام، اگست ۱۹۸۳ء، ص۲۶۔

جو مذکور فی الآیت ہے۔ صحابہ کو اس پر اطمینان ہوا، اور ان کا اضطراب مبدل بہ سکون ہوا۔ لیکن چودہ سو سال بعد، وہ شخص، جس نے اشتراکیت پر قرآن کا ٹھپہ لگا کر، اُسے ''قرآنی نظام'' کا نام دے رکھا ہو، وہ نہ خود مطمئن ہو سکتا ہے، اور نہ ہی اس کی ذرّیت۔ ایسے لوگ، اپنی یہودیانہ تحریفِ قرآن کی بنیاد پر ژاژ خائی کرتے ہی رہیں گے، لہٰذا، ان کی پروا ہی نہ کی جائے۔

سوال یہ ہے کہ اگر جمع مال مطلقاً ممنوع ہوتا، تو غزوۂ تبوک میں صاحب ثروت صحابہ، قربانی و ایثار کی روش اپناتے ہوئے، وہ کثیر رقوم کیسے پیش کر سکتے تھے جسے ہم خود، پرویز صاحب ہی کے اقتباس سے ثابت کر چکے ہیں۔

صحابہؓ کے مال و دولت کی حقیقت

اب آخر میں یہ بات بھی سمجھ لیجیے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے جمع مال کی حیثیت کیا تھی۔

یاد رکھیے! ایک خدا پرست مالدار کے مال و دولت کی حیثیت اور نوعیت، کسی مال پرست آدمی کی دولت زر سے قطعی مختلف ہوتی ہے، اگر ایمانِ راسخ اور فضائل اخلاق کے ساتھ دولت دنیا موجود ہو، تو وہ بجائے خود اللہ کا فضل ہے، لیکن اگر جمع مال، خدا کی محبت کی بجائے، مال کی محبت کی بناء پر ہو، اور اس مال کے ساتھ، انسان میں تمرّد اور سرکشی بھی پیدا ہو جائے تو ایسا مال، جس فرد یا قوم کے پاس ہوگا، وہ نجس اور مبغوض مال ہوگا۔ لہٰذا، اصل چیز، ایمانِ مستحکم، اخلاقِ اسلامی اور اعمال صالحہ ہیں، جس کے ساتھ، اگر رزقِ حلال بھی موجود ہو، تو وہ نورٌ علیٰ نورٍ ہے۔ لیکن اگر دولت زر نہ بھی موجود ہو، تو ایسی ایمانی حالت اور اخلاقی فضیلت، بجائے خود، دولتِ زر سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ اس کے برعکس، اگر کوئی قوم یا فرد، ایمان کی بجائے، کفر میں، اور تقویٰ و خدا ترسی کی بجائے، نخوت و تکبر میں مبتلا ہو، خواہ اس کے ساتھ، دنیا و جہان کی دولت و ثروت اُن کے پاس موجود ہو، تو دراصل، وہ خدا کی اس آزمائش میں گرفتار ہے، جسے قرآن کی زبان میں ''استدراج'' کہا گیا ہے۔ اس حقیقت کو، خود پرویز صاحب نے بھی، ایک مقام پر تسلیم کیا ہے:

> قرآن نے بتایا ہے کہ اگر مال و دولت کے ساتھ، تقویٰ و خدا ترسی نہ ہو، اور وہ

> تکبر و نخوت اور تمرّد و سرکشی کا موجب بن جائے، تو ایسا مال، انسان کو بہت جلد ذلیل و خوار کر دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو قارون کا ذکر (۲۸: ۷۹ـ ۸۱)، اور ان دو شخصوں کا قصہ، جن میں سے ایک کے دو باغ تھے، اور دوسرا غریب تھا۔ (الکہف ع ۵، آیات ۳۲ تا ۴۵) ❶

ایک اور مقام، پرویز صاحب کا یہ اقتباس بھی موجود ہے:

> حقیقی عزت اور اعلیٰ مفاخر، دولت کی فراوانی اور سرمایہ کی کثرت میں نہیں ہے، بلکہ دلوں کے تقویٰ اور ایمان کی صلاحیت میں ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے دو انسان، جب میدانِ مسابقت میں نمودار ہوئے، تو ان میں سے ایک ہابیل، غریب تھا، لیکن خدا سے ڈرنے والا، اور دوسرا قابیل، امیر اور متکبر تھا، تو اللہ تعالیٰ نے ہابیل کی قربانی کو شرفِ قبولیت بخش کر، یہ واضح کر دیا کہ خدا کے نزدیک معیارِ فضیلت، تقویٰ ہے۔ ❷

اور یہ ظاہر ہے کہ صحابہ کرام کی دولت زر ایسی نہ تھی، جو خدا بے زار، زر پرست اور محبت مال میں گرفتار شخص کی دولت ہوا کرتی ہے۔ لیکن ہمارے ”مفکر قرآن“ ہیں کہ جب سے انھوں نے اشتراکیت کا چشمہ پایا ہے، صحابہ کی فراوانیٔ دولت اور کثرتِ مال اور تجارتی وسعت، ان کی نگاہ میں، موردِ طنز و طعن بن گئی ہے۔

اس بحث سے ان ”پرویزی حیلوں“ کی وضاحت ہو جاتی ہے، جو ”اثبات اشتراکیت“ کے لیے، مطالعۂ قرآن کی کوہ کنی میں ”مفکر قرآن“ اختیار کرتے رہے ہیں۔ ان ہتھکنڈوں پر مشتمل ٹیکنیک کا سب سے پہلا جزو یہ ہے کہ قرآن کے سانچے میں اپنے ذہن و دماغ کو ڈھالنے کی بجائے، قرآن کو اپنے اس ذہنی سانچے میں ڈھالتے ہیں جو کارل مارکس کی اشتراکیت پر ایمان و اعتقاد کے نتیجہ میں تشکیل پایا ہے۔ دوسرا جزو یہ ہے کہ قرآن کو صاحب

---

❶ طلوع اسلام، جولائی ۱۹۳۹ء، صفحہ: ۶۳، ۶۴۔

❷ طلوع اسلام، جولائی ۱۹۳۹ء، صفحہ: ۶۳۔

قرآن کے اسوۂ حسنہ کی روشنی میں سمجھنے کی بجائے، ''داس کیپیٹل'' اور مغربی معاشرت کی روشنی میں سمجھتے ہیں، اس کے لیے اصول یہ اختیار کیا گیا کہ ہر نئی نسل کو تعبیر قرآن کا حق حاصل ہے، تیسرا جزو یہ ہے کہ اشتراکیت کے رنگ میں مصبوغ ذہن، قرآن سے جو تصور بھی اخذ کرتا ہے، اسے ''معیارِ حق'' قرار دے کر، احادیث و سنن اور تاریخی حقائق کے ردّ و قبول (یا بالفاظِ دیگر ''مخالف قرآن'' اور ''مطابق قرآن'') کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔

* * * *

باب چہارم

”عجمی سازش“ کے متوازی ایک حقیقی ”عربی“ سازش

یہاں پہنچ کر، ”عجمی سازش“، یوں سمجھیے کہ پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتی ہے، اور اُمت مسلمہ، گویا، پرویز صاحب کے منسوب الی القرآن ”قرآنی دین“ سے منحرف ہو کر، (بقول ان کے) ایسے ”عجمی اسلام“ کو گلے لگا لیتی ہے، جو ایرانی دانشوروں نے مسلمانوں سے انتقام لینے کے لیے، اُنھیں، احادیث کی بنیاد پر پیش کیا تھا۔ اور آج تک جملہ علماء وفقہاء، مؤرخین و اہل سیر اور محدثین ومفسرین، اس ”سازش“ کی چکنی مٹی پر سے مسلسل پھسلتے رہے ہیں۔ چودہ صدیوں میں، اگرچہ، بڑے بڑے ذہین وفطین اور نابغۂ روزگار علماءِ اسلام، منصۂ شہود پر آئے، مگر کسی بڑے سے بڑے عالم دین کو بھی، اُس ”عجمی اسلام“ کی بو محسوس نہ ہوئی، جس کو ہندوستان میں جنم لینے والے، ایک ایسے ”مفکر قرآن“ کی قوت شامہ نے پالیا، جو خود بھی عربی نہیں بلکہ سراپا عجمی ہے۔ اس کی رگوں میں، عربی نہیں بلکہ عجمی خون ہی گردش کرتا رہا ہے۔ پھر کوئی دستاویزی ثبوت بھی، اس امر کے حق میں، اب تک پیش نہیں کیا جا سکا کہ اگر ماں باپ کی طرف سے نہیں، تو کم از کم، کسی بلڈ بینک (Blood Bank) ہی کی طرف سے، ”مفکر قرآن“ کی رگوں میں، عربی خون آیا ہو۔

بہر حال، آخری منزل کے پلیٹ فارم پر، ”عجمی سازش“ کی گاڑی کے رکتے ہی، یہ واضح ہو جاتا ہے کہ (بقول ”مفکر قرآن“) امت محمدیہ، کن ”عجمی عقائد“ کو اختیار کر چکی ہے، اور کس طرح، ”قرآنی معتقدات“ سے دُور ہو چکی ہے۔ چنانچہ اس باب میں تفصیل سے یہ بیان کیا جا رہا ہے کہ (بقول پرویز صاحب) قومِ رسولِ ہاشمی، کن ”غیر قرآنی معتقدات“ کو اپنے سینوں سے لگا چکی ہے۔ اس کے ساتھ ہی، اُن ”قرآنی معتقدات“ کی تفصیل بھی، نذرِ

قارئین کی جارہی ہے، جن پر (بقول منکرین حدیث) اہل اسلام کو ایمان لانا چاہیے تھا، اور جن کو تسلیم کیے بغیر، (اُن کے نزدیک) ایمان باللہ کا اعتراف و اقرار بھی، کوئی قدر و قیمت اور اہمیت و حیثیت نہیں رکھتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ خوردبین لگا کر، دیکھنے سے بھی، قرآنِ کریم میں، ایسے کسی عقیدے کا وجود کہیں نظر نہیں آتا۔

لیجیے، اب ملاحظہ فرمایئے، "قرآنی" اور "غیر قرآنی معتقدات" کی تفصیل ...... جس میں قارئین کرام پر یہ حقیقت بھی بے نقاب ہو جائے گی کہ "مفکر قرآن" صاحب، اپنے فکری حریفوں کی جس بات پر زبانِ طعن دراز کیا کرتے تھے، ویسی ہی بات، خود اُن کے قلم سے بھی صادر ہوتی رہی ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جن جرائم کا وہ خود ارتکاب کرتے رہے ہیں، ٹھیک ان ہی جرائم کا (یا ان جیسے جرائم کا) الزام، وہ، اپنے نظریاتی مخالفین پر لگاتے رہے ہیں، تاکہ اس الزام بازی سے، وہ، عامتہ الناس کی توجہ، اپنے جرائم سے ہٹا کر، دوسروں کی طرف مبذول کر ڈالیں، اور یوں خود اُن کے، عیوب و نقائص، نگاہِ ناظرین کی گرفت میں نہ آ سکیں۔ کیونکہ "مفکر قرآن" کے ایسے مثالب و مناقص کو، بعید از نگاہ رکھنا، دراصل، اُس حقیقی اور اصلی "عربی سازش" کو نگاہوں سے اوجھل رکھنے کو مستلزم ہے جو خود انھوں نے "عجمی سازش" کے متوازی، گھڑ ڈالی تھی، اور جس کا سارا، اینٹ گارا، مغرب کی فاسد معاشرت اور اشتراکیت کی قاہرانہ آمریت سے ماخوذ ہے۔

قارئین کرام پر، یہ حقیقت واضح رہنی چاہیے کہ گذشتہ ابواب میں، "نکات پرویز" کو، جس تسلسل کے ساتھ، نمبروار پیش کیا گیا ہے، اُسی تسلسل کو، اس باب میں بھی برقرار رکھا گیا ہے۔

(۶۲) "عجمی سازش" کے اثرات، اُمت مسلمہ پر — (۱) — عقیدۂ تقدیر"

شاہکارِ رسالت میں "مفکر قرآن" صاحب، ایک لمبی رام کہانی بیان کرتے ہوئے، یہ انکشاف فرماتے ہیں کہ خلافت راشدہ کے بہت بعد، عقیدۂ تقدیر کو، مسلمانوں میں، ایرانیوں نے پھیلایا تھا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> قرآنِ کریم کی رو سے ایمان کے پانچ اجزاء ہیں۔ اللہ، ملائکہ، انبیاء، کتب اور آخرت۔ (۲:۱۷۷۔۴:۱۳۶) سارے قرآن میں انہی اجزاء کا ذکر ہے۔ انہی کے اقرار سے ایک شخص، مسلمان ہوتا ہے، اور انہی کے انکار سے کافر۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اب، ایمان کے پانچ اجزاء نہیں، چھ ہیں۔ اور چھٹا جزو یہی عقیدۂ تقدیر ہے۔ ❶

اس کے بعد، تھوڑا سا آگے چل کر، مزید فرماتے ہیں:

> ایمان کے پانچ اجزاء، خدا نے مقرر کیے تھے۔ ان میں ایک کا اضافہ بعد میں کر دیا گیا۔ اب کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا، جب تک وہ تقدیر پر ایمان نہ لائے۔ ❷

اسی بات کو، وہ، اپنی تفسیر مطالب الفرقان میں، بایں الفاظ دہراتے ہیں:

> یہاں ایک نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔ قرآنِ کریم نے ایمان کے پانچ اجزاء بیان کیے ہیں۔ (۱) اللہ پر ایمان، (۲) رسولوں پر ایمان، (۳) ملائکہ پر ایمان، (۴) کتابوں پر ایمان، (۵) آخرت پر ایمان۔
>
> لیکن ہمارے ہاں، ان میں (اپنی طرف سے) ایک اور جزو کا اضافہ کر لیا گیا ہے، یعنی تقدیر پر ایمان (یعنی معاذ اللہ، خدا کی فہرست میں، جو کمی رہ گئی تھی، اُسے ہم نے پورا کر دیا۔) ❸

اب اس بَرخود غلط ''مفکرِ قرآن'' کو یہ بات کون سمجھائے کہ تقدیر پر ایمان، کوئی مستقل اور جداگانہ عقیدہ نہیں ہے، بلکہ یہ ایمان باللہ ہی کا ایک حصہ ہے جسے اس کی اہمیت کے پیش نظر، الگ سے بیان کیا جاتا ہے، بالکل اُسی طرح، جس طرح، ختمِ نبوت کا عقیدہ، حضرت محمدؐ کی رسالت و نبوت پر ایمان ہی کا ایک جزو ہے، لیکن دورِ حاضر میں، اس کی اہمیت کے پیش

---

❶ + ❷ شاہکارِ رسالت، صفحہ: ۵۱۶ تا ۵۱۷۔

❸ تفسیر مطالب الفرقان، جلد: ۴، صفحہ: ۴۲۵۔

نظر، اسے بھی جداگانہ حیثیت سے بیان کیا جاتا ہے۔ ختم نبوت کے عقیدہ کی یہ جداگانہ حیثیت، اور پھر اس کی یہ اہمیت، آج کے خصوصی حالات کا تقاضا قرار پا گئی ہے، لیکن عقیدۂ تقدیر کو یہ اہمیت، خود نبی اکرم ﷺ نے عطا فرمائی تھی۔

> عن علي قال: قال رسول الله ﷺ لا يؤمن عبد حتى يؤمن بأربع: بالله وحده لا شريك له وأني رسول الله والبعث بعد الموت والقدر. ❶

> حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، کوئی شخص صاحب ایمان نہیں جب تک کہ وہ چار چیزوں پر ایمان نہ لائے، اللہ کے واحد اور لاشریک ہونے پر، میری رسالت پر، بعث بعد الموت اور تقدیر پر۔

لیکن ہمارے ’’مفکر قرآن‘‘ کو احادیث رسول سے جو چڑ، ضد، تعصب اور عداوت و بیر ہے، اس کی بناء پر، وہ یہ لکھتے نہیں جھجکتے کہ:

> یہ جو ہمارے ہاں، ایمان کی تفصیل بیان کی جاتی ہے کہ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلٰئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى. تو اس میں وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ کا اضافہ، خارج از قرآن اور مسئلہ تقدیر کو جزوِ ایمان قرار دینے کی عجمی سازش ہے۔ ❷

بہر حال، عقیدۂ تقدیر کو اسلامی عقائد میں، ایمان باللہ کے اہم جزو کی حیثیت سے جداگانہ طور پر بیان کرنا، نہ تو اسلامی عقائد میں اضافہ ہی ہے اور نہ ہی یہ کسی عجمی سازش کا نتیجہ ہے۔ اسے خود رسول اللہ ﷺ ہی نے یہ اہمیت دی ہے کہ اسے ایمان باللہ کے ایک اہم اور لازمی جزو کے طور پر، جداگانہ انداز میں بیان فرمایا ہے، لیکن پرویز صاحب کو احادیث رسولؐ سے، جو بغض و عناد اور کینہ و کدورت لاحق ہے، اس کا نشانہ خود، ذاتِ رسولؐ بھی بنے بغیر نہیں

---

❶ سنن ابن ماجہ، باب فی القدر، حدیث: ۸۱۔

❷ تفسیر مطالب الفرقان، جلد: ۳، صفحہ: ۱۵۶۔

رہتی، کیونکہ ''مفکر قرآن'' رسولِ رحمان کے عمل کو بھی عجمی سازش قرار دینے سے نہیں چوکتے۔

''مفکر قرآن'' کا رسولِ قرآن سے معارضہ و مقاومہ

کیا یہ عجیب بات نہیں کہ اگر رسول اللہ ﷺ عقیدۂ تقدیر کو، ایمان باللہ ہی کی شاخ کے طور پر، اس کا الگ ذکر فرمائیں، تو وہ ''عجمی سازش'' قرار پا جاتی ہے، لیکن اگر خود ''مفکر قرآن''، اپنی طرف سے ایک نیا عقیدہ گھڑ کے، اسلامی عقائد میں داخل کر دیں، تو یہ، نہ صرف یہ کہ ''عجمی سازش'' نہیں ہے، بلکہ ''تفسیر قرآن'' اور ''خدمت اسلام'' ہے۔

واضح رہے کہ ''مفکر قرآن'' نے، ''انسانی ذات پر ایمان'' کا ایک نیا عقیدہ تراش کر، اُسے اس قدر اہمیت دی کہ اس پر ایمان لائے بغیر، خدائے قدوس پر ایمان لانا بھی بے فائدہ اور بے معنیٰ ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

> اگر کوئی شخص، اس خدا کو مانتا ہے جس نے کارگہ کائنات کو پیدا کیا اور جس کے قوانین کے مطابق، یہ عظیم الشان سلسلہ، اس حسن و خوبی سے چل رہا ہے، لیکن وہ انسانی ذات پر یقین نہیں رکھتا، تو قرآن کی رُو سے، اس کا خدا کو ماننا، کچھ معنیٰ نہیں رکھتا۔ انسان کا اپنی ذات پر ایمان، خدا پر ایمان کی بنیادی شرط (Pre-Requisite Condition) ہے۔ ❶

کیا ستم ظریفی ہے کہ اگر پرویز صاحب، کسی من گھڑت عقیدے کو ایسی اہمیت دیں کہ گویا اس کے مانے بغیر، ایمان باللہ کا عقیدہ ہی بے معنیٰ ہو کر رہ جائے، تو وہ ''مفکر قرآن'' کہلائیں، لیکن اگر خود رسولِ خدا ہی، ایک عقیدے کو، دوسرے عقیدہ میں سے برآمد شدہ فرع اور جزو کی حیثیت سے، اس کی اہمیت کے پیشِ نظر، جداگانہ انداز میں بیان کریں، تو وہ عقیدہ، ''مفکر قرآن'' کی نگاہ میں ''قرآنی ایمانیات میں اضافہ''، ''مجوس کا وضع کردہ عقیدہ'' اور ''عجمی سازش کا نتیجہ'' قرار پاتا ہے، اور اس قابل ہو جاتا ہے کہ ''مفکر قرآن'' صاحب، اس پر ''خدا کی نامکمل فہرست کو مکمل کر دینے'' کی طنز کر گزریں۔

---

❶ طلوعِ اسلام، مئی ۱۹۵۹ء، صفحہ: ۳۰۔

ایمانیاتِ خمسہ اور ''انسانی ذات پر ایمان'' کا عقیدہ

''مفکر قرآن'' کا قرآنی ایمانیات خمسہ پر مشتمل اقتباس (تفسیر مطالب الفرقان، جلد چہارم، صفحہ ۴۲۵ اور شاہکارِ رسالت، صفحہ: ۵۱۶ اور ۵۱۷ کے حوالہ سے) پہلے پیش کیا جا چکا ہے۔ ایمانیاتِ خمسہ کی اس فہرست میں، ''انسانی ذات پر ایمان'' کا عقیدہ، سرے سے موجود ہی نہیں ہے، لیکن پھر بھی اسی عقیدے پر ایمان لانا، ''قرآنی ایمانیات میں اضافہ'' نہیں ہے، اور یہ عقیدہ، ''مجوس کا وضع کردہ عقیدہ'' بھی نہیں ہے، کیونکہ اسے فی الواقع، مجوس نے وضع نہیں کیا، بلکہ منکرین حدیث کے ''مفکر قرآن'' ہی نے وضع کیا ہے، اور نہ ہی اسے ماننا اور عقاید اسلام میں داخل کرنا، کوئی ''عجمی سازش'' ہے، کیونکہ ''مفکر قرآن'' صاحب، تو ماشاء اللہ ''خالص عرب'' ہیں، جن پر عجمیت کی کوئی پرچھائیں تک نہیں پڑی۔ پھر بھلا وہ کسی ''عجمی سازش'' میں کیسے شریک ہو سکتے ہیں؟

عقیدۂ تقدیر اور طلوعِ اسلام

حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک ''انسانی ذات پر ایمان'' کا تعلق ہے، عہد رسالت اور خلافت راشدہ کیا معنی، کسی بھی دور میں اس کا وجود تک نہیں ملتا، لیکن اس کے مقابلہ میں، عقیدۂ تقدیر، قرآن سے بھی، اور احادیث سے بھی ثابت ہے، اور صحابہ کرام، اس پر ایمان رکھتے تھے۔ خود طلوعِ اسلام کو بھی، ایک موقع پر، اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے، ایک مرتبہ، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہوتے ہوئے، اس عقیدہ کا اقرار و اعتراف کیا تھا

> خدا نے جو کچھ مقدر کر دیا ہے، اس کے سوا ہمیں کچھ نہیں پیش آ سکتا۔ ①

حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے جو کچھ فرمایا ہے، وہ ہو بہو، قرآنِ کریم کی اس آیت کا مفہوم ہے:

﴿ قُل لَّن يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا ۚ ﴾ [التوبة: ٥١]

---

① طلوعِ اسلام، مارچ ۱۹۵۳ء، صفحہ: ۱۷۔

> ”آپ فرما دیجیے، ہمیں وہی کچھ پہنچے گا جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ رکھا ہے۔“

یہ عقیدہ کہ والقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالیٰ (ہر اچھی اور بری تقدیر، اللہ ہی کی طرف سے ہے)، خود قرآن کے مختلف مقامات پر موجود ہے، مثلاً: وَنبلو کم بالشر والخیر فتنۃ۔ اچھے اور برے حالات کے ذریعہ، اللہ کی طرف سے لوگوں کی آزمائش، آخر عقیدۂ تقدیر کے سوا، کیا چیز ہے؟ پھر راحت ورنج، دُکھ اور سکھ، شادی وغم، فتح وشکست اور خوف وامن میں سے، ہر پہلو کا منجانب اللہ ہونا، (جسے قرآنِ کریم ...... کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ ...... کہتا ہے) والقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالیٰ ہی کا تو، پرتو ہے۔ لیکن ہمارے ”مفکرِ قرآن“ صاحب، اس عقیدہ کو مجوس کا وضع کردہ عقیدہ قرار دیتے ہوئے بھی، اس پر مجبور ہیں کہ اسی عقیدہ پر اساس پذیر ایک جملہ کو (قرآنی آیت کا تاثر دیتے ہوئے) اپنی نکتہ طرازی کا ذریعہ بنائیں، اور یہ سمجھائیں کہ قرآن میں، ”اللہ“ سے مراد، ذاتِ خداوندی نہیں، بلکہ ”اس کا قانون“ ہے۔

> رنج اور راحت، سب خدا کی طرف سے ملتے ہیں، یعنی مصیبت اور راحت، سب قانونِ خداوندی کے مطابق ملتے ہیں۔ ①

کیا ہی عجیب بات ہے کہ اگر ”مفکرِ قرآن“ صاحب، یہ فرمائیں کہ ”رنج اور راحت، سب خدا کی طرف سے ملتے ہیں“ تو وہ قرآنی تعلیم قرار پائے، جو اُن کے لیے نکتہ آرائی کا ذریعہ بن جائے، لیکن اگر محمد رسول اللہ کی لسانِ مبارک سے ”اچھی اور بری تقدیر منجانب اللہ ہے“ کا جملہ صادر ہو جائے، تو وہ ”عجمی سازش“ اور ”مجوس کا وضع کردہ عقیدہ“ قرار پائے۔

”مفکرِ قرآن“ کی مزید گوہر افشانیاں

”مفکرِ قرآن“ صاحب، رسول اللہ ﷺ کے بیان کردہ عقیدہ تقدیر کے خلاف، اپنی بھڑاس نکالتے ہوئے، فرماتے ہیں:

> ”عجمی سازش“ نے اس عقیدہ کو اُمت میں عام کر کے ...... بلکہ اسے اس کا جزوِ ایمان بنا کر ...... اس ہمہ تن شعلہ جوالہ قوم کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا، اور اس کی نگاہ کا

---

① سلیم کے نام، جلد: ۱، صفحہ: ۱۰۸۔

> زاویہ، اس طرح بدل دیا کہ اگر کوئی شخص ان سے کہے کہ یہ چھٹا جزوِ ایمان، قرآن پر اضافہ اور اس کی بنیادی تعلیم کے یکسر خلاف ہے، تو قوم اس کے لیے صلیبیں کھڑی کر دیتی ہے۔ ①

زوال و انحطاط اور نکبت و زبوں حالی کے اس دور میں، قوم کہاں صلیبیں کھڑی کرتی ہے؟ پھر دینی اعتبار سے جو قوم راکھ کا ڈھیر بن چکی ہو، اس سے صلیبوں کے کھڑا کرنے کی توقع کی ہی نہیں کی جا سکتی۔ اگر قوم، نظریاتی طور پر بیدار ہوتی، اسلام کا گہرا شعور رکھتی، مقتضیاتِ اسلام سے واقف ہوتی، تو ''انسانی ذات پر ایمان'' کا نیا عقیدہ پیش کرنے پر، اور قرآنی عقائدِ خمسہ پر اضافہ کرنے پر، ضرور یہ قوم صلیبیں کھڑی کر دیتی۔

اس کے بعد، قدرے آگے چل کر، ''مفکرِ قرآن'' فرماتے ہیں:

> تقدیر کا ایک مفہوم وہ تھا جسے عمر رضی اللہ عنہ نے سمجھایا تھا، اور ایک مفہوم وہ ہے جسے عجمی سازش نے وضع کیا۔ ②

یہ عبارت، اس امر کو واضح کر دیتی ہے کہ عقیدۂ تقدیر، صحابہؓ کے ہاں معروف و مسلم عقیدہ تھا، اگر یہ بعد میں کوئی وضع شدہ عقیدہ ہوتا اور عہدِ صحابہ میں اس عقیدہ کا وجود ہی نہ ہوتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کا کوئی مفہوم سمجھا ہی نہ سکتے تھے۔ نیز اس اقتباسِ پرویز سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ عقیدۂ تقدیر، بحیثیت ایک عقیدہ کے، ایرانی مجوسیت نے وضع نہیں کیا تھا، بلکہ ہو سکتا ہے کہ اس کا غلط مفہوم وضع کیا ہو، جب کہ یہ عقیدہ پہلے سے موجود تھا۔

اس بحث سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ:

۱ .... عقیدۂ تقدیر، قرآن و سنت سے ثابت ہے، صحابہؓ کے ہاں، اس عقیدہ کا رائج و متداول ہونا، ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ حضرت ابوذر غفاری، بقول طلوعِ اسلام، اس عقیدہ کے معترف تھے، اور حضرت عمرؓ، نے اسی عقیدہ کا ایک صحیح اور درست معنی و مفہوم واضح کیا تھا۔ لہٰذا، ''مفکرِ قرآن'' کا یہ افسانہ اپنے اندر کوئی حقیقت نہیں رکھتا کہ یہ اعتقاد، معبد بن خالد

---

① شاہکارِ رسالت، صفحہ: ۵۱۷ تا ۵۱۸۔

② شاہکارِ رسالت، صفحہ: ۵۱۸۔

جہمی اور ایرانی اساورہ کی کوششوں سے اُمت مسلمہ میں پھیلا ہے۔

2 .... "مفکر قرآن" نے عقیدۂ تقدیر کو، قرآنی عقائد میں اضافہ قرار دیتے ہوئے، خدا کی فہرست کو مکمل کر دینے کی جو طنز فرمائی ہے، وہ عقیدۂ تقدیر کے ساتھ، تو کوئی تعلق نہیں رکھتی، البتہ اس عقیدہ کے متوازی اور مدمقابل، "انسانی ذات پر ایمان" کے عقیدہ پر خوب پھبتی، جچتی اور سجتی ہے۔

یہاں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ "مفکر قرآن" صاحب، اپنے فکری مخالفین کی جن باتوں پر زبانِ طعن دراز کرنے کے عادی تھے، ویسی ہی باتیں، وہ، خود بھی کیا کرتے تھے، اب یہاں دیکھئے کہ عقیدۂ تقدیر کو وضعی عقیدہ قرار دے کر، علماءِ اُمت کو مطعون کرنے کے بعد، ان کا خود "انسانی ذات پر ایمان" کا عقیدہ وضع کرنا، اس کی واضح مثال ہے۔

(۶۳) "عجمی سازش" کے اثرات، اُمت مسلمہ پر ــــ (۲) ــــ تصوف

کتب شیعہ سے ماخوذ، اقتباسات کی روشنی میں، "مفکر قرآن" نے جس "عجمی سازش" کا افسانہ تراشا ہے، اس کے اثرات میں سے دوسرا اثر "تصوف" کا رائج ہونا ہے۔ "مفکر قرآن" نے اپنی کتب میں، مختلف مقامات پر، تصوف کو، اوّلاً، ایک غیر اسلامی تصور قرار دیا ہے، ثانیاً، علامہ اقبال کے حوالے سے، اسے "اسلام کی سرزمین میں ایک "اجنبی پودا" سمجھا ہے، اور ثالثاً، صوفیاء کے کشف و الہام کو، عقیدہ وحی کے مساوی سمجھ کر، اسے عقیدۂ ختم نبوت کے منافی اور اجرائے نبوت کا ہم معنی قرار دیا ہے۔ یہ تینوں امور کتب پرویز میں، مختلف اور متفرق مقامات پر مذکور ہیں، اس لیے، اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے، ہماری توجہ، صرف شاہکارِ رسالت تک ہی محدود نہیں رہی ہے، بلکہ "مفکر قرآن" کی دیگر نگارشات تک بھی متعدی اور وسیع ہوگئی ہے۔

(الف) حقیقت تصوف ...... اسلامی یا غیر اسلامی؟

جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ تصوف کی اصل حقیقت کیا ہے؟ کیا اسلام میں، اس کی

اصل و اساس موجود ہے یا نہیں؟ آیا یہ گلشن اسلام ہی کا ایک پودا ہے، یا سرزمین اسلام میں کوئی اجنبی پودا ہے؟ تو اس کے بارے میں، علماءِ سلف وخلف کی آراء پیش کرنے کی بجائے، خود "مفکر قرآن" ہی کے چند اقتباسات، نذرِ قارئین کرام کرنا زیادہ مناسب ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں

> اعمال میں اخلاص کا ہونا ضروری ہے۔ اخلاص نہ ہو تو پھر اعمال، یا تو محض ریاکاری ہو جاتے ہیں یا مشینی عمل، کہ جس میں حرکت تو ہوتی ہے لیکن روح مفقود۔ جب عوام میں کچھ ظاہرداری آنے لگی حقیقت بین نگاہوں نے اخلاص پر زور دیا، اور اعمال کے اصل مقصد یعنی تزکیۂ نفس، صفائی قلب، انابت الی اللہ اور خشیت باری تعالیٰ کی طرف توجہ دلائی۔ یہ سمجھئے تصوف کی اصل۔ ①

ٹھیک، یہی وہ چیز ہے جسے علماءِ کرام، روحانیت سے بھی تعبیر کرتے ہیں، اور خود پرویز صاحب نے بھی، ایک مقام پر، یہی تعبیر اختیار کی ہے

> یاد رہے کہ اگر خشیت وتقویٰ کہ جسے آپ روحانیت کہہ لیجیے، خدا کی رحمت و بخشش ہے، تو دنیاوی شوکت وعظمت بھی کچھ کم نعمت نہیں۔ اور یہ وہ نعمت ہے جس کی یاددہانی، اقوامِ عالم کو بار بار کرائی جاتی ہے۔ ②

ایک اور مقام پر تصوف کی ابتداء کے بارے میں، "مفکر قرآن" صاحب تحریر فرماتے ہیں:

> عبادات میں اخلاص کا ہونا ضروری ہے۔ اسے قرآنی اصطلاح میں احسان کہتے ہیں۔ اگر اخلاص نہ ہو تو پھر عبادات یا تو محض ریاکاری ہو جاتی ہیں، یا مشینی عمل کہ جس میں حرکت تو ہوتی ہے لیکن روح مفقود۔ جب عوام میں کچھ ظاہرداری آنے لگی تو حقیقت بین نگاہوں نے اخلاص پر زور دیا، اور عبادات کے اصل مقصد، یعنی تزکیۂ نفس اور صفائی قلب کی طرف توجہ دلائی۔ یہ تھی تصوف کی ابتداء، لیکن جس طرح اور شعبوں میں غلو وتشدد ہوا، اُسی طرح، بلکہ اس سے بڑھ کر، اس

---

① طلوع اسلام، مئی ۱۹۴۰ء، صفحہ: ۲۶۔

② طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۳۹ء، صفحہ: ۲۸۔

شعبہ میں ہوا۔ ❶

قارئین کرام سے گزارش ہے کہ ''مفکر قرآن'' کے ان اقتباسات کے مفہوم کو اپنے قلوب و اذہان میں متحضر رکھیں، کیونکہ آگے ان کی طرف اشارات آرہے ہیں۔ اب جب کہ تصوف کی اصل حقیقت، عبادات و اعمال میں اخلاص، نفوس کا تزکیہ، قلوب کی صفائی، انابت الی اللہ اور خشیت باری تعالیٰ ہی ہے، تو کون مسلمان، اسلام میں، اس کے وجود سے انکار کرسکتا ہے؟ قرونِ اولیٰ میں یہی چیز، احسان کہلاتی تھی، جو خود ''مفکر قرآن'' کے نزدیک، ایک قرآنی اصطلاح ہے۔ البتہ یہ درست ہے کہ صحابہ کرام اور مسلمانانِ قرونِ اولیٰ میں، تصوف کی اصطلاح موجود نہیں تھی، لیکن اس کی حقیقت اور اصل و اساس، نہ صرف یہ کہ قرآن و سنت میں، بلکہ فرزندانِ اسلام کے کردار میں بھی موجود تھی۔ جب کہ دورِ حاضر میں، تصوف کی اصطلاح، بڑے زور و شور سے موجود اور متداول ہے مگر اس کی روح مفقود و معدوم ہے، اور پھر قرونِ اولیٰ کے بعد، مرورِ ایام کے ساتھ، (بقولِ پرویز صاحب) ''جس طرح، اور شعبوں میں غلو و تشدد ہوا، اُسی طرح، بلکہ اس سے بڑھ کر، اس شعبہ میں بھی ہوا۔'' اور نتیجہ یہ نکلا کہ عصر حاضر میں جو تصوف پایا جاتا ہے، اس میں ایک عنصر، خالص قرآن و سنت سے ماخوذ ہے، جس کی نہ صرف حمایت کرنے کا، بلکہ اسے زندہ رکھنے کا اسلام خود تقاضا کرتا ہے۔ دوسرا عنصر قطعی غیر اسلامی ہے جسے ردّ کرنا، ویسا ہی تقاضائے اسلام ہے، جیسا کہ باطل کی ہر صورت کو مٹانا، مطالبہ قرآن ہے، اور تیسرا عنصر وہ ہے جس میں اسلام اور غیر اسلام کی آمیزش پائی جاتی ہے، اس میں سے، غیر اسلام، کو الگ کرنا، اور اسلامی تصوف کو، خالص، بے آمیز اور منقّح شکل میں پیش کرنا، ضروری ہے، تیسرے عنصر کو بلا تطہیر و اصلاح قبول کرنا، غذائے مسموم کو قبول کرنے کے مترادف ہے۔ خود حضرت علامہ اقبالؒ نے تصوف میں اعلیٰ اور ادنیٰ تصوف کی تمیز کرتے ہوئے، اوّل الذکر کو اپنانے اور مؤخر الذکر کو ترک کرنے کی یہ کہہ کر تلقین فرمائی ہے۔

> تصوف، اپنے اس مرتبہ سے، جہاں وہ روحانی تعلیم کی ایک قوت رکھتا تھا، نیچے گر کر، عوام کی جہالت اور ضعفِ اعتقادی سے فائدہ اُٹھانے کا ذریعہ بن گیا تھا

---

❶ ماہنامہ ترجمان القرآن، جلد: ۱۰، نمبر: ۳، صفحہ: ۱۷۵۔

> ....بیسویں صدی کے مصلحین نے اس قسم کے تصوف کے خلاف علم بغاوت بلند کردیا .... ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان، اسلام کی روح سے آشنا ہوجائیں۔ ❶

ایک اور مقام پر، علامہ اقبالؒ نے تطہیر وتجدید تصوف پر زور دیا، اور اس سلسلہ میں حضرت مجدد الف ثانی کی تجدیدی مساعی پر، انھیں خراجِ عقیدت بھی پیش کیا۔ چنانچہ علامہ اقبالؒ:

> فرمانے لگے کہ تصوف کا علم پرانا اور کسی قدر نکما ہوچکا ہے۔ اس سلسلہ میں، ضرورت ہے کہ زمانۂ حاضر کے علم نفسیات کی روشنی میں، اس کی پھر تجدید کی جائے، اس کام میں شیخ احمد سرہندی کی تحقیقات بہت امداد دے سکتی ہیں۔ ❷

الغرض، تصوف کی اصل واساس، اسلام میں موجود ہے، اور قرآنی اصطلاح میں اسے احسان کہا جاتا ہے۔ گردشِ ایام کے نتیجہ میں، جس طرح دیگر شعبوں میں بگاڑ پیدا ہوا۔ اسی طرح، یہ شعبہ بھی فساد کا شکار ہوا۔ اور یہ سب کچھ پرویز صاحب کے اقتباسات ہی سے ثابت کیا جاچکا ہے۔ لیکن ان کا المیہ یہ تھا کہ وہ ہر معاملہ میں تضاد وتناقض کی روش اپنایا کرتے تھے، چنانچہ تصوف کی حقیقت واصلیت کے بارے میں بھی، جب ان کا مزاج معکوس ہوا، تو پھر انھوں نے یہ کہنا شروع کردیا:

> تصوف کو اسلامی اور غیر اسلامی شقوں میں تقسیم کرنا، ایسا ہی ہے جیسے کوئی اسلامی کمیونزم اور غیر اسلامی کمیونزم کا تصور پیش کرے۔ ❸

(ب) کیا تصوف سرزمین اسلام میں اجنبی پودا ہے؟

”مفکر قرآن“ کا ذہن ودماغ، جب تصوف کی مخالفت پر پلٹا تو انھوں نے یہ راگ الاپنا شروع کردیا کہ علامہ اقبالؒ نے تصوف کو سرزمین اسلام پر، ایک اجنبی پودا قرار دیا ہے:

---

❶ طلوعِ اسلام، اپریل ۱۹۶۲ء، صفحہ: ۲۲۔

❷ طلوعِ اسلام، مئی ۱۹۶۱ء، صفحہ: ۸۰۔

❸ طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۶۶ء، صفحہ: ۴۰۔

> اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ تصوف کا وجود ہی سرزمین اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے، جس نے عجمیوں کی دماغی آب و ہوا میں پرورش پائی ہے۔ (اقبال نامہ، جلد اوّل، صفحہ: ۷۸) ❶

علامہ اقبالؒ کے اس اقتباس کو اپنے ناروا استحصال (Exploitation) کا نشانہ بناتے ہوئے ''مفکر قرآن'' نے اپنے لٹریچر میں متعدد مقامات پر پیش کیا ہے، حالانکہ اگر اس فرمودۂ اقبال کے دورِ صدور کی تحقیق و تفتیش کی جائے تو ''مفکر قرآن'' کی مغالطہ آفرینی اور فریب دہی کا پردہ چاک ہو جاتا ہے۔

تصوف کے حوالہ سے، علامہ اقبالؒ کی زندگی کے تین دور ہیں۔ ابتداء میں تصوف کے قائل اور حامی تھے۔ اس کے بعد، وہ اس کے مخالف ہو گئے، اپنے آخری دور میں، وہ، دوبارہ تصوف کی طرف لوٹ آئے، اور اس کے گرویدہ دلدادہ ہو گئے۔ ان ادوارِ ثلاثہ کا اعتراف، خود پرویز صاحب نے بھی، اور طلوع اسلام نے بھی کیا ہے۔ چنانچہ پرویز صاحب لکھتے ہیں:

> ان کی زندگی کو عام طور پر تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔
>
> (۱) شروع سے ۱۹۱۳ء تک...... تصوف کی فضا سے متاثر
>
> (۲) ۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۷ء تک...... تصوف کے خلاف
>
> (۳) ۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۸ء تک...... پھر تصوف کے حق میں۔ ❷

طلوعِ اسلام میں بھی ان ادوارِ ثلاثہ کا ذکر، بایں الفاظ موجود ہے:

> تصوف کے متعلق، اقبال کے نظریات، ہمیشہ ہی متنازعہ رہے ہیں، کسی زمانہ میں وہ تصوف کے دلدادہ تھے، پھر ایک زمانہ آیا کہ وہ اس کو مسلمانوں کے زوال کا سبب سمجھنے لگے۔ اسی زمانہ میں، انھوں نے ''تصوف، شعبدہ بازیوں کی کمند'' جیسا مضمون تحریر کیا۔ اس کے علاوہ، وہ تصوف کو اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا کہا

---

❶ شاہکارِ رسالت، صفحہ: ۵۱۸۔

❷ تصوف کی حقیقت، صفحہ: ۳۲۱۔

کرتے تھے۔ اور اس کے بعد، عمر کے آخری حصے میں، پھر اسی کی طرف آ گئے۔ ❶

" تصوف کو شعبدہ بازوں کی کمند" بھی، علامہ اقبالؒ نے اس دور میں کہا تھا، جب وہ تصوف کے خلاف تھے، حتی کہ خود پرویز صاحب ہی یہ لکھتے ہیں

> علامہ اقبالؒ نے ۱۹۱۷ء میں (Islam and Mysticism) کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جو لکھنؤ کے اخبار (New Era) کی ۲۸ جولائی ۱۹۱۷ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا، اس میں انھوں نے تصوف کو "شعبدہ بازوں کی کمند" کہہ کر پکارا تھا۔ ❷

اب "مفکر قرآن" کی مغالطہ آفرینی اور دھوکہ بازی یہ ہے کہ وہ، علامہ اقبال کی زندگی کے درمیانی دور میں کہی ہوئی بات کو، تو، اپنے حق میں بطور دلیل قبول کرتے ہیں، لیکن اُن کے بعد کے اُس دور کو نظر انداز کر دیتے ہیں جس میں تصوف کی مخالفت کو ترک کر کے، دوبارہ اسے قبول فرما لیتے ہیں، اور "مفکر قرآن" صاحب اپنے الفاظ کی تماشہ گری (Jugglery of Words) کے ذریعہ، اپنے قارئین کو، اوّلاً، یہ تاثر دیتے ہیں کہ تصوف کی مخالفت کا دور ہی، ان کا "قرآنی دور" ہے، اور ثانیاً یہ کہ، یہی مخالفتِ تصوف کا زمانہ، ان کی زندگی کا آخری زمانہ تھا، چنانچہ علامہ اقبالؒ کے جو فرمودات، "مفکر قرآن" کے نظریات سے ہم آہنگ نہیں، اُن کے بارے میں، وہ، یہ ڈھنڈورا پیٹا کرتے تھے کہ...... "یہ اُس زمانے کی بات ہے، جب وہ قرآنی تعلیمات سے دُور اور غافل تھے۔"

> اقبال کی طرف منسوب، ان قصوں کا بھی جواب یہ ہے کہ یہ اُس زمانے یا اُن لمحات کی باتیں ہیں، جب قرآنی حقائق سے وہ متعارف نہیں ہوئے تھے، یا وہ، اُن کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ ❸

گویا، اُن کی زندگی کا آخری دور (جس میں وہ دوبارہ تصوف کی طرف پلٹ آئے تھے)

---

❶ طلوع اسلام، جون ۱۹۸۵ء، صفحہ: ۱۱۔

❷ شاہکار رسالت، صفحہ: ۵۲۵

❸ طلوع اسلام، مئی ۱۹۸۴ء، صفحہ: ۳۰۔

وہ زمانہ تھا، ”جب قرآنی حقائق سے وہ پھر غیر متعارف ہو چکے تھے، یا وہ، اُن کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکے تھے۔“

ایک بے لاگ اور نیک نیت محقق کے لیے لازم ہے کہ وہ کسی کے سابقہ اور متروکہ فرمودات سے تمسک اختیار کرنے کی بجائے، ان فرامین کو قبول کرے، جو اُس کے آخری دورِ حیات کے فرامین ہیں، اور جن کی گرویدگی، آخری سانس تک برقرار اور قائم رہی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ تصوف کو ”شعبدہ بازوں کی کمند“ اور اسے ”سرزمین اسلام میں ایک اجنبی پودا“ قرار دینا، اقبال کے وہ تصورات تھے، جنھیں وہ، اُس دور میں ظاہر کیا کرتے تھے، جب وہ تصوف کے مخالف تھے، لیکن بعد میں، جب وہ دوبارہ تصوف کے دلدادہ ہوئے، تو اپنے ان تصورات سے وہ دستبردار ہو چکے تھے۔ ”مفکرِ قرآن“ کا، علامہ اقبالؒ کے آخری دور کے مؤقف سے نظریں چرا کر، اُن کے دورِ سابق کی رائے کو بطورِ دلیل پیش کرنا، ایسا ہی ہے، جیسا کوئی شخص، حرمتِ شراب سے قبل، صحابہؓ کی روشِ مے خوری سے، شراب پینے کا جواز نکال ڈالے۔

(ج) صوفیاء کا کشف والہام

جہاں تک نفسِ الہام کا تعلق ہے، وہ، انبیاءِ کرام کے علاوہ، غیر انبیاء کے حق میں بھی، قرآنِ کریم سے ثابت ہے، اللہ تعالیٰ نے، اُمِّ موسیٰ کو، نومولود کی جان کی بابت خوف وخطرہ کے پیشِ نظر، گہرے سمندر میں بہا دینے کا جو حکم دیا تھا، وہ الہامی وحی ہی کے ذریعے دیا تھا، جیسا کہ درج ذیل آیت سے ظاہر ہے:

﴿ وَأَوْحَيْنَآ إِلَىٰٓ أُمِّ مُوسَىٰٓ أَنْ أَرْضِعِيهِ، فَإِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَأَلْقِيهِ فِى الْيَمِّ وَلَا تَخَافِى وَلَا تَحْزَنِىٓ إِنَّآ رَآدُّوهُ إِلَيْكِ وَجَاعِلُوهُ مِنَ الْمُرْسَلِينَ ۝ ﴾ [القصص: ۷]

”ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کی ماں کو وحی کی کہ اسے دودھ پلاتی رہ۔ جب تمھیں اس (کی زندگی) کی بابت خوف لاحق ہو، تو اسے سپردِ بحر کر دینا، اور نہ ہی خوف کرنا، اور نہ ہی رنج۔ ہم اسے تیری طرف لوٹا دیں گے اور اسے پیغمبر بنا دیں گے۔“

اسی طرح، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کو الہامی وحی کے ذریعے، یہ حکم دیا گیا کہ وہ ایمان لائیں۔

﴿ وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ۝ ﴾ [المائدۃ: ۱۱۱]

"اور میں نے حواریوں کو یہ (الہامی) وحی کی کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ، وہ کہنے لگے "ہم ایمان لائے، تو (اے پروردگار!) گواہ رہ کہ ہم مسلمان (فرمانبردار) ہیں۔"

اب ظاہر ہے کہ نہ تو اُمّ موسیٰ، اور نہ ہی حواریین عیسیٰ، منصب نبوت و رسالت پر فائز تھے کہ انھیں وہ وحی کی جاتی، جو حضراتِ انبیاء ہی کا خاصہ ہے۔ انھیں (غیر نبی ہوتے ہوئے) جو وحی کی گئی تھی، وہ وہی چیز ہے، جسے الہام کہا جاتا ہے۔ پس جہاں تک نفس الہام کا تعلق ہے، وہ قرآنِ کریم سے ثابت ہے، اور یہ الہامی علم، صرف انبیاء و مرسلین ہی کو نہیں بلکہ غیر از انبیاء و رُسل کو بھی دیا جاتا ہے۔

الہامی وحی کی اس صریح اور واضح حقیقت کا انکار کرتے ہوئے، آیات کی یہ تاویل کر ڈالنا، کہ اُمّ موسیٰ اور حواریین عیسیٰ کو، جو حکمِ خدا دیا گیا تھا، وہ براہِ راست نہیں تھا بلکہ کسی اور نبی یا پیغمبر کے واسطہ سے دیا گیا تھا، ایک گھناؤنی تحریف قرآن ہے۔ اور خود خدائے قدوس کی تکذیب کے مترادف ہے، کیونکہ انبیاء کے ذریعے، اعلانیہ پیغام پہنچا دینے کے لیے، تبلیغ کا لفظ استعمال ہوتا ہے، نہ کہ وحی و ایحاء کا، جس میں "خفیہ طریقہ سے اشارہ کر دینا" کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اعلانیہ تبلیغ احکام پر، وحی و ایحاء کا لفظ استعمال کرنا، عربی زبان سے جہالت و بے خبری کی دلیل ہے۔

اب رہا صوفیاء کا کشف والہام، تو اس کے بارے میں، "مفکر قرآن" (جہالتاً یا شرارتاً) دو حقیقتوں کو نظر انداز کر ڈالتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ:

> وحی اور کشف والہام میں صرف لفظی فرق ہے۔ مفہوم اور معانی کے اعتبار سے دونوں، ایک ہی ہیں، یعنی خدا سے براہِ راست علم حاصل ہونا۔ ①

---

① شاہکار رسالت، صفحہ: ۵۲۰۔

یہ دونوں، ایک ہی چیز ہیں یا الگ الگ؟ ان میں لفظی فرق ہے یا نہیں؟ اس بحث میں پڑنا، اصل حقیقت سے فرار اختیار کرنا ہے، جبکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ نفس الہام، خود قرآنِ مجید سے ثابت ہے۔ اُمّ موسیٰ اور حواریین عیسیٰ کو، بالیقین، وہ احکام، خدا سے براہِ راست (بذریعہ الہامی وحی) ملے تھے، جو اوپر دی گئی آیات میں مذکور ہیں۔

اب ''مفکرِ قرآن'' کا، اسے عقیدۂ ختم نبوت کے منافی، قرار دینا، صرف اور صرف اسی صورت میں درست قرار پا سکتا ہے، جب کہ اس کشف والہام کے ذریعہ ملنے والے علم کو، انبیاء کے علم وحی سے بالاتر جانتے ہوئے، یا کم از کم اس کے ہم مرتبہ سمجھتے ہوئے، اسے سب کے لئے واجب الاطاعت قرار دیا جائے۔ اُمت مسلمہ میں، آج تک کسی مسلمان نے، بقائمی ہوش وحواس، اور بحیثیت مسلم، نہ تو اس طرح کے کشفی والہامی علم کو، علم وحی پر فوقیت دی ہے، اور نہ ہی اُسے، اس کا ہم مرتبہ قرار دیا ہے۔ بنی نوع انسان، جس علم کے اتباع و پیروی کے مکلّف ٹھہرائے گئے ہیں، وہ صرف اور صرف انبیاء ورسل کا علم وحی ہے، جو ہر بندۂ مومن کے نزدیک سند و حجت کا درجہ رکھتا ہے، نہ کہ غیر نبی کا کشفی والہامی علم۔ اس علم کا عام لوگوں پر حجت ہونا تو رہا ایک طرف، خود صاحب کشف والہام کے لیے بھی، یہ دلیل و حجت نہیں بن سکتا۔ مدعی کشف والہام کے لیے بھی، سند و حجت، وہ علم ہے جو قرآن وسنت پر مشتمل ہے۔ اپنے مقصود و ہدف کے ''اثبات'' کی دُھن میں یہ وہ (پہلی) حقیقت ہے، جس کو ''مفکر قرآن'' نے ہمیشہ نظر انداز کیا ہے، لیکن، بہر حال، طلوع اسلام میں، آج سے پچپن چھپن سال قبل، نامعلوم کس مصلحت کے تحت، اس کا ذکر بایں الفاظ کیا گیا تھا:

> سب کو معلوم ہے کہ آج تک کشف والہام کو دین میں، کسی نے بھی حجت قرار نہیں دیا، حتیٰ کہ خود صاحب کشف اپنے کشف کو، خود اپنے لیے بھی دینی حجت نہیں مانتا۔ ❶

رہی دوسری حقیقت، جسے ''مفکر قرآن'' نے (دیدہ دانستہ یا غیر شعوری طور پر) ہمیشہ نظر

---

❶ طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۵۲ء، ص ۵۳ تا ۵۴۔

انداز کیے رکھا، یہ ہے کہ کشف والہام کی بناء پر، کسی کے لیے بھی شرعاً یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ملہم من اللہ ہونے کا دعویٰ کرے، یا اپنے کشفی علم اور الہامی وحی کو، کفر و ایمان کی کسوٹی قرار دے، اور یہ ادّعاء کرے کہ میرے علم کو ماننے والا، مومن اور اس کو نہ ماننے والا، کافر ہے۔ کفر و اسلام کا فیصلہ صرف اور صرف، اس علم وحی کی بنیاد پر ہے، جو انبیاء و رسل کے توسط سے، مخلوقِ خدا تک پہنچتا ہے۔ اسی علم کی بناء، وہ، اپنے مہبطِ وحی ہونے کا دعویٰ کرنے کے مجاز قرار پاتے تھے۔

اب، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ .... (۱) علم کشف و الہام، خود صاحب کشف و الہام کے لیے بھی سند و حجت نہیں ہے کجا یہ کہ وہ دوسروں کے لیے ایسا ہو، اور (۲) کشف و الہام کی بناء پر، کوئی شخص، کسی دینی منصب کا دعویٰ دار ہونے کا بھی مجاز نہیں ہے .... تو پھر ''مفکرِ قرآن'' کا یہ رٹ لگائے جانا کہ ''وحی اور کشف و الہام ایک ہی چیز ہے، اور اس سے عقیدۂ ختم نبوت مجروح ہوتا ہے، اور اجرائے نبوت کا دروازہ کھلتا ہے،'' ایک ایسی ہٹ دھرمی ہے، جو صرف ''مفکرِ قرآن'' ہی کے شایانِ شان ہے، اور اس سخن سازی کا مقصد بھی، وحی اور کشف و الہام میں خلط مبحث پیدا کر کے، لوگوں کے قلوب و اذہان میں شکوک و شبہات کے کانٹے ڈالنا ہے۔

باقی رہے صوفیاء کے بعض غلط افکار و نظریات، تو ایسی اغلاط اور بے اعتدالیاں صرف حلقۂ صوفیاء تک ہی محدود نہیں ہیں۔ دوسرے طبقوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ صرف صوفیاء کو ہی نشانہ بنانا، اور دوسروں کو نظر انداز کرنا، کسی بے لاگ اور غیر جانبدار محقق کا کام نہیں ہو سکتا۔ خود ''مفکرِ قرآن'' نے بھی، نہ صرف اسلامی عقائد میں ''انسانی ذات پر ایمان'' کا نیا عقیدہ داخل کیا ہے، بلکہ اشتراکیت کے معاشی نظام کو بھی، من و عن قبول کر کے، اس پر ''قرآن'' کا ٹھپہ لگا دیا ہے، اور مغرب کی بے حیا اور برہنہ معاشرت کے اجزاءِ فاسدہ کو، قرآن کے نام پر درآمد کیا ہے۔ موازنہ کیا جائے تو ''مفکرِ قرآن'' کی تلبیسات و تحریفات کا پلڑا، جملہ صوفیاء کی مجموعی اغلاط سے کہیں زیادہ وزنی ثابت ہوگا۔

(۶۴) ''عجمی سازش'' کے اثرات، اُمت مسلمہ پر

___ (۳) ___ تصوف میں مجوسی عقائد

''مفکرِ قرآن'' کی یہ ایک مستقل عادت تھی کہ وہ جھوٹ سچ کا ملغوبہ تیار کر کے، خلط مبحث کے ذریعے تقلیبِ امور، تنکیسِ واقعات اور مسخِ حقائق کی روش اپنایا کرتے تھے، اور پھر اس طریقہ سے اپنے موقف کے حق میں، دلائل تراشا کرتے تھے۔ چنانچہ وہ تزکیۂ نفس کا معنی، ''ترکِ دنیا'' کو اہل تصوف کے کھاتہ میں ڈالنے کے لیے، مندرجہ ذیل الفاظ میں، سخن سازی کرتے ہیں۔

> مجوسیت کا بنیادی تصور، اہرمن اور یزداں کی ثنویت تھا، یعنی خیر اور شر کی مسلسل جنگ، صوفیہ نے کہا کہ انسانی ذات، روحِ خداوندی کا ایک جزو ہے، جو اپنی اصل سے الگ ہو کر، مادہ کی دلدل میں پھنس گئی ہے۔ مادہ سراسر شر ہے، اور روحِ خداوندی (خواہ وہ کل ہو یا اس کا جزو) خیر۔ اب دنیا میں مادہ اور روح کی کشمکش جاری ہے، اور انسانی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ انسانی ذات، مادہ کی کثیف دلدل سے نکل کر، پھر سے اپنی اصل میں جا کر جذب ہو جائے، اس عقیدے کا لازمی نتیجہ، مادی دنیا کو قابل نفرت سمجھنا ہے۔ چنانچہ ترکِ علائق، ترکِ لذات، یعنی دنیا اور مافیہا کو قابل نفرت سمجھ کر، اس سے دور بھاگنا، تزکیۂ نفس کی بنیادی شرط ہے۔ ❶

اس اقتباس میں مندرجہ ذیل امور قابل غور اور سزاوارِ توجہ ہیں۔

① .... پورا اقتباس یہ ظاہر کرتا ہے کہ ''مفکرِ قرآن'' نے، مجوسی عقائد و تصورات کو بیان کر کے، مادہ اور روح کی کشمکش کو، خیر و شر کی جنگ کے طور پر پیش کرتے ہوئے، انسانی روح کے مادہ کی دلدل سے نکلنے کو، نجات، قرار دیا ہے، اور پھر اسی مذہب مجوسیت کو آخری جملے میں، یہ کہہ کر صوفیاءِ اسلام کے گلے مڑھ دیا ہے کہ...... ''دنیا و مافیہا کو قابل

---

❶ شاہکارِ رسالت، صفحہ: ۵۲۱۔

نفرت سمجھ کر، اس سے دور بھاگنا، ''تزکیۂ نفس'' کی بنیادی شرط ہے۔ اسے کہتے ہیں تلبیس حق و باطل۔

2 .... اقتباسِ بالا میں سچ کا عنصر صرف اس قدر ہے کہ..... ''دنیا میں خیر و شر کی جنگ برپا ہے'' ..... لیکن خیر کیا ہے؟ شر کیا ہے؟ اسے مجوسی نقطۂ نظر سے پیش کیا گیا ہے۔ (حالانکہ یہ صرف مجوس ہی کا نقطۂ نظر نہیں ہے، بلکہ ہر باطل مذہب کا نقطہ نظر ہے۔) اسلامی نقطۂ نظر کو پیش نہیں کیا گیا ہے، جس کے مطابق، انسان کا اپنے خالق و مالک، رازق و ربّ، محسن و منعم اور مجازی و محاسب، خدائے واحد کی اطاعت کرنا خیر ہے اور اس کی نافرمانی کرنا شر ہے..... خیر و شر کا یہی تصور، اسلام اور اسلامی تصوف میں پایا جاتا ہے۔ بعد کے ادوار میں'' جس طرح اور شعبوں میں غلو اور تشدد ہوا، اُسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر، اس شعبہ میں بھی ہوا۔'' اس فرق کو ہم بھی تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن آخر یہ کیا امانت و دیانت اور عدل و انصاف ہے کہ غیر اسلامی مذاہب باطلہ سے خیر و شر کا تصور لے کر، اسے مسلم صوفیاء کی طرف منسوب کر ڈالا جائے، اور پھر نتیجتاً، تزکیۂ نفس کا معنی، ترکِ دنیا، کر ڈالا جائے۔

3 .... اسلامی تصوف، جس چیز کا نام ہے، وہ اخلاص فی العمل، انابت الی اللہ، صفائی قلب، تطہیر باطن، اور خشیت الٰہیہ کے زیر اثر، فعل الخیرات اور ترک المنکرات کا نام ہے۔ اسی کو (بقول پرویز صاحب) قرآنِ کریم میں احسان کہا گیا ہے۔ اب بتائیے کہ اس تصوف کا، آخر، اُس تصوف سے کیا تعلق ہے، جسے علامہ اقبالؒ نے سرزمین اسلام میں اجنبی پودا قرار دیا، یا جسے شعبدہ بازوں کی کمند کہا تھا؟ الفاظ کے ہیر پھیر سے، مسلک مجوسیت کے عقائد و تصورات کو، اس تصوف کی طرف منسوب کر ڈالنا، جسے (بقولِ پرویز) اُس قرآن کی اصطلاح میں احسان کہا گیا ہے، جس میں:

﴿لَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا	''دنیا میں سے اپنا حصہ نہ فراموش کر، اور جیسی
وَأَحْسِنْ كَمَآ أَحْسَنَ اللّٰهُ إِلَيْكَ	اللہ نے تجھ سے بھلائی کی ہے، ویسی تو بھی
وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ ط﴾	لوگوں سے بھلائی کر، اور زمین میں طالب

[القصص : ۷۷]   فساد نہ ہو۔"

کی تعلیم دی گئی ہے۔ یہ نہ صرف یہ کہ بدترین تحریف قرآن ہے، بلکہ ناواقفانِ دین کو دھوکہ دینے کے بھی مترادف ہے۔

ہاں! ہم اس بات کے قائل ہیں کہ قرآنِ کریم کی تعلیم یہ ہے...... اور اس پر وہ بہت زور بھی دیتا ہے...... کہ دنیا پر آخرت کو ترجیح دی جائے، اس لیے کہ: وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى۔ (آخرت، دنیا کے مقابلہ میں بہتر بھی ہے اور باقی و برقرار رہنے والی بھی ہے۔) آخرت کو ترجیح دیتے ہوئے، دنیا کا جو مال بھی کمایا جائے گا، وہ بندوں پر، اللہ کی طرف سے فضل و رحمت اور نعمت و بخشش ہے۔ دین کے تابع رہ کر، حاصل کی ہوئی دنیا، نہ تو قابل نفرت ہی ہے، اور نہ مبغوض ہے۔ البتہ وہ دنیا اور اس کا مال، یقیناً اسلام کی نگاہ میں ملعون و مطعون ہے، جو خدا و آخرت کو فراموش کر دینے کے نتیجہ میں حاصل ہو۔ قرآن و سنت میں ایسی ہی دنیا کی مذمت کی گئی ہے۔ خود پرویز صاحب کا یہ اقتباس بھی، اسی حقیقت کا ترجمان ہے:

> قرآن نے بتایا ہے کہ مال و دولت کے ساتھ، اگر تقویٰ اور خدا ترسی نہ ہو، اور وہ تکبر، نخوت، تمرد اور سرکشی کا موجب بن جائے، تو ایسا مال، انسان کو بہت جلد ذلیل و خوار کر دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو قارون کا ذکر۔ (۲۸:۷۹۔۸۱)
>
> اور ان دو شخصوں کا قصہ، جن میں سے ایک کے دو باغ تھے، اور دوسرا غریب تھا۔
>
> (الکہف، آیات: ۳۲۔۴۵) ❶

اور یہ اقتباس پرویز بھی، اسی حقیقت کا مظہر ہے:

> حقیقی عزت اور اعلیٰ مفاخر، دولت کی فراوانی اور سرمایہ کی کثرت میں نہیں ہے، بلکہ دلوں کے تقویٰ، اور ایمان کی صلاحیت میں ہے، چنانچہ سب سے پہلے دو انسان، جب میدانِ مسابقت میں نمودار ہوئے، جن میں سے ایک ہابیل غریب تھا، لیکن خدا سے ڈرنے والا۔ اور دوسرا قابیل، امیر اور متکبر تھا، تو اللہ تعالیٰ نے

---

❶ طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۳۹ء، صفحہ: ۶۳ تا ۶۴۔

> ہابیل کی قربانی کو شرفِ قبول بخش کر، یہ واضح کر دیا کہ خدا کے نزدیک معیارِ فضیلت، تقویٰ ہے۔ ❶

پھر یہ بھی ''مفکرِ قرآن'' کا کذبِ خالص اور بہتان صریح ہے کہ...... ترکِ علائق، ترکِ لذات، یعنی دنیا ومافیہا کو قابلِ نفرت سمجھ کر، اس سے دور بھاگنا، تزکیۂ نفس کی بنیادی شرط ہے۔''...... رسولِ اکرم اور نبی معظم ﷺ کے فرائضِ منصبی میں تزکیۂ نفس کا فریضہ بھی شامل ہے، کیا ''مفکرِ قرآن'' یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حضور ﷺ کے ہاں بھی تزکیۂ نفس کا یہی مفہوم تھا؟ جو تصوف ادوارِ مابعد میں پیدا ہوا، اس کی برائیوں کو، اُس تصوف کی طرف منسوب کر ڈالنا، جسے قرآنِ کریم بطورِ احسان تسلیم کرتا ہے، نہ صرف علمی خیانت ہے، بلکہ فریب دہی بھی ہے۔

(۶۵) ''عجمی سازش'' کے اثرات، اُمتِ مسلمہ پر ــ (۴) ــ باطنی معانی

چوتھا اثر، جو (بقول پرویز صاحب) ''عجمی سازش'' کے باعث، اُمتِ مسلمہ پر ہوا، وہ ''باطنی معانی'' کا اثر ہے۔ چنانچہ ''مفکرِ قرآن'' صاحب فرماتے ہیں:

> صوفیاء کا دعویٰ ہے کہ ان کے تمام عقائد اور نظریات کا مدار، قرآنِ کریم پر ہے، (پرویز صاحب اور ان کے اتباع بھی، ایسا ہی دعویٰ کیا کرتے ہیں۔ قاسمی) اس کے لیے وہ کہتے ہیں کہ قرآن کے وہ معنی، جو اس کے الفاظ سے سمجھ میں آتے ہیں، ظاہر بینوں کے لیے ہیں۔ اس کے حقیقی معنی، اس کے باطن میں پوشیدہ ہیں (''مفکرِ قرآن'' بھی ایسا ہی کہتے ہیں، لیکن ذرا الفاظ کو بدل کر،...... قاسمی) اور یہ باطنی علم صرف صوفیاء کو حاصل ہوتا ہے۔ اس علم باطن کی رو سے، وہ، قرآنی آیات کو کس طرح مسخ کرتے ہیں، اس کا اندازہ، ابن عربی کی بیان کردہ، ایک مثال سے لگائیے۔ قرآنِ کریم میں ہے: ﴿مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ

---

❶ طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۳۹ء، صفحہ: ۶۳۔

> وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرٰى ۝﴾ [۲۰ : ۵۵]۔ اس کا صاف اور سیدھا ترجمہ یہ ہے...... "ہم نے تمھیں اسی زمین سے پیدا کیا، اسی میں تمھیں لوٹائیں گے، اور اسی سے تمھیں باردگر نکالیں گے۔"...... ابن عربی، اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں...... "ہم سب احدیت سے نکلے تھے۔ فنا ہو کر، پھر احدیت میں جا چھپیں گے۔ پھر بقا ملے گی اور دوبارہ نمودار ہوں گے۔" (فصوص الحکم) ①

یقیناً، قرآنی تصوف سے ہٹے ہوئے صوفیاء میں، اس طرح کے دور خیز معانی پائے جاتے ہیں، جن کی بناء پر، وہ غلط تفسیر پیش کرتے ہیں، لیکن ایسی غلط اور دُور از کار تفاسیر کا وجود صرف صوفیاء ہی میں نہیں پایا جاتا، دیگر طبقات میں بھی پایا جاتا ہے۔ لیکن "مفکر قرآن" صاحب سب سے صرفِ نظر کرتے ہوئے، صرف صوفیاء ہی کو نشانہ بناتے ہیں، جو ان کے مخصوص مقاصد اور خفیہ ہدف کا تقاضا ہے۔

"باطنی معانی" سے بدتر، "مفکر قرآن" کے مجازی مفاہیم

ابن عربی کی طرف سے، آیت (۲۲:۵۵) کا جو باطنی معنی پیش کیا گیا ہے، اُسے بھی پیش نظر رکھیے، اور پھر "مفکر قرآن" کا وہ معنی و مفہوم بھی ملاحظہ فرمائیے، جو انھوں نے وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يٰمُوسٰى کی قرآنی آیت (اور اس کے بعد کی آیات) کا تحریر فرمایا ہے۔ اس آیت کا صاف اور سیدھا ترجمہ یہ ہے کہ "اور تیرے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟ اے موسیٰ!" پھر یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ یہ آیت وَ + مَا + تِلْكَ + بِ + يَمِيْنِ + كَ + يَا + مُوْسٰى کے صرف آٹھ الفاظ پر مشتمل ہے، اور "مفکر قرآن" ان آٹھ الفاظ پر مشتمل آیت کا مفہوم و مراد، جب بیان کرنے پر اُتر آتے ہیں، تو الفاظ کا بے پناہ امنڈتا ہوا سیلاب، اُن کے قلم سے اس طرح برآمد ہوتا ہے کہ حقیقت منہ چھپائے پھرتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔ مفہومِ آیت، جسے اگرچہ "مفکر قرآن" صاحب، باطنی مفہوم نہیں کہتے، لیکن اُن کا بیان کردہ مفہوم، ابن عربی کے پیش کردہ "باطنی مفہوم" سے بدرجہا بدتر اور گیا گزرا ہے۔ ابن عربی کے محولہ بالا باطنی معنی میں، صرف هَا کی

---

① شاہکارِ رسالت، صفحہ: ۵۲۱۔

ضمیر کو (جو مِنۡهَا اور فِيۡهَا میں مذکور ہیں) زمین کی بجائے، ''احدیت'' کی طرف لوٹایا گیا ہے، لیکن اس کے مقابلہ میں، ''مفکر قرآن'' کا مفہوم، سراپا مجموعۂ اغلاط ہی نہیں، بلکہ خدائی مفہوم کی قطعی تردید اور صریح تغلیط کا آئینہ دار ہے۔

> (چنانچہ اس کے بعد، موسیٰ کو، اس انقلابی پروگرام کے سلسلہ میں ہدایات و احکام دیے گئے۔ ان میں فریق مقابل کو روشن دلائل و براہین سے قائل کرنے کی ہدایات بھی تھیں، اور مقابلہ کے وقت، قوت اور سخت گیری سے کام لینے کے احکام بھی۔ جب یہ احکام دیے جا چکے، تو ندائے غیب نے کہا کہ (اے موسیٰ! تم ان احکام و ہدایات پر، قوت اور برکت، ہر دو نقاطِ نگاہ سے غور کرو، اور بتاؤ کہ انھیں کیسا پاتے ہو؟ ❶

اس مفہوم آیت سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ''مفکر قرآن'' صاحب کے نزدیک، شاید، الفاظِ قرآن کی پابندی سے آزاد ہو کر، اپنے من پسند اوہام و وساوس کے لیے مسرفانہ الفاظ کا کباڑ خانہ جمع کرنا ہی، مفہومِ آیت قرار پاتا ہے۔ اسی طرح کے ''مفاہیم'' اُن آیات کے بھی بیان کیے گئے ہیں، جو وَمَا تِلۡكَ بِيَمِيۡنِكَ يٰمُوۡسٰى کے بعد کی آیات ہیں۔ قارئین کرام کی سہولت کے پیش نظر، آیات مع ترجمہ ملاحظہ فرمائیے!

﴿قَالَ هِيَ عَصَايَ اَتَوَكَّؤُا عَلَيۡهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيۡ وَلِيَ فِيۡهَا مَاٰرِبُ اُخۡرٰى ○ قَالَ اَلۡقِهَا يٰمُوۡسٰى ○ فَاَلۡقٰهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسۡعٰى ○ قَالَ خُذۡهَا وَلَا تَخَفۡ سَنُعِيۡدُهَا سِيۡرَتَهَا الۡاُوۡلٰى ○ وَاضۡمُمۡ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخۡرُجۡ بَيۡضَآءَ مِنۡ غَيۡرِ سُوۡٓءٍ اٰيَةً اُخۡرٰى ○﴾

[طٰهٰ: ۱۸ تا ۲۲]

> ''(موسیٰ نے) کہا'' یہ میری لاٹھی ہے چلنے میں اس کا سہارا لیتا ہوں۔ اسی سے اپنی بکریوں کے لیے پتے جھاڑتا ہوں، میرے لیے اس میں اور بھی طرح طرح

---

❶ مفہوم القرآن، صفحہ: ۷۰۵۔

> کے فائدے ہیں" حکم ہوا: "اے موسیٰ! اسے ڈال دے۔" چنانچہ موسیٰ نے ڈال دیا، اور دیکھتا کیا ہے کہ وہ تو ایک سانپ ہے جو دوڑ رہا ہے۔ حکم ہوا: "اب اسے پکڑ لے، ہم اسے پھر اس کی اصلی حالت پر کیے دیتے ہیں، اور (نیز یہ حکم) "اپنا ہاتھ اپنے پہلو میں رکھ، اور پھر نکال، بغیر اس کے کہ کسی طرح کا عیب ہو، چمکتا ہوا نکلے گا۔ یہ (تیرے لیے) دوسری نشانی ہوئی۔"

یاد رکھیے کہ ان آیات کا یہ صاف اور سیدھا ترجمہ بھی، جناب پرویز صاحب ہی کے قلم سے پیش کیا گیا ہے، جو معارف القرآن، جلد سوم، صفحہ ۲۰۲ تا ۲۰۳ سے ماخوذ ہے۔ اب ابن عربی کے باطنی معانی کے بالمقابل، ان ہی آیات کا "مفکر قرآن" کا ماڈرن مفہوم بھی ملاحظہ فرمایئے:

> ۱۸ ...... موسیٰ نے عرض کیا "بارِالٰہا! یہ احکام کیا ہیں، میرے لیے تو سفرِ زندگی میں بہت بڑا سہارا ہیں۔ میں اب انہی کے آسرے سے چلوں گا، اور ہر مشکل مقام پر انھیں مضبوطی سے تھامے رکھوں گا تاکہ میرا قدم کہیں نہ پھسلے۔ انہی کے ذریعے، اب میں اپنے ریوڑ یعنی بنی اسرائیل کو، جن کا گڈریا بنا کر تو مجھے بھیج رہا ہے، جھنجھوڑوں گا، اور اس طرح ان کے جمود و تعطل کو مبدل بہ حرکت و عمل کر دوں گا۔ ان کے علاوہ، زندگی کے دیگر معاملات کے متعلق، جو میرے سامنے آئیں گے، ان سے بصیرت و راہنمائی حاصل کروں گا۔
>
> ۱۹ ...... حکم ہوا "تم نے ٹھیک سمجھا ہے۔ اب تم انھیں لوگوں کے سامنے پیش کرو۔
>
> ۲۰ ...... اس کے بعد، جب موسیٰ نے اس مہم پر غور کیا، جس کے لیے اسے مامور کیا جا رہا تھا، تو اسے اندازہ ہوا کہ ان احکام کا لوگوں کے سامنے پیش کرنا آسان کام نہیں۔ اس نے ایسا محسوس کیا کہ وہ ضابطۂ احکام نہیں، ایک اژدہا ہے جو تیزی سے دوڑ رہا ہے۔

۲۱ ...... خدا نے موسیٰ کو اطمینان دلایا، اور کہا کہ اس خیال سے مت گھبراؤ۔ ان احکام کو مضبوطی سے تھامے رکھو۔ ان کے متعلق جو بات، تم نے پہلے کہی تھی (کہ ان سے فلاں فلاں منفعت بخش کام لوں گا) ہم انھیں ویسا ہی بنا دیں گے (یہ اژدہا کی طرح ہلاکت آفریں ہوں گے باطل کے لیے، لیکن تمہارے اور تمہاری قوم کے لیے سہارا بن جائیں گے۔)

۲۲ ...... اس مہم میں تو بالکل پریشان نہ ہو، بلکہ نہایت اطمینان وسکون اور کامل دلجمعی سے اپنی دعوت کو واضح اور روشن دلائل کے ساتھ پیش کرتا چلا جا۔ تو تمام مشکلات سے محفوظ ومصئون باہر نکل آئے گا۔ تیری یہ کامیابی، تیری دعوت کی دوسری نشانی ہوگی۔ (پہلی نشانی دشمن کی تباہی، اور دوسری نشانی تمہاری جماعت کا تمکن اور سرفرازی۔) ❶

ابن عربی کا باطنی مفہوم اور ''مفکر قرآن'' کا مجازی مفہوم

ابن عربی کے باطنی مفہوم کے مقابلہ میں، سورۂ طٰہٰ کی چند آیات کا یہ مفہوم، جو ''مفکر قرآن'' نے پیش کیا ہے، کہیں زیادہ باطل اور بدتر ہے۔ ابن عربی کے باطنی مفہوم میں، یقیناً صحت سے بعد پایا جاتا ہے، لیکن ''مفکر قرآن'' کے مفہوم میں تو سرے سے صحت پائی ہی نہیں جاتی۔ علاوہ ازیں، ایک دوسرا (اور بہت ہی نمایاں) فرق یہ ہے کہ ابن عربی (بقولِ پرویز صاحب) اپنے بیان کردہ باطنی مفہومِ آیت کو، ''باطنی مفہوم'' ہی قرار دیتا ہے، لیکن ''مفکر قرآن'' صاحب، ابن عربی کے باطنی مفہوم سے کہیں زیادہ بدتر، باطل اور بے بنیاد مفہوم پیش کرتے ہیں، لیکن اسے ''باطنی مفہوم'' کہنے کی بجائے، (بربناءِ خیانت ودروغ گوئی) مجازی مفہوم کہتے ہیں۔

آیات نمبر ۱۷ تا ۲۲ میں، الفاظ کے مجازی معانی لیے گئے ہیں۔ ❷

گویا، ابن عربی، غلط کار ہونے کے باوجود، دیانتدار ہے کہ وہ، اپنے بیان کردہ مفہوم کو

---

❶ مفہوم القرآن، صفحہ: ۷۰۵ تا ۷۰۶۔ ❷ مفہوم القرآن، صفحہ: ۷۰۶۔

(بقولِ پرویز صاحب) ''باطنی مفہوم'' ہی قرار دیتا ہے، لیکن ہمارے ''مفکر قرآن'' صاحب، غلط کار ہونے کے ساتھ ساتھ خیانت کار بھی ہیں، اور باطنی معانی سے بڑھ کر، ازحد غلط، انتہائی گمراہ کن اور نہایت ہی باطل مفہوم پیش کرتے ہیں، اور پھر ''عذرِ گناہ، بدتر از گناہ'' کا مصداق بنتے ہوئے، انھیں باطنی معانی قرار دینے کی بجائے، ''مجازی معانی'' کہہ ڈالتے ہیں۔ حالانکہ مجازی معانی، ایسے معانی ہوتے ہیں، جو معاشرہ میں رائج اور متداول ہونے کی بناء پر، ہر شخص کے لیے قابل فہم ہوتے ہیں، متکلم سے سنتے ہی، سامعین فوراً مجازی مفہوم سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن جہاں تک ''مفکر قرآن'' کے بیان کردہ ان معانی و مفاہیم کا تعلق ہے، تو ان کا وجود، نہ تو دورِ نزولِ قرآن ہی میں تھا، اور نہ ہی بعد کے کسی دور میں کبھی رہا، یہاں تک کہ عصر حاضر میں، معارف القرآن جلد سوم کی تصنیف تک، خود ''مفکر قرآن'' صاحب بھی، ان معانی سے ناآشناءِ محض تھے۔

آخر ''باطنی معانی'' اور ''مجازی معانی'' میں کیا فرق پایا جاتا ہے کہ اسے اگر اوّل الذکر الفاظ سے تعبیر کردیا جائے، تو وہ غلط قرار پائے، اور مؤخر الذکر الفاظ سے تعبیر کردیا جائے، تو درست سمجھا جائے؟ آخر وہ معیار کیا ہے، جس کی بناء، ابن عربی کا بیان کردہ معنیٰ تو ''باطنی معنیٰ'' قرار پاتا ہے، اور ''مفکر قرآن'' کا انتہائی بدتر، نہایت باطل اور عقل وصحت سے ازحد بعید معنیٰ، ''مجازی معنیٰ'' قرار پاتا ہے؟ حرام ہے جو ''مفکر قرآن'' صاحب نے کبھی اس فرق کو کہیں واضح کیا ہو۔

باطنی علم کی سند

قدرے آگے چل کر، ''مفکر قرآن'' صاحب، ''باطنی علم کی سند'' کی سرخی جما کر، ایک ایسی حدیث کو، پیش کرتے ہیں، جس کے الفاظ میں، خود اپنی طرف سے بین القوسین اضافوں کے ذریعہ، اُسے ''باطنی علم'' کی سند قرار دیتے ہیں، اور پھر اسے اپنی خود ساختہ ''عجمی سازش'' کے خاکہ میں رنگ بھرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

اس کی سند کے لیے اس قسم کی حدیثیں وضع کی گئیں:

> حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے علم کے دو برتن ملے، ایک (علم ظاہری) کو تو میں نے پھیلا دیا ہے، لیکن اگر میں دوسرے (علم باطنی) کو ظاہر کردوں تو میری رگِ حیات کاٹ دی جائے۔ (بخاری، باب العلم، نیز مشکوۃ، باب العلم) ❶

اس اقتباس میں، جس حدیث کو پیش کیا گیا ہے، جب تک اس کے اصل الفاظ کو سامنے نہ لایا جائے، اُس وقت تک "مفکر قرآن" کی خیانت کا پردہ چاک نہیں ہوسکتا، ملاحظہ فرمائیے، اصل الفاظِ حدیث:

((عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه قال حفظت من رَّسُول اللّٰهِ ﷺ وعاءين فاما احدهما فبثثته واما الاخر فلو بثثته قطع هٰذا البلعوم .))

ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ حدیث میں سرے سے ایسے الفاظ موجود ہی نہیں ہیں، جو "علم ظاہری" اور "علم باطنی" کے حق میں قرآنی دلیل بن سکیں یا جن کا ترجمہ، ان الفاظ سے کیا جاسکے۔ ان الفاظ کا بین القوسین اضافہ، صرف اس لیے ہے کہ صوفیاء کے باطنی علم کی انھیں سند قرار دے کر، اپنی "عجمی سازش" کے خاکہ میں رنگ بھریں۔ پھر حدیث میں مذکور دو برتنوں میں سے، ایک کو علم ظاہری اور دوسرے کو علمِ باطنی کا برتن کہنا (ماسواء فرقہ باطنیہ کے) مفسرین قرآن، محدثین کرام اور فقہائے عظام میں سے کسی بھی صاحب علم سے منقول نہیں ہے۔ "مفکر قرآن" نے اپنی مطلب برآری کے لیے، باطنیہ ہی کے ہاں سے حدیث کا یہ مفہوم لیا، اور پھر اسے صوفیا کے کھاتے میں ڈال کر، اس پر اعتراض کا قصر بلند و بالا تعمیر کر ڈالا، کیونکہ یہ مفہوم صرف باطنیہ ہی کا بیان کردہ ہے، جیسا کہ ابن المنیر کا بیان ہے:

> قال ابن المنير: جعل الباطنية هٰذا الحديث ذريعة الى تصحيح باطلهم حيث اعتقدوا ان للشريعة ظاهرا وباطنًا. ❷

---

❶ شاہکارِ رسالت، صفحہ: ۵۲۲۔

❷ فتح الباری، ج ۱، ص ۲۱۶۔

ابن المنیر نے کہا کہ فرقہ باطنیہ نے اس حدیث کو اپنے اس باطل عقیدے کو صحیح قرار دینے کا ذریعہ بنایا ہے کہ شریعت کا ایک ظاہر ہے، اور ایک باطن ہے۔

''مفکرِ قرآن'' کی یہ ایک پرانی تکنیک اور قدیم حربہ ہے، کہ وہ گمراہ فرقوں سے نظریات وتصورات کو اخذ کر کے، انھیں امت مسلمہ کے علماء کی طرف منسوب کر ڈالتے تھے، تاکہ انھیں اپنی طنز وتعریض کا نشانہ بناتے رہیں۔

حدیث کا صحیح مفہوم

اب رہا حدیث کا صحیح مفہوم، تو وہ صرف یہ ہے کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس، ظالم اور ستم شعار حکمرانوں کی بابت، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیاں موجود تھیں، جنھیں اگر وہ بیان کرتے، تو ایسے حکمرانوں سے انھیں اپنی جان کا خطرہ محسوس ہوتا، کیونکہ ان فرامین رسولؐ میں، ایسے سربراہانِ مملکت کے اوصاف بد اور ظلم وستم کے احوالِ سیئہ مذکور تھے۔ چنانچہ وہ بعض اوقات، (بغیر تصریح کیے محض اشارہ وکنایہ سے، اس قسم کے جملے بول دیا کرتے تھے کہ ''میں چھٹے عشرے کے آغاز سے، اللہ تعالیٰ کی پناہ کا طالب ہوں''، یا یہ کہ ''میں بچوں کی سربراہی سے، خدا کی پناہ چاہتا ہوں۔'' اور ان کا اشارہ، یزید ابن معاویہ جیسے افراد کی امارت کی طرف ہوتا تھا۔ چنانچہ، اللہ تعالیٰ نے، ان کی دعاء کو شرفِ قبولیت بخشا، اور وہ اس واقعہ سے ایک سال قبل، اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

> حمل العلماء الوعاء الذی لم یبثه علی الاحادیث التی فیها تبیین اسامی امراء السوء واحوالهم وزمنهم وقد کان ابوهریرة یکنی عن بعضه ولا یصرح به خوفا علی نفسه منهم، کقوله اعوذ بالله من رأس الستین وامارة الصبیان یشیر الی خلافة یزید بن معاویة لانها کانت سنة ستین من الهجرة واستجاب الله دعاء ابی هریرة فمات قبلها بسنة. ❶

---

❶ فتح الباری، جلد:۱، صفحہ:۲۱۶۔

(امت مسلمہ کے) علماء نے، اُس ظرفِ علم کو، جسے، ابو ہریرہؓ نے نشر نہیں کیا، ان احادیث پر محمول کیا ہے، جن میں برے حکمرانوں کے نام، احوال اور ان کے زمانے کی وضاحت موجود ہے، اور وہ، ان کا ذکر، صراحت سے کرنے کی بجائے، اشارہ وکنایہ سے کیا کرتے تھے، محض اس بناء پر، کہ ایسے حکمرانوں سے انھیں اپنی جان کا خوف لاحق ہوتا تھا، مثلاً ان کے اس قسم کے دعائیہ جملے کہ ''میں ساٹھویں سال کے آغاز سے خدا کی پناہ چاہتا ہوں، اور بچوں کی امارت سے طالبِ پناہِ خداوندی ہوں'' ان کا اشارہ، یزید بن معاویہ کی امارت کی طرف ہوتا تھا، جو ساٹھ ہجری ہی کا واقعہ ہے، اللہ تعالیٰ نے ابو ہریرہؓ کی دعاء کو شرفِ قبولیت سے نوازا، اور وہ اس واقعہ سے ایک سال قبل فوت ہو گئے۔

اس دوسرے ظرفِ علم کی بابت، جسے کھول دینے میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، خطرۂ جان محسوس کرتے تھے، مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> علم کی دوسری قسم، اہل بدعت اور ظالم بادشاہوں کے متعلق پیشین گوئیاں تھیں، جن کا تذکرہ، غالباً آنحضرت ﷺ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا، جس کا ذکر، فتنہ کے ڈر سے علانیہ مناسب نہ سمجھا گیا۔ ①

مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم نے، اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو فرمائی ہے، وہ اس حدیث کے تین امکانی مفہوم بیان کرتے ہیں، ابتدائی دونوں مفاہیم کی عقل و درایت کی روشنی میں تردید فرماتے ہیں۔ اور پھر تیسرے مفہوم کو بایں الفاظ پیش فرماتے ہیں، اور پھر تفصیلاً تبصرہ کرتے ہیں:

> اب رہ گئی تیسری صورت، یعنی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا یہ ذخیرۂ علم، ایسی حدیثوں پر مشتمل ہو، جن کے نقل وروایت اور جن کے پھیلنے میں، وقت کے اربابِ اقتدار، اپنے اقتدار کے لیے خطرہ محسوس کرتے ہوں۔

---

① مشکوٰۃ مترجم، جلد: ۱، صفحہ: ۱۷۱۔

ہم کو یہی بات، قرینِ قیاس اور عقل و نقل کے مطابق معلوم ہوتی ہے، کیونکہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بنوامیہ کا دور اور مروان اور امرائے مروان کا جور دیکھا تھا، ان کی وفات ۵۸ یا ۵۹ھ میں ہوئی ہے جب کہ مسلمان، بنوامیہ کے جبر و استبداد کے شکنجے میں اچھی طرح کسے جاچکے تھے، اور بنوامیہ، تلوار کے زور سے، ان تمام اہل حق کے دبا لینے کے درپے تھے جو ان کے استبداد اور ان کی سیاسی و اجتماعی بدعتوں کے خلاف آواز اُٹھا رہے تھے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے ذخیرۂ علم میں، ایسی بہت سی حدیثیں تھیں، جن میں اسلامی امراء و حکام کی ذمہ داریاں بیان کی گئی ہیں، یا جن میں بنو اُمیہ کے دور کے فتنوں، ان کے ملک عضوض (استبداد) اور ان کے چھوکروں کی ستم رانیوں، اور ان کے ہاتھوں، دین اور اہل دین کی بربادی کی بابت، حضورؐ نے پیشین گوئیاں فرمائی تھیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس قسم کی روایات کے ذخیرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر میں روزہ و نماز اور حج و زکوٰۃ کی حدیثوں کی طرح اجتماعی و سیاسی معاملات سے متعلق حدیثیں بھی کھلم کھلا بیان کرنا شروع کردوں، تو مستبدین وقت، مجھے جیتا نہ چھوڑیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے قول کا یہ مطلب، عقل و نقل اور روایت و درایت کے بالکل مطابق معلوم ہوتا ہے، اور صرف میں نے ہی اس کا یہ مطلب نہیں سمجھا ہے، بلکہ دوسرے شارحین حدیث بھی اس مطلب کی طرف گئے ہیں۔ ❶

صحیح مفہوم حدیث کی وضاحت کے بعد، اب یہ امر بھی ذہن نشین رہنا چاہیے کہ وہ احادیث، جن کی نشر و اشاعت سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ محترز و مجتنب تھے، وہ اسلام کے احکام، اور ان کے حکم و مصالح یا حلال و حرام سے متعلق نہ تھیں، کیونکہ پیشین گوئی پر مبنی ایسی احادیث کو بیان نہ کرنا، نہ تو کسی پہلو سے دینی تعلیمات کے لیے ضرر رساں ہے، اور نہ ہی ایسا اجتناب، کتمانِ علم دین کے زمرہ میں آتا ہے، جس کے بارے میں، خود ان ہی کی یہ روایت ہے:

عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ من سئل عن علم

---

❶ تزکیۂ نفس، جلد: ۱، صفحہ: ۲۸ تا ۲۹۔

علمه ثم كتمه الجم يوم القيامة بلجام من نار .

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جس سے علم کی کوئی ایسی بات پوچھی گئی، جسے وہ جانتا ہو، اور پھر اُسے چھپا ڈالے (اور بیان نہ کرے) تو روزِ قیامت، اسے آگ کی لگام پہنائی جائے گی۔ ❶

کتمانِ علم دین کے متعلق، احادیث تو رہیں ایک طرف، خود قرآن میں بہت سی وعیدیں پائی جاتی ہیں۔ صرف ایک آیت ملاحظہ فرمائیے:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَآ أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ أُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُونَ ۝ ﴾ [البقرة: ۱۸۹]

”بے شک جو لوگ، ہمارے نازل کردہ واضح احکام اور ہدایات کو، بعد اس کے کہ ہم نے کتاب میں لوگوں کے لیے خوب کھول دیا ہے، چھپاتے ہیں، ان پر اللہ بھی، اور دیگر لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں۔“

اسی آیت (اور اس جیسی دیگر آیات) کے پیش نظر، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، حدیث رسول ﷺ کو بھی، قرآن ہی کی طرح، دوسروں تک پہنچانے کے خود کو مجاز و مکلّف قرار دیا کرتے تھے، جیسا کہ مفتی محمد شفیع صاحب، اپنی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:

> صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ اگر قرآن کی یہ آیت نہ ہوتی، تو میں تم سے کوئی حدیث بیان نہ کرتا۔ آیت سے مراد، یہی آیت (البقرۃ: ۱۸۹) ہے، جس میں کتمانِ علم پر لعنت کی وعید شدید مذکور ہے۔ ایسے ہی بعض دوسرے صحابہ نے بھی بعض روایاتِ حدیث کے ذکر کرنے کے ساتھ، ایسے ہی الفاظ فرمائے کہ اگر قرآن کی یہ آیت، کتمانِ علم کے بارہ میں نہ ہوتی، تو میں یہ حدیث بیان نہ کرتا۔ ❷

---

❶ مشکوۃ، کتاب العلم، حدیث: ۲۱۲۔

❷ تفسیر معارف القرآن، جلد: ۱، صفحہ: ۴۰۴۔

ابن عربی کے "باطنی معانی" سے کہیں زیادہ بدتر اور غلط تر معانی، جو "مفکرِ قرآن" نے ان کی وفات کے برسوں بعد پیش کیے تھے، اُن کی نگاہ میں آ جاتے، تو ہمیں سو فیصد یقین ہے کہ وہ ان کی بابت بھی وہی کچھ فرماتے جو فرقۂ باطنیہ کے متعلق، وہ، فرما چکے تھے۔ اگر سورۂ طٰہٰ کی آیات ۱۷ تا ۲۲ کا وہ مفہوم، جو اسی بحث میں پہلے گزر چکا ہے۔ علامہ اقبالؒ کی زندگی میں منظرِ عام پر آ جاتا، تو علامہ اقبالؒ، اسے بھی الحاد و زندقہ کا مرقع، اور قرآنی تعلیمات کا ناسخ قرار دیتے، اور اسے پیش کرنے والے کو گوسفندی فطرت کا حامل گردانتے۔ لیکن اگر وہ آج ہم میں موجود نہیں ہیں، تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ علامہ اقبالؒ کے یہی فرمودات، "مفکرِ قرآن" کے متذکرہ بالا مفہومِ آیات پر بھی بدرجہ اولیٰ صادق آتے ہیں، کما لا یخفی۔

(۶۶) "عجمی سازش" کے اثرات، اُمتِ مسلمہ پر
ــــ (۵) ــــ جماعتی زندگی کی نفی اور جہاد سے بے زاری

"مفکرِ قرآن" کی خود ساختہ "عجمی سازش" میں، ایک اہم جزو، اثراتِ تصوف کا جزو بھی ہے۔ ان اثرات میں سے ایک اثر، (بقول اُن کے) امتِ مسلمہ میں، "اجتماعی زندگی کی نفی" بھی ہے، چنانچہ اس کی بابت "مفکرِ قرآن" فرماتے ہیں:

> دین، انسانی حیاتِ اجتماعیہ کے لیے، ایک مکمل نظام، اور ضابطہ کا نام ہے، جو اپنی مملکت میں متشکل ہوتا ہے، اسی بناء پر، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ: لا اسلام الا بالجماعۃ۔ جماعت کے بغیر، اسلام کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ لیکن تصوف، جماعتی زندگی سے دور بھاگتا ہے، وہ اپنی خلوت گاہوں میں مراقبوں اور ریاضتوں کے ذریعے، انفرادی نجات کا قائل ہے۔ اس تصور کی رُو سے، اسلام میں ہندوؤں کی ویدانت، عیسائیوں کی رہبانیت اور ایرانیوں کی مجوسیت میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ ❶

"مفکرِ قرآن" جن "قرآنی اخلاقیات" سے، اپنے دامنِ کردار کو مزین رکھا کرتے

---

❶ شاہکارِ رسالت، صفحہ: ۵۲۳ تا ۵۲۴۔

ابن عربی کے ”باطنی معانی“ سے کہیں زیادہ بدتر اور غلط تر معانی، جو ”مفکر قرآن“ نے ان کی وفات کے برسوں بعد پیش کیے تھے، اُن کی نگاہ میں آ جاتے، تو ہمیں سو فیصد یقین ہے کہ وہ ان کی بابت بھی وہی کچھ فرماتے جو فرقۂ باطنیہ کے متعلق، وہ، فرما چکے تھے۔ اگر سورۂ طٰا کی آیات ۱۷ تا ۲۲ کا وہ مفہوم، جو اسی بحث میں پہلے گزر چکا ہے۔ علامہ اقبالؒ کی زندگی میں منظر عام پر آ جاتا، تو علامہ اقبالؒ، اسے بھی الحاد و زندقہ کا مرقع، اور قرآنی تعلیمات کا ناسخ قرار دیتے، اور اسے پیش کرنے والے کو گوسفندی فطرت کا حامل گردانتے۔ لیکن اگر وہ آج ہم میں موجود نہیں ہیں، تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ علامہ اقبالؒ کے یہی فرمودات، ”مفکر قرآن“ کے متذکرہ بالا مفہومِ آیات پر بھی بدرجہ اولیٰ صادق آتے ہیں، کما لا یخفی۔

(۶۶) ”عجمی سازش“ کے اثرات، اُمت مسلمہ پر

—— (۵) —— جماعتی زندگی کی نفی اور جہاد سے بے زاری

”مفکر قرآن“ کی خودساختہ ”عجمی سازش“ میں، ایک اہم جزو، اثراتِ تصوف کا جزو بھی ہے۔ ان اثرات میں سے ایک اثر، (بقول اُن کے) امت مسلمہ میں، ”اجتماعی زندگی کی نفی“ بھی ہے، چنانچہ اس کی بابت ”مفکر قرآن“ فرماتے ہیں:

> دین، انسانی حیاتِ اجتماعیہ کے لیے، ایک مکمل نظام، اور ضابطہ کا نام ہے، جو اپنی مملکت میں متشکل ہوتا ہے، اسی بناء پر، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ: لا اسلام الا بالجماعۃ۔ جماعت کے بغیر، اسلام کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ لیکن تصوف، جماعتی زندگی سے دور بھاگتا ہے، وہ اپنی خلوت گاہوں میں مراقبوں اور ریاضتوں کے ذریعے، انفرادی نجات کا قائل ہے۔ اس تصور کی رُو سے، اسلام میں ہندوؤں کی ویدانت، عیسائیوں کی رہبانیت اور ایرانیوں کی مجوسیت میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ ①

”مفکر قرآن“ جن ”قرآنی اخلاقیات“ سے، اپنے دامن کردار کو مزین رکھا کرتے

---

① شاہکارِ رسالت، صفحہ: ۵۲۳ تا ۵۲۴۔

تھے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ: ”جھوٹ بولو اور بولتے ہی چلے جاؤ۔“ یہاں تک کہ بتکرار و اعادہ، دروغ گوئی کی بھرمار سے، لوگ، جھوٹ کو سچ سمجھنے لگ جائیں، کیونکہ بقول طلوع اسلام:

> نازیوں کے گوئبلز کا مقولہ تھا کہ...... ”جھوٹ کو اگر سو دفعہ دہرایا جائے، تو وہ سچ بن جاتا ہے۔“ ①

اب یہاں، ”مفکر قرآن“ کے اس جھوٹ کو ملاحظہ فرمائیے، کہ وہ ”قرآنی تصوف“ کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں اور بعد کے فاسد تصوف کا نام لے کر، تمام شرور و سیئات کو، مطلق تصوف کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں، بغیر اس امر کا لحاظ کیے کہ ان معائب و نقائص کا تعلق، آغازِ اسلام کے قرآنی تصوف سے ہے یا بعد کے غیر اسلامی تصوف سے۔ حالانکہ قرآن، جس تصوف پر زور دیتا ہے، وہ (بقول پرویز صاحب) پاکیزگیٔ قلب، صفائی باطن، انابت الی اللہ، اخلاص فی العمل اور خشیت الٰہی پر مشتمل اوصاف و خصائل کا نام ہے، اور یہی تصوف، بقول اُن کے، قرآنی اصطلاح میں، احسان، کہلاتا ہے۔ اب بتائیے کہ اس تصوف میں، جماعتی زندگی کی نفی کہاں پائی جاتی ہے؟ اس تصورِ تصوف کی بناء پر، صحابہ کرام، کب، حیاتِ اجتماعیہ سے دور بھاگے تھے؟ مکہ یا مدینہ کی کن خلوت گاہوں میں، مراقبوں اور ریاضتوں کے ذریعے، وہ انفرادی نجات کے قائل اور طلب گار رہے تھے؟ اس تصوف میں، کہاں ہندوؤں کی ویدانت، عیسائیوں کی رہبانیت اور ایرانیوں کی مجوسیت در آئی تھی؟ لیکن ہمارے ”مفکر قرآن“ صاحب، اس ”قرآنی تصوف“ کو نظر انداز کرتے ہوئے، اُس تصوف کا بار بار ذکر کرتے ہیں، جو نہ صرف یہ کہ اصل قرآنی تصوف (کے اجزائے صالحہ) کے خلاف ہے، بلکہ آغازِ اسلام کے بہت بعد کے بگڑے ہوئے اجزائے تصوف پر مشتمل ہے۔ یہ رویہ کسی منصف مزاج محقق کا نہیں ہوسکتا کجا یہ کہ کسی مفسر قرآن کا ہو۔

پھر ”مفکر قرآن“ کی یہ حدید البصری بھی قابل داد ہے کہ انھیں، ”اسلام میں ہندوؤں کی ویدانت، عیسائیوں کی رہبانیت اور ایرانیوں کی مجوسیت“ تو نظر آ جاتی ہے لیکن خود اُن کے

---

① طلوع اسلام، ستمبر ۱۹۶۰ء، صفحہ: ۶۹۔

”قرآنی اسلام“ میں، انھیں، نہ تو مغرب کی بے حیا معاشرت کے فاسد اجزاء دکھائی دیتے ہیں، اور نہ ہی کارل مارکس کی وہ اشتراکیت، جس کا خمیر ہی جبر و استبداد سے اُٹھا ہے، اور یہ صرف اس لیے کہ مغرب کی ذہنی غلامی اور فکری اسیری میں مبتلا ہو جانے کے بعد، اُنھیں، قرآنی تعلیمات کی کارفرمائی، اگر، کہیں نظر آتی ہے تو وہ یا تو دورِ حاضر کی غالب تہذیب کی بے حیا معاشرت، اور اُس کے فاسد تمدن میں نظر آتی ہے، یا پھر روس کی مستبدانہ اشتراکیت میں۔

اب رہی، جہاد سے بے زاری و سرد مہری، تو اس کو ثابت کرنے کے لیے، ”مفکر قرآن“ پھر وہی حربہ اختیار کرتے ہیں، جسے وہ ”اجتماعی زندگی کی نفی“ کے ضمن میں اپنا چکے ہیں، حالانکہ جہاد سے بے زاری، اُس تصوف کی پیداوار ہرگز نہیں ہے، جس کا جوہر، اخلاص فی العمل، طہارتِ قلب، تزکیۂ باطن، رجوع الی اللہ، اور خشیت الٰہی ہے، بلکہ اس تصوف کا نتیجہ و ثمرہ ہے، جو بہت بعد میں بگڑی ہوئی صورت میں، منظر عام پر آیا۔ لیکن ”مفکر قرآن“ صاحب، اسلامی تصوف اور بعد کے فاسد تصوف کو، بلا امتیاز، اندھے کی لاٹھی کی نوک پر رکھ لیتے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی، وہ، اس حقیقت کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں کہ فاسد تصوف، ہمیشہ اور ہر عصر و مصر میں، اُمت مسلمہ کے ایک نہایت ہی قلیل طبقہ میں مقبول و رائج رہا ہے، عام مسلمانوں کی اکثریت کبھی بھی، اس تصوف کے زیر اثر نہیں رہی۔

مزید برآں، جہاد سے بُعد اور بے زاری کی اصل وجہ، لوگوں کا دلدادۂ دنیا ہونا ہے۔ مرغوباتِ دنیا کی کشش اور اس فانی زندگی کے لذائذ کی شدید رغبت کے باعث، موت سے ڈرنا اور آخرت کی بجائے، حبِ دنیا کا شدید تر ہونا، ہی وہ علت ہے، جو ضعفِ اعتقاد کی بناء پر، فرزندانِ اسلام کو، جہاد فی سبیل اللہ اور شہادت سے دور رکھے ہوئے ہے۔ تصوف کا کردار، اس معاملہ میں نہایت قلیل اور محدود ہے۔

(۶۷) مرزا غلام احمد کا دعویٰ

تصوف کی بابت، یہ حقیقت واضح کی جا چکی ہے کہ:

١ ---- صوفیاء کا کشف والہام، انبیاءِ کرام کے علمِ وحی کا ہم پلہ نہیں ہے کجا یہ کہ وہ

افضل و برتر ہو۔ بلکہ وہ علم وحی کے تابع ہے، اور ہر انسان، جس علم کی پیروی کا مکلّف قرار دیا گیا ہے، وہ، صوفیاء کا نہیں، بلکہ انبیاء ورسل کا علم وحی ہے۔ کفر و اسلام کی بنیاد بھی، صوفیاء کے الہامی و کشفی علم پر نہیں، بلکہ فرستادگان ایزدی کے علم وحی پر قائم ہے۔

2 ---- تصوف، شرعاً کسی منصب کا نام نہیں ہے کہ اس پر فائز ہونا کسی صوفی کو ادعاءِ منصب کا حق دیتا ہو۔ اس کے برعکس، نبوت و رسالت، بہرحال، ایک شرعی منصب ہے۔ اس منصب کا انکار و اقرار، کفر و اسلام کی بنیاد ہے، جب کہ کسی صاحب تصوف کو، صوفی نہ ماننا، اور اس کے کشفی علم کا انکار کرنا، کسی کو دائرۂ اسلام سے خارج نہیں کرتا۔

ان حقائق کی روشنی میں، مرزا غلام احمد قادیانی کا خود کو ملہم من اللہ قرار دینا، (قطع نظر اس کے کہ وہ ایسا ہونے میں سچا تھا یا جھوٹا) کوئی ایسی چیز نہیں ہے، جس پر اسے منکر ختم نبوت قرار دیا جائے۔ البتہ اس کا انبیاءِ سابقین کی طرح، خود کو مہبط وحی قرار دینا، عقیدۂ ختم نبوت کے بھی منافی ہے، اور اس کے کافر و مرتد ہونے کی بھی دلیل ہے۔ لیکن ہمارے "مفکر قرآن" صاحب، تصوف کی مخالفت کے پیش نظر، مرزا غلام احمد قادیانی کے دعوائے نبوت کا ذکر تک نہیں کرتے، (جس پر، اس کے کفر صریح کی بنیاد ہے۔) اور صرف، اس کے محدث و ملہم من اللہ ہونے کا ذکر کرتے ہیں، اور اسے عقیدۂ ختم نبوت کے منافی قرار دیتے ہوئے، لکھتے ہیں:

> جب تصوف کے اس عقیدہ نے، (جس کی بنیاد محدثیت کے نظریہ پر تھی، اور جس کی ابتداء، شیعوں کے ہاں سے ہوئی) کشف و الہام کے دروازے کھول دیئے، تو اس سے دعوائے نبوت کا بھی امکان پیدا ہوگیا۔ چنانچہ مرزا غلام احمد قادیانی، انہی سیڑھیوں سے مقامِ نبوت تک پہنچنے کے دعوے دار ہوئے تھے۔ انھوں نے پہلے کہا:
>
> > ہمارے سید الرسول اللہ، خاتم الانبیاء ہیں، اور بعد، آنحضرت، کوئی نبی نہیں آ سکتا۔ اس لیے شریعت میں نبی کے قائم مقام، محدث رکھے گئے ہیں۔ (شہادت القرآن، صفحہ: ۲۸)

پھر دوسری جگہ لکھتے ہیں:

> میں نے لوگوں سے سوائے اس کے، جو میں نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے، اور کچھ نہیں کہا کہ میں محدث ہوں، اور اللہ تعالیٰ مجھ سے اسی طرح کلام کرتا ہے جس طرح محدثین سے۔ (حمامۃ البشریٰ، صفحہ:۹۶)

سابقہ صفحات میں، جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کی روشنی میں، اس بات کو سمجھنے میں کچھ بھی دقت نہیں رہتی کہ مرزا صاحب نے محدثیت کا تصور کہاں سے لیا تھا؟ اس کا سرچشمہ، شیعہ اور تصوف لٹریچر ہے۔ ①

[یہ بات ذہن نشین رہے کہ "مفکر قرآن" کی "عجمی سازش" کی ابتداء وآغاز کی بنیاد بھی، شیعی لٹریچر پر رکھی گئی ہے۔ جیسا کہ گذشتہ صفحات میں گزر چکا ہے۔ ...... قاسمی]

اب "مفکر قرآن" کو یہ بات کون سمجھائے کہ کشف والہام کے دروازے، تصوف کے کسی عقیدہ نے نہیں، بلکہ خود قرآنِ کریم نے کھولے ہیں، لہٰذا، کشف والہام کے وجود ووقوع میں تو کسی شک وشبہ کی گنجائش ہی نہیں، البتہ اس کا حامل، شرعاً یہ حق نہیں رکھتا کہ اپنے منصب (ملہم من اللہ) کو تسلیم کرنے کی لوگوں کو دعوت دے، اور اپنی دعوت کی بنیاد، قرآن وسنت کی بجائے، اپنے کشفی اور الہامی علم کو بنا ڈالے۔ سلف میں سے، جن لوگوں نے، اپنے کشف و الہام کا اعلان کیا ہے۔ ان کی یہ روش، بہرحال، مستحسن نہیں ہے۔ محدث اور ملہم (من اللہ) ہونے کے دعوے (خواہ، اہل تشیع کی طرف سے ہوں یا اہل تصوف کی طرف سے)، اگر نہ کیے جاتے، تو ازروئے قرآن وسنت، یہ بہتر ہوتا۔ کیونکہ مسلمان، بحیثیت مسلمان، علم کشف و الہام کی پیروی کے نہیں، بلکہ انبیاء ورسل کے علم وحی کی پیروی کے پابند ہیں، اور ملہم من اللہ کو بھی لازم ہے کہ وہ اپنی بات (قرآن وسنت کی) دلیل کے ساتھ پیش کرے، (نہ کہ اپنے کشفی والہامی علم کی سند کے ساتھ۔) تاہم، اگر کشف والہام سے بہرہ ور حضرات، ایسے دعوے نہ بھی کرتے، اور محدثیت اور ملہمیت کی سیڑھیاں نہ بھی فراہم کرتے، تب بھی مرزا صاحب،

---

① شاہکارِ رسالت، صفحہ:۵۲۵۔

جن کے ”خود کاشتہ پودے“ تھے، ان کی خواہش کے مطابق، وہ، نبی و رسول بننے پر تلے بیٹھے تھے۔ اُنھوں نے محدثیت اور ملہمیت کے دعووں کو اُسی طرح، ”اپنی سیڑھیاں“ بنالیا تھا، جس طرح، انکارِ سنت سے قبل، خود ”مفکر قرآن“ نے مسلک حجیت حدیث کو اپنا زینہ بنا رکھا تھا۔ پھر جس طرح، مرزا صاحب، ابتداء و آغاز میں عقیدۂ ختم نبوت کا اقرار و اعلان کر کے، اور اپنی مناظرانہ خدمات کی تشہیر کر کے، لوگوں میں، اپنا ایک مقام مقبولیت پیدا کر چکے تھے، اُسی طرح، ”مفکر قرآن“ نے بھی، نہ صرف یہ کہ سندیت سنت اور حجیت حدیث کا اقرار کرتے ہوئے، بلکہ ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے، منکرین حدیث کے خلاف، مدافع حدیث اور محافظ سنت کا روپ اپناتے ہوئے، عامۃ الناس میں اپنے لیے ہر دلعزیزی کا مقام پیدا کیا، اور یوں پبلک میں ”پاپولر“ ہوتے گئے۔ مزید برآں، جس طرح، برطانیہ کے کافرانہ نظامِ حکومت کو مرزا صاحب، اپنے لیے، سایۂ عاطفت سمجھتے تھے، بالکل اسی طرح، وہ روس کی اشتراکی حکومت کو بھی ”رحمت“ قرار دیا کرتے تھے، (اگرچہ کبھی کبھی، وہ، متضاد روش اختیار کرتے ہوئے، اشتراکیت کی مذمت بھی کر ڈالا کرتے تھے، بالکل اُسی طرح، جس طرح ایک جعل ساز دکاندار، اپنی دکان میں جعلی اور نقلی اشیاء کے ساتھ، کچھ اصلی اور کھری چیزیں رکھنے پر بھی مصلحتاً مجبور ہوتا ہے۔)

بہر حال، مرزا غلام احمد صاحب کا کفر و ارتداد، اُس وقت کھل کر سامنے آ گیا، جب اُنھوں نے نہ صرف یہ کہ عقیدۂ ختم نبوت کا انکار کر کے، اجراءِ نبوت کا ادّعاء کیا، اور پھر خود بھی نبی بن بیٹھے، اور اپنے لیے، ایسی وحی پانے کے مدعی بنے، جو انبیاء و رسل ہی کا خاصہ و لازمہ ہے۔ اور چوہدری غلام احمد پرویز کا کفر، اُس وقت بے نقاب ہوا، جب ۱۹۶۱ء میں، حد کفر تک پہنچی ہوئی، اُن کی ضلالت کو، ایک قلمی مناظرہ کے ذریعہ، ٹھوس دلائل اور قوی براہین کے ساتھ، ثابت کیا گیا۔ تب مختلف مکاتب فکر کے علماء نے، اُسی طرح متفق ہو کر، ”مفکر قرآن“ اور ان کے ہم مسلک افراد پر، فتوائے کفر عائد کیا گیا، جس طرح قادیانیت اور اس کے بانی کے خلاف، اجماعی فتویٰ جاری ہوا تھا۔

قادیانیت کے مقابلہ میں پرویزیت کا فتنہ، کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ قادیانیت کی

مخالفتِ ختم نبوت، بالبداہت غلط اور باطل نظر آتی ہے۔ اس کے برعکس، پرویزیت نے اپنے کافرانہ عقائد و تصورات پر، قرآن کا غلاف چڑھا رکھا ہے، جو ناواقفان دین کے لیے دام ہمرنگ زمین کا کام دیتا ہے۔ دونوں فتنوں کا مقصد، مسلمانوں کو محمد رسول اللہ کی اطاعت سے منحرف کر کے، اپنی اطاعت پر جمع کرنا ہے۔ مرزا غلام احمد، یہی کام اپنی نبوتِ زائفہ کی آڑ میں کرتے ہیں، جب کہ غلام احمد پرویز صاحب، اپنے نام لیواؤں کے لیے، قرآن کا نام لے کر، اپنی خود ساختہ تعبیراتِ قرآن کے ذریعہ، یہی کام کرتے ہیں۔ مقصد، دونوں کا یہ ہے کہ حضرت خاتم الانبیاء کی پیروی و اطاعت سے لوگوں کو بھٹکا اور بہکا کر، اپنی اطاعت و انقیاد میں سمیٹا جائے۔ دونوں کے طریقہ کار میں فرق ہے، لیکن مقصد و ہدف میں اتفاق ہے۔ ختم نبوت کے خلاف، قادیانیت کی دعوت کا مبنی بر ضلالت ہونا، ایک واضح چیز ہے، لیکن، قرآن کے نام پر، اپنی ذاتی تعبیراتِ قرآن کو، خدائی حکم قرار دے کر، اُن کی پیروی کی دعوت دینا، ایک پرفریب طریقہ کار ہے، جو دین سے بے بہرہ افراد کے لیے، دامِ تزویر کی حیثیت رکھتا ہے، چنانچہ منکرین حدیث، قرآنِ کریم سے رسولِ قرآن کا تعلق توڑ کر، تعلیم بلا معلم، کتاب بلا پیغمبر، اور قرآن بلا محمدؐ، کا نرالا مسلک ایجاد کرتے ہیں، اور پھر یوں، سنت رسولؐ کی سندیت اور حدیث نبی کی حجیت کو ختم کر کے، یہ لوگ چاہتے یہ ہیں کہ ختم نبوت کے ساتھ ساتھ، ''ختم نبی'' کا مسلک بھی اپنا لیا جائے۔ اگرچہ زبان سے یہ لوگ، بلاشبہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی رٹ لگاتے ہیں، اور اس کلمہ پر ایمان کے بھی دعوے دار ہیں، لیکن اُن کی زبانِ حال کا اصل کلمہ لا الہ الا اللہ والقرآن کتاب اللہ ہے (اور پھر کتاب اللہ کو یہ لوگ، مفہومِ پرویز کے ساتھ ہی قبول کرتے ہیں نہ کہ مفہومِ رسول کے ساتھ) اور پھر بڑی ڈھٹائی اور دروغ گوئی کے ساتھ، جماعت اسلامی کے خلاف یہ پراپیگنڈہ کرتے ہیں کہ اس جماعت کے افراد کا کلمہ، عام مسلمانوں سے الگ اور جدا ہے:

> جماعت اسلامی کا عقیدہ، نصب العین اور کلمہ، باقی سب مسلمانوں سے الگ ہے، اور اسی بناء پر، اُنھوں نے ایک الگ جماعت بنانا ضروری سمجھا۔ ❶

---

❶ طلوعِ اسلام، مئی ۴ ۱۹۷ء، صفحہ: ۳۶۔

اس صریح جھوٹ، واضح کذب اور کھلی دروغ گوئی پر، اس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے کہ: لَعۡنَةُ اللّٰهِ عَلَى الۡكَاذِبِيۡنَ .

بہر حال، بات یہ ہو رہی تھی کہ مرزائیت کی بہ نسبت، فتنہ پرویزیت، کہیں زیادہ گھناؤنا اور خطرناک فتنہ ہے۔ اوّل الذکر فتنہ کی گمراہی، ہر فردِ مسلم کو واضح طور پر نظر آ جاتی ہے، جب کہ مؤخر الذکر گروہ، اپنے سم ضلالت کو، قرآنی کپسول (Capsule) میں پیش کرتا ہے۔ اس فتنہ کی گمراہی، اُس وقت تک ظاہر نہیں ہوتی، جب تک قرآن کے نام پر ڈالے ہوئے، ان کے پردوں کو چاک نہ کر دیا جائے۔ لیکن دونوں فتنوں کے طریقہ کار میں اختلاف کے باوجود، ان میں (بقول سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ) مندرجہ ذیل وجوہِ مماثلت بھی پائی جاتی ہیں:

> جس طرح، مرزائی حضرات، ایک جعلی نبی کی نبوت کو ثابت کرنے کے لیے، رسول اللہ ﷺ کو درمیان میں لاتے ہیں، اُسی طرح، منکرین حدیث، رسول اللہ کی سنت اور کتاب اللہ کا باہمی تعلق کاٹ پھینکنے کے لیے، کتاب اللہ کو استعمال کرتے ہیں۔ جس طرح، مرزائیوں نے تمام اُمت کے متفقہ عقیدۂ ختم نبوت کے خلاف، ایک نئی نبوت کا فتنہ کھڑا کیا، اُسی طرح منکرین حدیث نے، سنت کی آئینی حیثیت کو چیلنج کر کے، ایک دوسرا خطرناک مسئلہ کھڑا کر دیا، حالانکہ خلفاءِ راشدین کے عہد سے لے کر، آج تک، تمام دنیا کے مسلمان، ہر زمانے میں اس بات پر متفق رہے ہیں کہ قرآن کے بعد، سنت دوسرا ماخذ قانون ہے، حتیٰ کہ غیر مسلم ماہرین قانون بھی، بالاتفاق، اس کو تسلیم کرتے ہیں۔ جس طرح مرزائی، ختم نبوت کی غلط تاویل کر کے، ایک نیا نبی سامنے لے آئے ہیں، اسی طرح منکرین حدیث، اتباعِ سنت کی غلط تعبیر کر کے، یہ راستہ نکالتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی ساری ہدایات و تعلیمات کا دفتر لپیٹ کر رکھ دیا جائے، اور کسی مرکز ملت کو ہر زمانے میں، وہی حیثیت حاصل ہوتی رہے جو رسول اللہ ﷺ کو حاصل تھی۔ مرزائی، اپنے نبی کی نبوت کا راستہ صاف کرنے کے لیے ذاتِ رسول میں نقص

نکالتے ہیں، اور منکرین حدیث، اپنے مرکز ملت کے لیے راستہ بنانے کی خاطر، سنت رسول ﷺ کی عیب چینی کرتے ہیں۔ ❶

لیکن وابستگانِ طلوعِ اسلام، اپنی اس مماثلت کو، جو وہ مرزائیوں کے ساتھ رکھتے ہیں، چھپانے کے لیے، الٹا پراپیگنڈہ یہ کرتے ہیں کہ جماعت اسلامی قدم بقدم، مرزائیت کے نقش قدم پر، چل رہی ہے، اور اس کے افراد، قادیانیوں سے بھی زیادہ خطرناک ہیں۔

* * * *

---

❶ ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۶۱ء، صفحہ: ۱۵۶۔

باب پنجم

’’مفکرِ قرآن‘‘

علماءِ اسلام اور دانشورانِ کفر کی نظر میں

منکرین حدیث کے ’’مفکرِ قرآن‘‘ جناب غلام احمد پرویز کو اپنی ’’قرآنی خدمات‘‘ پر اس قدر فخر و ناز تھا کہ وہ خصوصیت کے ساتھ، ان کا ذکر کرتے ہوئے، طلوعِ اسلام میں رقمطراز ہیں!

> مہ و سال کے شمار سے، مَیں، ۹ جولائی ۱۹۷۸ء کو، اپنی عمرِ رواں کے پچھتر (۷۵) سال پورے کر رہا ہوں۔ یہ کوئی ایسا اہم واقعہ نہیں، جس کا خصوصیت کے ساتھ، طلوعِ اسلام کے صفحات پر ذکر کیا جاتا۔ قابلِ ذکر واقعہ یہ ہے کہ میں اپنی موجودہ قرآنی فکر اور اس کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں پچاس سال پورے کر رہا ہوں۔ عام اصطلاح میں اسے گولڈن جوبلی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ ①

’’تفسیر مطالب الفرقان کا علمی اور تحقیقی جائزہ‘‘ کے زیرِ عنوان، مَیں نے ’’مفکرِ قرآن‘‘ کی ’’پچاس سالہ قرآنی خدمات‘‘ کا جائزہ لیا ہے۔ میرا یہ علمی و تحقیقی جائزہ، جناب پرویز صاحب کی، اُن ’’قرآنی خدمات‘‘ کی قدر و قیمت کو واضح کر دیتا ہے، جسے بجا لانے والا، نہ تو صحت عقائد اور سلامتیٔ فکر ہی کا حامل ہے، اور نہ تقویٰ و دیانت کا جوہر ہی، اُس کے طرزِ عمل میں پایا جاتا ہے، جس کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اس کے عقائد فاسدہ اور افکار زائغہ، نہ صرف یہ کہ نصوص کی تحریف پر، اُسے اُبھارتے رہے ہیں، بلکہ نقلِ اخبار میں بھی خیانت و بددیانتی پر اُکساتے رہے ہیں۔ پھر ایک جذباتی، جوشیلی، تندمزاج اور غیر متوازن شخصیت

---

① طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۷۸ء، صفحہ: ۶۔

ہونے کی بناء پر، اپنے مخالفین کی مخالفت میں، عدل وانصاف کی روش اپنانے کی بجائے، ایسا غلط طرزِ عمل اپناتے رہے ہیں، جو اُن کے کبرِ نفس کے لیے موجب تسکین رہا ہے۔ غیروں کی عبارتوں کو سیاق وسباق سے کاٹنا، ان کی غلط ترجمانی کرنا، دوسروں کے الفاظ وعبارات میں اپنے ہی مفاہیم ومطالب کی تلاش وجستجو کرنا، اور واقعات وحقائق کو مسخ کرتے رہنا، کسی صورت بھی ایک شریف النفس شخص کے شایانِ شان نہیں، کجا یہ کہ ایسی باتیں، اُس ذات کے لیے سزاوار ہوں، جو کلام اللہ کی تفسیر لکھ رہا ہو، اور وہ بھی اس اہلیت وقابلیت کے ساتھ، کہ عربی زبان پر عبور و مہارت کا ہونا تو ایک طرف، اُسے اس زبان کا، اور اس کے قواعد وضوابط کا ابتدائی علم تک نہ ہو۔ افعال کی معرفت سے یکسر عاری ہو۔ فعل نہی اور فعل مضارع میں فرق و امتیاز سے قاصر ہو۔ عربی لغات میں زیر (ـِـ) اور زبر (ـَـ) کے تغیر سے، جو فرقِ معانی واقع ہوتا ہے، اُسے جہالت و بے علمی کی بناء پر، یا دیدہ دانستہ شرارت کی بناء پر، نظر انداز کر کے، محض اپنے ہی مدّعا ومقصد کی دھن میں، قواعد زبان کی مخالفت پر کمربستہ رہا ہو، تاریخی حقائق کا یا تو نہایت سطحی مطالعہ رکھتا ہو، یا پھر جان بوجھ کر، انھیں معکوس ومنقلب کر دینے کا عادی رہا ہو، ایسی شخصیت کے حامل، ''مفکر قرآن'' کی ''قرآنی خدمات'' کا میزان علم وحقیقت میں جو وزن قرار پاسکتا ہے، اس کا ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے۔

''مفکر قرآن'' کی پچاس سالہ ''قرآنی خدمات'' کی حقیقی قدردانی، تو وہی لوگ کر سکتے ہیں، جو دل وجان سے مغربی تہذیب کے دلدادہ ہیں، مگر شومی قسمت سے، اپنی مرضی کے خلاف، مسلم گھرانوں میں پیدا ہو چکے ہیں۔ اس لیے وہ آرزومند ہیں کہ روش تو مغربی آقاؤں ہی کی اختیار کی جائے، لیکن قرآن کی سند بھی، اُن کے ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے، یا پھر ان کے اصلی قدردان، وہ لوگ ہیں، جو اپنا عقیدہ وایمان، بڑی محبت اور عقیدت کے ساتھ، ''مفکر قرآن'' کی جیب میں ڈال کر، خود غور وفکر اور سوچ بچار کی صلاحیتوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ اور اب ان

لوگوں نے اپنی آنکھوں پر، پرویز صاحب کے ساتھ عقیدت والفت کی ایسی عینک چڑھا رکھی ہے جس میں انھیں اپنی محبوب شخصیت کے عیوب ومثالب بھی فضائل وکمالات دکھائی دیتے ہیں، اور دوسروں کی اچھائیاں اور خوبیاں بھی، برائیاں اور نقائص ہی دکھائی دیتی ہیں۔

علماءِ کرام کے ہاں پرویز اور فکرِ پرویز کی قدر و قیمت

تفسیر مطالب الفرقان اور جملہ کتب پرویز میں، جن افکار ونظریات، اصول واقدار، اور اعمال وافعال کو پیش کیا گیا ہے، ان کا خلاصہ، اگر ایک جملے میں بیان کیا جائے، تو ان کی پچاس سالہ "قرآنی خدمات" کا ماحصل آخر اس کے سوا کیا ہے کہ انھوں نے دورِ حاضر کی غالب تہذیب سے جملہ معاشرتی اطوار لے کر، انھیں، قرآن کے نام پر، اس معاشی نظام کے ساتھ ملا کر پیش کیا ہے، جسے کارل مارکس نے اشتراکیت کی صورت میں ترتیب دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ جاہلیت جدیدہ کے اس نظام کو، قرآنی فکر کی بنا پر پیش کرنا، قرآن کی نہیں، بلکہ تہذیب مغرب ہی کی نشر وتبلیغ اور ترویج وتنفیذ ہے۔ (اس لیے اہلِ مغرب، پرویز صاحب کی "قرآنی خدمات" پر پھولے نہیں سماتے)۔ اس صورتِ حال میں، علماءِ کرام نے تحریک طلوعِ اسلام کا ایک مدت تک مطالعہ کر کے، ۱۹۶۲ء میں، پرویز صاحب اور ان کے ہم مسلک افراد پر کفر کا فتویٰ عائد کیا۔ اس فتویٰ پر پاکستان کے تقریباً ایک ہزار علماءِ کرام کے دستخط تھے۔ یہ فتویٰ، کسی ایک مفتی یا کسی ایک مکتبۂ فکر کے علماء کی طرف سے نہیں، بلکہ پاکستان میں بسنے والی اُمت مسلمہ کے تمام مکاتب فکر کے علماء کی طرف سے متفقہ طور پر جاری ہوا تھا۔ غلام احمد قادیانی کے بعد، غلام احمد پرویز، وہ دوسری شخصیت ہے جس کے کفر پر، بلا اختلاف اور بلا شبہ، اجماعِ امت قائم ہوا ہے، جو بجائے خود اہلِ اسلام کے لیے ایک شرعی حجت ہے۔

علماءِ عرب کی طرف سے فتاوائے کفر

پاکستان کے مقتدر علماء کے علاوہ، سعودی عرب کے علماء نے بھی، غلام احمد پرویز پر کفر کا فتویٰ جاری فرمایا۔

امام حرمین شریفین، شیخ محمد عبداللہ السبیل نے، اُن کے خلاف، جو فتویٰ دیا، وہ ان الفاظ میں موجود ہے:

الحمد للّٰه وحده والصلوٰة والسلام على من لا نبى بعده وعلى اٰله واصحابه أجمعين، أما بعد: فان منظمة (طلوعِ اسلام) والتى تصدر مجلة باسم "طلوع اسلام" وتنتمى الى امامها الضال (غلام احمد برويز) الذى انكر حجية الحديث الشريف وانكر المعجزات وعذاب القبر وكثيرا من ضروريات الدين والحد وحرف فى اٰيات القرآن الكريم واقوال الرَّسول ﷺ مما يتعلق بالصلوٰة والزكوٰة والحج والجنة والنار وغير ذالك.

ولا شك ان غلام احمد برويز واتباعه ومن كان على عقائد المذكورة كفار خارجون عن ملة الاسلام وهم فى ذالك مثل القاديانيين الكفرة.

وقد المنا ما بلغنا من ان هاتين الطائفتين "منظمة طلوع اسلام" و "القاديانيين" تقوم بانشطة متنوعة لنشر كفرياتهما فى دولة الكويت الشقيقية وغيرها من دول الخليج.

ويجب على المسئوليين والعلماء ان ينتبهوا لهٰذا الخطر العظيم ويعملوا للحظر على انشطتهم حتى لا تنتشر سمومهم بين المسلمين. والله الهادى الى سبيل الرشاد.

وصلى الله على سيّدنا ونبينا محمد وعلى اله وصحبه اجمعين وبارك وسلم تسليما.

الرئيس العام لشئون المسجد الحرام والمسجد النبوى
امام و خطيب المسجد الحرام محمد عبدالله السبيّل

الحمد للہ وحدہ والصلوٰۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ وعلی الہ واصحابہ اجمعین، اما بعد:

طلوعِ اسلام نامی تنظیم، جو طلوعِ اسلام کے نام سے ایک رسالہ نکال رہی ہے، اپنے گمراہ پیشوا، غلام احمد پرویز کی طرف منسوب ہے۔ یہ شخص حجیت حدیث، معجزات، عذابِ قبر اور بہت سی ضروریاتِ دین کا منکر ہے۔ اس ملحد نے قرآنِ کریم کی ان آیات اور آنحضرت ﷺ کی ان احادیث میں تحریف کی ہے، جو نماز، زکوٰۃ، حج، جنت اور دوزخ وغیرہ سے متعلق ہیں۔

یقیناً اس میں شک نہیں کہ غلام احمد پرویز، اس کے متبعین، اور جو بھی اس کے مذکورہ بالا عقائد کے حامل ہیں، کافر ہیں اور ملت اسلامیہ سے خارج ہیں۔ اس معاملہ میں یہ لوگ قادیانی کافروں ہی کی طرح ہیں۔

ہمیں اس بات پر دلی رنج اور دکھ ہوا کہ یہ دونوں گروہ، پرویزی اور قادیانی، اپنے کفریہ نظریات کو پھیلانے کے لیے، برادر اسلامی ملک کویت اور دیگر خلیجی ریاستوں میں مصروف عمل ہیں۔

حکومت کے ذمہ داران اور علماء پر واجب ہے کہ وہ اس عظیم خطرے سے آگاہ رہیں، اور ان کی جملہ حرکات اور ممکنہ کارروائیوں پر پابندی لگائیں، تاکہ ان کا زہر مسلمانوں میں نہ پھیل سکے۔

واللّٰـه الهادي الى سبيل الرشاد وصلى الله على سيّدنا ونبينا محمد وعلى اٰله وصحبه اجمعين وبارك وسلم تسليما .

نگران اعلیٰ مسجد حرام و مسجد نبوی شریف

وامام خطیب مسجد حرام (مکہ مکرمہ) محمد عبداللہ السبیل ①

حکومت کویت کا فتویٰ

اس سے قبل، حکومت کویت بھی سرکاری طور پر، غلام احمد پرویز اور اس کے پیروؤں کو کافر

---

① ماہنامہ محدث، اگست ستمبر ۲۰۰۲ء، صفحہ: ۱۱۲۔

و مرتد قرار دے چکی ہے۔ اس سلسلے میں حکومت کویت کی وزارۃ الاوقاف کی فتویٰ کمیٹی کے چیئرمین، شیخ مشعل مبارک عبداللہ احمد الصباح نے اپنے فتویٰ میں لکھا:

> غلام احمد پرویز کے عقائد، باطل و گمراہ کن ہیں اور اسلامی عقیدے کے منافی ہیں۔ ہر وہ شخص، جو ان عقائد پر ایمان رکھتا ہے، وہ کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج ہے، اور اگر وہ پہلے مسلمان تھا پھر ان عقائد کو اختیار کیا ہو تو وہ مرتد شمار ہوگا، کیونکہ ان عقائد سے ان امور کا انکار لازم آتا ہے جو قرآن و سنت سے قطعی طور پر ثابت ہیں اور ضروریاتِ دین میں شمار ہوتے ہیں۔ ❶

متحدہ عرب امارات کا فتویٰ

اسی طرح متحدہ عرب امارات، دبئی کے ''اسلامک مشن'' نے بھی، پرویز کے کفریہ عقائد کی تفصیل لکھتے ہوئے، اجماعِ اُمت کی روشنی میں، اس کے کفر اور خارج از اسلام ہونے کا فتویٰ صادر کیا ہے۔ ❷

شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ آلِ شیخ کا فتویٰ

علاوہ ازیں سعودی عرب ہی کے مفتی اعظم شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ آل شیخ نے بھی ۱۴ر ذی قعدہ ۱۴۲۰ھ کو فتویٰ نمبر ۲۱۱۶۸ کی رُو سے ''بزمِ طلوعِ اسلام'' کے مؤسس، غلام احمد پرویز اور اس کے پیروکاروں کے کافر و مرتد ہونے کا فتویٰ صادر فرمایا ہے، جس میں مسلمان حکومتوں سے یہ کہا گیا ہے کہ وہ اس گروہ کے تائب نہ ہونے کی صورت میں، اس کے خلاف ارتداد کی شرعی سزا نافذ کریں۔ اس فتوے میں چند کفریہ عقائد کو بیان کرنے کے بعد، جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کا اُردو ترجمہ درج ذیل ہے:

> اس کے علاوہ بھی، اس جماعت نے بہت سے ایسے گمراہ عقائد و افکار اپنائے ہوئے ہیں (جن کی یہ دعوت بھی دیتے ہیں) جن میں سے ایک ہی عقیدہ، اس جماعت کے اسلام سے خارج ہونے اور زمرۂ مرتدین میں شامل ہونے کے لیے کافی ہے چہ جائیکہ بہت سے عقائد کفریہ جمع ہوجائیں۔ علماءِ اسلام کی بجائے،

---

❶ ماہنامہ محدث، اگست ستمبر، صفحہ: ۱۰۹۔

❷ ماہنامہ محدث، اگست ستمبر ۲۰۰۲ء، صفحہ: ۱۱۰۔

اگر عام لوگ بھی، ان کے عقائد و افکار کے بارے میں غور و فکر کریں گے تو وہ بھی اس جماعت کی ضلالت و کفریات کے جاننے کے بعد، اس کے کافر و مرتد ہونے کا یقینی فیصلہ کریں گے، کیونکہ یہ جماعت، اللہ اور اس کے رسول کو جھٹلاتی اور مؤمنین کے راستے سے انحراف کرتی، اور معروف ضروریاتِ دین میں تحریف کرتی ہے۔ ❶

الغرض، یہ ہے، عالمِ اسلام کے علماء کے نزدیک، جناب پرویز صاحب کی ''قرآنی خدمات'' کی قدر و قیمت۔ اب اس کے برعکس یہ بھی ملاحظہ فرما لیجیے کہ عالمِ کفر، ان کی ''قرآنی خدمات'' کو کس نظر سے دیکھتا ہے۔

دُنیاءِ کفر کا پرویز صاحب کو خراجِ تحسین

جناب غلام احمد پرویز کا قرآنِ کریم سے اخذ کیا ہوا، وہ جدید اسلام، جو دراصل اشتراکیت اور مغربی معاشرت کے عادات و اطوار پر، قرآنی ٹھپہ لگا کر تیار کیا گیا ہے، خود ان کے نزدیک، ''انقلابی اسلام'' ہے، کفر کی مصلحتوں نے، اس جدید اور ''انقلابی اسلام'' کو، اپنے مطلب کے مطابق، محمد رسول اللّٰہ والذین معه کے حقیقی اسلام کے خلاف پایا، تو عالمِ کفر، اس کی تعریف و تحسین پر اُتر آیا۔ طلوعِ اسلام نے جب یہ دیکھا کہ عالمِ اسلام کے علماء، جس شخص کو کافر و مرتد قرار دے رہے ہیں، دنیائے کفر کے بے دین اسکالرز، اُسی شخص کو اپنی آنکھ کا تارا سمجھتے ہیں، اور اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں، تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ چنانچہ طلوعِ اسلام، خوشی سے باغ باغ ہوتے ہوئے، وفورِ مسرت سے یہ لکھتا ہے:

> ڈاکٹر (Freeland Abbot) امریکہ کی (Tufts) یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے صدر اور بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ انھوں نے ''اسلام اینڈ پاکستان'' کے نام سے، ۱۹۶۸ء میں، ایک بلند پایہ کتاب شائع کی تھی۔ اس میں انھوں نے فکرِ پرویز اور تحریکِ طلوعِ اسلام کے متعلق بڑی تفصیل سے دادِ تحسین دینے کے بعد کہا ہے کہ...... ''پرویز صاحب، اس وقت، پاکستان کے سب سے بڑے فعال

---

❶ ماہنامہ محدث، اگست ستمبر ۲۰۰۲ء، صفحہ: ۱۱۵ تا ۱۱۶۔

> اسلامی ریفارمر ہیں۔" ...... یہ کتاب، فکر پرویز کو دنیا کے دور دراز گوشوں تک متعارف کرانے کا موجب بن گئی ہے۔ ①

اب یہ بات، ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ اگر یہ "جدید اور انقلابی اسلام" واقعی صحیح اسلام ہے، تو امریکہ کو اسلام کا یہ درد کیسے اُٹھ آیا کہ وہ اس کو "دنیا کے دور دراز گوشوں تک متعارف کرانے کا موجب" بن جائے؟ کیا یہ "انقلابی اسلام" فی الواقع اشتراکی نظام معیشت اور مغربی معاشرت کے لوازمات کو، قرآن کے نام کا چکمہ دے کر درآمد کرنے کی وہ سازش نہیں ہے، جو امریکہ اور یورپ کی مادہ پرست تہذیب کو، صرف اس لیے پسند ہے کہ اس "انقلابی اسلام" کو محمد رسول اللہ والذین معہ کے حقیقی اسلام کے متبادل اور مقابل قرار دیا جا رہا ہے؟ یوں دین اسلام میں رخنہ اندازی اور پیوند کاری، امریکی، یورپی اور اشتراکی حکومتوں کے سیاسی اغراض کے عین مطابق ہے، کیونکہ

> مغربی ممالک، خواہ وہ یورپ ہو یا امریکہ، اسلام کی طرف خالص علمی نقطۂ نظر سے توجہ نہیں کر رہے ہیں۔ یورپ کے سامنے بھی اپنے سیاسی مقاصد تھے، اس طرح امریکہ کے پیش نظر بھی اپنے سیاسی مصالح ہیں۔ ②

بہرحال، مغربی دنیا، پرویز صاحب کو، ان کے "انقلابی اسلام" اور ان کی "قرآنی خدمات" کی بناء پر، بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ طلوع اسلام اور پرویز صاحب، بڑے مسرور و مطمئن ہیں کہ چلو عالم اسلام میں نہیں، تو عالم کفر میں تو ان کی پذیرائی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ طلوع اسلام، اہل کفر کے ہاں، "مفکر قرآن" (اور ان کی "قرآنی خدمات") کی پذیرائی اور قدر افزائی پر، خوشی سے نہال ہوتے ہوئے لکھتا ہے:

> غالباً ۱۹۶۰ء کا ذکر ہے، (Peter Schmid) نامی ایک جرمن سکالر، ہندو پاک کی سیاحت کے لیے آیا، اور پرویز صاحب سے بھی آ کر ملا۔ بعد میں، اس نے اپنے تاثرات اور افکار کو کتابی شکل میں مرتب کیا، جس کا انگریزی ترجمہ

---

① طلوع اسلام، نومبر ۱۹۷۶ء، صفحہ: ۵۸۔

② طلوع اسلام، ۳ ستمبر ۱۹۵۵ء، صفحہ: ۱۳۔

(Idia_Mirage & Reality) کے نام سے شائع ہوا، جس کا اس زمانے میں بڑا چرچا ہوا، اس نے پرویز صاحب سے اپنی ملاقات کا حال، بڑے شگفتہ اور ڈرامائی انداز میں بیان کیا ہے۔ ❶

اس کے بعد ''مفکرِ قرآن'' کی تعریف وتحسین میں (Peter Schmid) کا درج ذیل اقتباس دیا گیا ہے:

> میں پچھلی مرتبہ پاکستان میں آیا تھا تو ایک مذہبی شخصیت، پیر مانکی شریف (مرحوم) سے ملا تھا۔ اس دفعہ ایک اور مذہبی شخصیت سے ملاقات ہوئی جس کی تعلیم اور وسعت ظرف، اسے بالکل ایک مختلف زمرہ میں شامل کرتی ہے۔ قرآنک ریسرچ سنٹر، جس کے سربراہ جی اے پرویز ہیں، گلبرگ کے ایک مکان کی نچلی منزل پر واقع ہے، اسی گلبرگ میں جو فلم اسٹارز اور دیگر ارضی مخلوق کا مسکن ہے۔ ان کے کمرے میں کھانے پینے کے برتن، اور ان کا کتب خانہ اور مسودات، اس امر کی شہادت دیتے تھے کہ وہی کمرہ، ان کا دفتر بھی ہے اور خواب گاہ بھی۔ اس مردِ بزرگ کے چہرے کی عمیق لکیریں، اور اس کی نیند کو ترسی ہوئی آنکھیں، سادہ سی دھات کے فریم کا چشمہ اور سفید بال، اس حقیقت کے غماز تھے کہ وہ کس گہری سوچوں میں ڈوبا رہتا ہے۔ ان سوچوں کی پیدا کردہ علمی اور فکری صلابت میں کچھ لوچ پیدا کرتی تھیں، تو اس کی خواب آلود آنکھیں۔ اس کے نزدیک، تقویٰ، ترکِ دنیا کا نام نہیں بلکہ اس دنیا کو صفاتِ خدا کا آئینہ دار بنا دینے کی بالارادہ کوشش کا نام ہے۔ ❷

لادینیت کی علمبردار تہذیب مغرب کے ایک اور سپوت کی طرف سے، پرویز صاحب کو خراجِ تحسین پیش کیے جانے کا تذکرہ، بایں الفاظ کیا گیا ہے:

> ہالینڈ کے مشہور مستشرق (Dr. J.M.S. Baljon) نے ۱۹۶۱ء میں ایک کتاب

---

❶ طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۷۶ء، صفحہ: ۵۷۔

❷ طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۷۶ء، صفحہ: ۵۷۔

> شائع کی، جس کا عنوان ہے: (Modern Muslim Koran Interpre-tation)، یعنی ''عصر جدید کے مفسرین قرآن''۔ اس مقصد کے لیے، اس نے برصغیر ہندو پاک سے تین مفسرین کا انتخاب کیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم)، علامہ عنایت اللہ خاں المشرقی (مرحوم) اور پرویز صاحب۔ ❶

ضمناً، یہاں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ عنوانِ کتاب کا جو ترجمہ ''عصر جدید کے مفسرین قرآن'' کے الفاظ میں کیا گیا ہے، وہ قطعی غلط ہے۔ صحیح ترجمہ یا تو یہ ہے کہ ''تجدد پسند مسلمانوں کی ترجمانی قرآن'' یا پھر یہ کہ ''قرآنِ مسلم کی تجدد پسندانہ ترجمانی۔'' طلوعِ اسلام کا غلط ترجمہ، خواہ جہالت علمی کے باعث ہو، یا جان بوجھ کر، شعوری خیانت کے تحت ہو، بہرحال اور بہر صورت، معیوب حرکت ہے۔ اس ضمنی وضاحت کے بعد اس غیر مسلم مصنف نے ''مفکر قرآن'' کو، ان الفاظ میں ہدیۂ عقیدت پیش کیا ہے:

> پرویز صاحب کی شخصیت کے حقیقی جوہروں کو ان کی درخشندہ اور بلند پایہ علمی صلاحیتوں میں تلاش نہیں کرنا چاہیے، مبداءِ فیض نے، انھیں، ان نوجوانوں کے لیے، جن کا موجوں کے تلاطم میں گھرا ہوا سفینۂ حیات، مذہبی لنگر کی تلاش میں ہو، اعلیٰ صلاحیتوں کا استاد اور شفیق باپ کی طرح دوست بنایا ہے، ان کی صاف اور شفاف نگاہ، پیش آمدہ مسائل کی گہرائیوں تک پہنچ جاتی ہے، اور ان کے متعلق، ان کے بلا کاوش و تردّد، صائب رائے، آزادانہ فیصلے، ان کے اطمینانِ قلب و شرحِ صدر کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ اس سے توقع کی جاسکتی ہے کہ ان کے اثر و نفوذ کا دائرہ دن بدن وسیع تر ہوتا جائے گا۔ ❷

مغربی اسکالرز میں سے، ایک اور شخصیت کی طرف سے، پرویز صاحب کو ملنے والے شرفِ تہنیت و پذیرائی کو، طلوعِ اسلام، ان الفاظ میں پیش کرتا ہے:

> مستشرقینِ مغرب میں سے پروفیسر (E.I.J. Rosenthal) کا نام کسی تعارف

---

❶ طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۷۶ء، صفحہ: ۵۷ تا ۵۸۔

❷ طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۷۶ء، صفحہ: ۵۸۔

کا محتاج نہیں۔ انھوں نے (Islam in The Modern National State) کے عنوان سے ایک شہرۂ آفاق کتاب لکھی ہے، جسے کیمبرج یونیورسٹی پریس نے ۱۹۶۵ء میں شائع کیا۔ اس میں انھوں نے پاکستان میں مختلف اسلامی تحریکوں کا وسیع جائزہ لیا، اور پرویز صاحب اور ان کی تحریک کا ذکر خاصی تفصیل سے کیا ہے۔ ❶

کینیڈا کی ایک یونیورسٹی کی علمی تحقیقات کا ذکر کرتے ہوئے، ایک کافر خاتون کے گل ہائے عقیدت (جو اس نے پرویز صاحب کی ''قرآنی خدمات'' پر پیش کیے ہیں)، طلوع اسلام میں، ان الفاظ میں مذکور ہیں:

> کچھ عرصہ ہوا، (Mc Gill) یونیورسٹی (کینیڈا) کی طرف سے (Miss Sheila Mc Donough) نامی ایک طالبہ، ڈاکٹریٹ کے لیے اپنے تھیسس کی غرض سے پاکستان آئی تھی۔ وہ کافی عرصہ یہاں رہی، اور اس کے بعد (The Authority of the Past) کے عنوان سے اپنا تحقیقاتی مقالہ لکھا، جسے امریکن اکادمی آف ریلیجن نے ۱۹۷۰ء میں شائع کیا۔ اس میں اس نے سرسیّد، اقبال اور پرویز کو اپنی تحقیق کا موضوع قرار دیا ہے۔ مقالہ اگرچہ ایک طالب علم کا ہے، لیکن اس سے اس حقیقت کا پتہ چلتا ہے کہ امریکہ اور کینیڈا وغیرہ کی یونیورسٹیاں، فکر پرویز کو ڈاکٹریٹ کے لیے تحقیقاتی مقالات کا موضوع منتخب کر رہی ہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ (Mc Donough) نے (Social Importance of Pervez's Religious thoughts) کے نام سے ایک اور تحقیقاتی مقالہ بھی شائع کیا ہے، وہ ابھی تک ہماری نظروں سے نہیں گزرا، لیکن علمی حلقوں میں اس کا بھی ذکر آتا ہے۔ ❷

ایک اور عیسائی اسکالر، جو کسی عیسائی مشنری سے وابستہ ہیں، پرویز صاحب کو جو خراج

---

❶ طلوع اسلام، نومبر ۱۹۷۶ء، صفحہ: ۵۸۔

❷ طلوع اسلام، نومبر ۱۹۷۶ء، صفحہ: ۵۹۔

عقیدت پیش کرتا ہے، اسے طلوعِ اسلام یوں بیان کرتا ہے:

> سوئٹزرلینڈ کے ڈاکٹر (P. Robert A. Butler) پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ لاطینی سے وابستہ اور عیسائی مشنری حلقہ کی ایک ممتاز شخصیت ہیں۔ فکرِ پرویز کے ساتھ، ان کی وابستگی کا اندازہ، اس سے لگائیے کہ وہ طلوعِ اسلام کا التزاماً مطالعہ کرتے ہیں، اور پرویز صاحب کی کوئی کتاب ایسی نہیں، جسے وہ، اس کے شائع ہونے کے ساتھ ہی حاصل نہ کر لیتے ہوں۔ سالِ گذشتہ انھوں نے، اپنے عرصۂ دراز کے اس مطالعہ کا ماحصل (Ideological Revolution Through The Quran) کے نام سے ایک تحقیقاتی مقالہ کی شکل میں پیش کیا، جس نے مشنری دوائر میں بالخصوص بڑی شہرت حاصل کی۔ اس مقالہ کی اہمیت کا اندازہ، اس سے لگائیے کہ اب حال ہی میں، اس کا فرانسیسی زبان میں ایڈیشن، ٹیونس (مراکو) سے شائع ہوا۔ ①

آخر یہ پذیرائی کیوں؟

یہ خراجِ تحسین، یہ تعریف و توصیف، یہ تہنیت و پذیرائی اور گل ہائے عقیدت، ’’مفکرِ قرآن‘‘ صاحب کو، اُن یہودی، عیسائی، کافر و لادین علماءِ مغرب کی طرف سے پیش کیے گئے ہیں جو اسلام کے بدترین دشمن ہیں۔ کیوں؟ اور کس لیے؟ صرف اور صرف اس لیے کہ جو ’’انقلابی اسلام‘‘ انھوں نے پیش کیا ہے، وہ مغربی ممالک کے سیاسی اغراض و مصالح کے عین مطابق ہے۔ اس لیے وہ ’’مفکرِ قرآن‘‘ چوہدری غلام احمد پرویز صاحب سے انتہائی خوش ہیں، بالکل اُسی طرح، جس طرح کل (اور آج بھی) انگریز، اپنے ’’خود کاشتہ پودے‘‘ مرزا غلام احمد قادیانی سے خوش تھے (اور ہیں۔) آج روئے زمین پر پورا عالمِ کفر، پرویز صاحب، سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین جیسی شخصیتوں کی ’’قرآنی خدمات‘‘، ’’حق گوئی‘‘ اور ’’لبرل اسلام‘‘ سے راضی بھی ہے، اور خوش بھی۔ قرآنِ کریم نے تو چودہ سو سال قبل ہی، اس حقیقت کو واشگاف

---

① طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۷۶ء، صفحہ: ۵۹۔

کر دیا تھا کہ: ﴿ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً ﴾ [النساء: ۸۹] ...... ’’وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح وہ خود کافر ہیں اُسی طرح تم بھی کافر ہو کر، سب برابر ہو جاؤ۔‘‘ اور یہ بھی غیر مبہم انداز میں واضح کر دیا تھا کہ: ﴿ وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ﴾ [البقرة: ۱۲۰] ......اس آیت کا ترجمہ، خود پرویز صاحب نے بایں الفاظ کیا ہے:

> یہ یہود اور نصاریٰ، تم سے کبھی راضی نہیں ہو سکیں گے، جب تک تو (اپنا مسلک چھوڑ کر) ان کا مسلک اختیار نہ کر لے۔ ❶

طلوعِ اسلام اور پرویز صاحب خوش تھے (اور اب بھی، وفاتِ پرویز کے بعد، طلوعِ اسلام شاداں و فرحاں ہے) کہ یہودی سکالرز، عیسائی مفکر، لادین و بے دین محقق اور علمبردارانِ کفر ’’مفکرِ قرآن‘‘ صاحب کے ’’انقلابی اسلام‘‘ اور ان کی ’’قرآنی خدمات‘‘ سے راضی ہیں، اور چاہتے ہیں کہ یہ ’’انقلابی اور جدید اسلام‘‘ پھیلتا چلا جائے، اسی مقصد کے پیشِ نظر، وہ اپنے مقالات و کتب کے ذریعے، اس کی تعریف و تحسین اور اشاعت و توسیع میں کوشاں ہیں۔ اور ’’مفکرِ قرآن‘‘ کا عالمِ کفر میں عزت و توقیر پالینا، انھیں، اُن منافقین مدینہ کے مشابہ قرار دیتا ہے، جن کے متعلق، قرآن یہ کہتا ہے کہ: ﴿ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ ﴾ [النساء: ۱۳۹] ...... ’’کیا یہ کفار کے ہاں عزت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔‘‘

امرِ واقعہ یہ ہے کہ پرویز صاحب کا ’’جدید اور انقلابی اسلام‘‘، اشتراکیت اور مغربی معاشرت کے اقدار و اطوار اور عادات و آداب کے مخلوطہ پر اسی طرح مشتمل ہے، جس طرح اکبر کا دینِ الٰہی، ہندومت اور اسلام کے آمیزہ پر مشتمل تھا۔

یہاں ایک ستم ظریفی تو یہ ہے کہ ’’مفکرِ قرآن‘‘ صاحب، الفاظ تو قرآن سے لیتے ہیں، مگر مفہوم، اشتراکیت اور مغربیت سے لیتے ہیں۔ آنکھیں تو اپنی استعمال کرتے ہیں، مگر نقطۂ نظر، یورپ سے لیتے ہیں۔ دماغ تو ان کا اپنا ہے، مگر اس میں فکر غیروں سے لے کر بھری ہوئی

---

❶ تفسیر مطالب الفرقان، جلد: ۳، صفحہ: ۲۷۔

ہے۔ کان تو وہ اپنے ہی رکھتے ہیں، مگر مَا قَالَ الرَّسُوْلُ کو سننے کی بجائے، فلاسفۂ کفر والحاد کو سنتے ہیں، زبان تو ان کی اپنی ہے مگر وہ بولی، غیروں کی بولتے ہیں، ﴿ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ط﴾

اور دوسرا المیہ یہ ہے کہ غیروں کی بولی بولنے والا آدمی، اگر حالت جنگ میں ایسا کرے، تو غداروں کے چوکھٹے میں، اس کی تصویر کو محفوظ کر کے، تاریخ کے ایوانوں میں سجا دیا جاتا ہے، لیکن اگر یہی کام حالت امن میں کیا جائے، اور قرآن کے نام پر، قرآن کھول کر کیا جائے، تو اسے ''وسیع النظری''، ''رواداری''، ''لبرل اسلام'' اور ''روشن خیالی'' کا حامل قرار دیا جاتا ہے۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

اب غور طلب بات تو یہ ہے کہ جس ''انقلابی اسلام'' اور جن ''قرآنی خدمات'' سے یہود ونصاریٰ کے احبار و رہبان، کفر و الحاد کے پیشوا، لادینیت کے حامل دانشور اور سیکولرزم سے وابستہ مفکرین، تو راضی اور خوش ہوں، مگر عالم اسلام کے علماء، اسی ''انقلابی اسلام'' اور ان ہی ''قرآنی خدمات'' کی بناء پر، ایک دو نہیں، بلکہ سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں، ''مفکر قرآن'' پر کفر کے فتوے لگا رہے ہوں، تو اس ''انقلابی اسلام'' اور اُن ''قرآنی خدمات'' کی قدر و قیمت معلوم شد۔

اس کے برعکس، مولانا مودودیؒ، کے لٹریچر پر، علماءِ کفر و الحاد اور علمبردارانِ لادینیت نے، جو ریسرچ کی ہے، اُس کے نتیجہ میں، وہ مولانا مودودیؒ کی تعریف و تحسین کی بجائے، اُن کی تحقیر و توہین کرتے ہیں، اور انھیں نامبارک، نامسعود اور منحوس قرار دیتے ہیں۔ صرف ایک حوالہ ملاحظہ فرمائیے:

Finally We Come to The Most Ominous Representative of this Trend, Back to Religious Conservatism: Syed Abu_Al_Ala Mawdudi. ❶

---

❶ Modern Islam in India, By Wilfred Cantwell Smith, 1969, LHR. Page 164.

> (اب) آخر کار، ہم اُس منحوس ترین شخص (کے تذکرہ) کی طرف آتے ہیں جو مذہبی قدامت پرستی کی طرف پلٹنے والے رجحان کا نمایندہ ہے، (یعنی) سیّد ابوالاعلیٰ مودودی۔

مولانا مودودیؒ، کوئی مبرا عن الخطا، یا کوئی معصوم شخصیت نہیں تھے۔ اُن سے بھی غلطیاں ہوئی ہوں گی، (بلکہ یقیناً ہوئی ہیں، اور خود ہمیں بھی، ان سے بعض اُمور میں اختلاف ہے)، لیکن، وہ، بہرحال، ایسے گناہ گار نہیں تھے کہ عالم کفر کے کافر سکالرز، ملحد پیشوا، زندیق فلاسفہ، یہودی ربی اور عیسائی احبار و رہبان، اُن سے خوش ہوتے۔ اگر کسی کی آنکھوں پر تعصب کی عینک نہ چڑھی ہو، سینے میں کینہ و کدورت نہ ہو، دلِ دردمند اور قلبِ حق پسند میں، ذرّہ برابر بھی ایمان موجود ہو، تو وہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ...... مودودیؒ صاحب کی یہی فضیلت و منقبت کیا کم ہے کہ کفارِ اہلِ مغرب کے ہاں، وہ، انتہائی نامسعود، از حد نامبارک اور سب سے بڑھ کر منحوس (The Most Ominous) شخصیت قرار پاتے ہیں...... اور وہ، اپنی اس تحقیر و توہین پر، بجاطور پر یہ کہہ سکتے ہیں:

اذا اتتك مذمتي من ناقص | فهي الشهادة لي باني كامل

> (جب کسی ناقص و کمتر آدمی کی طرف سے میری مذمت آئے، تو یہی، دراصل، میرے کامل ہونے شہادت ہوگی۔)

اور اس کے برعکس، ''مفکر قرآن'' جناب چودھری غلام احمد پرویز صاحب کی یہی رذیلت و رسوائی کیا کم ہے کہ علماءِ یہود ہوں یا احبار و رہبانِ عیسائیت، علمبردارانِ کفر ہوں یا پشتی بانانِ الحاد، فلاسفۂ زندقہ ہوں یا دانشورانِ دہریت، وہ سب کے سب، راضی اور خوش ہو کر، انھیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ○ فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَلْبَابِ ○

* * * *

اختتامی کلمات

ا۔ استشراقی ہتھکنڈے اور ''مفکر قرآن''

کتاب ھذا کے افتتاحی کلمات میں یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ ہمارے ''مفکر قرآن'' جناب غلام احمد پرویز صاحب، دورِ حاضر کی غالب (مغربی) تہذیب سے ذہناً مرعوب اور عملاً مفتوح ہیں۔ اپنی فکری اسیری اور ذہنی غلامی کے باعث، قرآن کریم کے نام کی آڑ میں، اپنی جن ''پچاس سالہ قرآنی خدمات'' پر، وہ نازاں و فرحاں تھے، اُس کے جملہ اجزاء، بغیر کسی قرآن کے، مغرب میں، پہلے سے موجود ہیں۔ پھر ان ''قرآنی خدمات'' کو بجا لاتے ہوئے، جن ہتھکنڈوں کے ساتھ، کتاب اللہ کو، اپنی رکیک تاویلات، بلکہ تحریفات و تلبیسات کا نشانہ بنایا ہے، وہ، سب کے سب مستشرقین ہی کے طرۂ امتیاز ہیں، جن کی وضاحت مندرجہ ذیل اقتباسات میں ظاہر ہے:

> (۱)............ مستشرقین کی ایک عادت یہ رہی ہے کہ وہ جب بھی کسی موضوع پر قلم اُٹھاتے ہیں، تو وہ اس کے مسلمات کو جھٹلاتے یا کم از کم ان میں تشکیک پیدا کر کے، خود اپنا نظریہ گھڑتے ہیں۔ ❶

> (۲)............ یورپی مؤرخین ایک اعتراض بیان کرنے میں، جو غلط ہوتا ہے، پے در پے اور بہت سے جھوٹ ملاتے چلے جاتے ہیں، جواب دینے والا ایک جھوٹ کا جواب دینا چاہتا ہے، تو سامنے ایک اور جھوٹ آ جاتا ہے۔ وہ ادھر متوجہ ہوتا ہے تو ایک اور جھوٹ نمایاں ہوتا ہے۔ مسلسل دروغ بیانیوں اور افتراء پردازیوں کے ہجوم پر بے اختیار اس کو طیش آ جاتا ہے، اور بجائے اس کے کہ وہ

---

❶ اسلام اور مستشرقین، جلد: ۲، صفحہ: ۱۴۱۔

سکون اور اطمینان کے ساتھ، اس واقعہ کے انکشاف پر متوجہ ہو، غصہ سے بے قابو ہو جاتا ہے۔ ❶

(۳)………… مستشرقین کا یہ شیوہ رہا ہے کہ وہ جب کچھ زہریلی باتیں کہنا چاہتے ہیں تو وہ بہت کچھ تعریف و تحسین کی باتیں کہہ کر، اپنی زہریلی باتوں کا جواز نکال لیتے ہیں۔ ❷

(۴)………… ایک اور بات، جو سب ہی مستشرقین میں پائی جاتی ہے، یہ کہ وہ سیرتِ طیبہ کے واقعات کی صحیح نوعیت کو سمجھنے کے لیے، اُس زمانہ کے عربی ماحول سے تو صرفِ نظر کر لیتے ہیں، اور پھر خود، اپنے ہی زمانہ کے آئینے میں، اپنے ہی رسوم و قیود سے بندھے ہوئے ماحول میں، ان واقعات کو سمجھنے اور اپنے خیالات کا ان پر عکس ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مغربی محققین نے سیرتِ رسول ﷺ پر جو کام کیا ہے، ان میں تحقیق کی یہ خامی، ہر جگہ موجود ہے۔ ❸

(۵)………… متعصب مستشرقین کی یہ ایک عام عادت ہے کہ اگر انھیں اسلام کا کوئی رُخ زیادہ روشن اور تابناک نظر آتا ہے، تو وہ اس کی بدنمائی میں لگ جاتے ہیں، اور اس کے لیے اصل ماخذ میں ردّ و بدل اور عبارتوں میں قطع و برید کے ایسے طریقے اختیار کرتے ہیں، جو متانت، سنجیدگی، معقولیت اور انصاف سے خالی اور تاریخی حقائق و شواہد کے خلاف ہوتے ہیں۔ ❹

(۶)………… مستشرقین، مسلمانوں کے جو علمی خزائن منظر عام پر لائے، اُن میں اور اپنی اسلام سے متعلق تصانیف میں بھی، اُنھوں نے صحیح واقعات کو توڑ مروڑ کر، نیا اور غلط رنگ دے کر، ان کا اصلی اور حقیقی رنگ غائب کر دیا ہے۔ جس حقیقت کو چاہا، افسانہ اور جس افسانے کو چاہا، اپنی رنگ آمیزی سے حقیقت بنا دیا، اور سچائی اور

---

❶ اسلام اور مستشرقین، جلد:۴، صفحہ: ب ج۔

❷ ایضاً، جلد:۶، صفحہ:۱۶۔

❸ ایضاً، جلد:۶، صفحہ: ۳۳۰۔

❹ ایضاً، جلد:۶، صفحہ:۳۱۹۔

> اصلیت کو اپنی ملمع کاری سے جھوٹ اور فریب ثابت کر دیا۔ وہی مارگولیتھ، جس نے مسند احمد کی چھ جلدوں کا ایک ایک حرف پڑھا تھا، جب رسول اکرم ﷺ کی سوانح عمری لکھتا ہے، تو بقول مولانا شبلی نعمانی، دنیا کی تاریخ، اس سے زیادہ کوئی کذب وافتراء اور تاویل وتعصب کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ اس کا اگر کوئی کمال ہے، تو یہ ہے کہ سادہ سے سادہ اور معمولی سے معمولی واقعہ کو، جس میں برائی کا کوئی پہلو نہیں ہوسکتا، صرف اپنی طباعی کے زور سے بدمنظر بنا دیتا ہے۔ ①

خدا گواہ ہے کہ ''مفکر قرآن'' نے اپنے پورے لٹریچر میں، مختلف مباحث ومسائل پر قلم اُٹھاتے ہوئے، نہ صرف یہ کہ مستشرقین کے ان سب حربوں سے کام لیا ہے، بلکہ اپنے کچھ مخصوص ''پرویزی حیلوں'' کا بھی، ان میں اضافہ کیا ہے۔ انھوں نے جہاں چاہا، اپنی طباعی کے زور پر، سیدھے سادے تاریخی واقعات میں، عیب ونقص کا کوئی نہ کوئی پہلو پیدا کر ڈالا۔ ایران کی ظالمانہ حکومت اور اُس کی مفسدانہ تہذیب کے خاتمہ پر، مسلم فاتحین کے حسن سلوک کے باوجود، اہل ایران کے دلوں میں اُبھرنے والے ''انتقام'' کا شاخسانہ، اور پھر شہادتِ عمر رضی اللہ عنہ کو اپنے اس من گھڑت شاخسانے کا نتیجہ قرار دینا، اور پھر ہرمزان جیسے صادق الایمان اور امین المشاورت شخص کو، جو کلمۂ توحید پڑھتے ہوئے اپنی مقتولانہ موت کا استقبال کرتا ہے، قتل خلیفۂ ثانی کی سازش میں شریک قرار دینا، اس کی واضح مثالیں ہیں۔

تاریخی حقائق کی تکذیب کے لیے، یا کم از کم، ان میں تشکیک پیدا کرنے کے لیے، اپنے توہمات کو حقائق کا لباسِ زُور پہنانے سے بھی گریز نہیں کیا۔ اپنی دیگر کتب میں بالعموم اور ''عجمی سازش'' کے افتراء واختراع میں بالخصوص، تہہ در تہہ اور پے در پے مغالطات سے اس قدر ملمع کاری کی ہے کہ پریشان ہو کر، دورانِ تصنیف، مَیں یہی سوچتا رہا ہوں کہ کس مغالطے کا پردہ چاک کروں اور کسے نظر انداز کروں۔ میں نے بہر حال، اپنی طرف سے بھرپور کوشش کی ہے کہ ''مفکر قرآن'' کا پیش کردہ کوئی قابل لحاظ باطل تصور، میرے جائزہ میں چھوٹنے نہ

---

① اسلام اور مستشرقین، جلد: ۷، صفحہ: ۲۔

پائے۔ تاہم قارئین کرام، اگر ایسی کوئی چیز محسوس کریں، تو پبلشر کی معرفت، مجھے اطلاع دیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کوتاہی کا ازالہ کر سکوں۔

پھر "عجمی سازش" کی اس خود ساختہ داستان میں، کتنے ہی ایسے مقامات ہیں جہاں "مفکر قرآن" نے ماخذ کا حوالہ دینے سے گریز کیا ہے، کتاب ہذا میں ان مقامات کی نشاندہی میں نے کردی تھی۔ بلا حوالہ پیش کیے جانے والے اقتباسات کی تلاش و جستجو میں جس قدر میرا وقت صرف ہوا ہے، اور جو محنت و مشقت مجھے برداشت کرنا پڑی ہے، وہ بس خدا ہی کو معلوم ہے۔

مواد پیش کرتے ہوئے، "مفکر قرآن" نے قطعاً اس بات کا خیال نہیں رکھا کہ صحت و صداقت کے اعتبار سے، اس کی کیا حیثیت ہے۔ جو کچھ مفاد و مصلحت کے ترازو میں پورا اُترا، اُسے قبول کر لیا، خواہ وہ معیار صحت کے لحاظ سے کتنا ہی گرا ہوا ہو، اور جو کچھ اس ترازو میں پورا نہ اُتر سکا، اسے ردّ کر ڈالا، خواہ وہ صحت و صداقت کے لحاظ سے کتنا ہی بلند پایہ ہو۔ پھر ان امور میں "مفکر قرآن" کی یہ "مخصوص ذہنیت" بھی بے نقاب ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے کہ کتب احادیث ہوں یا کتب تواریخ، وہ، ان میں مذکور، ہر روایت کو، قرآن کے نام کی آڑ لے کر، اس اصولی دلیل کے ساتھ قبول کر لیتے ہیں۔

> اگر ہمیں تاریخ میں صحابہ کبار (یا خود نبی اکرم ﷺ) کے متعلق کوئی ایسی بات ملے، جو قرآن کے خلاف ہو، تو ہمیں بلا تامل کہہ دینا چاہیے کہ تاریخ کا وہ بیان صحیح نہیں۔ ①

لیکن "مفکر قرآن" کی خود ساختہ "عجمی سازش" کا واقعہ، اپنی جملہ تفصیلات و جزئیات کے ساتھ، (بقول ان کے) نزولِ قرآن کے برسوں بعد وقوع پذیر ہوا، لہٰذا، قرآن میں اشارتاً یا کنایتاً، تفصیلاً یا اجمالاً، حقیقتاً یا مجازاً، صریحاً یا تلمیحاً، اس سازش کا کہیں بھی ذکر نہیں ہے، اس لیے اپنی اس خود ساختہ "عجمی سازش" کے سلسلہ میں، "مفکر قرآن" نے جن روایات کو قبول کیا ہے، وہ اس بناء پر نہیں کہ وہ مطابق قرآن ہیں اور جن روایات کو ترک کیا

---

① طلوع اسلام، جنوری ۱۹۶۳ء، صفحہ: ۵۸۔

ہے، وہ بھی اس بناء پر نہیں کہ وہ خلافِ قرآن ہیں، بلکہ یہ سب ردّ و قبول، صرف اور صرف، اس بنیاد پر ہے کہ کون سی روایت، مزعومہ "عجمی سازش" کے اثبات میں معاون ہے، اور کون سی مخالف ہے۔ پھر ان میں کتنی ہی ایسی روایات ہیں، جن کے ماخذ کا حوالہ دیا ہی نہیں گیا، لیکن دعویٰ پھر بھی یہی ہے:

> میں نے انتہائی کوشش کی ہے کہ جو کچھ بیان کیا جائے، تاریخ اور روایات کی سند سے بیان کیا جائے۔ ❶

تاریخی امور ہوں یا کتبِ سیر کے واقعات، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر، خواہ قرآن و حدیث کے حقائق ہوں، انھیں توڑ مروڑ کر، نئے اور غلط رنگ میں مصبوغ کرتے ہوئے، "مفکرِ قرآن" نے ان کا واقعی اور حقیقی رنگ اڑا دیا ہے۔ بعض عبارات و اقتباسات سے، اپنا من پسند مطلب نچوڑنے کے لیے، یا تو غلط تراجم پیش کیے ہیں، یا ان میں بین القوسین اضافے کیے ہیں، جیسا کہ میں نے مختلف مقامات پر واضح کیا ہے۔

ان "پرویزی حیلوں" اور اشتراقی ہتھکنڈوں کے ذریعے، حقائق کو افسانوں میں اور افسانوں کو حقائق میں تبدیل کرنے کے ساتھ ساتھ، مسخِ حقائق کی وارداتیں بھی کی گئی ہیں۔ پھر کسی تاریخی واقعہ پر بحث کرتے ہوئے، اُس کے واقعی ماحول کو پیشِ نظر رکھنے کی بجائے، دورِ حاضر کے ماحول کو سامنے رکھ کر، اعتراض کا نشانہ بنایا گیا ہے۔

سب سے بڑھ کر، یہ کہ "عجمی سازش" کو عالمِ واقعہ کی حقیقت قرار دینے کے لیے، جن اقتباسات کو بنیاد بنایا گیا ہے، ان میں دو تہائی سے زائد اقتباسات وہ ہیں جنھیں شیعہ علماء کی کتب سے لیا گیا ہے، اور کچھ وہ ہیں جنھیں ناصبیت کے علمبرداروں، انکارِ حدیث کے پیشواؤں، قادیانیت کے سرغنوں اور مستشرقین کے شاگردوں کی تصنیفات سے ماخوذ کیا گیا ہے۔ کل ستتر (۷۷) اقتباسات میں سے، صرف دس گیارہ عبارتیں، علماءِ اہل سنت کی کتب سے لی گئی ہیں، پھر انھیں مختلف حیلوں اور حربوں کے ذریعے نشانۂ تحریف بنایا گیا ہے، (جس کی

---

❶ شاہکارِ رسالت، صفحہ: ۴۴۷۔

وضاحت، میں نے اس کتاب میں کردی ہے) کیونکہ اس کے بغیر ’’عجمی سازش‘‘ کی بیل منڈھے نہیں چڑھ سکتی تھی۔

پھر ’’عجمی سازش‘‘ کی اس آکاس بیل کو، شجر اسلام پر مسلط کرنے کے لیے، ’’مفکر قرآن‘‘ نے جن استشراقی مکائد اور ’’پرویزی حیلوں‘‘ سے کام لیا ہے، اُن میں ایک بہتان تراشی کا حیلہ بھی شامل ہے۔ اپنی شاطرانہ قلمکاریوں کے ذریعے، نہ صرف ائمۂ فقہ اور ماہرین حدیث ہی پر افتراء پردازی کی گئی ہے، بلکہ صحابہ کرام تک کو معاف نہیں کیا گیا کہ انھوں نے شہادتِ عمر رضی اللہ عنہ کو ’’مفکر قرآن‘‘ کے زعم وگمان پر، اہل ایران کی ’’انتقامی کارروائی‘‘ باور کرنے کی بجائے، محض ایک نجی وارداتِ قتل قرار دیا۔ اور جس مقدمے کو ’’مفکر قرآن‘‘ نے، چودہ صدیوں بعد، اپنی وکیلانہ موشگافیوں کا نشانہ بنایا ہے، اُسے صحابہ کرام نے کوئی اہمیت نہ دی۔ اور قتل عمر رضی اللہ عنہ کے جن سازشیوں کو، صدیوں کی دور دراز مسافت سے، اپنی دوربین اور خوردبین آنکھوں سے ڈھونڈ نکالا، صحابہ نے انھیں کیفر کردار تک نہ پہنچایا۔

مزید برآں، ’’مفکر قرآن‘‘ نے، اپنی ’’عجمی سازش‘‘ کی ساخت کے دوران، جن ذنوب و جرائم کو، علماءِ اُمت کے گلے مڑھ دیا ہے، بعینہٖ وہ یا اُن سے ملتے جلتے جرم و گناہ کا ارتکاب، خود انھوں نے بھی کر ڈالا ہے، لیکن وہ، دوسروں کی آنکھ کا تنکا دیکھنے کے لیے تو بڑے حدید البصر واقع ہوئے تھے، لیکن اپنی آنکھ کا شہتیر انھیں کبھی دکھائی نہیں دیا۔ ان امور کی مثالیں اگرچہ گزر چکی ہیں، لیکن ذہنی استحضار کے پیش نظر، اجمالاً، انھیں دُہرا دینا، مناسب و موزوں نظر آتا ہے۔

1 قرآنِ کریم کی اہمیت کو کم کر ڈالنے کا ’’جرم‘‘ جن وجوہ کی بنیاد پر، ’’مفکر قرآن‘‘، علماءِ اُمت کے کھاتے میں ڈالتے ہیں، ان سب وجوہ کا اعتراف، خود ’’مفکر قرآن‘‘ نے بھی کیا ہے، ان کے استاد جناب جیراجپوری نے اپنی کتاب تاریخ القرآن میں بھی کیا ہے، اور خود طلوعِ اسلام کی عبارات بھی، اس ’’جرم‘‘ پر شاہد عدل ہیں۔

2 نظریۂ ناسخ و منسوخ پر ’’مفکر قرآن‘‘ اگرچہ سیخ پا تھے، لیکن ’’عبوری دور کے احکام‘‘ کے

نام پر، اسے قبول بھی کیے ہوئے تھے، یوں وہ خود، اُن تمام اعتراضات کی زد میں تھے، جن کی بوچھاڑ، وہ، قائلین مسئلہ نسخ پر کیا کرتے تھے۔

3 ”مفکرِ قرآن“ صاحب، وحی جلی اور وحی خفی (یا وحی متلو اور وحی غیر متلو) کی دو قسموں پر تو آتش در پیراہن تھے، لیکن ان کی کتاب، معارف القرآن، جلد دوم میں، تین قسموں پر مشتمل وحی کا اعتراف موجود ہے۔

4 مثلهٗ معه کے فرمانِ نبوی کی تردید، اس بہانہ کے ساتھ کرتے ہیں کہ اس سے قرآن کو ناتمام اور نامکمل دین کا حامل ماننا پڑتا ہے، لیکن وہ، خود، دین اسلام کو اُس وقت تک مکمل نہیں تسلیم کرتے، جب تک کہ ”مرکزِ ملت“ کی جزئیات، ملحق بالقرآن نہ ہوں۔

> دین کی ضروریات، قرآن کے اتباع اور امام وقت کی اطاعت سے پوری ہوتی ہیں۔ ①

5 ”سنت، قرآن پر قاضی ہے“ اس پر ”مفکرِ قرآن“ زبان طعن دراز کیا کرتے تھے۔ اس لیے نہیں کہ سنت سے قرآن کو آزاد رکھنا چاہتے تھے، بلکہ اس لیے کہ، سنت کی بجائے، خود اُن کی اپنی تعبیرات، قرآن پر قاضی بنی رہیں۔ تقیید المطلق، اطلاق المقید، تعمیم الخاص اور تخصیص العام کے جو اختیارات، رسولِ اکرم ﷺ، مامور من اللہ ہوتے ہوئے، بروئے کار لایا کرتے تھے، اُنھیں ”مفکرِ قرآن“ صاحب، بغیر مامور من اللہ ہونے کے، خود استعمال کیا کرتے تھے۔

6 عقیدۂ تقدیر کو، جسے خود حضورِ اکرم علیہ الصلاۃ والسلام، ایمان باللہ کے ایک جز کی حیثیت سے، اس کی اہمیت کے پیشِ نظر، جداگانہ انداز میں بیان فرمایا کرتے تھے، ”مفکرِ قرآن“ نے اُسے ”مجوس کا وضع کردہ عقیدہ“ قرار دے ڈالا۔ لیکن چونکہ ”مجوس کا وضع کردہ یہ عقیدہ، اُنھیں پسند نہ آیا، اس لیے، اُنھوں نے ”انسانی ذات پر ایمان“ کا عقیدہ، خود تراش ڈالا، جسے منکرین حدیث نے بخوشی قبول کرلیا، کیونکہ ان لوگوں کو، ”مفکرِ قرآن“ کے

---

① مقامِ حدیث، صفحہ: ۸۴۔

سوا، کسی کا گھڑا ہوا عقیدہ پسند نہیں ہے۔

۷ ماضی کے فرقہ باطنیہ کے باطنی معانیٔ قرآن کو، صوفیاء کرام کے کھاتے میں ڈال کر، ''مفکر قرآن'' نے، پھر انھیں اپنے اعتراض کا نشانہ بنایا، لیکن ان باطنی معانی سے کہیں بڑھ کر بدتر اور باطل معانی، خود اُنھوں نے پیش کیے، اور ساتھ ہی، عذرِ گناہ بدتر از گناہ، کے مصداق، یہ خیانت اور فریب دہی بھی کہ اپنے من گھڑت باطنی معانی کو باطنی قرار دینے کی بجائے، مجازی معانی قرار دے ڈالا۔

یہ سب کچھ کرتے ہوئے کیا مجال ہے کہ کسی مقام پر بھی، خوفِ خدا یا آخرت میں جواب دہی کا کوئی ادنیٰ سا احساس اُن کے قریب بھی پھٹک سکا ہو۔ اگرچہ ان مختلف مکائد کی مثالیں، ''مفکر قرآن'' کی جملہ کتب کے متفرق مقامات پر موجود ہیں، لیکن یکجا طور پر، ان ہتھکنڈوں سے جہاں بھرپور استفادہ کیا گیا ہے، وہ، ''حدیث کا مقام و مرتبہ'' اور ''عجمی سازش'' کے دو مباحث ہیں۔ پہلا مبحث، اُن کی کتاب ''مقامِ حدیث'' میں ہے اور دوسرا مبحث، ''شاہکارِ رسالت'' اس کے آخری باب میں ہے، جس کا جائزہ زیرِ نظر کتاب میں لیا گیا ہے۔

میری اس کتاب کے آخری باب میں، ''مفکر قرآن'' کی ''پچاس سالہ قرآنی خدمات'' کی، وہ قدر و قیمت واضح کی گئی ہے، جو علماءِ اسلام اور دانشورانِ کفر کے نزدیک قرار پائی ہے۔

پرویز صاحب کا کسی فکر یا نظریہ کو جانچنے کا ایک معیار یہ بھی ہے کہ مخالفین اسے کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ اگر مخالفین، اس کی مخالفت کر رہے ہیں، تو وہ نظریہ یا فکر، درست اور صحیح ہوگا۔ چنانچہ وہ، اسی اصول کی روشنی میں، متحدہ ہندوستان میں، تقسیم ملک کے مسلم لیگی مؤقف کو درست قرار دیا کرتے تھے، کیونکہ ہندو، مسلمانوں کے الگ وطن کی سخت مخالفت کر رہے تھے۔ چنانچہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی قرارداد پاکستان پر، ہندوؤں کے ردّ عمل کا ذکر کرتے ہوئے، ''مفکر قرآن'' صاحب نے فرمایا تھا:

> آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ اس ریزولیشن نے ہندوؤں کو کس طرح آتش در پیرہن کر دیا ہے۔ مہاسبھائی اور کانگرسی، نرم اور گرم، سب بیک زبان، اس کی سخت

> سے سخت مخالفت کر رہے ہیں۔ کیا یہی امر اس چیز کے ثبوت کے لیے کافی نہیں کہ یہ نصب العین، کس طرح، مسلمانوں کے مفاد کے عین مطابق ہے۔ ①

اب اگر مخالفین کی طرف سے کسی مؤقف کی مخالفت، اُس کی صحت کی دلیل بنتی ہے، تو یقیناً مخالفین کی طرف سے ہمنوائی اور حمایت سے آگے بڑھ کر، پرجوش تعریف و تحسین، اُس موقف کے باطل ہونے کی دلیل قرار پاتی ہے۔

پھر اس امر میں تو ذرّہ بھر بھی شک نہیں ہے کہ اسلام کے بدترین دشمن (خواہ وہ یہودی ہوں یا عیسائی، مشرک ہوں یا کافر، دہریئے ہوں یا لادین) سب کے سب ''مفکرِ قرآن'' کی ''پچاس سالہ قرآنی خدمات'' پر خوش اور مسرور ہیں، جب کہ دوسری طرف، عالم اسلام کے جید علماء، کفر کے فتوے عائد کر رہے ہیں۔

اگر ''مفکرِ قرآن'' کے پیش کردہ، اس اصول کی روشنی میں دیکھا جائے، تو عالم کفر کے یہ علماء و محققین، جو ''مفکرِ قرآن'' صاحب کی تعریف و تحسین میں رطب اللسان ہیں، مولانا مودودیؒ کی اسلامی خدمات کے باعث، ان کی تحقیر و توہین اور تردید و تنقید میں بڑے دریدہ دہن اور منہ پھٹ واقع ہوئے ہیں، جیسا کہ گزشتہ باب میں بیان ہو چکا ہے۔ عالم کفر کی طرف سے مخالفت اور حمایت کا پرویزی اصول، یہ بات واضح کر دیتا ہے کہ مولانا مودودیؒ اور ''مفکرِ قرآن'' میں سے، کس کا پیش کردہ اسلام، اعداءِ اسلام کی آنکھوں کا کانٹا ہے اور کس کا اسلام، اُن کی آنکھوں کا تارہ ہے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ فتنۂ قادیانیت ہو، یا فتنۂ انکارِ حدیث، یہ دونوں ہی اُمت مسلمہ میں فکری انتشار اور نظریاتی خلفشار پیدا کرتے ہیں۔ اہل اسلام میں یہی تشتت و پراگندگی، عالم کفر کا مطلوب و مقصود ہے۔ یہود و نصاریٰ کے احبار و رہبان، خوب جانتے ہیں کہ ایسی ہی سرگرمیوں سے، مسلمانوں کے ابدان سے روحِ محمد ﷺ کو نکالا جا سکتا ہے۔ اس لیے وہ ایسے انتشار افزاء اور فتنہ پرور ''دانشورانِ قرآن'' کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

---

① طلوعِ اسلام، مارچ ۱۹۷۰ء، صفحہ: ۴۷۔

۲۔ عالم کفر کی جامعات

مغربی ممالک کی جامعات (Universities) میں، اعلیٰ تعلیم کے مراحل میں، تحقیق و ریسرچ کے لیے، جن موضوعات کا انتخاب کیا جاتا ہے، اس کا منتہائے مقصود، بفرمانِ ربّ رحمان: ﴿ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً ﴾ ہے۔ جن اغراض و مصالح کے ترازو میں، دانشورانِ مغرب نے، پرویز صاحب کی ''قرآنی خدمات'' کو تولا ہے، اُن ہی غایات و مقاصد کے ترازو میں تحقیقی موضوعات کو تول کر وہ قبولیت یا عدم قبولیت کا فیصلہ کرتے ہیں۔ مغربی جامعات میں، مسلم طلبہ کے حوالے سے جو ہدف، علمی تحقیق کے دوران اساتذہ کے پیش نظر ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ مسلمان، خواہ یہودی یا عیسائی بنیں یا نہ بنیں، لیکن وہ مسلمان نہ رہ سکیں۔ خود علامہ اقبالؒ نے، مغرب کی یونیورسٹیوں میں، اسلامی ریسرچ کے مذموم مقاصد کا ذکر بایں الفاظ کیا ہے:

> جہاں تک اسلامی ریسرچ کا تعلق ہے، فرانس، جرمنی، انگلستان اور اٹلی کی یونیورسٹیوں کے اساتذہ کے مقاصد خاص ہیں، جن کو عالمانہ تحقیق اور احقاقِ حق کے ظاہری طلسم میں چھپایا جاتا ہے۔ سادہ لوح طالب علم، اس طلسم میں گرفتار ہو کر گمراہ ہو جاتا ہے۔ (اقبال نامہ، صفحہ: ۳۹۲) ①

اس اعتبار سے دیکھا جائے، تو استشراق کے زیر سایہ قائم ہونے والی مغربی جامعات میں، اسلامی تحقیق اور اسلامی تعلیم کا مقصد، آخر، اس کے سوا کیا ہے کہ یہ۔

''اک سازش ہے فقط دین و مروّت کے خلاف''

مذکورہ بالا ممالک اور ان کے علاوہ دیگر ممالک کی جامعات میں، مسلم طلبہ کو تحقیق و ریسرچ کے نام سے، جو نصابی کتب پڑھائی جاتی ہیں، وہ ایسے متعصب مستشرقین کی تصنیفات ہیں، جنھوں نے اسلام کے خلاف، دروغ و کذب کے ذریعے حقائق کو مسخ کیا ہے، مثلاً گولڈزیہر اور شاخت وغیرہ۔ ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی، شاخت کی بابت، فرماتے ہیں:

---

① اسلام اور مستشرقین، جلد: ۱، صفحہ: ۱۰۴۔

> یہ مستشرق، جامعہ قاہرہ میں مدرس بھی رہ چکا ہے، اس نے تاریخ فقہ اسلامی کے موضوع پر ایک کتاب تصنیف کی ہے جو اس کے استاد و مرشد گولڈزیہر کی تصانیف کی طرح دروغ بافی اور تحریفات کا پلندہ ہے۔ ①

ان نصابی کتب کے بارے میں، ڈاکٹر سباعی، یہ بھی فرماتے ہیں:

> یہ نصاب، گولڈزیہر، مارگولیتھ اور شاخت جیسے مستشرقین کی تصانیف سے ماخوذ ہے۔ ان مستشرقین کا نام، اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ نصاب کس حد تک مسخ شدہ اور خلافِ اسلام و اہلِ اسلام ہوگا۔ ②

ان اقتباسات سے یہ ظاہر ہے کہ شاخت اور گولڈزیہر نے، جو باہم تلمیذ و استاد کے رشتہ میں منسلک ہیں، اپنی تصنیفات میں خوب دروغ گوئی اور تحریف کا مظاہرہ کیا ہے۔ اب رہا مارگولیتھ، جس کی اگر ایک طرف یہ خوبی ہے کہ اس نے مسند احمد بن حنبل کی چھ ضخیم جلدوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے، اور اس کی اس خوبی میں ہمسری کا دعویٰ، شاید ہمارے کسی بڑے سے بڑے شیخ الحدیث کو بھی نہ ہو، تو دوسری طرف، اُس کا یہ حال ہے کہ:

> اُس نے آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری پر جو کتاب لکھی ہے۔ دنیا کی تاریخ، اس سے زیادہ کوئی کتاب، کذب و افتراء اور تاویل و تعصب کی مثال کے لیے پیش نہیں کر سکتی۔ اس کا کمال یہ ہے کہ جس میں برائی کا کوئی پہلو پیدا نہیں ہو سکتا، اُسے صرف اپنی طباعی کے زور سے بدمنظر بنا دیتا ہے۔ ③

اب یہ ظاہر ہے کہ مستشرقین کے اغراض و مقاصد بھی، نصابی کتب بھی اور اساتذۂ جامعات بھی یہ سب مل کر، مسلم طلبہ کو طلسم باطل کا شکار بنا دینے کے لیے کافی ہیں، ڈگری پا کر، اسلام کے بارے میں، ان کا نقطۂ نظر، وہ نہیں رہتا جو قرآن و سنت پیش کرتے ہیں۔ مستشرقین کے یہ مسلمان شاگرد، اُمت مسلمہ میں ذہنی پراگندگی، فکری انتشار، نظریاتی خلفشار اور دماغی

---

① حدیث رسول کا تشریعی مقام، صفحہ: ۴۹۔

② حدیث رسول کا تشریعی مقام، صفحہ: ۴۷۔

③ اسلام اور مستشرقین، جلد: ۱، صفحہ: ۱۱۔

تشتت پیدا کرنے کا وہ کارنامہ انجام دیتے ہیں، جو ان کے اسلام دشمن اساتذہ، خود انجام نہیں دے سکتے۔ فتنۂ استشراق کے ان مراکز (جامعات) میں، اگر کوئی شخص، گولڈزیہر یا شاخت وغیرہ کی علمی اغلاط کو بےنقاب کرنے پر دادِ تحقیق دینا چاہے، تو اُسے ایسے موضوع پر، تحقیقی کام کی اجازت نہیں ملتی، خواہ وہ شخص، استشراقی اساتذہ کی کتنی ہی فکری اسیری اور ذہنی غلامی میں مبتلا ہو کر، ان کا سعادت مند شاگرد قرار پا چکا ہو۔ ڈاکٹر احمد امین مصری، مستشرقین کا ایک ایسا ہی ہونہار مطیع ومنقاد شاگرد تھا، جس کا قارورہ، منکرین حدیث سے ملتا ہے۔ طلوعِ اسلام سے وابستہ لابی کے ایک فرد، جناب عمر احمد عثمانی نے ان کی ایک کتاب کو فجر الاسلام کے نام سے اُردو زبان میں منتقل کیا ہے، اُن کا مندرجہ ذیل واقعہ، جسے ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی کو، خود احمد امین نے سنایا، اس کی واضح مثال ہے:

> احمد امین نے طے کیا کہ وہ شاخت کی تصانیف کے نقد وتبصرہ کو، اپنے مقالہ کا موضوع قرار دیں گے۔ احمد امین نے پروفیسر انڈرسن سے، اس مقالہ کے سلسلہ میں راہنمائی اور امداد کی درخواست کی۔ انڈرسن نے کہا کہ آپ اس موضوع پر تحقیق نہیں کر سکتے۔ جب لنڈن یونیورسٹی میں مایوسی کا سامنا ہوا، تو وہ کیمبرج گئے اور وہاں کے اساتذۂ علوم اسلامیہ کی خدمت میں یہی درخواست پیش کی، مگر سب نے اس موضوع پر تحقیق کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ تاہم احمد امین کو اُمید تھی کہ آخرکار اجازت مل جائے گی۔ مگر ان کی یہ آرزو بر نہ آئی، اور سب اساتذہ نے یک زبان ہو کر، واشگاف الفاظ میں کہہ دیا کہ یونیورسٹی، شاخت کی کتب کو نقد وجرح کا موضوع بنانے کی اجازت ہرگز نہیں دے گی۔ اگر آپ ڈگری لینا چاہتے ہیں، تو کسی اور موضوع پر دادِ تحقیق دیں۔ ①

الغرض، مستشرقین، اُن موضوعات پر تو تحقیق کی اجازت دینے کے لیے تیار ہیں جو اُمت مسلمہ میں فکری انتشار اور ذہنی خلفشار پیدا کرنے والے ہوں، لیکن کسی ایسے اسلامی موضوع پر

---

① حدیث رسول کا تشریعی مقام، صفحہ: ۵۱ تا ۵۲۔

تحقیق کی اجازت دینے کے لیے ہرگز آمادہ نہیں ہیں جو مستشرقین کے اکاذیب و اباطیل اور ان کے دجل و فریب کو بے نقاب کر ڈالے۔

> ان (مستشرقین) کی دلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ مغرب کے جو طلبہ، علوم شرقیہ حاصل کرنا چاہتے ہیں، یا وہ عرب اور مسلم طلبہ، جو ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے یہاں آتے ہیں، صرف گولڈزیہر، مارگولیتھ اور شاخت جیسے متعصب مستشرقین کی تصانیف کا مطالعہ کریں۔ وہ ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ کوئی طالب علم، کسی اسلامی موضوع پر دادِ تحقیق دے، اور مستشرقین کے دجل و فریب کا راز طشت از بام کرے۔ ❶

اس صورتِ حال میں، مغربی جامعات کے کار پرداز اور علومِ اسلامیہ سے وابستہ سکالرز، ہر اُس عنوانِ مقالہ کو، پی ایچ ڈی یا ایم فل کے لیے قبول کر لیتے ہیں، جس کا نتیجہ، اُمت مسلمہ کو، قرآن و سنت کی پٹڑی سے منحرف کر دینے کی صورت میں نکلتا ہو۔ ایسے کسی موضوع پر تحقیق کی اجازت دینا، مغرب سے مسحور دماغوں کے نزدیک، دانشورانِ کفر کی ''وسعت نظر'' اور ''علمی رواداری'' کا شاندار کارنامہ قرار پاتا ہے۔

طلوعِ اسلام کی فکر سے واقف، ہر پڑھا لکھا شخص، یہ جانتا ہے کہ ''مفکر قرآن'' نے جس گمراہی کو بھی اختیار کیا، ''خالص قرآن کی روشنی'' ہی میں اختیار کیا۔ اس کے ساتھ ہی، اُنھوں نے، قارئین طلوعِ اسلام میں یہ فریبِ یقین بھی پیدا کیا کہ چودہ صدیوں میں علماءِ اُمت، خواہ وہ مفسرین قرآن ہوں یا ماہرین حدیث، اصحاب سیر ہوں یا ممتاز مؤرخین، حاملین علم کلام ہوں یا مجتہدین، ان سب نے قرآن کی تعلیمات پر دبیز پردے ڈالے رکھے تھے، اور یہ صرف اور صرف، پرویز صاحب ہی کی ذات ہے، جس نے بڑی ''جراَتِ ایمانی'' اور ''بصیرتِ فرقانی'' سے، قرآن پر سے ان پردوں کو اُتار پھینکا۔

یہ ہے وہ ذکر للعالمین، جس کے مفہوم مبین پر، مذہبی پیشوائیت نے دبیز پردے

---

❶ حدیث رسول کا تشریعی مقام، صفحہ: ۵۱۔

> ڈال رکھے تھے، اور جناب پرویز صاحب، اپنی جرأتِ ایمانی اور بصیرت فرقانی سے، اسے، ان پردوں سے باہر نکال لائے۔ ❶

چودہ صدیوں میں، نہ کسی مترجمِ قرآن نے قرآن کا صحیح ترجمہ کیا، اور نہ ہی کسی مفسر قرآن نے صحیح تفسیر پیش کی، ہر عالم، قرآن اور اسلام کی اصل صورت کو مسخ ہی کرتا رہا، کتاب اللہ اور دین اسلام کی صحیح تصویر، صرف چودھری پرویز صاحب ہی نے پیش کی ہے۔

> ان کی اس بصیرت نے قرآن کریم اور اسلام کی صحیح تصویر، ہمارے سامنے پیش کر دی ہے۔ ❷

تیرہ چودہ سو سالہ مدت کے دوران، قرآن کی آواز کو ''ملاؤں'' نے دبائے رکھا ہے، اب پاکستان کی سرزمین میں، تاریخ کا یہ پہلا موقع ہے، کہ پھر سے یہ آواز اُبھرنا شروع ہوئی ہے:

> اس سرزمین سے تیرہ سو سال بعد، پہلی بار قرآن کی آواز اُٹھی ہے، اور قدرت کو یہ منظور ہے کہ تیرہ سو سال کے بعد، پھر ''قرآنی نظام'' اپنی عملی شکل میں سامنے آئے۔ ❸

> صدرِ اوّل کے بعد ہماری تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ قرآنی نظام کی آواز بلند ہو رہی ہے۔ ❹

''مفکر قرآن'' نے قرآنِ کریم کو، اس طرح اپنا ''اوڑھنا اور بچھونا'' بنا رکھا تھا کہ انہوں نے اگر دروغ گوئی سے کام لیا، یا خیانت و بد دیانتی سے، مغالطہ آفرینی کی روش اپنائی یا فریب دہی کی، اپنے فکری حریفوں پر سب وشتم کی بوچھاڑ کی یا اُنہیں افتراء پردازی کا نشانہ بنایا، حقائق و واقعات کو مسخ کیا یا اُن کا انکار کیا، الغرض، جس ضلالت کو بھی اپنایا، قرآن کا نام لے کر، ''خالص قرآن کی روشنی'' میں اپنایا۔ اور ٹھیک یہی ذہنیت، ''مفکر قرآن'' کی فکر سے وابستہ افراد میں پائی جاتی ہے۔ مستشرقین، جس طرح، پرویز صاحب کی اُن تحریفات و

---

❶ طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۷۸ء، ص ۲۰۔

❷ طلوع اسلام، ستمبر ۱۹۶۵ء، ص ۳۹۔

❸ طلوع اسلام، نومبر ۱۹۵۴ء، ص ۱۱۔

❹ طلوع اسلام، جون ۱۹۶۶ء، ص ۷۸۔

تلبیسات کو، (جنہیں ”مفکرِ قرآن“ اور ان کے مقلدین ”قرآنی خدمات“ قرار دیتے ہیں)، قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، بالکل اسی طرح، استشراقی جامعات کے کارپرداز، اعلیٰ تعلیم کے ان موضوعات کو، بہ نظرِ تحسین دیکھتے ہیں، جن پر پرویزیت یا قادیانیت کی چھاپ لگی ہوئی ہو۔ پھر جس طرح، مستشرقین کے ہاں سے، پرویز صاحب کی ”پچاس سالہ قرآنی خدمات“ پر ملنے والی پذیرائی سے، وابستگانِ طلوعِ اسلام خوشی سے نہال ہو جاتے ہیں، اور مستشرق اساتذہ کی ”علمی رواداری“، ”انصاف پسندی“ اور ”علم دوستی“ کے گن گاتے ہیں، اُسی طرح، ایسے (مسموم) موضوعات کی استشراقی جامعات میں منظوری (Approval) پر بھی، اُن کی مدح سرائی میں جت جاتے ہیں۔ چونکہ پاکستانی یونیورسٹیوں میں شعبہ اسلامیات کے اساتذہ، بالعموم، پرویزی فتنہ اور اس کے حیلوں سے واقف ہیں، اس لیے ظاہر ہے کہ اُن کا رویہ، اُن مستشرق اساتذہ کا سا نہیں ہو سکتا، جن کے مقاصد تحقیق کے بارے میں خود طلوعِ اسلام، اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے کہ

> مغربی ممالک، خواہ یورپ ہو، یا امریکہ، اسلامیات کی طرف، خالص علمی نقطہ نگاہ سے توجہ نہیں کر رہے ہیں۔ یورپ کے سامنے بھی، اپنے سیاسی مقاصد تھے، اسی طرح امریکہ کے پیشِ نظر بھی، اپنے سیاسی مصالح ہیں۔ ❶

منکرین حدیث کا طریقۂ واردات، جو انہوں نے ”مفکرِ قرآن“ ہی سے ورثہ میں پایا ہے، یہ ہے کہ نام تو قرآن کا لیا جائے، لیکن پیش وہ چیز کریں، جو اسلام کے ازلی دشمنوں (یہود و نصاریٰ کے سکالرز) کو قابلِ قبول ہو، اور ظاہر ہے کہ جس عنوان پر ”پرویزیت“ کی چھاپ لگی ہوئی ہو، اسے مسلمانوں (اور بالخصوص پاکستانی مسلمانوں) کی جامعات میں پذیرائی حاصل ہو یا نہ ہو، لیکن مغربی جامعات سے، اسے، مقبولیت اور پذیرائی کا مل جانا ضروری بلکہ یقینی ہے۔ اس امر کی بہترین مثال، طلوعِ اسلام کی مجلسِ انتظامیہ کے چیئرمین کا تیار کردہ، وہ تحقیقی خاکہ ہے جسے ڈاکٹریٹ کی ڈگری پانے کے لیے ملکی اور غیر ملکی جامعات میں

---

❶ طلوعِ اسلام، ۳ ستمبر ۱۹۵۵ء، ص ۱۳

بھیجا گیا۔ ملکی جامعات میں متعین سکالرز نے، جب اس خاکہ کو دیکھا تو انہوں نے محسوس کیا کہ قرآن کے نام پر، جو کچھ خاکہ میں پیش کیا گیا ہے، وہ دراصل، پرویزیت ہی کی روح لیے ہوئے ہے۔ اس صورت میں پاکستانی کارپردازانِ جامعہ کی طرف سے جو ردِّ عمل ہوا، اسے صاحب خاکہ نے، غیر ملکی جامعات کے پروفیسروں کے طرزِ عمل کے ساتھ، موازنہ کرتے ہوئے یوں بیان کیا ہے:

> ہمارے ملک کی جامعات کے اساتذہ اور غیر ممالک کے اساتذہ کی سوچ میں بہت فرق ہے۔ غیر ملکی، میرٹ پر فیصلہ اور تبصرہ کرتے ہیں جب کہ ہمارے اساتذہ، وُہی دیرینہ مُلّائی تعصب کے دائرے سے اپنے آپ کو باہر نکال نہیں پائے۔ ❶

اس کے بعد مغربی جامعات کے اساتذہ کے دو اقتباسات پیش کیے گئے ہیں جن میں اس خُطّۂ مقالہ کو بنظرِ تحسین دیکھا گیا ہے۔ پھر پاکستانی اور غیر ملکی اساتذۂ جامعات کے طرزِ عمل کا تقابلی جائزہ پیش کرتے ہوئے، نتیجہ بایں الفاظ پیش کیا گیا ہے:

> دونوں کے تقابل میں نظر آ رہا ہے کہ غیر ملکی سکالرز نے مقالہ کو کسی مکتبۂ فکر کی نمایندگی سے منسلک کرنے کی روشنی (یہاں صحیح لفظ "روش" ہے...... قاسمی) سے ہٹ کر، اسے خالص قرآن کی روشنی میں، اوّلین فکری تخلیق شمار کرتے ہوئے، ایک مستحسن علمی کاوش قرار دیا، البتہ ہمارے ملک کے سکالرز نے، اُمید کے مطابق، اس قرآنِ خالص کی فکر کو، فرقہ وارانہ رنگ دینے میں، مکتب و ملّا کی روشنی (روش ...... قاسمی) میں سبقت حاصل کرنے کی کوشش میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ ❷

حالانکہ، غیر ملکی اساتذہ (جو دینِ اسلام کے خلاف، بدترین عداوت اور تعصب میں مبتلا ہیں)، جس "میرٹ" کی بنیاد پر فیصلہ کرتے ہیں، وہ بڑی تفصیل کے ساتھ، طلوعِ اسلام،

---

❶ طلوعِ اسلام، اگست ۲۰۰۷ء، ص ۷۔

❷ طلوعِ اسلام، اگست ۲۰۰۷ء، ص ۱۰۔

۳ ستمبر ۱۹۵۵ء کے حوالہ سے بھی ، بیان ہو چکا ہے۔ پھر پاکستانی جامعات کے اساتذہ کرام (جو بقولِ منکرین حدیث، مُلائی تعصب میں گرفتار ہیں، اور میرٹ پر فیصلہ اور تبصرہ نہیں کرتے ہیں) ان کی وسعت نظر اور رواداری کا پھر بھی یہ عالم ہے کہ بالآخر، چیئر مین انتظامیہ طلوع اسلام کو، اُن ہی کے منتخب کردہ موضوع پر تحقیقی کام کرنے کی اجازت مل گئی۔ لیکن وہ ، غیر ملکی اساتذہ ، جو بقول اُن کے ''میرٹ پر فیصلہ کرتے'' ہیں، اور ''ملائی تعصب'' سے بالاتر ہیں، ان کے خلافِ اسلام تعصب و عداوت کا یہ حال ہے کہ اسلام کا تابناک اور درخشاں پہلو پیش کرنے والے طالب علم کو، اُس تحقیقی کام پر بھی ڈگری دینے کے لیے تیار نہیں ہیں، جس کی منظوری، وہ خود، اس سے پہلے دے چکے ہیں۔ ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی، فرماتے ہیں:

> دین اسلام کے خلاف انڈرسن کے دل میں جو تعصب تھا، میں اس کی مثالیں پیش کرنے سے قاصر ہوں۔ ڈاکٹر حمود غرابہ مرحوم، اُن دنوں، لنڈن میں، مرکز اسلامی ثقافت ، کے پرنسپل تھے۔ انہوں نے انڈرسن کے تعصب پر مشتمل بہت سے واقعات سنائے۔ البتہ ایک واقعہ بیان کرتا ہوں جو خود انڈرسن نے مجھے سنایا۔ کہنے لگا، میں نے جامعہ ازہر کے ایک فارغ التحصیل کو لنڈن یونیورسٹی سے فقہ اسلامی میں ڈاکٹر کی ڈگری لینے سے صرف اس لیے محروم کر دیا کہ اس نے ''اسلام میں عورت کے حقوق'' کے موضوع پر ایک مقالہ لکھا، جس میں بدلائل ثابت کیا کہ اسلام نے عورت کو پورے حقوق دیے ہیں۔ میں نے اس پر اظہارِ حیرت کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے اسے ڈاکٹر کی ڈگری لینے سے کیسے اور کیوں محروم رکھا، حالانکہ تم اپنی یونیورسٹیوں میں آزادیٔ فکر و نظر کا پرچار کرتے ہو؟ انڈرسن بولا، اس لیے کہ وہ ازہری ہر موقع پر یوں کہتا ہے کہ ''اسلام، عورت کو یہ سہولت دیتا ہے، اور اسلام نے عورت کے لیے یہ بات طے کی ہے۔'' میں سوچنے لگا کہ آیا وہ چلتا پھرتا اسلام ہے، جو خود بول رہا ہے، اور آیا وہ ابو حنیفہؒ یا شافعیؒ ہے کہ اس انداز میں بات کرتا ہے۔ ❶

---

❶ حدیث رسول کا تشریعی مقام، ص ۴۵۔

قصہ مختصر یہ کہ مغربی ممالک کی جامعات کے اسلام دشمن اساتذہ، قرآن کے نام پر، ہر اُس موضوع پر، اعلیٰ تعلیم کی ڈگری دینے پر تیار ہیں، جو ان کے ''میرٹ'' پر پورا اُترتا ہے، کیونکہ انہیں خوب معلوم ہے کہ قرآن کے نام پر، جو کچھ پیش کیا جاتا ہے، وہ، ان ہی کی عریاں اور بے حیا معاشرت کی اقدار و عادات اور اشتراکیت کا وہ نظام ہے، جو ایک فرزندِ یہودیت (کارل مارکس) نے پیش کیا تھا۔ رہے وہ موضوعات و عناوین، جو دین اسلام کے کمالات اور معالی کی وضاحت کرنے والے ہوں، تو وہ، اُن کے ''میرٹ'' پر پورے نہیں اُتر سکتے۔ یہ ہے وہ اصل حقیقت، جو مغرب کی ذہنی غلامی اور فکری اسیری میں مبتلا منکرین حدیث کی نگاہوں سے اوجھل ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ ان لوگوں کی آنکھوں پر، کون سی عینک چڑھی ہوئی ہے، جس کی بنا پر انہیں، مغربی ممالک کی جامعات کے اساتذہ میں، خلافِ اسلام تعصب اور عداوت، تو دکھائی نہیں دیتے، لیکن اپنے ملک کی جامعات کے مسلمان اساتذہ میں ''ملائی تعصب'' نظر آجاتا ہے۔ یہ ہے آج کے دور کی وہ ''عربی سازش'' جسے افرادِ مسلمین سے چھپائے رکھنے کے لیے، ''عجمی سازش'' کا ڈھول پیٹا جاتا ہے، تاکہ عالم کفر کے ہاں، یہ لوگ، سرخروئی اور سرفرازی پالیں۔ اَیَبْتَغُوْنَ عِنْدَھُمُ الْعِزَّۃَ فَاِنَّ الْعِزَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیْعًا.

۳۔ ''عجمی سازش'' اور شورش کاشمیری

گولڈزیہر، شاخت اور دیگر مستشرقین نے، اسلام کا جو تحریف شدہ مفہوم، اپنی تصنیفات میں پیش کیا ہے، وہ ان واقعات پر مبنی ہے، جو ادب عربی کی کتب میں مرقوم ہیں۔ ایسی کتب کے مصنفین، اخبار و واقعات کی صحت یا عدمِ صحت کی پروا نہیں کرتے، کیونکہ ان کتب میں مقصدِ تصنیف، خدمتِ دین نہیں بلکہ خدمتِ ادب ہوتا ہے۔ ایسی کتب کی قدر و قیمت، دینی پہلو سے متعین کرنے کی بجائے، ادبی پہلو سے کی جاتی ہے، ان نوشتوں میں علمی نکات سے کہیں زیادہ زور، جن امور و وقائع پر دیا جاتا ہے، وہ مزاح و فکاہت پر مشتمل ہوتے ہیں۔ لیکن مستشرقین، ایسی کتب سے واقعات لے کر، اسلامی تعلیمات کو، ان کی روشنی میں پرکھتے ہیں (بجائے اس کے کہ ان واقعات کو، قرآن وسنت کی روشنی میں پرکھیں) پھر خلافِ حقیقت اور

من پسند نتائج اخذ کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ قرآن وسنت کے ماہرین کی آراء وعبارات کی بجائے، اُن لوگوں کی نگارشات کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں، جو نثر نگاری، شعر وشاعری اور ادیبانہ ذوق میں طاق ومشاق ہیں۔ مستشرقین کی یہی ذہنیت، اُن کے مسلم شاگردانِ سعادت مند میں بھی پائی جاتی ہے۔ یہ لوگ بھی "دانش ورانِ قرآن" بن کر، جس فن کی مخالفت کرتے ہیں، اس کی تردید کے لیے اس فن سے ناواقف نثر نگاروں اور شاعروں کی آراء کو، "دلیل و برہان" کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ مثلاً حدیث اور علومِ حدیث کی تردید ومخالفت میں، یہ لوگ، شعراء کے اقوال کو حجت بنا کر پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ اِسی ضمن میں، دورِ ماضی کے ایک شاعر، بکر بن شدّاخ کے درجِ ذیل اشعار سے تمسک کیا گیا ہے:

لقد جفت الاقلام بالخلق کلهم
فمنهم شقی خائب و عنید

"یعنی ساری مخلوقات کی تقدیر لکھ کر قلم خشک ہو چکے، اب کوئی ان میں سے بدبخت ونامراد ہے تو کوئی بدنصیب۔"

تمر اللیالی بالنفوس سریعة
ویبدئ ربی خلقه ویعید

زمانہ لوگوں پر تیزی سے گزر رہا ہے، اور اللہ مخلوق کو یکے بعد دیگرے پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔

اری الخیر فی الدنیا یقل کثیر
وینقص نقصا والحدیث یزید

میں دیکھتا ہوں کہ اچھی چیزیں، دنیا میں کم ہوتی اور گھٹتی جارہی ہیں، لیکن حدیث ہے کہ برابر بڑھتی جاتی ہے۔

فلو کان خیرا قلّ کالخیر کلّہ
واحسب ان الخیر منہ بعید
اگر یہ بھی اچھی چیز ہوتی تو دوسری اچھی چیزوں
کی طرح گھٹتی۔ میرا خیال ہے کہ خیر، اس سے
بعید ہے۔ ❶

”مفکر قرآن“ کی ”عجمی سازش“ از سر تا پا، قطعی بے اصل و بے بنیاد ہے۔ تاہم، ”مفکر قرآن“ کے اس افسانے کو، جس شعبہ علم سے وابستہ کیا جا سکتا ہے، وہ علم تاریخ ہے، لیکن تاریخ کے قابل اعتماد مؤرخین میں سے کسی ایک نے بھی اسے بیان نہیں کیا، خواہ، ان کا تعلق اسلاف سے ہو یا اخلاف سے۔ ”مفکر قرآن“ نے اپنی لفظی ملمع کاریوں، قلمی چابک دستیوں، بھر پور رنگ آمیزیوں اور ادبی تصنع کاریوں سے، جس ”عجمی سازش“ کو گھڑا ہے، اس کی حمایت و تائید کسی مؤرخ نے نہیں کی، بلکہ ایک صحافی شورش کاشمیری نے کی ہے، جو اگرچہ ادیبانہ نثر نگاری اور ماہرانہ شاعری میں ممتاز مقام کا حامل تھا، لیکن دینی علوم اور تاریخی معلومات کے لحاظ سے اس کا کوئی مقام نہ تھا۔ وہ صاحب طرز ادیب اور کہنہ مشق شاعر ضرور تھا، لیکن شرعی علوم میں سے کسی شعبہ علم میں بھی، ماہرانہ دسترس تو رہی ایک طرف، اُسے مبتدیانہ واقفیت بھی حاصل نہیں تھی۔ اور شاعر ہونے کی حیثیت سے شورش کاشمیری کا جو مزاج تھا، نہ صرف اس کے متعلق، بلکہ ہر شاعر کے مزاج کے متعلق، جناب پرویز ہی کا قول ہے:

> ”شاعر کو تحقیق سے غرض نہیں ہوتی، وہ ہر مروّج اور مشہور روایت سے فائدہ اُٹھا لیتا ہے۔“ ❷

بہر حال، شورش صاحب، علم تاریخ سے ناواقف ہونے کی بناء پر، اور دینی اُمور میں تحقیق سے بے غرض اور بے پروا ہونے کی بنا پر، پرویز صاحب کی ساحرانہ و تلبیسانہ نگارش سے متاثر ہوئے، اور چکنی مٹی پر سے پھسل گئے۔ ان کے یوں پھسلنے سے وابستگانِ طلوع

---

❶ مقامِ حدیث، ص: ۵۷ تا ۵۸

❷ طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۶۴ء، ص: ۷۳۔

اسلام، خوشی سے اچھل پڑے، اور پکار اُٹھے کہ مدیر چٹان، جناب شورش کاشمیری نے ''مفکر قرآن'' کی ''عجمی سازش'' کی نہ صرف یہ کہ تائید کی، بلکہ پرویز صاحب کے لیے، ان کے دل میں احترام کی فضا بھی پیدا ہوئی۔ جیسا کہ طلوعِ اسلام، جون ۱۹۷۴ء میں مذکور ہے۔

شاہکار رسالت میں، ''مفکر قرآن'' نے جس طرح مسخ حقائق، تنکیس واقعات اور تقلیب اُمور سے کام لیا ہے، اور قطع و برید، کتربیونت، اور ترمیم و تغییر کے استشراقی حربوں کے ساتھ ساتھ، جس طرح اپنے مخصوص پرویزی حیلوں سے کام لیا ہے، وہ عربی زبان اور عربی مآخذ سے ناواقف شخص کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آسکتے۔ شورش کاشمیری، بلاشبہ، اپنی نثر نگاری میں اور پختہ مزاج شاعری میں، خواہ کتنا ہی اونچا مقام رکھتے تھے مگر علومِ شرعیہ میں، ان کا کوئی مقام و مرتبہ نہ تھا۔ ان کا ''عجمی سازش'' کی تائید کرنا، اور ذاتِ پرویز کی تحسین کرنا، بالکل ایسا ہی ہے، جیسے کسی فن سے ناواقف اور اناڑی شخص کا اپنی ''ماہرانہ رائے'' کا اظہار کرنا۔

اگر آج شورش کاشمیری، زندہ ہوتے، اور ''جناب غلام احمد پرویز کی (خودساختہ) عجمی سازش پر ایک نظر'' کا مطالعہ فرما لیتے، تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ ''عجمی سازش'' کن استشراقی حربوں اور پرویزی حیلوں کے ساتھ گھڑی گئی ہے۔ واقعاتِ تاریخ میں کس طرح اور کس قدر حقائق کو مسخ کیا گیا ہے، اور جس مواد پر، اسے اساس پذیر کیا گیا ہے، وہ صحت و صداقت کے لحاظ سے کیا مقام رکھتا ہے۔ تاریخ کے نام پر ''مفکر قرآن'' کے، اپنے کن اوہام و وساوس کو، حقائق کا لباسِ زُور پہنا کر پیش کیا گیا ہے، اور ایسا کرتے ہوئے اکابرین سلف کو، کس قدر، اپنی بہتان تراشیوں کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ مجھے قوی اُمید ہے کہ ان سب مکائد و دسائس سے اگر شورش کاشمیری، آگاہ ہو جاتے، تو اپنی رائے سے رجوع فرما لیتے۔

* * *

جناب غلام احمد پرویز کی

عجمی سازش...... حقائق کے آئینے میں

کتابیات

(الف) کتب ترجمہ و تفاسیر قرآن

۱: پرویز، غلام احمد چوہدری ...... تفسیر مطالب الفرقان، جلد اوّل ...... ادارۂ طلوعِ اسلام، ۲۵ بی گلبرگ، لاہور...... I ر اکتوبر ۱۹۷۵ء۔

۲: پرویز، غلام احمد چوہدری...... تفسیر مطالب الفرقان، جلد دوم...... ادارۂ طلوعِ اسلام، ۲۵ بی گلبرگ، لاہور...... I ر اکتوبر ۱۹۷۶ء۔

۳: پرویز، غلام احمد چوہدری...... تفسیر مطالب الفرقان، جلد سوم...... ادارۂ طلوعِ اسلام، ۲۵ بی گلبرگ، لاہور...... I ر نومبر ۱۹۷۹ء۔

۴: پرویز، غلام احمد چوہدری...... تفسیر مطالب الفرقان، جلد چہارم...... ادارۂ طلوعِ اسلام، ۲۵ بی گلبرگ، لاہور...... I ر نومبر ۱۹۸۱ء۔

۵: پرویز، غلام احمد چوہدری...... تفسیر مطالب الفرقان، جلد ششم...... ادارۂ طلوعِ اسلام، ۲۵ بی گلبرگ، لاہور...... I ر نومبر ۱۹۸۵ء۔

۶: پرویز، غلام احمد چوہدری...... تفسیر مطالب الفرقان، جلد ہفتم...... ادارۂ طلوعِ اسلام، ۲۵ بی گلبرگ، لاہور...... II ر نومبر ۱۹۹۵ء۔

۷: الخازن، علی بن محمد بن ابراہیم، تفسیر لباب التاویل فی معانی التنزیل، مطبعۃ التقدم العلمیہ مصر ۱۳۳۱ھ

۸: الشافعی، امام محمد بن ادریس ...... احکام القرآن ...... دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان ...... ۱۴۰۰ھ=۱۹۸۰ء۔

۹: عبدالقادر، شاہ ...... موضح القرآن ...... تاج کمپنی، کراچی۔

۱۰: مودودیؒ، سیّد ابوالاعلیٰ ...... تفہیم القرآن، جلد اوّل ...... ادارۂ ترجمان القرآن، لاہور، پاکستان ...... XX؍جولائی ۱۹۹۸ء۔

۱۱: مودودیؒ، سیّد ابوالاعلیٰ ...... تفہیم القرآن، جلد سوم ...... ادارۂ ترجمان القرآن، لاہور، پاکستان ...... XX؍جولائی ۱۹۹۸ء۔

(ب) کتب احادیث وشروح حدیث

۱۲: امام ابن ماجہ ...... سنن ابن ماجہ ...... ایچ ایم سعید اینڈ کمپنی، ادارۂ منزل، پاکستان چوک، کراچی۔

۱۳: امام ابو داؤد ...... سنن ابی داؤد مع شرح عون المعبود ...... نشر السنۃ، بیرون بوہڑ گیٹ، ملتان۔

۱۴: امام بخاری ...... صحیح بخاری مع شرح فتح الباری ...... المکتبۃ السّلفیہ۔

۱۵: امام ترمذی ...... جامع ترمذی مع شرح تحفۃ الاحوذی ...... ضیاء السنۃ، ادارۂ ترجمۃ التالیف، رحمت آباد، فیصل آباد۔

۱۶: امام مسلم ...... صحیح مسلم مع شرح الاکمال ...... قدیمی کتب خانہ، مقابل آرام باغ، کراچی ...... II؍جولائی ۱۹۵۶ء۔

۱۷: امام نسائی ...... سنن نسائی مع شرح التعلیقات السّلفیہ ...... المکتبۃ السّلفیہ، لاہور، پاکستان

۱۸: عبداللہ بن عبدالرحمٰن دارمی ...... سنن دارمی ...... نشر السنۃ، ملتان، لاہور، پاکستان۔

(ج) کتب متفرقہ

۱۹: ابن اثیر...... الکامل فی التاریخ۔ دار الصادر، للطباعۃ والنشر، بیروت ۱۳۸۵ھ/۱۹۶۵ء

۲۰: ابن تیمیہ...... فتاویٰ ابن تیمیہ...... ادارۃ المساحۃ العسکریۃ بالقاہرۃ، مصر...... ۱۴۰۴ھ

۲۱: ابن جریر الطبری۔ الریاض النضرہ فی مناقب العشرہ، مکتبہ محمد نجیب الخانجی مطبعۃ دار التالیف، مصر۔ طبع ثانی ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۳ء

۲۲: ابن حجر...... الاصابۃ فی تمییز الصحابہ...... دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان...... ۱۹۷۱ء۔
ابن حجر...... لسان المیزان...... دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان...... ۱۹۷۱ء۔

۲۳: ابن خلدون

۲۴: ابن قتیبہ...... الامامۃ والسیاسۃ...... منشورات الشریف الرضی، قم، ایران...... ۱۳۶۳ھ

۲۵: ابن قتیبہ...... المعارف...... قدیمی کتب خانہ، آرام باغ، کراچی، نور محمد اصح المطابع، کارخانہ تجارت کتب...... ۱۹۷۶ء۔

۲۶: ابن قیم...... اعلام الموقعین...... دار الجبل، بیروت، لبنان۔

۲۷: ابن کثیر۔ تاریخ ابن کثیر، نفیس اکیڈمی کراچی۔ جنوری ۱۹۸۹ء

۲۸: اسماعیل، مولانا محمد...... تحریک آزادیٔ فکر...... مکتبہ نذیریہ، جامع مسجد قباء، چناب بلاک، لاہور۔ ۱۸۔

۲۹: اسماعیل، مولانا محمد...... حجیت حدیث...... اسلامک پبلشنگ ہاؤس، ۲ شیش محل روڈ، لاہور...... I/ جون ۱۹۸۱ء۔

۳۰: اصلاحی، امین احسن...... تزکیۂ نفس (جلد اوّل)...... ملک سنز پبلشرز، کارخانہ بازار فیصل آباد...... ۱۹۸۶ء۔

۳۱: اکبر شاہ نجیب آبادی، تاریخ اسلام

۳۲: اکرام، شیخ محمد...... آبِ کوثر...... ادارۂ ثقافت اسلامیہ، ۲ کلب روڈ، لاہور...... XXII، جون ۲۰۰۲ء۔

۳۳: بلاذری ...... فتوح البلدان ...... دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان ...... ۱۳۹۸ھ = ۱۹۷۸ء۔

۳۴: بلخی افتخار احمد ...... فتنۂ انکار حدیث کا منظر و پس منظر ...... مکتبہ چراغ راہ، کراچی۔

۳۵: پرویز، غلام احمد ...... برقِ طور ...... طلوع اسلام ٹرسٹ، ۲۵ بی گلبرگ، لاہور ...... IV ...... ۱۹۹۳ء۔

۳۶: پرویز، غلام احمد ...... تحریک پاکستان اور پرویز ...... طلوع اسلام ٹرسٹ، ۲۵ بی گلبرگ، لاہور ...... I / اگست ۱۹۸۹ء۔

۳۷: پرویز، غلام احمد ...... تصوف کی حقیقت ...... طلوع اسلام ٹرسٹ، ۲۵ بی گلبرگ، لاہور ...... IV / دسمبر ۱۹۶۶ء۔

۳۸: پرویز، غلام احمد ...... دو مسائل ...... میزان پبلی کیشنز لمیٹڈ، لاہور ...... II / جون ۱۹۶۲ء۔

۳۹: پرویز، غلام احمد ...... سلیم کے نام، جلد اوّل ...... طلوع اسلام ٹرسٹ، ۲۵ بی گلبرگ، لاہور ...... VII / اگست ۱۹۸۹ء۔

۴۰: پرویز، غلام احمد ...... شاہکارِ رسالت ...... طلوع اسلام ٹرسٹ، ۲۵ بی گلبرگ، لاہور ...... IV / ۱۹۸۷ء۔

۴۱: پرویز، غلام احمد ...... قرآنی فیصلے، جلد اوّل ...... طلوع اسلام ٹرسٹ، ۲۵ بی گلبرگ، لاہور ...... II۔

۴۲: پرویز، غلام احمد ...... قرآنی قوانین ...... طلوع اسلام ٹرسٹ، ۲۵ بی گلبرگ، لاہور ...... II / اپریل ۱۹۷۸ء۔

۴۳: پرویز، غلام احمد ...... لغات القرآن، جلد اوّل ...... طلوع اسلام ٹرسٹ، ۲۵ بی گلبرگ، لاہور ...... II / مارچ ۱۹۶۰ء۔

۴۴: پرویز، غلام احمد ...... لغات القرآن، جلد سوم ...... طلوع اسلام، دہلی۔

۴۵: پرویز، غلام احمد ...... معارف القرآن، جلد اوّل ...... ۳۷ / ترکمان روڈ، نئی دہلی۔

۴۶: پرویز، غلام احمد...... معارف القرآن، جلد دوم...... ۳۷۔ ترکمان روڈ، نئی دہلی۔

۴۷: پرویز، غلام احمد...... معارف القرآن، جلد سوم...... ادارۂ طلوعِ اسلام، کراچی۔

۴۸: پرویز، غلام احمد...... معارف القرآن، جلد چہارم...... ادارۂ طلوعِ اسلام، کراچی۔

۴۹: پرویز، غلام احمد...... معراجِ انسانیت...... ادارۂ طلوعِ اسلام، ۲۵ بی گلبرگ، لاہور...... IV/۱۹۸۴ء۔

۵۰: پرویز، غلام احمد...... مفہوم القرآن، جلد ۱...... ادارۂ طلوعِ اسلام، ۲۵ بی گلبرگ، لاہور۔

۵۱: پرویز، غلام احمد...... مفہوم القرآن، جلد ۲...... ادارۂ طلوعِ اسلام، ۲۵ بی گلبرگ، لاہور۔

۵۲: پرویز، غلام احمد...... مقامِ حدیث...... ادارۂ طلوعِ اسلام، ۲۵ بی گلبرگ، لاہور...... V ......۱۹۹۲ء۔

۵۳: پرویز، غلام احمد...... نظامِ ربوبیت...... ادارۂ طلوعِ اسلام، ۲۵ بی گلبرگ، لاہور...... II ......۱۹۷۸ء۔

۵۴: جامعہ پنجاب لاہور، اُردو دائرہ معارفِ اسلامیہ، طبع ثانی ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۱ء

۵۵: جیراجپوری، محمد اسلم...... تاریخ الامت، جلد دوم...... میزان پبلی کیشنز لمیٹڈ، ۲۷ بی شاہ عالم مارکیٹ، لاہور...... II۔

۵۶: جیراجپوری، محمد اسلم...... تاریخ الامت، جلد چہارم...... میزان پبلی کیشنز لمیٹڈ، ۲۷ بی شاہ عالم مارکیٹ، لاہور...... II۔

۵۷: جیراجپوری، محمد اسلم...... تاریخ القرآن...... آواز اشاعت گھر، فاروق مارکیٹ، حق سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور۔

۵۸: حالی، الطاف حسین...... مسدس حالی...... پاپولر پبلشنگ ہاؤس، اُردو بازار، لاہور...... اگست ۱۹۹۳ء۔

۵۹: حریری، غلام احمد (مترجم)...... تاریخ تفسیر ومفسرین (اُردو)...... ملک سنز، ناشران و تاجران کتب، کارخانہ بازار، فیصل آباد...... جنوری ۲۰۰۴ء۔

۶۰: خادم حسین، الٰہی بخش...... القرآنیون۔

۶۱: خطیب بغدادی...... الکفایۃ فی علم الروایۃ...... المکتبۃ العلمیۃ۔

۶۲: ذہبی، امام...... میزان الاعتدال...... المکتبۃ الاثریۃ، سانگلہ ہل، شیخوپورہ...... ۱۳۸۲ھ = ۱۹۶۳ء۔

۶۳: رفیق شیخ + مسعود حیدر بخاری...... تاریخ اسلام...... III...... جنوری ۱۹۷۱ء۔

۶۴: سجاد، قاضی زین العابدین...... تاریخ الملت...... ندوۃ المصنفین، اُردو بازار، جامع مسجد، دہلی، انڈیا...... 1951ء۔

۶۵: شبلی نعمانی...... الفاروق...... ایم ثناء اللہ خاں، ۲۶، ریلوے روڈ، لاہور...... II، مارچ ۱۹۴۹ء۔

۶۶: شورش کاشمیری...... ابوالکلام آزاد...... مطبوعات چٹان، ۸۸ میکلوڈ روڈ، لاہور

۶۷: صباح الدین عبدالرحمٰن، اسلام اور مستشرقین۔ دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ انڈیا۔ دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۴ء

۶۸: ضیاء الدین اصلاحی، اسلام اور مستشرقین۔ دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ انڈیا۔ ۲۰۰۴ء

۶۹: عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی، اسلام اور مستشرقین۔ دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ انڈیا۔ نومبر ۲۰۰۳ء

۷۰: عبداللہ، ملک محمد...... تاریخ پاکستان...... طابع عبدالصمد قریشی، ناشر قریشی برادرز، چوک اُردو بازار، لاہور...... ۱۹۸۳ء۔

۷۱: عبدالرحمٰن بن یحییٰ...... الانوار الکاشفہ...... حدیث اکادمی، نشاط آباد، فیصل آباد، پاکستان

۷۲: عمری، ڈاکٹر محمد عارف۔ اسلام اور مستشرقین۔ دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ انڈیا۔ پہلا ایڈیشن ۲۰۰۶ء

۷۳: مسعود احمد (بی ایس سی) کراچی، تفہیم اسلام، اہل حدیث اکیڈمی، کشمیر بازار لاہور۔

نومبر ۱۹۶۷ء

۷۴: مسعودی...... مروج الذہب...... دار الاندلس للطباعة والنشر، بیروت، لبنان...... I...... ۱۹۶۵ء۔

۷۵: مصطفیٰ سباعی، حدیث رسول کا تشریعی مقام (مترجم غلام احمد حریری) ملک سنز پبلشرز فیصل آباد۔ ۲۰۰۶ء

۷۶: معین الدین حاجی...... خلفاءِ راشدین...... دار المصنفین، اعظم گڑھ...... ۱۳۶۴ھ = ۱۹۴۸۔

۷۷: معین الدین شاہ ندوی...... تاریخ اسلام...... معارف پریس، اعظم گڑھ...... ۱۹۳۹ء۔

۷۸: مناظر احسن گیلانی...... تدوین حدیث...... مکتبہ اسحاقیہ، جونا مارکیٹ، کراچی نمبر ۲۔

۷۹: مناظر احسن گیلانی...... ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی۔

۸۰: مودودی، ابوالاعلیٰ...... اسلامی نظامِ زندگی۔

۸۱: مودودی، ابوالاعلیٰ...... تفہیمات، جلد اوّل۔

۸۲: مودودی، ابوالاعلیٰ...... رسائل ومسائل، جلد دوم۔

۸۳: مودودی، ابوالاعلیٰ...... رسائل ومسائل، جلد سوم۔

۸۴: مودودی، ابوالاعلیٰ...... سنت کی آئینی حیثیت۔

(د) مجلّات

۸۵: ماہنامہ ترجمان القرآن...... سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ...... پٹھانکوٹ، لاہور۔

۸۶: ماہنامہ طلوعِ اسلام...... غلام احمد پرویز...... دہلی، کراچی، لاہور۔

۸۷: ماہنامہ معارف...... سیّد سلیمان ندویؒ...... اعظم گڑھ، انڈیا۔

۸۸: ماہنامہ محدث...... عبدالرحمٰن مدنی...... لاہور۔

(ر) انگریزی کتب

۸۰: T.W. Arnold, The Preaching of Islam. 7-Abeck Road, Lhr Sep,1979.

۸۱: C.W. Smith, Modern Islam in India,1969,Lhr.

* * *

جامعہ بیت العتیق (رجسٹرڈ)
کتاب نمبر

مصنف کی دیگر کتب

جناب
غلام احمد پرویز
اپنے الفاظ کے آئینے میں
پروفیسر محمد دین قاسمی

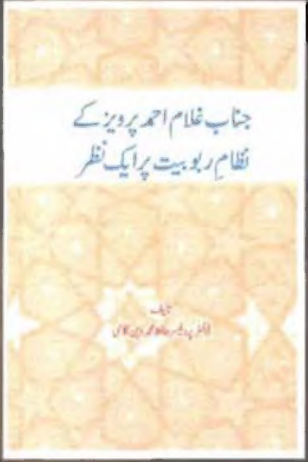
جناب غلام احمد پرویز کے
نظامِ ربوبیت پر ایک نظر

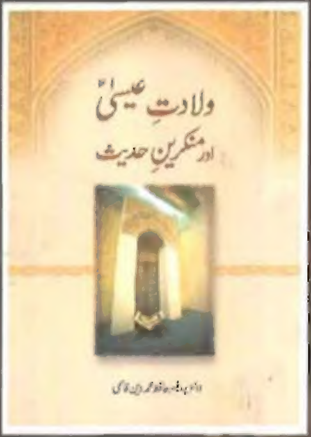
ولادتِ عیسیٰؑ
اور منکرینِ حدیث

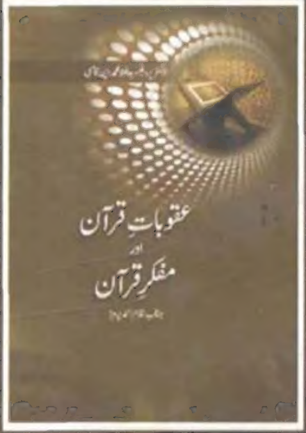
عقوباتِ قرآن
اور
مفکرِ قرآن
جناب غلام احمد پرویز

Designed by Naveed Ahmad 0321 8401998

کتاب سرائے
فون 042-7320318
hikmat100@hotmail.com

فضلی بک سپر مارکیٹ
فون 2212991-2629724